تعلیماتِ غزالی

تعلیماتِ غزالی

جس میں غزالی کی اس خصوصیّت کو اُجاگر کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے
کیونکر فقہ کی تفصیلات کو تصوّف کے رنگ میں بیان کیا ہے

محمد حنیف ندوی

★

۱۹۶۲

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ۔ لاہور

طبع اوّل ۱۹۶۲ء

تعداد ایک ہزار

یہ کتاب "تعلیماتِ غزالیؒ" حسب تصریح مرتب (ص ۲) امام غزالیؒ کی مشہور کتاب "احیاء علوم الدین" سے ماخوذ اور اس کا گویا انتخاب ہے۔

طابع: دین محمدی پریس۔ مل روڈ۔ لاہور

ناشر: محمد اشرف ڈار سیکرٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ۔ لاہور

فہرست

تعلیماتِ غزالی

عوام صرف زکوٰۃ دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ زکوٰۃ کے لئے ایک متعین مالی سال کی تعیین ضروری ہے۔ ریاکاری سے بچنے کی تدبیریں۔ حبِ جاہ کا جذبہ حبِ مال کے جذبہ سے کہیں قوی تر ہے۔ صدقات و خیرات کے سلسلہ میں اعلان بعض حالات میں موزوں ہے۔ من واذیٰ کی عملی صورتیں۔ من کا تعلق درحقیقت دل سے ہے۔ اذیٰ کی تعریف۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے انسان دل گرفتہ کیوں ہو۔ غنیٰ و ثروت میں فساد کے پہلو۔ علاج و دوا کے دو طریق۔ استعظام من واذیٰ سے مختلف شئے ہے۔ اس کا علاج۔ مشتبہ مال میں سے خیرات دینا سوءِ ادب ہے۔ اپنی دعوتوں میں انہی لوگوں کو حصہ دار بنائے جو اتقیاء ہیں۔ اہلِ علم کی دستگیری۔ اپنی عنایات کا مرکز اللہ کے شکر گزار بندوں کو ٹھہرانا چاہئے۔ شکر و سپاس الٰہی کی تین امثال۔ ان شرفاء کی بھی مدد کرنا چاہئے جو ازراہِ تعفف دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔ عیالدار بھی مستحق توجہ ہیں۔ اعزہ واقارب کی مدد میں دوگونہ ثواب ہے۔ استحقاقِ زکوٰۃ کی معنوی شرطیں: زکوٰۃ وصول کرنے والوں کی روحانی واخلاقی ذمہ داریاں۔ ابوطلحہ کا ایثار۔ تقسیم صدقات کا صحیح انداز کون سا ہے: اخفا یا اظہار۔ اخفاء کے دلائل خمسہ۔ ایوب سختیانی کا قول۔ اسرار و اظہار میں عملی فرق۔ اظہار کے دلائل۔ توحید کی اصلی روح۔ اخفاء و اظہار میں اصل معیار ہر ہر انسان کی نفسی کیفیت ہے۔ نیتوں کو جانچنے کا پیمانہ۔

حدیثِ صوم ۲۲۷ تا ۲۴۴

روزہ کی اہمیت۔ روزہ کو امتیاز کیوں حاصل ہے۔ روزہ کے اسرار اور معنوی شرطیں۔ روزہ کے تین مدارج۔ دنیا کی تعریف اربابِ قلوب کے نقطۂ نظر سے۔ صوم خصوص کا نقشہ اور شرائط۔ روزہ کی حقیقت۔ کیا روزہ میں کھانے پینے کے تعیشات کا معمول جاری رہنا چاہئے۔ رمضان میں جذبات کا کیا عالم ہونا چاہئے۔ حسن بصری کی تصریحات۔ معانیٔ باطنہ اور فقہاء ظاہر و باطن میں فرق۔ فقہاء اور علماء ظاہر کے مخاطبین الگ الگ ہیں۔ روزہ کا اوّلین اور بنیادی مقصد۔ روزہ رکھنے اور اس کی روح نظر انداز کرنے اور نہ رکھنے اور اس کی روح کو برقرار رکھنے میں کیا فرق ہے۔

اسرارِ حج ۲۴۵ تا ۲۸۸

حج کے فضائل و اہمیت۔ ایامِ حج میں شیطان کا اضطراب۔ حج کے بعد مکہ میں ٹھہر جانا افضل ہے۔ مکہ مکرمہ میں نیتوں پر بھی مواخذہ ہے۔ مدینہ کے فضائل: دیارِ حبیب کی برکتیں۔ حدیث شد رحال کی تشریح۔ ترکِ وطن میں دینی مصلحتوں کو ترجیح دینا چاہئے۔ ترکِ وطن

مترادف ہے۔ مرد کے لئے باپ کی حیثیت سے کن آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ طلاق بدرجۂ مجبوری دینا چاہئے۔ طلاق کب اور کیونکر دینا چاہئے۔ پہلے ایک ہی طلاق پر اکتفا کرنا چاہئے شوہر کے حقوق۔ شوہر کی اطاعت ضروری ہے۔ خاوند کی ناشکری اور لعن طعن کی عادت جہنم میں لے جانے والی ہے۔ ازدواجی زندگی کے لئے دو اہم باتیں۔ عورتوں کو کن اخلاق و عادات کا حامل ہونا چاہئے۔

محبت و اخوت ۱۸۱۴ تا ۲۷۴

اُلفت و محبت۔ مکارمِ اخلاق کے فضائل۔ مرد مومن بندۂ اُلفت و محبت ہے۔ وہ محبت جو اللہ کے لئے ہو حقیقی اُخوت کے مترادف ہے۔ خالص محبت میں اللہ تعالیٰ بھی شرکت فرماتا ہے۔ محبت فی اللہ کے معنی مجرد محبت کے نہیں، بلکہ ایسی محبت کے ہیں جو عملی زندگی میں اثر انداز ہو۔ الحب للہ کا مفہوم۔ محبت کی قسمیں اور فلسفہ۔ محبت کے سلسلہ میں ایک بڑی پیچیدگی اور آنحضرت کی توجیہ۔ محبت و اُلفت کی محرک کچھ باطنی مناسبتیں ہیں جن کی معقول اور جچی تلی توجیہ ناممکن ہے۔ کیا حُسن و جمال سے لُطف اندوزی کا محرک ہمیشہ جنسی جذبہ ہی ہوتا ہے۔ اگر وسائل سے محبت اس بنا پر ہے کہ اس سے کوئی دینی اور اونچا مقصد حاصل ہوتا ہے تو محبت کی یہ نوعیت الحب فی اللہ میں داخل ہے ورنہ نہیں۔ الحب فی اللہ کی بظاہر دُنیاوی صورتیں۔ محبت دُنیا فی نفسہٖ محبت عقبیٰ کے منافی نہیں۔ دنیا و آخرت میں کیوں منافات نہیں۔ کیا منہیات میں مزاح و طبیعت کی کوئی بُرائی پائی نہیں جاتی۔ محبت کی سب سے اونچی قسم۔ محبوب اور اس کے جملہ متعلقات سے تعلق خاطر۔ جب محبوب اور اس کے جملہ متعلقات سے محبت استوار ہو جاتی ہے تو عقوبت و ثواب کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ بغض فی اللہ کی حقیقت۔ بغض فی اللہ۔ الحب للہ کا منطقی نتیجہ ہے۔ بغض و محبت کے دوگونہ جذبات کے سلسلہ میں ایک پیچیدگی اور اس کا حل۔ بغض فی اللہ کی حدود۔ محبت و دوستی کی شرطیں۔ الحب فی اللہ کا معیار۔ عقل و زیرکی دوستی کا راس المال ہے۔ حسن خلق دوستی کی بُنیاد و اساس ہے۔ دوستی اور محبت کے بارہ میں اہلِ تقوےٰ کے حکیمانہ اقوال۔ حضرت علیؓ کا تصورِ محبت۔ پانچ آدمی صحبت کے قابل نہیں۔ فاسق مگر شائستہ اس قاری قرآن سے زیادہ اچھا ہے جو بداخلاق ہو۔ افادہ و ضرر کے نقطۂ نگاہ سے انسانوں کی تقسیم۔ حضرت ابوذر غفاری اور رفاقت۔ مسک الختام۔ اُخوت و رفاقت کے تقاضے۔ اخوت و رفاقت ایک طرح کا عقد و رابطہ ہے۔ دوستوں کے بارہ میں ہمارے اسلاف کا طرزِ عمل۔ مومن و منافق میں تفریقاتی

فرق۔ سوءِ ظن سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

معاملات ۴۷۳ تا ۵۰۸

کسبِ معاش کی فضیلت۔ دُنیا کی دلچسپیوں کے اعتبار سے اشخاص کی تین قسمیں۔ سچے تاجر کے رتبہ کی بلندیاں اسے انبیاء کی معیت حاصل ہوگی۔ پیشہ و ہنر کی عنداللہ کیا قدر و منزلت ہے۔ بیکاری جُرم ہے۔ کاروبار میں مصروفیت کی موت بہترین موت ہے۔ کچھ ایسی تصریحات جن سے حصولِ معاش کے مقابلہ میں اُخروی اقدار کو مرجح سمجھا گیا ہے۔ کاروبار یا تجارت میں عدل و احسان کی اہمیت۔ معاملات کی وہ صورتیں جو بظاہر جائز معلوم ہوتی ہیں، مگر دراصل ناجائز ہیں۔ احتکار کا تعلق صرف غذائیت سے ہے۔ احتکار کے بارہ میں اصل اصول ضرر و اضرار ہے۔ تزئیف یا کھوٹا سکہ چلانا اجتماعی معصیت کے مترادف ہے۔ فریقِ معاملہ کے حقوق۔ عدل و انصاف کا منطقی پیمانہ یا کسوٹی۔ اپنے مال کی بیجا تعریف نہیں کرنا چاہیئے۔ صحیح تعریف بھی اولیٰ نہیں۔ مبیع کے تمام عیوب بیان کر دینا چاہیئے۔ اسلاف کے نقطۂ نظر سے کاروبار میں یہ احتیاط صرف ازدیادِ درجات کی غرض سے نہ تھی بلکہ یہ حضرات اس کو اسلام کی ایک ضروری شرط قرار دیتے تھے۔ کاروبار میں مقامِ صدیقیت کے حصول کی دو شرطیں۔ تول اور وزن میں ہمیشہ تقاضائے دیانت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ تطفیف کا اصول صرف ناپ تول ہی سے مخصوص نہیں۔ مقررہ بھاؤ سے زیادہ دام وصول نہیں کرنے چاہئیں۔

فہمِ قرآن ۵۰۹ تا ۵۵۹

فضائلِ قرآن۔ قرآن سب سے بڑی دولت ہے۔ فضائلِ قرآن اور کچھ آثار قرآن سے بہرہ مندی علومِ نبوت سے بہرہ مندی کے مترادف ہے۔ قرآن کے معاملہ میں غفلت و سہو کی مذمت۔ کیا کلام اللہ کا درجہ ایک دوست کے خط سے بھی کم درجہ کا ہے۔ آدابِ تلاوت۔ قرآن کیونکر پڑھنا چاہیئے۔ تلاوت میں مقدار اولیٰ کیا ہے۔ ترتیل و تدبرِ قرآن۔ کیا قرآن بآوازِ بلند پڑھنا چاہیئے یا بآسر۔ اختلافِ احوال سے مسئلہ کا انداز بدل جاتا ہے۔ قرآن کو ترتیل و خوش الحانی سے پڑھنا چاہیئے۔ مگر اس کے معنی موسیقی نہیں۔ تلاوت و قرأتِ قرآن کے باطنی پہلو۔ فہم و تدبرِ قرآن سے متعلق دس اہم نکات۔ کلام اللہ کی اصل حقیقت۔ نزول کا سبب اس کا لطف و کرم ہے۔ تفسیر بالرائے۔ کیا تاویل و تفسیر کے دائروں کو صرف ظاہر تک محدود رہنا چاہیئے۔ معانی اور باطنِ قرآن کے سلسلہ میں آثار و اقوال۔ تفسیر بالرائے کے معنی کیا ہیں۔ استنباط صرف سماع و نقل کا حامل نہیں بلکہ معنوی تقاضے اور گہرائیاں بھی اس میں شامل ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

قانون و شریعت کے سانچوں پر اہلِ علم نے چار طریقوں سے غور کیا ہے۔ ایک اس طریق سے کہ مسائل و جزئیات کا تفصیلی نقشہ کیا ہے اور شریعت اسلامی کی وسعتیں کن کن جزئیات و تفریعات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ فقہ ہے، اور اس کے جاننے والے کو فقیہ کہا جاتا ہے۔ غور و فکر کا دوسرا نہج یہ ہے، کہ ان جزئیات و فروع کے پیچھے جو اصول، جو قانونی روح اور قواعد کلیہ کارفرما ہیں ان کا سراغ لگایا جائے۔ اس فن کو اصول کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے جاننے والے کو اصولی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ علم و فن کے اس مقام اور مجتہد کے مقام میں کیا فرق ہے؟ اس کو معلوم کرنے کے لئے زیادہ کاوش درکار نہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ان میں ایک ہی قدم یا جست کا فاصلہ حائل ہے۔ یعنی اگر ایک اصولی انھیں کلیات کو جن پر اس کو عبور و استحضار حاصل ہے، جزئیات پر پھیلاتا، یا ان کے جزئیات کو مستنبط کرتا ہے تو وہ مجتہد ہے۔ تیسرا نقطہ نظر یہ ہے۔ کہ شریعت و فقہ کی جزئیات کو عقل و خرد اور فلسفہ و حکمت کی کسوٹیوں پر پرکھا جائے۔ یہ علم الکلام ہے۔ اور تاریخ اسلامی میں ایسے حضرات کو متکلمین کہا جاتا ہے۔ جو دین و دانش میں ربط و توافق تلاش کرتے ہیں۔ اور مذہب کے لئے ایسے عقلی و فکری پیمانے مہیا کرتے ہیں۔ جو شکوک و شبہات کو دور کر سکیں۔ اور دینی و فکری اضطراب کے لئے ایک گونہ تسکین و طمانینت کا باعث ہو سکیں۔ غور و فکر کا چوتھا مگر زیادہ اہم اسلوب یہ ہے کہ جزئیات، رسوم، شعائر اور عبادات و اخلاق میں جو باطنی روح ہے اس کا کھوج لگایا جائے۔ اس فلسفہ کی نشاندہی کی جائے جس کا تعلق دماغ کی اوپری سطح سے

نہیں، دل کی گہری اور عمیق کیفیتوں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اسلامی نظامِ حیات کے اندر ذوق و وجدان کی جو مناسبتیں پنہاں ہیں ان کو اجاگر کیا جائے اور ان حقائق کو منظرِ عام پر لایا جائے، جن کو عطرِ دین یا روحِ دین قرار دیا جاسکتا ہے۔ غور و فکر کا یہ انداز تصوّف ہے۔ بشرطیکہ اس کے پہلو بہ پہلو عمل و مجاہدہ کے لطائف بھی پائے جائیں۔ غزالی میں یہ چاروں صفات نہایت توازن اور اعتدال کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ بیک وقت فقیہ و اصولی بھی ہیں، اور فلسفہ و تصوّف کے ہوشمند شناور بھی۔ ہماری اس کتاب کا موضوع، ان کی انہیں کوششوں کو ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ہے، جن میں تصوّف و فقہ کو باہم سمو دیا گیا ہے۔ اور اسلام کے فقہی نظام کی ایسی عارفانہ، دلنشیں اور لگتی ہوئی ترجمانی کی گئی ہے جس سے داعیاتِ محبّت اُبھرتے ہیں۔ دین سے وابستگی بڑھتی ہے اور ذوق و شوق کے کوائف تازہ ہوتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص غزالی کے ان شہ پاروں کا مطالعہ کرے اور بغیر کسی تاثر پذیری کے گذر جائے۔ قلب و ذہن کی سلامتی البتہ شرط ہے۔ یہ انتخاب ان کی مشہور کتاب "احیاء" سے ماخوذ ہے۔

غیر مناسب نہ ہوگا، اس مرحلہ پر اگر ہم تصوّف اور اس کے متعلقات پر ذرا کھُل کر بات چیت کرلیں۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کے بارہ میں رائے قائم کرنا غیر منطقی فعل ہوگا۔ فقہ اور اس کی تفصیلات سے سرِ دست تعرض نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ جانی بوجھی حقیقت ہے۔ اور اس کے مفہوم و معنی کی تعیین میں کوئی اختلاف رائے پایا نہیں جاتا۔ اختلاف رائے جو کچھ ہے وہ مدارسِ فکر میں ہے، نفسِ حقیقت میں نہیں۔ تصوّف کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس کی تعبیر و ترجمانی میں اچھا خاصا اختلاف رائے رونما ہے۔ خصوصیّت سے اس مسئلہ میں کہ اسلام کس نوع کے متصوّفانہ افکار کا حامل ہے اور اسلام کے نظامِ عقائد میں اس کا کیا درجہ و مقام ہے، قطعی متنازعہ فیہ مسئلہ

ہے۔ اس بنا پر اگر ہم آیندہ صفحوں میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو نظر و فکر کا ہدف ٹھہرا سکیں۔ اور اس راہ کی مشکلات کا جائزہ لے سکیں۔ تو یہ کوشش بہر حال مفید رہے گی۔ آخر آخر میں غزالی کا نقطہ نظر بیان کرنا ہے، اور یہ بتانا ہے کہ فقہ کے مختلف ابواب میں انہوں نے اپنے اس معیار نظر و فکر کو کس طرح برت کر دکھایا ہے۔

لفظ تصوف کا مشتق منہ صوفی کا ماخذ کون لفظ ہے اور اس کی اصل و اساس کیا ہے؟ اس کا جواب متفق علیہ نہیں۔ کچھ لوگ اسے صفا سے مشتق مانتے ہیں۔ کسی کے نزدیک یہ صف سے نکلا ہے۔ بعض نے اسے اصحاب صفہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور کچھ حضرات دور کی کوڑی لائے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ یونانی لفظ ہے۔ ایسے حضرات کی تعداد زیادہ ہے جو اسے صوف سے مشتق مانتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ پشمینہ یا صوف انبیاء اور اصحاب زہد کا لباس تھا لہذا اسی مناسبت سے ان لوگوں کو صوفی کہا گیا۔ فاضل آربری اور کلاباذی کی مشہور کتاب التعرف کے شارح کا رجحان اسی طرف ہے۔ لیکن یہ بوجوہ صحیح نہیں۔ ایک تو صرفی اعتبار سے یہ تمام انتسابات غلط ہیں، جیسا کہ عارف قشیری نے تصریح فرمائی ہے۔ دوسرے تمام صوفیاء صوف یا پشمینہ پہننے کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ ابن سیرین نے تو اس پر بعض صوفیاء کو یہ کہہ کر ٹوکا بھی ہے کہ پشمینہ کا استعمال حضرت مسیح کی پیروی کے مترادف ہے۔ اور ہم چونکہ آنحضرت کے پیرو اور جاں نثار ہیں، اور آپؐ نے سوتی ملبوسات زیب تن کئے ہیں اس لئے آپ کے تتبع اور پیروی کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے ملبوسات سے آنحضرت کی اطاعت کا ثبوت ملے۔ نہ یہ کہ ہمیں حضرت مسیح کے پیروکاروں میں شمار کیا جائے۔ تیسری اہم وجہ یہ کہ صحیح اور اونچے پائے کے صوفیاء کے نزدیک لباس کی تعیین کسی درجے میں بھی ضروری نہیں۔

مولانا جامی نے نفحات الانس میں تصریح فرمائی ہے کہ پہلا شخص جو صوفی کے نام سے موسوم ہوا، ابوہاشم سفیان ثوری کا ہم عصر ہے۔ انہیں کیوں صوفی کہا گیا؟ اس کا ٹھیک ٹھیک سبب نہیں معلوم ہو سکا۔ ہمارے نزدیک اشتقاق وانتساب کی یہ بحث سرے سے لاحاصل ہے۔ کیونکہ تصوف، لفظ ولقب سے کہیں زیادہ حقیقت کا نام ہے۔ ایک جیتی جاگتی زندگی سے تعبیر ہے۔ اور ایک خاص انداز زیست اور نقطہ نظر کا مظہر ہے۔ جس کا تعلق صفائے قلب وباطن سے بھی اتنا ہی ہے جتنا پاکبازانِ اسلام کی صف سے۔ اسی طرح اصحاب صفہ کی طرح، دنیا کے مزخرفات سے بے نیاز حضرات سے بھی ان کو شرف انتساب حاصل ہے۔ اور سادہ زندگی اختیار کرنے والے پشمینہ پوش زہاد سے بھی ان کا تعلق ثابت ہے۔

تصوف کا نقطۂ آغاز

اس کا آغاز کب ہوا، اور کب اس نے ایک فلسفہ حیات کی متعین شکل اختیار کی؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ جو درحقیقت دو سوالوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ اس کے نقطہ آغاز کی تعیین کی جائے دوسرے یہ کہ اس کی ارتقائی کڑیوں کو نظروبصر کے سامنے لایا جائے۔ اب جہاں تک سوال کے اس حصہ کا تعلق ہے کہ اس جاں بخش اور حیات آفرین تحریک کے نقطۂ آغاز کی تعیین کی جائے۔ اس کے بارہ میں دو ٹوک اور فیصلہ کن بات کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ دینی وعلمی تحریکیں اپنے سفر کا آغاز کسی متعین وقت سے نہیں کرتیں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں فکروعمل کے کچھ سادہ نقطے معاشرہ کی سطح پر ابھرتے ہیں۔ اور پھر وقت کی رفتار اور مناسبتوں سے یہی نقطے متعین نقوش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جن میں رنگ وروغن بھی ہوتا ہے اور شوخی اور جلا بھی ہے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی علمی ودینی تحریک یکایک اپنے تمام لوازم اور خصوصیات

کے ساتھ آن کی آن میں اُبھر آئے۔ تدریج و ارتقاء فطرت کا ہمہ گیر اور اٹل اصول ہے، جس سے تصوّف کو کسی طرح بھی مستثنیٰ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ تصوّف کو بھی شروع شروع میں بس ایک بیج ہی تصوّر کیا جائے جس کے مُضمرات نمو ابھی پنہاں اور مستور ہیں۔ اس کو ایک صالح معاشرہ میں بکھیرا گیا جو اس کے لئے بمنزلہ زمین کے تھا۔ یا جیسے کھیتی کہہ لیجئے۔ پھر وقت و ماحول کی سازگاریوں نے آہستہ آہستہ اس کو اُگایا اور بڑھایا۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے ایک بارآور اور تنومند درخت کی شکل اختیار کر لی۔ جس کے فیوض کبھی ختم ہونے والے نہیں۔

وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ .... يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (فتح ۲۹)

انجیل میں ان لوگوں کے اوصاف یوں بیان کئے گئے ہیں، وہ گویا ایک کھیتی ہیں، جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، .... پھر موٹی ہوئی اور اپنی نالی پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اب کسان ہیں کہ اسے دیکھ کر نہال ہو رہے ہیں۔

تؤتی اکلها کل حین باذن ربها۔ (ابراہیم ۲۵)

اپنے پروردگار کے حکم سے یہ شجرہ طیبہ ہر وقت میوے اور پھل سے لدا رہتا ہے۔

یہ پہلا معاشرہ جس میں معرفت و تصوّف کے بیج بوئے گئے، صحابہ رضوان علیہم اجمعین کا معاشرہ ہے۔ ان میں تقویٰ اخلاص اور محبت و عشق الٰہی کے وہ تمام مضمرات موجود تھے۔ جنہوں نے آگے چل کر تصوّف اور صوفیاء کی شکل اختیار کی ان کی زندگی کا کیا رنگ ڈھنگ تھا۔ قرآن نے اس پر پوری طرح روشنی ڈالی ہے:۔

تتجافی جنوبهم عن المضاجع (سجدہ ۱۶) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ زاہدان شب زندہ دار ہیں۔ یہ نرم اور گرم بستروں پر سونے کے بجائے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ یعنی رات ان کے لئے وہ تاریک اور اُکتا دینے والا لمبا عرصہ نہیں کہ انہیں ایک عربی شاعر کے ہمنوا ہو کر کہنا پڑے ع

الا ایھا اللیل الطویل الا انجلی۔ اے نہ ختم ہونیوالی لمبی رات، تو کبھی صبح کی سپیدی سے بدلے گی بھی یا نہیں۔

بلکہ یہ زبانِ حال سے اس کے برعکس یوں کہتے ہیں ؎

لیلی بوجھک مشرق وظلامہ فی الناس ساری

میری رات تیرے چہرۂ روشن کی وجہ سے روشن اور مستنیر ہے
حالانکہ دوسروں میں اس کی ظلمتوں کا دَور دورہ ہے

والناس فی سدف الظلام ونحن فی ضوء النہار

لوگ رات کی تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں
اور ہم دن کی کھلی روشنی میں سانس لے رہے ہیں

ان کے ذوقِ عبادت کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے :۔

تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانا۔ فتح ۲۹ تو ان کو دیکھتا ہے کہ خدا کے آگے جھکے ہوئے سربسجود ہیں اور خدا کا فضل اور خوشنودی طلب کر رہے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ :۔

والزمھم کلمۃ التقوی فتح ۲۶ اور ان کو پرہیزگاری کی بات پر قائم رکھا۔

کیا زہد و تقوے کی یہی صورتیں اصل تصوف نہیں۔

صحابہ سے ہماری مراد باصطلاح محدثین وہ نہیں جن کو آنحضرت کی صحبت کم از کم

ایک مرتبہ نصیب ہوئی ہو۔ اگرچہ یہ رتبہ بھی اپنی جگہ کچھ کم نہیں۔ ہمارے نزدیک صحابہ سے مقصود وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جن کو صلحاء و اتقیاء کا میر قافلہ کہا جا سکتا ہے۔ جو حضور کی صحبت و رفاقت سے باقاعدہ مستفید ہوئے جنہوں نے آغوشِ نبوّت میں تعلیم و تزکیہ کی منزلیں طے کیں، اور جلوت و خلوت میں ساتھ رہے۔ جنہوں نے دنیا کو ہمیشہ مرجوح اور ناقابلِ التفات سمجھا۔ اور دینی اقدار کو ہمیشہ راجح۔ اور جن کی مملکت فقر میں غنائم اور فتوحات کی کثرت کوئی تغیر نہ پیدا کر سکی۔ دوسرے لفظوں میں جنکی استقامت کا یہ عالم رہا کہ ایک دفعہ اگر تقوائے و عفاف کی راہ پر قدم بڑھائے تو آخر تک اس رسمِ عشق کو نبھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ ہم انہیں صوفی صحابہ کے نام سے موسوم کریں گے۔ اس فہرست میں پہلے تو خلفاءِ اربعہ کے نام مندرج ہوں گے اور اس کے بعد ایسے تمام صحابہ کے جو بالطبع متصوف تھے۔ اور جن کی زندگی اور سیرت و کردار کا نقشہ کسی طرح بھی ان لوگوں سے مختلف نہیں۔ جن کو آگے چل کر ہم نے عارف و صوفیاً کے لقب سے پکارا۔ جیسے حضرت سلمان۔ حضرت ابوذر غفاری۔ حضرت صہیب۔ حضرت بلال اور حضرت عمار بن یاسر وغیرہ۔

مثالیں ہمیشہ گمراہ کن ہوتی ہیں۔ ہم نے صحابہ رضوان اللہ علیہم کے بارہ میں جو یہ کہا ہے کہ ان میں تصوّف کا ابتدائی سادہ نقشہ پایا جاتا تھا۔ اور یہ گلشنِ تصوّف کے وہ گل بوٹے تھے، جو آگے چل کر خوب کھلے اور مہکے، اور جن کی شمیم انگیزیوں نے ایک عالم کو روحانی انبساط بخشا۔ تو اس کا خدانخواستہ یہ مطلب نہیں کہ بعد میں آنیوالے مراتب و کمالات میں ان سے آگے بڑھ گئے۔ اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ تصوّف مصطلحہ نے آیندہ چل کر تقوائے و اخلاص کا جو معیار مقرر کیا، اس کے لئے جو اصول وضع کئے، جو قاعدے ٹھہرائے اور جو سانچے ڈھالے اور قلب و ضمیر کے جن جن لطائف کی نشان دہی کی، ان حضرات کی زندگیوں میں اسکی سادہ اور ابتدائی مثالیں ملتی ہیں۔

چنانچہ ان میں وہی ذوقِ عبادت ہے، وہی اللہ تعالےٰ سے ربط وتعلق کا عالم ہے، وہی محبّت وشوق کے داعئے ہیں۔ وہی اصول کی پاکیزگی اور تقین واذعان کے پیمانے ہیں۔ جن کو تصدّف کا مابہ الامتیاز قرار دیا جاسکتا ہے۔

حضرت ابوبکر کے سوانح سے کون ناواقف ہے؟ اور ان کے رُتبہ صدیقیت کی جو بلندیاں ہیں ان کو عرفان وسلوک کے دائرُوں سے کون الگ کرسکتا ہے؟ بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہمیں بعض مستشرقین کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ اگر آنحضرت کے بعد کسی شخص کو منصبِ نبوّت کے قریب تر ٹھہرایا جاسکتا ہے تو وہ انھیں کی ذات گرامی ہے۔ حضرت عمر فاروق کے مرتبہ اجتہاد اور زندگی کی تابحدِ خشونت سادگی اور تورع سے کس کو انکار ہے؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مقام تصوّف کا اعلیٰ ترین مقام نہیں۔ اُنھوں نے اسلام کی نعمتوں کو جس طرح عام کیا ہے، اور فریضہ جہاد کے تقاضوں کو جس طرح ادا کیا ہے؟ اس کے لئے رہتی دُنیا تک اسلامی دنیا ان کی ممنون احسان رہے گی۔ حضرت عثمان نے اپنی دولت سے جس طرح ریاضِ نبوّت کو سینچا، جس طرح حیاء وعفاف کا ثبوت دیا۔ اور جس استقلال سے خرقہ خلافت کی حفاظت کی۔ اس کی شہادت پر خود ان کی شہادت گواہ ہے؟ اسیطرح حضرت علیؓ کی جامع الصفات شخصیّت کو کون بھول سکتا ہے؟ جن میں مع شئی زائد تمام صحابہ کی اداہائے خاص کی کچھ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ ایک معنی میں صدیق بھی ہیں۔ کیونکہ ان سابقین واوّلین میں ان کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے ایمان کے معاملہ میں سبقت کی۔ فاروقیت کا انعکاس بھی ان میں پایا جاتا ہے۔ کہ ان سے زیادہ قضا وفقہ کی موشگافیوں کو جاننے والا کوئی دوسرا نہیں۔ دولت نے اگرچہ کبھی بھی ان کے دامنِ طلب کو آلودہ نہیں کیا۔ تاہم یہ واقعہ بھی تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے کہ بیت المال تک کے سرمایہ کو جب تک مستحقین

میں بانٹ نہیں دیتے تھے چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا مقام حضرت عثمان غنی سے کسی طرح بھی گھٹ کر نہیں رہتا۔ رہا عفاف و شہادت کا معاملہ تو اس میں بھی ان کا حریف کون ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ان میں بلال کا عشق، ابوذر کا فقر اور عمار بن یاسر کا صبر و استقامت بھی پورے کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اگر زہد و ورع، سیرت و عمل کی پاکیزگی و بلندی اور ایمان و ایقان کی محکمی و استواری ایسی صفات حسنہ کو ہم تصوف کی اوّلیں اساس اور ضروری بنیاد قرار دیتے ہیں۔ تو لامحالہ ہمیں ماننا پڑے گا۔ کہ اس کی تاریخ کا نقطۂ آغاز یہی بابرکت ہستیاں ہیں۔ اور انھیں سے عرفان و سلوک کے مختلف سوتے پھوٹے ہیں۔

دوسری ارتقائی کڑیاں

سوال کے دوسرے حصّے کا منشا، یہ ہے کہ ارتقائی کڑیوں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس مرحلہ پہ ہمیں زیادہ رُکنا نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دَور شروع ہوتا ہے۔ اور اسی دَور کے ساتھ ملا ہوا وہ دَور ہے جس میں زہد و ورع نے باقاعدہ ایک نظریۂ حیات اور شعار کی حیثیت اختیار کر لی۔ تابعین اور تبع تابعین کا دَور کہاں ختم ہوتا ہے اور صوفیاء کے دَور کا آغاز کن نقاط سے ہوتا ہے؟ اس کی سرحدوں کی تعیین سخت دشوار ہے۔ تاریخ سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اختتام تک اسلامی معاشرہ میں ایک متعین گروہ ایسا پیدا ہو چکا تھا جنھیں لوگ صوفیا کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور تیسری اور چوتھی صدی ہجری تک اس نظریۂ حیات اور زندگی کے خاص اسلوب و نہج نے نہ صرف پورے عالم اسلامی میں اچھا خاصا

فروغ حاصل کرلیا تھا بلکہ اپنی تبلیغی کوششوں کو ایک تنظیم کی شکل دیدی تھی۔ اور اپنے علوم و معارف کو مدون کرلیا تھا۔ بلکہ ان میں ایسے ایسے منحرفانہ اور بدعی فرقے بھی پیدا ہونا شروع ہوگئے تھے، جن کو تصوف و اسلام کے بنیادی عقائد سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ یہی نہیں جو صحیح العقیدہ صوفیاء کے لئے باعث بدنامی تھے۔ انھیں کے بارہ میں عارف قیشری نے کہا :۔

ان الخیام فانھا کخیامھم   وان نساء الحی غیر نساءھا

ان کے خیموں کی سج دھج اور وضع تو وہی ہے
مگر ان میں قبیلہ کی وہ حسین عورتیں کہاں ہیں جن پر میں جان چھڑکتا تھا

اس سلسلہ میں ابن سینا نے اشارات میں جو کچھ کہا ہے، اس سے ترتیب ارتقاء کا صحیح نقشہ نظر و بصر کے سامنے آجاتا ہے :۔

المعرض عن متاع الدنیا و طیباتھا یخص باسم الزاھد والمواظب علی فعل العبادات من القیام والصیام ونحوھما یخص باسم العابد والمتصرف بفکرہ الی قدس الجبروت مستدیما لشروق نور الحق فی سرہ یخص باسم العارف وقد یترکب بعض ھذہ مع بعض

جو شخص متاع دنیا اور اس کے طیبات سے اعراض کناں ہوا اس کو زاہد کہا گیا۔ جس نے عبادات مثل صوم و صلوٰۃ اختیار کی اس کو عابد کے نام سے پکارا گیا۔ اور جس نے غور و فکر کی قوتوں کو قدس جبروت کی جانب متوجہ کیا۔ اور اسرار حق سے مستنیر ہوا اور باطن کو سنوارا اُسے عارف کے لقب سے نوازا گیا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ان گروہوں میں کوئی خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے یہ طبقے آپس میں باہم مختلط بھی ہو جاتے ہیں۔

مشہور متصوّفین

متصوفین میں وہ مشہور شخصیتیں کون ہیں؟ جنکے اعمال و افکار پر تصوف کا قصر رفیع تعمیر ہوا؟ ان سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ ہم ان میں سے چند حضرات کا ذکر کئے دیتے ہیں۔

۱۔ ابراہیم بن ادھم۔ المتوفی ۱۶۲ھ یہ خراسانی مدرسہ فکر کے بانی ہیں۔ تصوف کی کتابوں میں ان کے اقوال کو اکثر نقل کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے کیونکر طہارت و زہد کی زندگی اختیار کی؟ اور کس طرح تخت و تاج کی آسائشوں کو ٹھکرا دیا؟ اس کے بارہ میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق خراسان کے شاہی خاندان سے تھا۔ لہٰذا ان کے مشاغل بھی اسی انداز کے تھے۔ جو بادشاہوں کی اولاد کے ہوسکتے ہیں۔ یعنی سیر و سیاحت اور لہو و لعب۔ ایک دن یہ شکار کی غرض سے نکلے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہرن یا خرگوش تیر کی زد میں ہے۔ اس کے پیچھے دوڑے۔ قریب تھا کہ اس کو جالیں۔ اتنے میں ہاتف غیب نے آواز دی۔ کہ اے ابراہیم! تجھے اس کام کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ اُنھوں نے سُنی ان سنی کرکے پھر شکار کا تعاقب کیا۔ آواز نے پھر متوجہ کیا۔ یہ پھر ٹال گئے۔ اس کے بعد آواز پھر آئی۔ اور ان کے دل کی تہوں میں اُتر گئی۔ اب تبدیلی شروع ہوئی۔ اور خیالات و افکار نے پلٹا کھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے اپنا جُبّہ و عبا، تو ایک چرواہے کے حوالہ کیا۔ اور اس کے پھٹے پرانے کپڑے خود پہن لئے۔ جنگل کی راہ لی۔ اور بقیہ زندگی اللہ تعالیٰ کی یاد میں بسر کی۔

صوفیاء نے اگرچہ باقاعدہ سند کے ساتھ اس حکایت کو بیان کیا ہے اور اکثر کتابوں میں کیا ہے۔ تاہم ہمارے نزدیک اس کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے۔ خراسان پر چونکہ ایک عرصے تک بُدھ تہذیب و روایات کا اثر رہا اس لئے یہ بات ہرگز مستبعد نہیں، کہ یہ قصہ بعینہٖ بُدھ کی اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ بُدھ کی کہانی کا چربہ ہو۔ روایات اور تاریخی حقائق کے بیان کرنے میں صوفیاء کیوں متساہل ہیں؟ اس کا

جواب دئے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہے۔ بات یہ ہے کہ مؤرخین اور محدثین کا نقطۂ نظر اور موضوع ان سے بالکل جُدا گانہ ہے یہ جہاں نفس واقعات کی چھان پھٹک سے کام لیتے ہیں۔ یا روایات کی تحقیق اور اس کے مراتب صحت کی تعیین میں دادِ علم دیتے ہیں وہاں صوفیاء اس جھمیلے میں پڑے بغیر صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کس واقعہ یا روایت میں انکے ذوق و وجدان کی تسکین زیادہ ہوتی ہے۔ یا کس واقعہ یا روایت میں تاثر پذیری اور عبرت و تذکار کے پہلو زیادہ نکھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کی کتابوں اور تحریروں میں بے شمار ایسے عجائب کا پتہ چلتا ہے جن کی علمی توجیہ بیان کرنا آسان نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں نقطہ ہائے نظر اپنی اپنی جگہ مفید ہیں۔ بشرطیکہ ان کے حدود کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے۔ یہی نہیں ان میں باہمی کوئی تعارض بھی نہیں پایا جاتا۔ محدثین اور مؤرخین کی کوششوں کا کھلا ہوا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح واقعات و حقائق اور شریعت کے تمام گوشے پوری صحت کے ساتھ نظر و بصر کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور صوفیاء کے اقوال و حکایات کا ماحصل یہ ہے کہ ان سے عبرت و نصیحت، اور تاثر و انفعال کے وہ نوادر اور لطائف مستنبط ہوتے ہیں جو ذہن و فکر کی دُنیا کو پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی ادبی افادیت کا پہلو ایسا ہے کہ جس سے گویا فارسی اور عربی لٹریچر میں زندگی کی نئی روح بیدار ہوگئی ہے۔ اس میں ان اقوال و حکایات کی بدولت گہرائی، معنویت اور بلاغت کے ایسے اچھوتے محرکات کا بیش قیمت اضافہ ہوا ہے جو اس سے پہلے موجود نہیں تھے۔ اور ایسی دلنواز روحانیت پیدا ہوگئی ہے، جس نے فارسی اور عربی ادب کو حیاتِ جاوید بخش دی ہے اور نکھار دیا ہے۔

صوفیاء کا نظریۂ تاریخ کیا ہے؟ اس کو ہم آگے چل کر نسبۃً تفصیل سے بیان کرینگے۔

۲۔ ابو الفیض ذوالنون مصری المتوفی ۲۴۶ھ سہل بن عبداللہ تستری کے استاد اور محاسبی کے معاصر ہیں۔ ان کا علم و فضل، ورع و تقویٰ، اور حال و وجدان

تمام صوفیاء کے حلقوں میں مسلّم ہے۔ اُن کے اقوال میں کہیں کہیں وحدت الوجود کی جھلک پائی جاتی ہے۔ کتاب وسنت کے سختی سے پابند تھے۔ اس کی محبت کے بارہ میں ان کا قول ہے:۔

من علامات الحب للہ عزوجل متابعۃ حبیب اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی اخلاقہ وافعالہ واوامرہ وسنتہ۔	اللہ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ اللہ کے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری پوری متابعت کی جائے ان کے افعال، اوامر اور سُنن سب میں۔

فقہاء انھیں غالباً وحدت الوجود ہی کی بناء پر زندیق سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ متوکل سے ان کے ملحدانہ عقائد کی شکایت کی گئی۔ تو اس نے بلا بھیجا۔ یہ گئے، اور ایسی مؤثر تقریر کی۔ کہ متوکل کی روتے روتے گھگی بندھ گئی۔ اس پر اس نے اعزاز اور تکریم کے ساتھ انھیں مصر واپس جانے کی اجازت دے دی۔

ان سے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ حکمتِ اسلام کے علاوہ انھیں مصری اسرار پر بھی عبور حاصل تھا۔

۳۔ ابوعلی فضیل بن عیاض۔ المتوکل ۱۸۷ھ۔ تصوّف میں عراقی مدرسہ فکر کے حامل تھے۔ پہلے ڈاکو تھے۔ پھر اللہ نے توبہ واخلاص کی نعمت سے نوازا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ پیشے کا رُخ بدل گیا۔ پہلے اگر لوگوں کا مال لُوٹتے تھے تو اب اُنھوں نے خزائن معرفت پر ڈاکہ ڈالنا شروع کیا۔ طبیعت وذوق کے اعتبار سے حزن پسند تھے۔ ابوعلی رازی کا کہنا ہے کہ میں ان کی صحبت میں تیس برس تک رہا۔ میں نے کبھی انھیں ہنستے اور تبسم فرماتے نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ یہ ہنسے ـــ یہ وہ وقت تھا جب ان کا لختِ جگر علی فوت ہُوا۔ میں نے پوچھا، اس پر آپ کیوں ہنسے ہیں۔ ان کا جواب یہ تھا۔ جب میرے مولا کو علی کی موت پسند ہے تو میں کیوں نہ اس پر مسرت کا اظہار

کروں۔ دنیا کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا:۔

لو ان الدنیا بحذافیرها عرضت — اگر دنیا اپنی تمام دلچسپیوں کے ساتھ مجھے دیدی
علی ولا احاسب بها لکنت — جائے، اور اس پر کسی محاسبہ کا بھی اندیشہ نہ ہو
اتقذرها کما یتقذر احدکم — تب بھی میں اسے ایسا ہی ناپاک سمجھوں گا جیسے تم
الجیفة۔ — مردار کو ناپاک سمجھتے ہو۔

جب مکہ میں ان کا انتقال ہوا تو عبداللہ بن المبارک نے کہا، آج دنیا سے حزن وغم اٹھ گیا ہے۔

۴۔ **بایزید بسطامی** ۔(المتوفی ۲۶۱ھ) مشہور صوفی ہیں۔ ان پر سکر و حال کی کیفیتیں اکثر طاری رہتیں۔ وحدت الوجود کا رنگ ان میں نسبتۃً زیادہ شوخ اور چوکھا نظر آتا ہے۔ سبحانی ما اعظم شانی کے قبیل کے شطحیات (   ) ان کی طرف منسوب ہیں۔ یہ پہلے صوفی ہیں جنھوں نے واقعہ معراج نبوی کو سالک کے لئے ایک نصب العین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اسرا کی کیفیات سے یہ بہرہ مند ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ انھیں آسمانوں پر پرواز کا روحانی تجربہ ہوا ہے۔ جہاں اُنہوں نے جنت دوزخ کا نظارہ کیا ہے۔ شجرہ توحید کو بچشم خود دیکھا ہے۔ اور قربِ الٰہی کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہی نہیں اللہ سے تکلم کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کیا فرمایا، انھیں کے الفاظ میں دیکھئے:۔

> "اے ابو یزید تو اپنے پندار انا سے اُسی وقت نکل سکتا ہے، جب میرے محبوب محمد رسول اللہ کی پیروی کرے اور اس مٹی کو جس پر ان کے نقوش پا مرتسم ہیں اپنے لئے سُرمہ چشم قرار دے۔"

علم اور اس کے تقاضوں کے بارہ میں ان کا ایک حکیمانہ قول ملاحظہ ہو:۔

عملت فی المجاهدة ثلاثین سنة — تیس برس تک میں نے مجاہدہ کی سختیاں جھیلی

فما وجدت شیئاً اشد علی من العلم ومتابعته ولولا اختلاف العلماء لتعبت واختلاف العلماء رحمة الافی تجرید التوحید۔

ہیں. مگر علم اور اس کی پیروی سے زیادہ سخت چیز میں نے نہیں پائی۔ علماء اُمت کا باہمی اختلاف تنزیہ توحید کے علاوہ باعثِ رحمت ہے۔ اور اگر یہ اختلاف رائے پایا نہ جاتا تو میں علم کی یکسانی و یک رنگی سے اُکتا جاتا۔

ان کے آباؤ اجداد مجوسی تھے۔ اس مناسبت سے کہا کرتے تھے کہ میں جب بھی نماز پڑھتا ہوں، یہ محسوس کرتا ہوں، گویا میں نے ابھی ابھی مجوسیت سے توبہ کی ہے۔ اور قطع زنار کے درپے ہوں۔

کرامات کو ولایت کی نشانی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا قول ہے:-

لو نظرتم الی رجل اعطی من الکرامات حتی یرتقی فی الھواء فلا تغتروا به حتی تنظروا کیف تجدونه عند الامر والنھی وحفظ الحدود واداء الشریعة۔

اگر تم دیکھو کہ ایک شخص کو کرامات سے بہرہ وافر ملا ہے۔ تو اس سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اس میں دیکھو یہ کہ اوامر و نواہی کے بارہ میں اس کا طرز عمل کیا ہے؟ حفظ حدود کا کس درجہ پابند ہے۔ اور شریعت کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتا ہے۔

۵۔ ابو علی شفیق بن ابراہیم بلخی۔ حاتم الاصم کے شیخ الاستاد تیسری صدی ہجری کے بلند پایہ صوفی، توکل و صبر کے پیکر اور معرفت کے رکن رکین ہیں، یہ کیونکر زہد و تقوےٰ کی طرف مائل ہوئے؟ اس کے بارہ میں کئی قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں ان کا پیشہ تجارت تھا۔ ایک مرتبہ قحط پڑا، جس سے یہ بہت پریشان ہوئے، سوچنے لگے کہ رزق کی کشائش کیلئے کیا تدبیر اختیار کی جائے، اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک غلام رنگ رلیوں میں مصروف ہے، اور خوشی و انبساط سے اچھل کود رہا ہے، اس سے پوچھا

قحط و پریشانی کے ان دنوں میں یہ سرمستیاں۔ کیا تجھے کھانے پینے کی فکر لاحق نہیں۔ اس نے کہا جناب نہیں۔ میرے مالک کا ایک گاؤں ہے۔ جس نے ہم دونوں کو اس احتیاج سے بے نیاز کر رکھا ہے۔ یہ اس گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ دل نے کہا کیا تیرے مولا و آقا کے پاس یہ پوری زمین اپنی تمام ترشادابیوں کے ساتھ موجود نہیں ہے؟ اگر تیرا تعلق کم از کم اتنا ہی ہے جتنا کہ اس غلام کا اپنے آقا سے ہے تو پھر اس پریشانی اور اضطراب کے کیا معنی؟

معرفت کے متعلق ان کا حسب ذیل قول حاتم الاصم نے نقل کیا ہے:۔

• اگر ایک شخص دو سو برس تک زندہ رہتا ہے اور اس کو ان چار چیزوں کی معرفت حاصل نہیں۔ تو اس کو جہنم کی آتش سے کوئی نہیں بچا سکتا:۔

(۱) خدا کی معرفت

(۲) اپنا عرفان

(۳) خدا کے اوامر و نواہی کی معرفت۔ اور

(۴) خدا اور اپنے دشمن کی معرفت۔

خدا کی معرفت کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنے دل سے اس حقیقت پر یقین رکھے۔ کہ اس کی ذاتِ گرامی کے سوا اور کوئی بخشش و عطا یا نفع و ضرر پر قادر نہیں۔

اپنے عرفان سے یہ مقصود ہے کہ تو اپنی بیچارگی کو پوری طرح محسوس کرے، اور اس حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے کہ تو کسی شخص کو بھی نفع و ضرر پہنچانے پر قادر نہیں۔ یہی نہیں۔ تجھے براہِ راست کسی چیز پر بھی اختیار حاصل نہیں۔

خدا کے احکام یا اوامر و نواہی کا عرفان اس بات کا مقتضی ہے کہ تو یہ یقین رکھے کہ ان احکام و مسائل کو تیرے نفس پر پورا پورا قابو حاصل ہے۔ اس یقین کی علامت یہ ہے کہ ان کی بجا آوری کے سلسلہ میں جبن اور سستی یا بے صبری کو کوئی دخل نہ ہو۔

خدا اور اپنے دشمنوں کی معرفت کے معنی یہ ہیں۔ کہ تمہیں محسوس ہو کہ تم اپنے ذوق

وعبادات میں آزاد نہیں ہو۔ بلکہ کچھ عوامل رخنہ اندازی کرنے والے بھی ہیں۔ ان کے خلاف تمہیں بہرحال ایک لڑائی لڑنا ہے۔ اور اس کے حملوں سے اپنے آپ کو بچانا ہے

تقوے کی پہچان کیا ہے؟ اس کے بارے میں ان کا یہ حکیمانہ قول ماننے کے لائق ہے:۔

تعرف تقوی الرجل فی ثلاثہ اشیاء فی اخذہ، فی منعہ وفی کلامہ۔

تو اگر کسی شخص کے مرتبہ اتقاء کا اندازہ کرنا چاہیے تو تین چیزیں دیکھو، وہ کن چیزوں کو اختیار کرتا یا اپناتا ہے، کن چیزوں سے باز رہتا یا احتراز کرتا ہے، اور اس کی بات چیت کا موضوع کیا ہے؟

۶۔ ابو عبداللہ الحرث بن اسد المحاسبی المتوفی ۲۴۳ھ۔ ذی النون کے معاصر تھے یہ غزالی کے نہایت محبوب روحانی مرشد ہیں۔ احیاء میں ان کے اقوال کو انہوں نے اکثر نقل کیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کی کتاب احیاء میں محاسبی کی تحریرات کی جھلکیاں صاف نمایاں ہیں۔ یہ پہلے صوفی مصنف ہیں جنہوں نے اپنے خیالات وافکار کو قدیم حکماء یونان کی طرح سوال وجواب کی صورت میں ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی۔ ان کی کتاب "الرعایۃ بحقوق اللہ" تصوف کے حقائق پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

آربری نے اپنی کتاب تصوف (SUFISM) میں ان کی ایک غیر مطبوعہ تحریر الوصایا سے ایک طویل باب نقل کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غزالی کے بہت پہلے انہوں نے تحقیق مذاہب کے سلسلہ میں اسی انداز کے تحلیل وتجزیہ سے کام لیا ہے۔ جو غزالی کی شہرہ آفاق کتاب المنقذ من الضلال میں پایا جاتا ہے۔

محاسبی انہیں غالباً اس ضبطِ نفس کی بنا پر کہا جاتا ہے۔ جس کی انہوں نے

بار بار تاکید کی ہے۔ اور جس کو انہوں نے تقویٰ کی اساس قرار دیا ہے۔

فصل فی المحبۃ ان کا ایک خاص مقالہ ہے جس میں محبت کے متعلقات پر انہوں نے نہایت لطافت سے روشنی ڈالی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم طوالت کے اندیشہ سے اس کے اقتباسات درج کرنے سے قاصر ہیں۔

قشیری نے انہیں ان الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا ہے:۔

عدیم النظیر فی زمانہ علماً وورعاً ومعاملۃ وحالاً۔	اپنے زمانہ میں باعتبار علم، تقویٰ، معاملات اور احوال کے عدیم النظیر شخصیت۔

ان کے والد عقیدۃً قدری تھے اور بہت مالدار تھے۔ ان کے مرنے کے بعد مال ودولت کی کثیر مقدار انہیں بطور ترکہ و . . . . میراث کے ملی۔ لیکن انہوں نے اختلاف عقائد کے پیش نظر اس کو قبول نہ کیا۔

صوفیاء میں یہ ان پانچ شیوخ میں سے ہیں، جن کو مستند مانا جاتا ہے۔

ابوعبداللہ خفیف کا قول ہے:۔

اقتدوا بخمسہ من شیوخنا والباقون سلموالھم حالھم الحرث بن اسد المحاسبی والجنید بن محمد وابو محمد رویم وابوالعباس بن عطاء وعمرو ابن عثمان المکی لانھم جمعوا بین العلم والحقائق۔	ہمارے شیوخ میں ان پانچ کی اقتداء اختیار کرو۔ اور باقی کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ محاسبی، جنید، ابو محمد رویم، ابوالعباس بن عطا، عمرو بن عثمان کی، —— کیونکہ —— یہ وہ حضرات ہیں جو علم وحقائق دونوں کے جامع ہیں۔

۷۔ ابوسلیمان الدارانی المتوفی ۲۱۵ھ۔ یہ بھی غزالی کے عزیز ترین ممدوح ہیں۔ ان کا تذکرہ اور اقوال اکثر احیاء کے صفحات کی زینت ہیں۔

سید الطائفہ حضرت جنید نے بھی ان کے عارفانہ اقوال کو نقل کیا ہے۔ ان کا فلسفہ تصوّف چونکہ گرسنگی پر مبنی ہے۔ اسی لئے کلاباذی نے انہیں مدار الجائعین کے لقب سے یاد کیا ہے۔ گرسنگی کے بارہ میں ان کے اقوال یہ ہیں :۔

الجوع مفتاح الاخرۃ ،	بھوک یا گرسنگی خزائن آخرت کی کلید ہے ،
والشبع مفتاح الدنیا۔	اور شکم سیری دنیا کی کلید ہے۔

گرسنگی کی تہ میں فلسفہ یہ تھا :۔

اذا شبع الانسان جاعت اعضائہ بالشھوۃ واذ جاع الانسان شبعت اعضاءہ عن الشھوۃ۔	انسان جب شکم سیر ہوتا ہے تو اس میں حرص وشہوت کے عوامل کی گرسنگی تیز ہوجاتی ہے اور جب بھوکا ہوتا ہے تو یہی عوامل حرص و شہوت سے بیگانہ ہوجاتے ہیں۔

کتاب وسنت کی پابندی کا اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ ان کے نزدیک وہ وارداتِ قلب جن کا تعلق دینیات سے ہے اُس وقت تک حجت ومستند نہیں جب تک کہ ان کو کتاب وسنت کی خارجی کسوٹی پر پرکھ نہ لیا جائے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے :۔

ربما یقع فی قلبی نکتۃ من نکتہ تدوم ایامًا فلا اقبل منہ الا بشاھدین عدلین الکتاب والسنۃ۔	میرے دل میں کبھی متصوفانہ نکات کا القاء ہوتا ہے اور کئی کئی دن تک میں انہیں یونہی دل میں پڑا رہنے دیتا ہوتا ہوں، اور اخذ و قبول پر راضی نہیں ہوتا۔ تا وقتیکہ دو شاہد

عدل اس کی تائید نہ کردیں یعنی اللہ اور سنت رسول۔

دنیا عقبیٰ اور آخرت میں جو تضاد ہے اس کو انہوں نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے :۔

اذا سکنت الدنیا القلب ترحلت	جب دنیا کسی شخص کے دل میں سکونت اختیار

منه الآخرة۔ کرلیتی ہے تو آخرت کا خیال اُسی وقت دل سے نکل جاتا ہے۔

۸۔ **ابو سلیمان داؤد بن نصیر الطائی**۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ صاحبین امام محمد اور امام یوسف دونوں اختلافی مسائل میں ان کو اپنا حکم تسلیم کرتے۔ اور ان کی رائے اور فتوے کو صائب جانتے تھے۔ یہ امام محمد کی بیحد عزّت کرتے تھے۔ لیکن قاضی ابو یوسف سے اس بناء پر خفا تھے کہ انھوں نے اپنے اُستاد کی روش کے علی الرغم عہدہ قضا کیوں قبول کرلیا۔ ان کا کہنا تھا، امام نے تو کوڑے کھائے اور تازیانوں کی اذیت برداشت کی، مگر عہدۂ قضا قبول نہ کیا اور اُنھوں نے نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کے لئے طلب و رغبت کا اظہار بھی کیا۔

اسی خفگی کے پیشِ نظر ان کا معمول یہ تھا کہ اگر یہ دیکھتے کہ امام محمد کا مسلک صحیح ہے تو کہتے، محمد کا مسلک صحیح ہے۔ اور اگر قاضی ابو یوسف کی رائے اچھی تُلی محسوس ہوتی، تو نام لئے بغیر کہتے اس نوجوان کی رائے زیادہ قرینِ صواب ہے۔

یہ کس طرح زہد و ورع کی جانب ملتفت ہوئے، اس کے بارہ میں مختلف حکائتیں کُتب تصوف میں مذکور ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کا ایک ہی سبب تھا۔ اور وہ یہ کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زہد و تقوے نے انہیں متاثر کیا۔ اور ان کے داعیاتِ شوق کو اُکسایا۔

صوفیاء میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اللہ تعالےٰ سے ان کے ربط و تعلق کی کیا نوعیّت تھی؟ اس کا اندازہ ان کے اس قول سے لگائیے۔ جب یہ رات کی تاریکی میں روح کے اُجالے کا سامان بہم پہنچاتے اور تہجد کے لئے کھڑے ہوتے تو کہتے:

الٰھی ھمک عطل علی الھموم الدنیویۃ۔ پروردگار! تیرے ایک غم نے میرے تمام دنیوی غموں کو بھلا دیا اور معطل کردیا ہے۔

ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے حتیٰ کہ خادمہ کھانے کے لئے بلاتی تو فرماتے:۔

بین مضغ الخبز وشرب الفتیت — روٹی کھانے اور فتیت (ایک مشروب) پینے میں
قرأة خمسین آیة۔ — وقت صرف ہوتا ہے اتنے میں پچاس آیات کی تلاوت ہو سکتی ہے

اخلاص کے دقائق ولطائف کا بہت خیال رکھتے۔ ایک مرتبہ ان کے ہاں ایک صاحب آئے، اُنھوں نے دیکھا کہ پانی کی صراحی دھوپ میں رکھی ہے۔ ان سے نہ رہا گیا کہنے لگے بھائی اس کو تو سایہ میں رکھ دیا ہوتا۔ جواب ملاحظہ ہو:۔

حین وضعتہا لم یکن شمس — آپ بجا ارشاد فرماتے ہیں، میں نے دراصل اسے
وانا استحیی ان یرانی اللہ — سایہ ہی میں رکھا تھا، اب دھوپ آگئی ہے، اس کو
امشی طالبہ حظ نفسی۔ — اُٹھا کر دوبارہ سایہ میں رکھنے میں یہ شرم مانع ہے
کہ کہیں صراحی تک چل کر جانے کو میرے حظِ نفس پر نہ محمول کیا جائے۔

۹۔ ابوالقاسم جنید بن محمد المتوفی ۲۹۷ھ سرخیل صوفیاں اور چمنستانِ تصوف کے گل سرسبد۔ عراق ان کا مولد و منشا ہے۔ ان کے والد شیشہ کا کاروبار کرتے تھے۔ اس مناسبت سے انہیں قواریری بھی کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے تصوف میں ایک خاص مدرسہ فکر کی بنیاد ڈالی ہے۔ افسوس ہے کہ بعد کے آنے والے حضرات نے اس انداز کو آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا شمار ان چند لوگوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے تصوف کو خاص نظریات سے روشناس کرایا۔ اور اُسے ایک متعین پیرایۂ بیان بخشا۔ محاسبی سے انہیں تلمذ حاصل ہے۔ توحید کیا ہے، اور غیر زمانی وجود کی کیا حقیقت ہے، اس کے بارہ میں ان کے اقوال کس درجہ فلسفیانہ حقیقت کے حامل ہیں۔ دیکھئے توحید کے معنی یہ ہیں، کہ ازلی وابدی خدا کو زمانیات سے الگ کر کے دیکھا جائے۔

اللہ تعالےٰ نے حضرتِ انسان سے سوال کیا تھا:۔

الست بربکم ۔ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں۔

حضرت جنید کا کہنا ہے ۔کہ یہ گفتگو اس مرحلے کی ہے جب انسان نے ابھی وجود کا مادی پیرہن زیب تن نہیں کیا تھا۔اور زمانیات سے یکسر آزاد تھا۔ یعنی اس کا وجود محض روحانی انداز و نہج کا تھا۔جو زمان و مکان کی گرفت میں نہیں آیا تھا۔

تصوّف کی نعمت انہیں کیونکر حاصل ہوئی۔ان کا اپنا قول ملاحظہ ہو۔

ما اخذ نا التصوف عن القیل والقال ولکن عن الجوع و ترک الدنیا وقطع المالوفات والمستحسنات ۔	ہمنے تصوف قیل وقال اور فقیہانہ بحث ومناظرہ سے حاصل نہیں کیا، بلکہ اس کے لئے گرسنگی کی اذیتیں جھیلی ہیں۔مالوفات اور پسندیدہ چیزوں کو ترک کیا ہے۔

ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ تصوّف کی بنیاد کتاب و سنت کی تصریحات پر ہے۔ لہذا جو شخص ان نعمتوں سے محروم ہے اس نے تصوّف کی بُو بھی نہیں سونگھی۔ ان کا کہنا تھا ۔

الطرق کلھا مسدودۃ علی الخلق الامن اقتفی اثر الرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام۔	خلق اللہ پر معرفت کے تمام دروازے بند ہیں الا یہ کہ آں حضرت کے نقشِ قدم کی پیروی اختیار کی جائے ۔
من لم یحفظ القرآن ولم یکتب الحدیث لا یقتدی بہ فی ھذا الامر لان علمنا مقیدٌ بالکتاب والسنۃ ۔	جس نے قرآن حفظ نہیں کیا۔اور حدیث قلمبند نہیں کی وہ معرفت کے باب میں اقتداء کے لائق نہیں۔کیونکہ ہمارے ہاں یہ علم مقید بہ کتاب سنت ہے۔

کرامات کو وجہ فضیلت نہیں سمجھتے تھے۔ایک شخص ان کے زہد و ورع کا

چرچا سُنکر ان کے ہاں آیا اور کچھ عرصہ تک ان کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھتا رہا۔ آخر ایک دن اجازت لے کر جانا چاہا۔ حضرت جنید نے پوچھا اتنی جلدی کیوں جاتے ہو۔ اس نے کہا میں تو اس خیال سے آیا تھا کہ آپ بہت بڑے ولی ہوں گے اور آپ کے ہاں بڑی بڑی کرامتیں دیکھنے میں آئیں گی۔ لیکن افسوس میں نے تو کوئی کرامت ایسی نہیں دیکھی جس سے آپ کی ولایت کا اندازہ ہو سکے۔ جنید مُسکرائے اُنھوں نے کہا، اس عرصہ میں کیا تو نے دیکھا کہ میں نے ترک فرائض کا ارتکاب کیا ہو۔ اس نے کہا جی نہیں۔ آپ نے کہا، کیا ترک سُنن کی نوبت آئی۔ اس نے کہا۔ جی نہیں۔ آپ نے فرمایا، پھر کیا نوافل و مستحبات میں تساہل برتا گیا۔ اس نے کہا حضور یہ بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ جاؤ یہی میری کرامت ہے۔

مسٹر شکالیم کی طرفہ طرازی

اہم اور مقتدر مشائخ کی فہرست کافی طویل ہے۔ جس کو ہم اختصار کی خاطر نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں۔ اس میں ہم نے اُن پاکباز اور پاک نہاد خواتین کا ذکر نہیں کیا جنھوں نے عرفان کے بادہ صافی سے سکر و مستی کی کیفیتیں پیدا کیں۔ اور زہد و تقوےٰ اور عفاف و پرہیزگاری سے ظاہر و باطن کی سج دھج کا اہتمام کیا۔ صرف رابعہ بصری کا نام لے لینا اس سلسلہ میں کافی ہے۔ ایک لطیفہ سنئے۔ مغربی علماء میں ایک خوبی یہ ہے کہ اپنی کمزوریوں کو بڑے اچھے انداز میں چھپانا جانتے ہیں۔ مسٹر سکالیم (SCHOLEM) فلسطین کی عبرانی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ اور یہودی تصوف ان کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ اس پر اُنھوں نے ایک فاضلانہ اور شاندار کتاب بھی لکھی ہے۔ اس میں یہودی تصوّف پر بحث کرتے ہوئے جب اس سوال پر پہنچتے ہیں کہ یہودی صوفیوں میں رابعہ بصریہ کے پایہ کی باکمال عورتیں کیوں نظر نہیں آتیں۔ ظاہر ہے اسلام کے مقابلہ میں یہاں یہودی تصوّف کا کوردبتی

ہے۔ تو وہ یہ کہہ کر اس سوال کے وزن کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ کہ یہودی تصوّف، دراصل معرفت و روحانیت کا مردانہ تصوّر ہے اور عورتیں اس کی متحمل ہو ہی نہیں سکتیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ یہودی فلسفہ مذہب کو جن لوگوں نے مدون کیا۔ اُنہوں نے عورتوں کی روحانی و فکری ضرورتوں کا مطلق خیال نہیں رکھا۔

اختصار کے پیشِ نظر ہم مشائخ کی اس فہرست میں اُن لوگوں کو بھی شامل نہیں کر رہے ہیں جنھوں نے عملی مجاہدات کے ساتھ ساتھ قلمی مجاہدات میں بھی نمایاں حصّہ لیا یعنی جنھوں نے تصوّف کو نکھارا اور نئے نئے تصوّرات اور مصطلحات سے مالا مال کیا ہے۔ یا جن کی جنبش ہائے قلم سے تصوّف نے ایک علم، ایک فن اور قابلِ فہم تصوّر کی حیثیت اختیار کی ہے۔ یوں بھی تصوف سے متعلق مستند تحریرات اور کتابوں کا دائرہ بدرجہ غایت سمٹا ہوا ہے۔ جس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:-

۱۔ یہ چونکہ اپنے مزاج اور خصوصیات کے اعتبار سے علم سے زیادہ عمل ہے اس لئے اس کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوششیں بڑی حد تک محدود رہیں۔

۲۔ صوفیاء چونکہ نفی ذات (NEGATION) کے شدّت سے قائل ہیں اس لئے نہیں چاہتے تھے کہ تحریر و نگارش کے چکّر میں پڑیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اظہار کا یہ اسلوب بھی نفس میں کبر و پندار پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ خطرہ بھی ہے کہ کہیں عوام کی عقیدت کا رُخ ادھر نہ مُڑ جائے۔ حالانکہ انھیں سے یہ بھاگتے اور دور رہنے کا عزم کر چکے تھے۔

۳۔ جب علوم عقلیہ کا فروغ ہوُا، بالخصوص نوافلاطونیت کے تصوّرات جب اسلامی معاشرہ میں پھیلے، تو صوفیاء کے عقائد بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ

رہ سکے۔یہی نہیں ان خیالات نے اس درجہ اس کے ذہن وقلب پر استیلاء حاصل کیا کہ ان کے پُرجوش مبلّغ بن گئے ——— ظاہر ہے فکر ورائے کے اس نہج سے فقہاء و محدثین متفق نہیں ہو سکتے تھے۔اور یہی وہ گروہ تھے جن کا عامۃ الناس میں زیادہ عمل دخل تھا۔اس لئے صوفیاء مجبور ہوئے کہ اپنے ان عقائد کو عام نہ کریں۔اور از راہِ احتیاط صرف انھیں حضرات تک ان کو محدود رکھیں جن میں صبر و برداشت کی صلاحیتیں بدرجۂ اتم پائی جائیں۔

۴۔یوں بھی تصوّف چونکہ اصلاح وتزکیہ کی ایسی سطح سے متعلق ہے جس کے مخاطب خال خال حضرات ہی ہو سکتے ہیں،عوام نہیں۔اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس کی نشر و اشاعت کے دائروں کو وسیع نہ کیا جائے۔

لیکن اخفاء و احتیاط کی ان تدبیروں میں چونکہ کھلی ہوئی مضرت یہ تھی کہ کہیں علم و معارف کا یہ گنجینہ ضائع ہی نہ ہو جائے۔اس لئے کچھ حضرات نے بہرحال اپنی تحریری کوششوں کو جاری رکھا۔خصوصاً حلاج کے قتل نے تو انہیں چونکا سا دیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اچھے خاصے گروہ نے جرأت سے اپنے خیالات و افکار کو منظرِ عام پر لانے کا تہیّہ کر لیا۔

یہ تحریری کوششیں کئی اقسام کی ہیں۔کچھ لوگوں نے ان احادیث و آثار کو قلمبند کیا جن کا تعلق زہد و رقاق سے تھا جیسے عبداللہ بن المبارک اور احمد بن حنبل وغیرہم۔کچھ حضرات نے سلسلہ تصوّف کے مقتدر مشائخ و اکابر کے اقوال و افعال کا دلآویز مرقع تیار کیا۔جیسے حلیۃ الاولیاء۔صفۃ الصفوۃ اور تذکرۃ الاولیاء کے مصنّفین،کسی کسی نے نفس فن کے بارہ میں بحث کی۔اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور پیچیدگیوں کو حل کرنے اور سلجھانے کی کوشش کی جیسے قشیری،ہجویری اور کلاباذی وغیرہ۔ایک مختصر سا گروہ ان میں ایسا بھی ہے،جنھوں نے

نہ صرف تصوّف کی زلف معتقد کو سنوارا اور سجایا۔ بلکہ جس نے اس کو گہرے تصوّرات اونچے معارف اور حکیمانہ طرزِ فکر سے بھی بہرہ مند کیا جیسے نفاری۔ ابوالنصر سراج اور ابنِ عربی وغیرہ۔

اس مختصر سی وضاحت کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قدرے ان اصطلاحوں کی تشریح کردی جائے۔ جو صوفیاء کے لٹریچر میں دائر و سائر ہیں۔ اور ان عقائد کی ایک جھلک دکھا دی جائے۔ جن پر ان حضرات کے فکر و عمل کی عمارت اُستوار ہوتی ہے۔ کیونکہ ان چیزوں سے متعارف ہوئے بغیر ان کے بارہ میں ہم ٹھیک ٹھیک رائے قائم کرنے سے قطعی قاصر ہیں۔ اس میں کچھ طوالت تو ہوگی۔ مگر یہ فائدہ سے خالی ہرگز نہیں۔

صوفیاء کی مشہور اصطلاحات

جس طرح منطق و فلسفہ کی اصطلاحیں ہیں۔ فقہ و اصول کے لئے مخصوص الفاظ اور استعمالات ہیں۔ ٹھیک اسی طرح صوفیاء کی بھی اصطلاحیں ہیں جو ان میں رواج پذیر ہیں۔ اصطلاحات کی غرض و غایت تعیین اور سہولت ہے۔ یعنی جو بات آپ پھیلا کر اور مختلف پیرایہ ہائے بیان میں بیان کرنا چاہیں گے۔ وہی بات اصطلاحات کے رنگ میں نہایت اختصار کے ساتھ کہہ دیں گے۔ اور سامع یا قاری ان کے معنی و مفہوم کے فہم و ادراک میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوگا۔ صوفیاء کے ہاں اصطلاحات کی اہمیت علاوہ تعیین و سہولت کے یہ بھی ہے۔ کہ اس طرح وہ عوام کی گرفت اور بدہمی سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور کج فہم فقہاء اور کم سواد علماء کو ان پر زبانِ طعن دراز کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ کیونکہ اعتراض وہی کرے گا۔ جو ان کی بولی سمجھتا ہو۔ اور ان کی منطق سے واقف ہو۔ ہر اس شخص کو جو تہمتِ علم سے متہم ہو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ ان کو ہدفِ عتاب ٹھہرائے۔ اور بغیر جانے بوجھے اور ان کے علوم و معارف سے شناسائی حاصل کئے ان پر فتوائے کفر لگائے۔ اور عوام میں ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کرے۔ گویا اصطلاحات کے پردہ میں حقائق و معارف کو چھپانے میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ صوفیاء نااہلوں کے حملوں سے محفوظ رہیں۔ اسی حقیقت کو کلاباذی نے ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے:۔

هذا اسلم من ردحق و انکار ہ۔ | اس طرح ہم حقائق کے رد و انکار کے عاجلانہ فعل سے محفوظ رہتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد آئیے ان کی اصطلاحات پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

وقت صوفیاء میں وقت کا استعمال کئی معنی میں ہوتا ہے۔ ایک استعمال یہ ہے کہ اس سے مراد وہ حادث متوہم ہے۔ جن کا حصول کسی حادث متحقق پر موقوف ہو۔ اس صورت میں حادث متحقق حادث متوہم کے لئے بمنزلہ وقت کے ہوگا۔ اس کو اس مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ فرض کیجئے۔ آپ نے کہا، میں فلاں تاریخ کو تمہارے ہاں پہنچوں گا۔ یہ پہنچنا یا آنا ایک ایسا حادث ہے جو وہم وخیال کی گرفت میں آتا ہے۔ اور متعین تاریخ ایسا حادث ہے جو وقوع پذیر ہونے والی شئے ہے جو متحقق ہے۔ لہذا یہ متحقق یا وقوع پذیر ہونے والی شئے متوہم کے لئے بمنزلہ وقت کے ہے۔ بات بالکل آسان ہے۔ جو اصطلاح کے گورکھ دھندے میں کسی قدر پیچیدہ ہوگئی ہے۔ صوفیاء دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ وقت کا مفہوم وتصوّر سراسر واقعات وحوادث (EVENTS) کا رہینِ منت ہے۔ اگر یہ پائے جاتے ہیں تو یہ بھی اُبھرتا ہے۔ اور یہ نہیں پائے جاتے تو یہ بھی نہیں پایا جاتا۔ یہاں یہ نکتہ بہرحال ملحوظ رہنا چاہئے۔ کہ صوفیاء زمانہ کے منکر نہیں۔ جو بغیر کسی تعین کے ایک جوئے آب کی طرح رواں دواں ہے۔ جس میں ماضی وحال اور مستقبل کا کوئی وجود نہیں۔ جو صرف ایک بہاؤ ہے۔ ایک حرکت ہے یا پیہم ومسلسل ایک طرح کے فیضان سے تعبیر ہے۔

وہ جس کو واقعات وحالات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ وقت ہے، اور وہ تعین ہے، جو کسی حادث سے اُبھرتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جو حوادث وواقعات کو سمجھنے کا ایک ناگزیر پیمانہ ہے۔ ابو علی دقاق نے وقت کے ایک اور معنی بھی بیان کئے ہیں۔ وہ غلبہ حال ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص حزن وغم سے دوچار ہے تو کہا جائیگا کہ یہ وقت اس کے حزن وغم کا ہے۔ اگر کشاکش دنیا میں گرفتار ہے۔ تو کہا جائیگا

اس وقت اس کو دنیا کا سامنا ہے اور دنیا اس پر سوار ہے۔ اسی طرح اگر عقبیٰ و آخرت کا خیال اس پر غالب ہے۔ تو اسی مناسبت سے اس کے وقت کو عقبیٰ و آخرت کا وقت قرار دیا جائے گا۔

کبھی کبھی وقت رعایت احوال کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "ابن الوقت" صوفیاء کی خاص اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک وقت کے اہم ترین تقاضوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ اور اس کی حالت و کیفیت جس طرح کی عبادات و فرائض کی مقتضی ہے، وہ اس میں باحسن وجہ مشغول ہے۔ اور کسی طرح کی کوتاہی نہیں کر رہا ہے۔ یہی مطلب ہے ان کے اس قول کا۔

الفقیر لا یھمه ماضی وقته	فقیر ماضی و مستقبل سے واسطہ نہیں رکھتا۔
واتیه بل یھمه وقته الذی	اس کی توجہ کا مرکز تو وہ وقت (یعنی حالت)
فیه۔	ہے کہ جس میں سے وہ اس وقت گزر رہا ہے۔

یعنی ایک فقیر یہ نہیں دیکھتا کہ ماضی میں اس کے قلب و ذہن کی کیا کیفیتیں تھیں۔ یا مستقبل میں اُسے کس نوع کے اذکار و اعمال سے دوچار ہونا ہے۔ وہ تو بس یہ دیکھتا ہے کہ اس وقت جلاء قلب اور ارتقاء روح کے لئے اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ ماضی کی فکر یا مستقبل کا اندیشہ ان کے نقطۂ نظر سے وقت کے تقاضوں سے محرومی کے مترادف ہے۔ یا انہیں کے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے:۔

الاشتغال بفوات وقت ماضی	ماضی کے گذرے ہوئے ان لمحات سے تعرض کرنا
تضییع وقت ثانٍ۔	جن میں کوئی لغزش سرزد ہوئی ہے گویا دوبارہ وقت ضائع کرنا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر حال درست ہے تو کیا کہنے یہی آئندہ چل کر اچھے مستقبل اور بہترین ماضی کی تعبیر کا ضامن ہوگا۔

وقت کا ایک معنی تصرفات حق تعالیٰ پر راضی و قانع رہنا ہے۔ یعنی جب یہ کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں حکم وقت کی منزل میں ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ اللہ کی طرف سے جن جن آزمائشوں سے دوچار ہے، ان میں ثابت قدم ہے۔ اور اپنے کو اس معاملہ میں بالکل مختار اور صاحب ارادہ و تدبیر نہیں تصوّر کرتا۔ بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ کائنات میں تمام تر تصرفات اللہ تعالیٰ کی مرضی و مشیت کے تابع ہیں۔ اس لئے ان تصرفات کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہی اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور اس مرحلہ پر یہ نکتہ جان پر ور ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے۔ کہ صوفیاء امور تکوینی میں تو جبر کے قائل ہیں۔ امور شرع میں نہیں۔ اور یہ کہ اُن کا جبر اُس ملحد و زندیق کا جبر نہیں۔ جو تکلفاتِ شرعیہ کی پابندی سے یکسر آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کو فسق و فجور کا محض ایک بہانہ سمجھتا ہے۔ بلکہ اس عارف کا جبر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مشیت تکوینی کے خلاف نہ صرف لبکشائی نہیں کرتا بلکہ بکمال رضا و رغبت ان تمام شدائد او رسختیوں کو برداشت کرتا ہے۔

الوقت سیفٌ صوفیاء کا مشہور مقولہ ہے۔ اس کے دو معنی ہیں:-

(۱) یہ کہ جس طرح تلوار کی کاٹ غالب اور فیصلہ کُن ہوتی ہے اسی طرح حق تعالیٰ اس کے ذریعہ جن جن واقعات و حوادث کو رو نما کرتا ہے۔ ان کا وقوع پذیر ہونا ناگزیر ہے۔ اور فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف احتجاج کرنا درست نہیں۔ یہ استعمال قریب قریب انہیں معانی کا حامل ہے، جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

(۲) تلوار چھونے میں نرم اور کاٹ میں تیز ہے۔ اس لئے جس نے اس کو نرمی سے چھوا وہ تو اس کی زد اور حملہ سے محفوظ رہا۔ اور جس نے اس کے معاملہ میں سختی برتی، اُس کا محفوظ رہنا اور زخمی نہ ہونا دشوار ہے۔ ٹھیک یہی حال

وقت و زمانے کا ہے۔ جس شخص نے اس کی فطرت کو سمجھا۔ اور عمل و زہد کی وہی صورت اختیار کی جو اس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ وہ تو نفس کی آفات اور مصیبتوں سے محفوظ رہا۔ اور جس نے وقت کا معصیت و نافرمانی سے مقابلہ کیا، وہ مارا گیا۔

وکالسیف ان لاینته لان مسه

اور وقت تلوار کی مانند ہے۔ اگر تم نے اس کو نرمی سے تھاما۔ تو وہ بھی نرم ثابت ہوگا۔

وحدہا ان خاشنۃ خشنان

اور اگر اس کو سختی سے چھوا تو پھر اس کی دھاریں سخت ثابت ہونگی

علامہ اقبال نے امام شافعی کے حوالہ سے اس تلمیح کو دوران و تسلسل زماں کے معنوں میں استعمال کیا ہے ؎

سیف بران وقت را نامیدہ است

مگر صوفیاء کے کلام سے اس معنی کی تائید نہیں ہو پاتی۔ اور تائید ہو بھی کیسے جب کہ صوفیاء اور علامہ اقبال کے موضوع میں بیّن فرق ہے۔ علامہ وقت و زمان کی فلسفیانہ تشریح کرنا چاہتے ہیں۔ اور برگساں کو دکھانا چاہتے ہیں۔ کہ زمان و دہر کے جس فلسفیانہ تصوّر پر تجھے ناز ہے ہمارے ہاں وہ کوئی بالکل ہی اجنبی اور انوکھی چیز نہیں۔ لیکن صوفیاء کے ہاں وقت کی فلسفیانہ تعبیر غیر متعلق اور خارج از بحث ہے۔ وہ وقت کو صرف مجاہدات اور ریاضیات کا پیمانہ سمجھتے ہیں۔ اور اسی نقطۂ نظر سے اس پر نظر ڈالتے ہیں۔ کہ اس کے تغیر سے ایک سالک پر کیا کیا نئی روحانی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ـــــ یہ اسلوب بیان قرآن حکیم کے انداز بیان کے

مین مطابق ہے۔ بلکہ اُسی سے ماخوذ ہے۔ لوگوں نے آنحضرت سے پوچھا کہ چاند کے گھٹنے، بڑھنے یا ہلال و بدر ہونے کی کیا وجہ ہے؟ ظاہر ہے ان کا سوال کسی فلسفیانہ جواب کا متقاضی تھا۔ یعنی وہ اس کی سائنٹیفک توجیہ جاننا چاہتے تھے۔ مگر قرآن نے سوال کی اس نوعیّت کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا۔ بلکہ اس کے رُخ کو صحیح گوشوں کی طرف موڑتے ہوئے جواب دیا تو یہ کہ ان تغیّرات سے کیا کیا دُنیاوی اور دینی فائدے حاصل ہوتے ہیں؟

یسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس والحج۔ — اے محمد لوگ تم سے نئے چاند کے بارہ میں پوچھتے ہیں، کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟ کہدو کہ وہ لوگوں کے کاموں کی میعادیں اور حج کے وقت معلوم ہونے کا ذریعہ ہے۔ (بقرہ ۱۸۱)

قرآن نے جواب کے اس نہج کو کیوں اختیار کیا؟ اس لئے کہ قرآن کا موضوع فلکیات نہیں، انسان کی اصلاح و ترقی ہے۔

ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اس تلمیح کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ وہ صوفیاء کے حلقوں میں نئے اور غیر متعارف تو قطعی ہیں مگر غلط نہیں۔ کیونکہ ایک فلسفی اور شاعر کی حیثیت سے انہیں یہ حق ہے کہ ایک محدود اور سمٹی ہوئی تلمیح کو وسیع تر اور عمیق تر معنوں میں استعمال کریں۔

کیّس — اس سے ملتا جلتا لفظ کیّس ہے۔ جس کے لفظی معنی عقلمند اور زیرک انسان کے ہیں۔ مگر تصوّف میں اس سے مراد یہ ہے کہ اگر سالک ہوش و حواس میں ہے۔ اور اس پر عالم صحو طاری ہے۔ تو اس کے لئے شریعت کی پیروی ضروری ہے۔ اور اگر صحو کے بجائے محو (سکر) کا غلبہ ہے۔ تو اس صورت میں حقیقت کے احکام کا تتبع کرنا ہوگا۔

مقامات سالک چونکہ اللہ تعالےٰ کی طرف ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے اس سفرِ سلوک کی کچھ منزلیں ہیں۔ اور ان منزلوں کے متعیّن آداب ہیں۔ اس لئے سالک جس منزل یا مقام میں ہو اسی کے مطابق متعلقہ آداب و احکام کی اُسے رعایت رکھنا چاہئیے۔ یہی نہیں بلکہ جس مقام میں ہے۔ اس کے تمام آداب کو جب تک پورا نہ کرلے آگے نہ بڑھے۔ کیونکہ آگے بڑھنے کے لئے بے صبری کا اظہار قناعت کے منافی ہے۔ اور قناعت سے محرومی توکل کے خلاف ہے۔ اور اگر توکل کی نعمت سے کوئی شخص محروم ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس میں تسلیم و رضا کی بھی صلاحیّت نہیں۔ جو تصوّف کی جان ہے۔

حال یہ ایسی کیفیاتِ قلب سے تعبیر ہے جن سے ایک سالک ایک لمحہ بھر کے لئے دوچار ہوتا ہے۔ اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے جیسے طرب و حزن، قبض و انبساط یا شوق و تحیّر اور ہیبت و احتیاج وغیرہ۔ مقامات اور احوال میں یہ فرق ہے۔ کہ مقامات توجد وجہد سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ کیفیات سالک کے ذہن و فکر پر بغیر قصد و ارادہ کے ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک فرق ان دونوں میں یہ بھی ہے، کہ جہاں مقام ٹھہراؤ یا اقامت گزیں ہونے کا متقاضی ہے۔ وہاں احوال کا تقاضا آگے بڑھنا اور ترقی کی طرف تیزی سے گام فرسا ہونا ہے۔ گویا احوال میں تو ایک وقت خاص تک ٹھہرنا اور رُکنا خوبی ہے۔ اور احوال میں یہی خوبی عیب شمار ہوتی ہے۔ ذی النون مصری سے کسی نے پوچھا صاحب فلاں عارف کہاں ہیں۔ اُنہوں نے کہا:۔

کان ههنا فذهب — ابھی تو تھے اب کہیں نکل گئے ہیں۔

مطلب یہ کہ وہ احوال میں گرفتار نہیں —— بلکہ ان کے جذبہ عرفان

نے انہیں اگلی منزلوں کی طرف بڑھا دیا ہے۔

ایک صاحب کا قول ہے :-

الاحوال کالبروق فان بقی فحدیث ۔	احوال برق کی مانند ہیں ، اگر باقی رہ جائیں ، تو یہ احوال نہیں حدیثِ نفس ہیں۔

احوال کے بارہ میں صوفیاء کا ایک اور نقطۂ نظر بھی ہے۔ اور وہ بقاء احوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ احوال بھی مقامات کی طرح قیام و بقا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جب تک کوئی عارف چندے ٹھہر کر اور رُک کر ان سے استفادہ نہیں کر پائے گا۔ آگے نہیں بڑھ پائے گا۔ یہ لوگ احوال اور لوائح میں ایک قسم کا بیّن فرق محسوس کرتے ہیں۔ احوال تو ان کی اصطلاح میں وہ کیفیات ہیں جو ثبات و قرار کی مقتضی ہیں۔ اور جو چیز برق کی طرح سطح قلب پر چمکی اور غائب ہو گئی اس کو یہ احوال کے بجائے لوائح کہتے ہیں۔ جس کے لفظی معنی ہی چمکنے والی شئ کے ہیں۔ ابو عثمان حیریؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے :-

منذ اربعین سنۃ ما اقامنی اللہ فی حال فکرھتہٗ ۔	چالیس برس سے اللہ تعالےٰ نے مجھے جس حال سے دوچار کیا میں نے کبھی اس کو بُرا نہیں سمجھا۔

یعنی میں بہرحال قانع اور راضی بہ رضا رہا۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ بقاء احوال مطلقاً سکون اور ٹھہراؤ ہی چاہتا ہے۔ اور سالک مجبور ہے کہ ان سے بہرہ مندی کی صورت میں ترقی نہ کرے۔ ان کے نزدیک ان احوال میں بھی بے انتہا درجات و مراتب ہیں۔ جن کی طرف ایک سالک برابر حرکت کناں رہتا ہے۔ یعنی ہر ہر مرتبہ اور درجہ جس سے ایک سالک دوچار ہوتا ہے۔ اپنے آغوش میں کچھ حسنات اور

نیکیاں لئے ہوئے ہے۔ اور ایک عارف جب اس مقام کی تمام سعادتوں کو اپنے دامنِ طلب میں سمیٹ لیتا ہے، تو پھر قانع ہو کر نہیں بیٹھا نہیں رہتا بلکہ انہیں احوال کے آیندہ درجات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مسلسل ترقی ہے۔ جو مقربین کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور یہی مطلب ہے اس مقولہ کا:۔

حسنات الابرار سیات المقربین ابرار کی نیکیاں مقربین الٰہی کی برائیاں ہیں۔

غرض یہ ہے کہ ابرار حسنات میں اس طور پر ترقی کُناں رہتے ہیں کہ انہیں نیکی کا ہر وہ درجہ جس کو وہ چھوڑ آتے ہیں بہ نسبت آگے کے درجات کے سیئات محسوس ہوتی ہیں۔

قبض و بسط

کبھی کبھی سالک پر ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب وہ کسی ایسے محذور یا ضرر سے متاثر ہوتا ہے جو زمانہ قریب میں لاحق ہونے والا ہے۔ اس تاثر کو ان کی اصطلاح میں قبض سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ تاثر خوف اور خشیت کی بناء پر اُبھرتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عارف کو محبوب کا وصل قریب ترین نظر آتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں توقع و رجا کے داعیے اُبھرنا شروع ہوتے ہیں۔ اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ عنقریب اس کو قُرب و حضور کی وادیوں میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ اس کیفیت یا تاثر کو بسط کہا جاتا ہے۔ بسط کا اطلاق بصورتِ تنزّل اس کیفیت پر بھی ہوتا ہے۔ جو زوال ضرر یا محذور کی صورت میں پیدا ہو۔ یعنی عارف کے دل میں یہ توقع چٹکیاں لینے لگے کہ کسی روحانی ضرر سے عنقریب مخلصی حاصل ہو گی۔

بسط و قبض کی ان کیفیات کے بھی کئی درجے ہیں۔ کبھی قبض کا یہ تاثر ایسا حاوی اور چھا جانے والا ہوتا ہے کہ دوسری کیفیات کے لئے سرے سے

کوئی جگہ ہی نہیں رہتی۔ اور کبھی اس درجہ حاوی نہیں ہوتا۔ اس طرح بسط میں بھی اختلاف ہے۔ کبھی مبسوط یہ محسوس کرتا ہے۔ کہ یہ تاثر اس پر اس طرح چھا گیا ہے کہ مخلوق اور گردوپیش کے مکروہات کے لئے قلب میں کہیں فراغ و گنجائش باقی نہیں رہی۔ اور کبھی کبھی اس تاثر کے باوجود خلق اللہ کے لئے قلب و ذہن کے کچھ گوشے وا رہتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ عارف ان کیفیات میں حکمِ وقت کا تابع رہے۔ اور ان مقامات کا جو اقتضا ہے اس سے غافل نہ ہو۔

بسط کی کیفیّات میں اطاعت وقت کے عملی نتائج کیا ہوتے ہیں، اس کا اندازہ مشہور صوفی و عارف قحطی کے اس طرزِ عمل سے لگائیے۔ ان کا ایک نوجوان بیٹا تھا۔ جو تقاضائے جوانی سے انھیں جوان اور رنگین مشغلوں میں مصروف رہتا۔ جن میں عموماً نوجوان مشغول رہتے ہیں۔ ان کے ایک دوست کو یہ دیکھ بہت صدمہ ہوا۔ اس نے دل میں کہا بیچارے شیخ کے دل پر اس کی آوارگی سے کیا گذرتی ہو گی۔ لیکن اس کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے شیخ کو اس حالت میں پایا کہ اپنے انبساط روحانی میں اس درجہ مست ہیں کہ گردوپیش کے مکروہات اس میں خلل ڈالنے والے نہیں۔ قحطی نے اس کے استعجاب کو یہ کہہ کر رد کر دیا:۔

قد حررنا عن رق الاشیاء فی الازل۔	ہم نے اپنے نفوس کو اشیاء کی غلامی سے ازل ہی سے آزاد کر رکھا ہے۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ تصوّرِ محبوب اور لقائے محبوب کی توقعات نے ایسی تسکین عطا کر رکھی ہے اور ایسا اطمینانِ قلب بخش رکھا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے اعزہ و اقارب یا معاشرہ کی بے راہ روی ہمیں اپنی جگہ سے نہیں

ہٹا سکتی۔

قبض کی ان کیفیتوں کے دل میں اُبھرنے اور پیدا ہونے کے لئے ضروری نہیں کہ سبب بہر حال معلوم ہی ہو۔ بلکہ کبھی کبھی یہ کیفیتیں دفعۃً بغیر کسی معلوم سبب کے بھی طاری ہو جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں عارف کو تسلیم و رضا سے کام لینا چاہیئے۔ اور اس کے ازالہ کے لئے عجلت نہیں اختیار کرنا چاہیئے۔ کہ اس سے قبض و تکدر روحانی کے اور بڑھ جانے کا خطرہ ہے۔ اسی طرح بسط و انبساط کی کیفیتیں بھی عارف پر کبھی کبھی اچانک چھا جاتی ہیں۔ اور ان کا ظاہری سبب معلوم نہیں ہو پاتا۔ اس حالت میں ان پر لازم ہے کہ سکون اختیار کئے رہیں۔ اور اس مرحلے کے آداب سے غافل نہ ہوں۔

ہیبت وانس جس طرح قبض و بسط، خوف و رجاء کے آگے کا ایک مقام ہے۔ اسی طرح ہیبت وانس کی کیفیتیں قبض و بسط سے بھی آگے کے مدارج سے تعبیر ہیں۔ ہر ہر ہیبت ایک انداز کے غیاب و سُکر کو چاہتی ہے۔ اور ہر ہر انس، صحو ہوش کا مقتضی ہے۔ چنانچہ ہر ہائب (ہیبت سے دوچار ہونے والا) احساس وجود سے عاری و غائب ہوتا ہے۔ اور مستانس (انس سے متصف) ہوش و صحو کے تقاضوں سے قریب تر۔ پھر ان دونوں میں ارتقاء کے نئے مدارج ہیں۔ جن کی تفصیل علم و تجزیہ سے زیادہ عمل و تجربہ سے تعلق رکھتی ہے۔

انس کا ادنیٰ درجہ یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اگر اس کو آگ میں پھینک دیا جائے جب بھی اس کے احساساتِ انس میں تکدر پیدا نہ ہو۔ جنید کہتے ہیں مجھے اندیشہ تھا کہ کوئی شخص انس کے اس مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ مگر پھر تجربہ سے معلوم ہوا کہ عارف کے لئے اس مقام کا حصول کچھ بھی مشکل نہیں۔

ایک مرتبہ اہلِ تمکین کا ہے۔ جو ان دونوں کیفیتوں سے بالا اور بے نیاز

رہتے ہیں۔ اور ان کو ایک طرح کا نقص تصوّر کرتے ہیں۔ یہ وجود حق میں اس طرح محو و مشغول رہتے ہیں۔ کہ نہ ہیبت سے دو چار ہوتے ہیں اور نہ انس ہی سے ان کا کوئی واسطہ رہتا ہے۔ نہ علم انھیں پریشان کرتا ہے اور نہ احساس کی اذیتیں انہیں مکدر کرتی ہیں۔ ابی سعید خراز کا قصّہ اس کیفیّت کا بہترین غماز ہے۔ ان کا کہنا ہے میں ایک مرتبہ جنگل میں حیران و ششدر ان اشعار کو پڑھ رہا تھا۔

اتیہ فلا ادری من اتیہ من انا   سوا ما یقول الناس فی و فی جنسی

میں حیران و ششدر گھوم رہا ہوں اور نہیں جانتا کہ خود میں کیا ہوں
مجھے اپنے بارے میں صرف اتنا ہی علم ہے جتنا کہ لوگ میرے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں

اتیہ علی جن البلاد و انسہا   فان لم احب شخصاً اتیہ علی نفسی

میرا یہ تحیر جن و انس دونوں کو شامل ہے

اور اگر کسی اور کو نہ پاؤں تو پھر میرے تحیر کا مرکز خود میرا نفس بن جاتا ہے

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ہاتف غیب میرے ان تاثرات کے جواب میں کہہ رہا ہے:۔

ایا من یری الاسباب اعلی وجودہٖ   ویفرح بالتیہ ایدانی و بالانس

اے وہ شخص جو اسباب و ذرائع کو وجود کا بہترین مرتبہ سمجھتا ہے

اور ادنیٰ قسم کے تحیر و انس پر نازاں ہے

فلو کنت من اھل الوجود حقیقۃً   لغبت عن الاکوان والعرش والکرسی

اگر تو حقیقۃً اہل وجود سے ہوتا۔

تو پوری کائنات حتیٰ کہ عرش و کرسی تک سے اپنے کو غائب بے نیاز پاتا

وکنت بلا حال مع اللہ واقفاً   تصان عن التذکار بالجن والانس

اور اللہ کے سامنے بغیر کسی تغیر حال کے کھڑا ہوتا

اس صورت میں تو جن و انس کے تذکرہ اور یاد سے بالکل محفوظ رہتا

تاثر کی ایک کیفیت یہ ہے کہ کوئی شخص اس لئے

تواجد۔ وجد اور وجود کوئی شعر سُننے یا قوالی کی مجالس میں شریک ہو تاکہ اس کے دل میں رقّت و گداز کے جذبات پیدا ہوں۔ اور وہ اس حد تک بڑھیں کہ اس کو بےخود کر دیں۔ تاثر کی اس کیفیت کو دعوت دینا یا اس کے لئے اس طرح کا تکلّف و اہتمام کرنا کہ یہ خود بخود پیدا ہو جائے تواجد ہے۔ اس کے بارہ میں صوفیاء کی دو رائیں ہیں۔ ایک گروہ اس میں کوئی مضائقہ خیال نہیں کرتا کہ رقّت و گداز کی فضا بہ تکلّف پیدا کی جائے۔ اور ایک کے نزدیک اس میں چونکہ تکلّف اور بناوٹ کا عنصر پایا جاتا ہے اس لئے باکمال عارفوں کو اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ جو لوگ اس کو جائز سمجھتے ہیں ان کی بُنیاد اس حدیث پر ہے :-

ابکوا فان لم تبکوا تباکوا۔ تمہیں خشیت الٰہی سے رونا چاہیئے اور اگر رونا نہ آئے تب رونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

ابو محمد حریری کا قصّہ اس سلسلہ میں فیصلہ کُن رائے کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں مسئلے کے دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، مجھے ایک ایسی مجلس میں شریک ہونے کا موقع ملا جس میں ابنِ مسروق اور حضرت جنید ایسے بزرگ موجود تھے۔ مجلس سماع کا آغاز ہُوا۔ قوال نے گانا شروع کیا۔ اور اس انداز سے گانا شروع کیا کہ ابنِ مسروق متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان پر وجد کی کیفیتیں طاری ہو گئیں۔ حضرت جنید نہایت تمکین و وقار سے اپنی جگہ جمے بیٹھے رہے۔ اس پر ابو محمد نے پوچھا کہ کیا آپ پر سماع نے کوئی اثر نہیں کیا۔ حضرت جنید نے جواب میں کہا :-

وتری الجبال جامدۃ وھی تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ اپنی

تمر مر السحاب۔ جگہ پر جمے کھڑے ہیں۔ حالانکہ یہ بادل کی طرح اُڑتے پھریں گے۔ نمل ۸۸

حضرت جنید نے کہا تم تو اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ اُنھوں نے کہا، جناب میں جب کسی ایسی مجلس سماع میں شریک ہوتا ہوں جس میں کوئی مُوقر و محترم شخصیّت موجود ہو، تو اپنے کو از راہِ ادب لئے دئے رہتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ دل بے قابو نہ ہونے پائے۔ لیکن تنہائی میں یہ تاثر اس درجہ شدّت اختیار کر لیتا ہے، کہ میں بھی وجد سے بہرہ مند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وجد یہ ہے کہ دل پر اس طرح کا بےخود کر دینے والا تاثر خود بخود بغیر کسی کوشش اور تکلّف کے طاری ہو جائے۔ لیکن یہ وجد طاری کب ہوتا ہے؟ اور کن لوگوں پر طاری ہوتا ہے! اس کے جواب میں صوفیاء کا کہنا ہے۔ کہ جو لوگ اوراد و وظائف پر مواظبت کرتے ہیں انھیں کو اس نعمت سے مالا مال کیا جاتا ہے۔

وجد کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو یوں سمجھئے کہ جس طرح اعمال شریعت کی بجا آوری سے دل میں ایک طرح کی لذّت و حلاوت کا احساس ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اوراد و وظائف کی کثرت و مواظبت سے وجد کی لذتیں محسوس ہوتی ہیں۔

وجود کا درجۂ وجد کے بعد کا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب عارف مواجید سے ترقی کر کے وجودِ حق کے غلبہ و استیلاء کو محسوس کرتا ہے۔ مگر یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب بشریت کے تقاضے ختم ہو جائیں۔ اور اپنے وجود اور اپنے احساسِ 'انا' سے آگے بڑھ کر سالک حی و قیوم انا سے اپنے کو قریب تر محسوس کرے۔ اس میں شرط یہی ہے کہ جس نسبت سے اس کو اپنے وجود کا احساس رہیگا

اُسی نسبت سے وجود حق سے دور رہے گا۔ اور جس نسبت سے اپنے احساس ذات سے دور ہوتا جائے گا۔ اسی نسبت سے حق اس سے قریب تر ہوتا جائے گا! اسی نکتہ کو ابوالحسین نوری نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

انا منذ عشرین سنة بین الوجد والفقد ۔	میں بیس برس سے وجود و فقدان وجود کی منزلوں میں ہوں۔

یعنی جب جب اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی ذات مفقود ہوتی جاتی ہے۔ اور جب جب اپنی ذات کو مفقود پاتا ہوں اس کی ذات کو دل کے گوشوں میں موجود پاتا ہوں۔

ان تینوں میں باہمی ربط و ترتیب کا کیا عالم ہے؟ صوفیاء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ تواجد تو ابتداء کا نام ہے۔ اور وجود انتہاء سے تعبیر ہے۔ اور وجد کو اس سلسلہ کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ ابوعلی وقاق کا کہنا ہے :-

التواجد یوجب استیعاب العبد	تواجد تو یہ چاہتا ہے کہ احساس عبدیت کو پوری طرح گھیرے، وجد اسی احساس کو اپنی
والوجد یوجب استغراق العبد	پہنائیوں میں گم کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے اور
والوجود یوجب استھلاک العبد ۔	وجود کا یہ تقاضا ہے کہ عبد اپنے کو بالکل ہلاک اور مستہلک قرار دے۔

+

ایک صاحب نے عارف شبلی سے سوال کیا۔ کہ آیا نعمت وجود سے بہرہ مند خوش نصیبوں پر کبھی ایسے آثار و نتائج کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ جن کو دیکھا اور ملاحظہ کیا جا سکے۔ اُنہوں نے کہا کیوں نہیں۔ یہ لوگ ایسے نور سے دوچار ہوتے ہیں۔ جس کے ڈانڈے اشتیاق کی آتش سوزاں سے ملے ہوئے ہیں۔ اور اس کا صاف اور واضح اثر ان کے ہیکل جسمانی پر قطعی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

وامطر الكاس ماء من ابارقها   فانبتت الدرفی ارض من الذهب

صراحی سے شراب انڈیلتے ہوئے پیمانہ نے کچھ اس طرح شراب چھلکائی اور برسائی کہ جس سے اس نے سنہری زمین میں موتیوں ایسے دانہ ہائے انگور پیدا کئے۔

وسبح القوم لما ان رأئعا عجبًا   نوراً من الماء فی نار من العنب

شراب کی اس تحیرزا تخلیق پر قوم ازراہ استعجاب سبحان اللہ پکار اٹھی۔ کہ یہ فوارہ نور (یعنی شراب) خوشہ تاک کی آگ سے کیونکر پیدا ہو گیا۔

سلافة ورثتها عاد عن ارم   کانت ذخیرة کسریٰ عن اب فاب

یہ خالص شراب ہے جس کو عاد نے ارم سے وراثت میں پایا ہے

اور یہی کسریٰ کا آبائی ورثہ و ترکہ ہے

جمع و فرق یہ اصلاح صوفیاء میں اکثر رائج اور دائر و سائر ہے۔ فرق ان عبادات وطاعات سے تعبیر ہے جس کو ایک بندہ اللہ کیلئے انجام دیتا ہے۔ اور جمع ان عنایات الٰہی اور احسانات کو کہتے ہیں، جن سے بندہ بطور جواب کے بہرہ مند ہوتا ہے۔ گویا اپنی بشریت و عبودیت کا احساس واثبات تو تفرقہ ہے۔ کہ انسان اپنے بشری حدود اور تقاضوں کو پہچانتا ہے۔ اور اس کے مطابق اطاعت و عبادت کے فرائض بجا لاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جب اس تعلق عبودیت پر اپنی طرف سے کوئی صلہ عطا کرتے ہیں۔ اور اثبات حق کے مواقع مہیا فرماتے ہیں تو اثبات کی یہ کیفیت جمع کہلاتی ہے۔ اسی حقیقت کو صوفیاء ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

من لا تفرقة لا عبودية   جس کو تفرقہ کا مقام حاصل نہیں اس کو عبودیت

له ومن لا جمع له لا   کا مقام بھی حاصل نہیں، اور جو جمع کی نعمت

معرفة له۔   سے آشنا نہیں وہ معرفت سے بھی آشنا نہیں۔

ایاك نعبد، وایاك نستعین میں ان دونوں مقامات کو جمع کردیا گیا ہے یعنی جب بندہ عبادت کا اقرار کرتا ہے۔ تو یہ گویا مقام تفرقہ پر فائز ہے۔ اور جب اللہ تعالٰے سے استعانت و مدد طلب کرتا ہے۔ تو یہ اس کے احسانات وعنایات کی طلب وجستجو کے مترادف ہے۔ جو مقام جمع کی طرف اشارہ کناں ہے۔

جمع الجمع فرق وجمع سے بھی آگے ایک مرتبہ جمع کا ہے۔ اس کا مستحق وہ شخص ہے جس نے وفورِ شوق کے باوجود اپنے نفس وانا کو محفوظ رکھا۔ گرد و پیش کی مخلوق سے بھی غافل نہیں ہونے پایا۔ اور کائنات کا بحیثیت مجموعی اس طرح مطالعہ کیا کہ گویا اس کا اثبات و مقام حق کے ساتھ وابستہ ہے۔ یعنی یہ قائم باللہ کی صفت سے متصف ہے۔ اور اگر شوق وعرفان کی سرمستیاں اس کو شہود وخلق سے مستغنی کردیں۔ اور یہ اپنے احساس سے بھی اس بناء پر بیگانہ ہو جائے کہ سلطانِ حقیقت نے اس پر قبضہ جمالیا ہے۔ اور اس کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ تو یہ جمع الجمع ہے۔

تفرقہ اور جمع میں باریک فرق یہ ہے۔ کہ جہاں تفرقہ ایسے شہود ومشاہدۂ خلق سے تعبیر ہے۔ جو اللہ کے لئے ہو وہاں جمع ایسے شہود ومطالعہ سے تعبیر ہے جو اللہ کے ساتھ قیامُ وابستگی کا نتیجہ ہو۔ اور جمع الجمع کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص اپنے نفس وانا کو کلیتہً مٹا ڈالے۔ اور ماسوی اللہ سے پوری پوری بیگانگی اختیار کرلے۔

ایک لطیف منزل جمع الجمع کی یہ ہے، کہ غلبہ حقیقت کے باوجود عارف ادائے فرائض کے وقت حالت صحو میں آجائے۔ اسے صوفیاء کی اصطلاح میں فرق ثانی کہا جاتا ہے۔ یہ رجوع الی اللہ کی ایسی قسم ہے جس میں تصوّف

براہِ راست دستِ قدرت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں بندے کے ارادہ وعزم کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس مقام میں عارف یہ سمجھتا ہے کہ میری ذات پر اللہ تعالےٰ کا پورا پورا قبضہ واستیلاء ہے۔ میرے اختیارات مسلوب میں میرا نفس مفقود ہے۔ اور حق تعالےٰ کی ذات گرامی ہے جو یہ توفیق بخشتی ہے کہ میں ادائے فرائض کے وقت سکر ومحو کی حالت سے عالم صحو وشہود میں آجاتا ہوں۔

غیبت وحضور

غیبت کے معنی یہ ہیں کہ عارف گردوپیش کی مخلوق کے حالات سے اس بنا پر غافل ہو جائے کہ اس کے احساسات پر کسی غالب تر اور مؤثر تر جذبے نے قابو پالیا ہے۔ یہ غالب تر اور مؤثر تر جذبات کئی قسم کے ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ثواب وصلہ کی فراوانیوں نے قلب وفکر کو چھالیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے عذاب الٰہی کے خوف واندیشہ نے سب کچھ بُھلادینے پر مجبور کردیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی آیت کسی شعر اور کسی عارفانہ نکتہ نے قلب وذہن کی توجہات کو سکر ومحو کی طرف موڑ دیا ہو۔ اور ماحول سے کلیتہً بیگانہ کردیا ہو۔ اس تاثر وکیفیت کی صحیح نوعیت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل واقعات پر غور کیجئے:۔

ربیع بن خیثم عبداللہ ابنِ مسعود کے ہاں روزانہ حاضری دیا کرتے تھے۔ جس راستہ سے ان کا گذر ہوتا۔ اس میں ایک دکان لُہار کی پڑتی تھی۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ لہار نے بھٹی سے گرم گرم اور لال لال لوہا نکالا۔ اور سندان پر رکھدیا۔ یہ اس منظر کی تاب نہ لاسکے۔ اور بے ہوش ہوگئے۔ پوچھا گیا کہ حضرت اس غشی کا سبب؟ اُنھوں نے کہا۔ اس آگ اور لوہے سے میرا ذہن جہنم اور اہلِ جہنم کی طرف منتقل ہوگیا۔ یہ غیبت ہے۔

علی بن حسین سجدے میں تھے کہ گھر کے ایک گوشے میں آگ لگ گئی۔ یہ

برابر خدا کے حضور سجدہ کناں رہے اور مطلق نہیں گھبرائے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے دریافت کیا حضور آپ آگ لگنے سے ڈرے اور سہمے کیوں نہیں۔ انھوں نے جواب میں کہا:۔

الھتنی النار الکبری عن ھذہ النار۔	مجھے اس بڑی آگ کے تصوّر نے کچھ اس طرح گھیر لیا کہ اس چھوٹی آگ کی طرف متوجّہ ہونے کا موقع ہی نہیں ملا۔

تیسرا واقعہ ملاحظہ ہو:۔

جنید اپنے گھر میں بیٹھے اپنی بیوی سے باتیں کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں شبلی آ گئے۔ بیوی نے بھاگنا چاہا۔ جنید نے کہا۔ نہیں بیٹھی رہو۔ ان کو اتنا ہوش ہی کہاں ہے کہ تمھیں دیکھ پائیں۔ کچھ عرصہ تک عرفان وسلوک کی مختلف منزلیں زیر بحث رہیں۔ آخر گفتگو تاثر دموعظمت کے ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئی۔ جہاں گھگھیا کے رونے لگے۔ اسپر جنید نے بیوی سے کہا۔ اب تمھیں پردہ میں ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ شبلی سکر و غیبت سے پلٹ آئے ہیں۔ اور صحو و ہوش کے تقاضوں سے دوچار ہونے ہی والے ہیں۔

حضور، اسی تاثر غالب تر اور مؤثر تر سے نکل آنے کا نام ہے۔ بشرطیکہ حضور بالحق کا احساس اس میں شامل ہو۔ عارف کو حاضر اس وقت کہیں گے۔ جب وہ اپنے قلب و ذہن کی تمام توجہات اور گہرائیوں کے ساتھ اللہ کے سامنے پیش ہو۔ اسی کا ذکر ہو۔ اسی کا ورد ہو۔ اور اسی کی یاد سے زبان لطف اندوز ہو۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ حضور دراصل غیاب وغیر حاضری کا ردّعمل ہے۔ جس قدر اس پر غیاب ومحویت کا غلبہ واستیلاء ہو گا۔ اسی قدر اس کا حضور اور رجوع الی اللہ قوی اور زبردست ہو گا۔ پھر

یہ حضور کبھی مکاشفات کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتا ہے۔

حضور کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حضور بہ خلق ہے۔ اور ایک حضور بحق۔ دونوں میں باریک فرق یہ ہے کہ جہاں اوّل الذکر کے معنی یہ ہیں کہ حاضر اپنے احوال نفس اور گرد و پیش کی مخلوق کی طرف متوجہ ہے، اور ان حقوق و فرائض کا احساس رکھتا ہے، جو اس کی ذات یا خلق اللہ سے متعلق ہیں، وہاں ثانی الذکر کا اطلاق ایسے حاضر پر ہوگا۔ جس کی توجہات کا مرکزی نقطہ ذات باری تعالےٰ ہے۔ غیبت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک جو عارضی اور وقتی ہوتی ہے۔ اور دوسری جو متلازم اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ بایزید بسطامی اسی دوسری قسم سے متصف تھے۔ یعنی ان پر عارفانہ تاثرات کا جو ایک مرتبہ حملہ ہوا تو پھر یہ عمر بھر اس سے نکل نہیں سکے۔ اس کی تصدیق مندرجہ ذیل قصّہ سے ہوتی ہے:۔

ذی النون مصری نے ایک شخص کو ان کے متعلق دریافت حال کی غرض سے بھیجا۔ ذی النون معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ محبت و عشق کی کس منزل میں ہیں۔ یہ شخص حسب ہدایت سیدھا بسطام پہنچا۔ اور ابویزید سے ملا۔ انھوں نے پوچھا، کیوں آئے ہو۔ اس نے کہا، ابویزید سے ملنے آیا ہوں۔ اس نے کہا اس کی کچھ خبر نہیں۔ میں خود اس کی تلاش میں ہوں۔ بتاؤ وہ کہاں ہے؟

ذوالنون نے یہ کیفیت سنی تو رو دئے۔ کہنے لگے یہ ذھاب الی اللہ کی منزل میں ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف اُن لپکنے والوں میں سے ہیں۔ جو کبھی بھی پلٹ کر دنیائے صحو کی طرف نہیں دیکھتے۔

صحو و سکر یہ دونوں کیفیتیں غیبت و حضور سے ملتی جُلتی ہیں۔ چنانچہ کبھی تو سُکر غیبت کا مترادف ہوتا ہے۔ اور کبھی اس میں مدارج کا فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ محققین کے نزدیک اس میں اصل فرق کیفیت کا نہیں نوعیت کا ہے۔

یعنی جہاں غیبت کے اسباب ہیں۔ان تاثرات کو دخل ہے۔جن کا تعلق کسی عبرت آفریں شئے سے ہو۔ وہاں سکر کا تعلق محض جمال الٰہی کی تجلّیات گوناں گوں سے ہے۔

قرآن میں ہے :۔

فلمّا تجلّیٰ ربہ للجبل جعلہ دکّا وخرّ موسیٰ صعقا۔ — سوجب تیرا رب پہاڑ پر نمودار ہُوا۔ تو پہاڑ کو توریزہ ریزہ کر دیا۔ اور موسیٰ تجلّیاتِ الٰہی کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اعراف ۱۴۳

یہ صعق یا بے ہوشی وہی سکر ہے۔جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا۔

ذوق وشرب صوفیاء کے کلام میں اکثر ذوق وشرب کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ یہ بھی اصطلاحیں ہیں۔ان سے مقصود وہ لطف وہ استراز اور فکر وعرفان کے نتائج ہیں۔جو تجلیاتِ الٰہی سے بہرہ مند ہونے پر حاصل ہوتے ہیں۔ یا کشوف اور واردات جس کا موجب ہوتے ہیں۔ ذوق اس بہرہ مندی کا پہلا درجہ ہے۔اس کے بعد شرب ہے۔شرب کے بعد سیری ہے۔عملی ترتیب یوں ہے۔کہ صفائے معاملات سے ادراک معانی کا ذوق اُبھرتا ہے۔اور وفاءِ منازل سے شرب (یعنی معرفت کے پینے) کے مواقع میسر آتے ہیں۔اور اس سے آگے بڑھ کر اگر مواصلات کے دوام وتسلسل کی توفیق نصیب ہو۔ تو پھر یہی روح وقلب کی سیری ہے۔لیکن وہ سیری وہ نہیں جس کے بعد شراب معرفت کی طلب ختم ہو جاتی ہے۔بلکہ یہ وہ سیری ہے۔جس کے بعد تشنگی اور بڑھتی ہے۔

شربت الحب کاسا بعد کاس — فما نفد الشراب ولا رویت

میں نے محبت کے جام پر جام لنڈھائے ہیں

اس پر بھی نہ تو شراب کا ذخیرہ ختم ہُوا ہے اور نہ میری طلب ہی میں فرق آیا ہے

اگر کوئی شخص اپنی عادات کی سطح سے اونچا رہتا ہے اور

محو واثبات کوشش کرتا ہے کہ اس میں جو بُرائیاں پائی جاتی ہیں ان کو دور کردے۔ اور ان کے بجائے اخلاقِ حسنہ، عبادات اور ذوق وسلوک سے عادات کو سنوارے تو یہ کوشش محو واثبات کہلائے گی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ذمائم اور بُرائیوں کو تو محو کرنے اور مٹانے کی جدوجہد کی ہے اور نیکیوں کو اپنایا ہے یا ثابت کیا ہے۔ محو واثبات کا قانون کتنا ہمہ گیر ہے اس کو ایک عارف کے الفاظ میں دیکھیے:-

ابو علی دقاق نے ایک شخص سے پوچھا، کس چیز کے محو کرنے اور کس چیز کے اثبات کے درپے ہو۔ اس کو خاموش پاکر خود ہی فرمایا۔ وقت وزمان کی گردشیں برابر محو واثبات کے ہمہ گیر قانون پر عمل پیرا ہیں۔ چنانچہ یہاں کتنی صورتیں، افکار، اور معانی ایسے ہیں کہ روزانہ تغیّر وتبدّل کے سانچوں میں ڈھل رہے ہیں۔ لیکن کوئی شخص اگر محو واثبات کے اس قانون سے مستثنیٰ رہنا چاہتا ہے، تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ مہمل اور بے کار ہے، جس نے شعور ادراک کی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کیا۔

محو واثبات کی مزید تفصیل ان کے اس قول میں ملتی ہے:-

وینقسم عن محو الزلة عن الظواهر و محو الغفلة عن الضمائر و محو العلة عن السرائر۔

عمل محو کئی خانوں میں منقسم ہے۔ ظواہر اعمال میں لغزشوں سے بچنا چاہیئے اور ضمیر وقلب کو غفلت وتساہل سے باز رکھنا چاہیئے اور سرائر کے معاملہ میں ان بیماریوں سے مجتنب رہنا چاہیئے جو ان کو داغدار کردیتی ہیں۔

اس محو کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ جب وہ اعمال ظواہر میں پیش آئیند لغزشوں سے

بچنے کی کوشش کرے گا۔ تو معاملات میں صفائی پیدا ہوگی۔ اور غفلت و تساہل کے خلاف جہاد کرے گا۔ تو منازلات (روح کے مدارج ارتقاء) کی طرف بڑھ سکے گا۔ اسی طرح اگر دل اور اس کے سرائر کو پاک رکھے گا اور ان پر بیماریوں کا سایہ نہیں پڑنے دے گا تو اس سے مواصلات میں ترقی کے مواقع پیدا کرے گا۔

محو و اثبات کا یہ پہلو تو وہ ہے جو اختیاری ہے۔ مگر حقیقی محو و اثبات یہ نہیں۔ اس کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ محو و اثبات کا یہ قانون اللہ کی طرف سے حرکت میں آئے۔

یمحوا اللّٰہ ما یشاء و یثبت۔ خدا جس کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے قائم و ثابت رکھتا ہے۔ (رعد ۳۸)

جس کا یہ مطلب ہے کہ اس کے بحر کرم میں جنبش پیدا ہو۔ اور اس کا دست فیض رساں بڑھے اور بڑھ کر عارف کے دل سے ان تمام نقوش کو مٹا ڈالے جن کا تعلق غیر سے ہے۔ اور اپنے ذکر، اپنی یاد اور محبت کے نقوش اس کے بجائے سطح دل پر مرتسم کر دے۔

محو سے آگے کا درجہ محق ہے، ان دونوں میں دقیق فرق یہ ہے کہ جہاں محو میں احساس اَنا کے کچھ کچھ اثرات باقی رہ جاتے ہیں وہاں محق یہی نہیں، اس منزل میں عارف کو اپنے نفس کا احساس نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ وہ اس کو کلیۃً اُس ذات اور اَنا میں گُم کر دینے کا متمنی ہوتا ہے۔ جس سے اس کو محبت و عشق ہے۔

محق و عرفان کے اسی مقام بلند کی طرف شبلی نے اشارہ کیا ہے۔ ان سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ پریشان کیوں ہیں۔ کیا آپ کو یہ مقام حاصل نہیں۔ کہ اس کی ذاتِ گرامی آپ کے ساتھ ہو۔ اور آپ کو اس کی معیت پر فخر ہو۔

انھوں نے کہا۔ صورتِ حال یہ نہیں :۔

لو کنت انا معہ کنت انا۔ اگر اس کی ذات گرامی میرے ساتھ ہوتی، تو

ولکنی محو فیما ھو۔ میں احساس انا رکھتا۔ لیکن میں تو اس کی ذات

میں گم ہوں۔ لہذا میرے اَنا کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ستر و تجلی ستر کے لفظی معنی چھپانے اور پنہاں کرنے کے ہیں۔ اصطلاح صوفیاء میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک عام آدمی جو حقائق معرفت سے آگاہ نہیں ہے۔ اس وقت مستور رہے جب تک مجاہدہ و ریاضت سے انوار غیب اس پر جلوہ ریز نہ ہوں۔ اور جب یہ انوار اس کے قلب و باطن کے گوشوں کو منور کریں گے۔ تو اس وقت حجاب بشریت قائم ہیں رہے گا۔ بلکہ اس میں اس طرح کی ملکوتیت اُبھر آئے گی۔ جس کے ذریعہ یہ ان تجلیات کا سامنا کر سکے گا۔

ستر و تجلی کا یہ پہلو عارف کی ذاتی جد و جہد اور ریاضت سے متعلق ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ خود حق تعالےٰ بندوں سے اپنے بعض انوار مستور رکھتا ہے تاکہ ان کے قافلہ شوق و محبت کو مہمیز ہو۔ اور یہ تیز رفتاری سے اس منزل کی طرف قدم بڑھا سکیں۔ تاآنکہ شوق و محبت کا وہ موڑ آجائے جہاں حق تعالےٰ کی جلوہ فرمائیاں سبقت فرماتی ہیں۔ اور اپنے بندوں کے قلب و فکر کو مطلع انوار بنا دیتی ہیں۔

محاضرہ۔ مکاشفہ اور مشاہدہ محاضرہ یہ ہے کہ عارف قلب سلیم کے ساتھ حق تعالےٰ کے سامنے ہو۔ مکاشفہ اس کا نتیجہ ہے۔ یہ حضور کی وہ منزل ہے۔ جب بغیر دلیل کی باقاعدہ رہنمائی کے اور جستجو و کاوش کے جانے بوجھے اصولوں کے اس پر حقائق اشیاء اس طرح

منکشف ہو جائیں۔ کہ انہیں شک و ریب کی قطعی گنجائش نہ ہو۔ اور مشاہدہ یہ ہے کہ عارف بلا کسی روک ٹوک اور واسطے کے اپنے کو حاضر بحق محسوس کرے۔ لیکن یہ منزل اس وقت تک حاصل ہونے والی نہیں جب تک بقول حضرت جنید کے سالک اپنے انا سے بالکلیہ دست بردار نہ ہو جائے۔

مشاہدہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو عمرو بن عثمان مکیؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

انہ تتوالی انوار التجلی	مشاہدہ یہ ہے کہ سالک عارف کے دل پر اسطرح
علی قلبہ من غیر ان	تجلیات کا پیہم و متواتر ہجوم ہو کہ درمیان میں ستر
یتخللہا ستر او انقطاع۔	وانقطاع خلل انداز نہ ہو۔

شرط یہی ہے کہ سالک نفس و انا کے جملہ لوازم بشریہ سے دستکش ہو جائے۔

ع سار وا فلم یبق لا رسم ولا اثر

وہ یوں نکلے چلے گئے کہ اب نہ تو نقوش پا ہی کا پتہ چلتا ہے اور نہ کسی نشان کا۔

لوائح طوالع اور لوامع یہ الفاظ قریب قریب مترادف ہیں۔ ان کیفیات سے عموماً وہ مبتدی حضرات بہرہ مند ہوتے ہیں جو جادۂ معرفت پر گامزن ہوں۔ اور ترقیاتِ قلبی و روحانی میں مصروف ہوں۔ انھیں کبھی کبھی از راہِ کرم ایک گونہ مکاشفات سے نوازا جاتا ہے۔ لیکن یہ مکاشفات اس درجہ مختصر اور گریز پا ہوتے ہیں کہ ادھر قلب و ذہن چمکے اور ادھر غائب۔ گویا

افترقنا حولا فلما التقینا

ہم سال بھر محبوب سے جُدا رہے

کان تسلیمہ علی وداعا

اور ملاقات ہوئی تو اس حال میں کہ اس کا سلام الوداعی تھا

لوامع بھی کشوف ہی کی ایک قسم ہے مگر ظہور میں نسبتاً نمایاں اور کچھ عرصہ قائم رہنے والے ہیں۔

طوالع۔ان کشوف کو کہتے ہیں۔جو وضاحت وظہور میں بھی بڑھے ہوئے ہوں۔ اور زیادہ قائم رہنے والے بھی ہوں۔

تلوین ارباب حال کی کیفیت ہے اور تمکین اہلِ حقائق کی۔

تلوین و تمکین

بات یہ ہے کہ جب سالک تغیرّات سے متاثر ہو، ترقی میں کوشاں ہو۔ اور وصل واتصال کی آخری منزل تک نہ پہنچا ہو۔ تو اس وقت اسے صاحب تلوین کہا جائے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ابھی فکر وعمل کے کئی رنگ دیکھنا ہے۔ اور ترقی وسلوک کی کئی منزلیں طے کرنا ہیں۔ لیکن اگر تغیرّات اور تجلیات تک اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اور وہ عرفان کے ایسے میدانوں میں پہنچ گیا ہے۔جہاں استقرار ہے، اطمینان ہے، اور وہ سب کچھ ہے جس سے دیدہ ودل کی تسکین کا سامان مہیّا ہوتا ہے۔ تو اس کیفیت کو تمکین کہیں گے اور اس سے جو متصف ہوگا اس کو صاحب تمکین کہا جائے گا۔

ابو علی دقاق نے اس فرق کو دو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرت موسیٰ ان کے نزدیک صاحب تلوین تھے۔ کیونکہ اُنھوں نے کلام الٰہی کو اپنے کانوں سے سنا، مگر اس تغیّرِ حال کو برداشت نہ کر سکے۔ بلکہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اس کے مقابلہ میں آنحضرت کے مرتبہ تمکین کی بلندیاں دیکھئے کہ شب معراج میں گفتگو بھی سُنتے ہیں اور حیران کُن مناظر بھی دیکھتے ہیں اور اللہ کی تجلیات کا براہِ راست مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ مگر برداشت وتحمل کا یہ عالم ہے کہ قلب و ذہن ان تغیرات سے ذرا بھی تو تاثر و اعجاب محسوس نہیں کرتا۔ اس فرق کو حضرت یوسف اور زلیخا کے قصّہ میں بھی دیکھئے کتنا نمایاں ہے۔ ایک طرف زلیخا ہے۔

کہ روزانہ یوسف کو دیکھتی ہے اور اس کے جمال جہاں افروز سے بہرہ مند بھی ہوتی ہے۔ مگر مجال ہے کہ آنکھوں میں خیرگی اور قلب و فکر میں تحیر پیدا ہو۔ دوسری طرف وہ عورتیں ہیں، جو حضرت یوسف کی ایک ہی جلوہ فرمائی سے اپنے ہاتھ زخمی کر بیٹھتی ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ زلیخا کا ظرف و جگر عالی ہے۔ اس میں تحمل و برداشت کی قوتیں زیادہ ہیں۔ اور اس کا مقام عشق و محبت ایسا ہے جسے ہم صوفیاء کی اصطلاح میں تمکین کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ایک قسم کا ٹھہراؤ اور وقار ہے۔ لیکن اس کے برعکس زنانِ مصر ابھی عشق و محبت کی پہلی ہی تجلّی سے دوچار ہیں۔ ان کا حوصلہ و ظرف بھی چھوٹا ہے۔ اور انھیں ابھی اپنے جذبہ کی تکمیل بھی کرنا ہے۔ یہ کیفیت تلوین کی غماز ہے۔

تمکین سے یہ غلط فہمی نہ ابھرنا چاہیئے، کہ جو انبیاء یا اولیاء مقام تمکین پر فائز ہوتے ہیں ان کے لئے مزید ارتقاء کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ لوگ جہاں تک کسبِ اکتساب سے انوار و حقائق کو پالینے کا تعلق ہے اپنے احوال پر مطمئن ہوتے ہیں۔ اور مشاہدہ و فیضان کی تحیر زائیاں ان کے وقار و تمکین میں تغیر نہیں کر پاتیں۔ مگر مقدرات الٰہی اور توجہاتِ ذات کی زنگارنگی کے آگے بند کس نے باندھا ہے۔ اس کی رحمتیں ان حضرات کو کب ایک ہی مقام و منزل میں محدود و محصور رہنے دیتی ہیں۔ یہ اس کی بخشش و کرم بے پایاں سے اس مقام سے بھی آگے بڑھتے رہے ہیں۔ اور بڑھتے رہتے ہیں۔ اس صورت میں یہ صرف تلوین ہی سے متصف نہیں ہوتے، بلکہ ملون بھی ہوتے ہیں ـــــ یعنی دوسروں کو بھی اس مقام پر پہنچانے کی ہمّت رکھتے ہیں۔

قرب و بُعد

صوفیاء کی یہ مشہور اصطلاع ہے۔ قرب سے ان کی مراد یہ ہے۔ کہ ایک شخص کس حد تک اللہ تعالیٰ کے حدود اطاعت کے قریب ہوا ہے۔ اور کس حد تک اس نے عبادات میں دوام اطاعت کو اپنایا

ہے۔ اسی طرح بعد ان کے نزدیک اللہ تعالےٰ کے احکام و اوامر کی عدم اطاعت کے مترادف ہے۔ جو قدرتاً عدم توفیق اور عدم تحقیق پر منتج ہوتا ہے۔

قرب کا یہ مطلب بھی ہے۔ کہ کوئی شخص ایمان و تصدیق کی وادیوں میں قدم دھرے اور اس کے بعد اللہ تعالےٰ کا احسان و لطف اس کو قریب تر کر دے۔

قربِ الٰہی کے بارہ میں دو چیزیں جاننے کی ہیں۔ ایک یہ کہ جب تک تعلق بُعد اور دوری اختیار نہ کی جائے گی۔ اس کا قرب حاصل نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ قرب سے مراد تدانی ذات یا قربِ ذات نہیں ہے بلکہ قربِ الطاف و تجلیات یا لطف احسان کی بوقلموں صورتیں ہیں۔ کیونکہ اس کی ذاتِ گرامی غیر محدود ہے۔ یعنی حدود و مقدار سے ناآشنا، منزہ اور بلند ہے۔ لہٰذا قرب ان معنوں میں قطعی ممکن نہیں کہ کوئی شخص عبادت و زہد یا محبّت و عشق کی فراوانیوں سے اس کی ذاتِ گرامی سے جا ملے۔ جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ ہے کہ جس نسبت سے کوئی عارف اطاعت و بندگی میں بڑھے گا اور ترقی کرے گا۔ اسی نسبت سے اس کی عنائتیں، اس کا لطفِ بے پایاں اور اس کے فیوضِ رحمت اس کو اپنے آغوش میں لے جائیں گے۔

شریعت و حقیقت بعض لوگ از راہِ جہالت شریعت و حقیقت کو دو متضاد چیزیں سمجھتے ہیں جن کے تقاضے اور مسائل اس طرح باہم متصادم ہیں کہ ایک اگر عمل و جد و جہد کی طالب ہے تو دوسری یکسر تعطل و اتحاد کی۔ حالانکہ خود صوفیاء کی اصطلاح میں ان میں قطعی تضاد پایا نہیں جاتا۔ ان کے نزدیک یہ ایک ہی شئے کے دو پہلو یا دو پرتو ہیں۔ چنانچہ یہ شریعت تو التزام عبودیت کو کہتے ہیں۔ اور حقیقت ان کے ہاں مشاہدہ ربوبیت سے تعبیر ہے۔ ان میں ربط و تعلق کی یہ صورت ہے کہ شریعت کے ساتھ ساتھ اگر مشاہدہ ربوبیت

کا عمل جاری نہیں ہے۔ تو اس کے معنی صوفیاء کی رائے میں ایسے جسد کے ہیں جس میں روح نہیں ہے۔ اور ایسے ڈھانچے کے ہیں۔ جو زندگی کی ادنیٰ رمق سے بھی محروم ہے۔ بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہئے یہ زندگی کا ایسا طریق و اسلوب ہے۔ جو روحانی ثمرات و نتائج سے یکسر عاری ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر حقیقت، شریعت سے بے نیاز ہے۔ اور فقہی سانچوں کو قبول نہیں کرتی۔ تو اس کی برکات و انوار حاصل ہونے والی نہیں تو یہ زندگی کا ایسا انداز ہے۔ جس کی تفصیلات، جس کا نقشہ اور رنگ ڈھنگ غیر متعین ہے۔

ایک بزرگ نے ان دونوں کے فرق کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:۔

الشریعۃ جاءت بتکلیف الخلق والحقیقۃ انباء عن تصریف الحق۔	شریعت تو مخلوق کو تکلیفات کا پابند بنانے کے لئے ہے۔ اور حقیقت یہ بتاتی ہے کہ اس پابندی کے صلہ میں حق تعالیٰ نے کن تصرفات سے بندے کو نوازا ہے۔
* * *	
الشریعۃ ان تعبدہٗ، والحقیقۃ ان تشہدہٗ۔	شریعت یہ ہے کہ تو اس کی عبادت کرے اور حقیقت یہ ہے کہ تو اس کے جمال جہاں آرا سے لطف اندوز ہو

حقیقت کا ایک مقام ایسا بھی ہے، جہاں یہ بھی شریعت کا رنگ قبول کر لیتی ہے۔ یعنی اس کے تقاضوں کے سامنے بھی اسی طرح سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے، جیسے شریعت کے اوامر و نواہی کے سامنے۔

خواطر

کبھی کبھی ایک صوفی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے قلب پر کچھ خواطر کا القاء ہو رہا ہے۔ جس میں باقاعدہ تخاطب ہے۔ اور بات چیت کا سا انداز ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ القاءِ حق۔ القاءِ ملک اور القاءِ نفس و شیطان۔ یعنی کبھی کبھی حق تعالیٰ اپنے بندوں کو شرفِ تخاطب بخشتے ہیں۔ کبھی کبھی ملائکہ

ان کے قلب و ضمیر کو متنفیر کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نفس و شیطان دھوکہ دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ صوفی کو اس کے جادۂ مستقیم سے منحرف کر دے۔ ان تینوں قسموں کے الگ الگ نام ہیں۔ اگر القاء اللہ کی طرف سے ہے۔ تو خاطر ہے۔ اگر ملائکہ کی توجہات کا نتیجہ ہے تو الہام ہے۔ اور اگر نفس کی شعبدہ طرازی ہے تو اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں وسواس یا وسوسہ کہا جائے گا۔ ان تینوں میں کیا فرق ہے؟ اور کس طرح القاء رحمانی کو القاء شیطانی سے ممیز کیا جا سکتا ہے، اس کے لئے صوفیاء نے کچھ پیمانے مقرر کئے ہیں۔

سب سے مقدم کسوٹی یا پیمانہ شریعت ہے۔ اگر القاء ایسا ہے کہ کتاب و سنت کے تقاضوں سے ٹکراتا ہے تو بلا شبہ یہ وسوسہ شیطان ہے۔ چنانچہ صوفیاء کا کہنا ہے:۔

کل خاطر لا یشھد لہ ظاھر فھو باطل۔	ہر القاء جس کی تائید ظاہر سے نہ ہو سکے باطل ہے۔

دوسری کسوٹی یہ ہے کہ افکار کے مزاج و حقیقت پر غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس کا منشاء کیا ہے؟ اگر منشاء نیک ہے اور اس میں بہر حال کسی نیکی ہی کی طرف اُبھارا یا مائل کیا گیا ہے۔ تو یہ الہام ہے۔ لیکن اگر اس کا مقصد اتباع شہوات ہے۔ یا شریعت کی کسی پابندی اور قید سے مخلصی یا آزادی حاصل کرنا مقصود ہے۔ تو اس کے وسوسہ شیطانی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

تیسرا پیمانہ کسی شخص کا اندازِ زیست ہے۔ سالک کو دیکھنا چاہئے کہ کہیں وہ اکلِ حرام کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے؟ کیونکہ اکلِ حرام اور الہام کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

الہام و وسوسہ میں فرق قائم کرنے کا ایک اور باریک معیار یہ ہے کہ

دوام وعدم دوام کے نقطۂ نظر سے اس پر غور کیا جائے۔ اگر ایک بات بار بار دل میں ڈالی جا رہی ہے اور باوجود قلب و ضمیر کی مخالفت کے ڈالی جا رہی ہے۔ تو یہ الہام ہے لیکن اگر آپ کی ادنیٰ مخالفت سے القاء کی یہ صورت ختم ہو جاتی ہے۔ اور دوبارہ قلب و ضمیر کو مخاطب نہیں کیا جاتا، تو یہ شیطانی وسوسہ اور ترغیب ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ صحیح اور حق بات تو تکرار و اعادہ کی متقاضی ہے۔ مگر شیطانی وسوسہ کے لئے تکرار و اعادہ ضروری نہیں۔ کیونکہ شیطان کی اصل دلچسپی یہ نہیں کہ وہ کسی خاص لغزش اور گناہ کے لئے اکسائے، اور اس پر اصرار کرے بلکہ اس کی دلچسپی کا مدار و محور ہر گناہ اور معصیت ہے۔ یعنی وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ صوفی کسی طرح مجاہدہ و ریاضت سے دستکش ہو۔ کسی بہانے سے ہو۔ گویا گناہ و معصیت کی کوئی متعین اور خاص صورت اس کے سامنے نہیں۔

علم الیقین۔ عین الیقین اور حق الیقین

علم کے یہ تینوں درجے قرآن سے ماخوذ ہیں :۔

کلا لو تعلمون علم الیقین (التکاثر ۵)	اگر تم علم الیقین رکھتے تو غفلت نہ برتتے
ثم لترونہا عین الیقین (التکاثر ۷)	پھر تم اس کو ایسا دیکھو گے کہ علم الیقین حاصل ہو گا
وانہ لحق الیقین (حاقہ ۵۱)	اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ بات حق الیقین یعنی غایت درجہ یقین کی حامل ہے۔

علم الیقین تو وہ ہے جو ایسے دلائل و براہین سے حاصل ہو، جن کا تعلق ہر شخص کی عمومی سمجھ بوجھ (Common Sense) سے ہے۔ عین الیقین اس مرتبۂ وثوق و اعتماد کا نام ہے جو منطقی دلائل سے متعلق ہو۔ اور حق الیقین معرفت و علم کے اس مقام بلند سے تعبیر ہے۔ جو براہِ راست مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔

مشاہدہ یا شاہد لیکن خود یہ مشاہدہ کیا ہے؟ صوفیاء کے ہاں یہ لفظ شاہد سے زیادہ مستعمل اور رائج ہے۔ اس کے معنی غلبہ واستیلائے خیال کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو خیال قلب وضمیر پر زیادہ حاوی ہوگا اس کو شاہد کہیں گے۔ چنانچہ اگر کسی کے دل پر علم کا قبضہ ہوگا، تو کہیں گے یہ علم کے مشاہدہ میں مصروف ہے۔ اور اگر اس پر وجود کے اسرار کا استیلاء ہے تو کہیں گے یہ مشاہدہ وجود میں منہمک ہے۔ اس اصطلاح کی روشنی میں مشاہدہ حق کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ صوفی کے قلب وذہن پر اللہ کا ذکر اور اس کا جمال جہاں آرا اور اس کی تجلّیاتِ قرب کا غلبہ ہے۔

نفس و روح از روئے لغت تو نفس کے معنی وجودِ شئی کے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً اس سے مراد اخلاقِ ذمیمہ اور برائیاں ہیں۔ اخلاقِ ذمیمہ سے مقصود نفس کی وہ کیفیتیں ہیں جو فطری اور خلقی ہیں۔ جیسے بخل، کبر اور حسد وغیرہ۔ اور برائیوں سے مراد وہ منہیات ہیں، جن سے شریعت نے روکا ہے مثلاً غیبت، جھوٹ اور دیگر فواحش۔ یہ دونوں قسم کے عیوب عبادت ومجاہدہ سے دور ہوسکتے ہیں۔ نفس سے مراد ایک ایسا لطیف وجود بھی ہوسکتا ہے جو اعمالِ ذمیمہ کا مورد و مصدر ہو۔ یعنیہ جس طرح کان سمع کا مرکز ہے۔ ناک سے سونگھنے کا کام لیا جاتا ہے۔ زبان ذائقہ کو محسوس کرتی ہے۔ اور آنکھ دیکھتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح نفس جذباتِ رذیلہ کا روحانی اور لطیف محلِ اتصاف ہے۔ نفس کی یہ تعبیر قرآن ہی سے ماخوذ ہے :-

وان النفس لامارۃ بالسوء (یوسف ۵۴) اور نفس برائیوں پر آمادہ کرنے والا ہے۔

روح کے بھی نفس کی طرح دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ تمام نیکیاں اور حسنات اور اچھے خیالات وافکار روح ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ حیات وزندگی کا محل و

سرچشمہ ہے۔ اوّل الذکر معنی کا متعین ماخذ معلوم نہیں ہوسکا۔ ممکن ہے اس کا تعلق استدلال سے ہو۔ اور اس استدلال کی بنیاد یہ حقیقت ہو کہ قرآن نے کہیں بھی کسی بُرائی کی روح کی جانب منسوب نہیں کیا۔ روح کے بارہ میں یہ نکتہ خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ کہ صوفیاء اس کو زندگی کے اس تصوّر سے بالکل الگ ایک مستقل حقیقت قرار دیتے ہیں، جس کا تعلق جسم کی ساخت و امتزاج سے ہے۔ یا جس کو ذہن کے تلافیف یا ابھاروں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک مستقل بالذات لطیفہ ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے انسان کے اس کالبد خاکی میں ودیعت کر رکھا ہے۔ مگر یہ نقطہ نظر بہت پُرانا ہے۔ چنانچہ سبھی مذاہب اس کے قائل ہیں۔ زیادہ دلچسپ اور ترقی پسندانہ (PROGRESSIVE) خیال عارف کشمیری نے پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ روح کے معنی نفسِ حیات کے بھی ہیں۔ یعنی روح کسی لطیف انا (EGO) کا نام نہیں۔ بلکہ ایک طرح کی لطیف قوت سے تعبیر ہے۔ کتنے پتے کی بات کہی ہے۔

فنا و بقاء

صوفیا جب فناء و بقاء کا استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ انسانی انا یا تشخص کی بالکلیہ نفی کر دی جائے۔ نہ بقاء کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ نفس کی تمام خصوصیات کو بعینہٖ باقی رہنے دیا جائے۔ بلکہ ان کا منشاء صرف یہ ہوتا ہے کہ اوصاف ذمیمہ سے مخلصی حاصل کی جائے۔ اور محاسن اوصاف سے روح کو بہرہ مند کیا جائے۔ یہ دونوں اوصاف باہم متعاقب اور لازم و ملزوم ہیں۔ جب رذائل اور بُرائیوں کی نفی ہوگی اوصاف حمیدہ آپ سے آپ پیدا ہوں گے۔ اسی طرح جب کوئی شخص اوصافِ حمیدہ سے متصف ہوگا۔ تو رذائل کے دل بادل خود بخود چھٹنا شروع ہو جائیں گے۔

اوصافِ حمیدہ کی تین قسمیں ہیں۔ حُسنِ افعال، حُسنِ اخلاق اور حُسنِ احوال۔ حُسنِ افعال کا تعلق انسان کے اپنے تصرفات اختیاریہ سے ہے۔ اخلاقی رجحانات بڑی حد تک جبلت کے تابع ہیں۔ تاہم کوشش اور سعی سے ان کے رُخ کو بدلا جا سکتا ہے۔ اور ان کے جبر کو اختیار کے حدود میں لایا جا سکتا ہے۔ احوال کا رتبہ افعال و اخلاق کے تزکیہ کے بہرحال بعد کا ہے۔ ان میں عملی ترتیب یوں ہوگی۔ جب کوئی شخص اپنے افعال کو کتاب و سنت کے سانچوں میں ڈھالیگا تو اس سے حُسنِ اخلاق کا وصف پیدا ہوگا۔ اور حُسنِ اخلاق پیش خیمہ ہوگا حُسنِ احوال کا۔

اس وضاحت کو نظر و فکر کے سامنے رکھئے۔ اس سے نفی و بقاء کا عُقدہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ اور ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ کسی مرتبے میں بھی نفی محض نفی اور مجرد سلب نہیں۔ بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو ایک بقاء، ایک اثبات، اور وجود کی جلوہ گری بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً جس نے شہوات اور خواہشات نفس کی نفی کی، اور ان سے دستکش ہُوا، اس نے بقاء عبودیت اور اخلاص کی دولت پائی۔ جس نے اخلاق کی زلفِ پریشاں کو سنوارا۔ اور بخل، حسد، بغض، غصّہ اور پندار ایسے رذائل سے گلو خلاصی حاصل کی۔ اس نے اس کے صلہ میں سخاوت، آدمیت اور تواضع کی نعمتوں سے اپنا دامن بھرا۔ اسی طرح جس شخص نے اپنے انا اور گردوپیش کی متاعِ حقیر سے روگردانی اختیار کی۔ وہ گویا دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہُوا۔ تاہم قیام بہ حق کے مرتبہ پر فائز ہُوا۔

فناء و بقاء کی اس بحث میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انا اور مخلوق کے یہ معنی نہیں کہ انا سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ یا دنیا فناء و ہلاکت کا شکار ہو گئی ہے۔ نہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ سالک ان کے تقاضوں کو اہمیت

نہیں دیتا۔ اور اس کی تمام تر توجہات ذہنی و فکری کا مرکز و مدار ذاتِ حق اور اس کا جمال جہاں آراء ہے۔ اور وہ اسی میں مشغول و منہمک ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ اس شخص کی سی ہے جس کو پہلی دفعہ دربار شاہی میں حاضری کا موقع ملا ہو۔ اس کے نزدیک اس مقام کی جلالتِ قدر، ہیبت اور تقاضے اس درجہ غالب اور محویّت آفریں ہوتے ہیں کہ اردگرد کا ماحول اس کی عنانِ توجہ کو کسی طرح بھی اپنی طرف موڑ نہیں سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی نظریں براہِ راست بادشاہ پر مرکوز رہتی ہیں۔ اور ادھر اُدھر کی تفصیلات پر نہیں پڑتیں۔ اس لئے اگر اس سے پوچھا جائے کہ دربار میں کون کون وزیر و امیر موجود تھا۔ اور دائیں بائیں کن لوگوں کی کرسیاں تھیں۔ اور ان پر کون کون لوگ جلوہ افروز تھے۔ تو وہ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دے پائے گا۔ ٹھیک یہی حال اُس شخص کا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ایوانِ جلال میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں کا حُسن، یہاں کی جاذبیتیں، اور یہاں کے لطافت جمال و جلال اور ہیبت و خوف اس کو اس درجہ متاثر کرتے ہیں اور اس پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ اسے دنیا و مافیہا کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔ یہی نہیں وہ خود اپنے انا کے احساس سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔

فناء و بقاء کے تقاضے انسانی سیرت کی تعمیر میں کس درجہ اہمیت رکھتے ہیں، اور ان سے طبیعتِ انسانی کے کون کون سے مخفی جوہر کھلتے ہیں اس کی تفصیلات آئندہ باب میں ملاحظہ فرمائیے!

تصوّف اور اسلام میں اس کا صحیح مقام و موقف

پچھلی بحثوں سے قارئین ایک حد تک تصوّف سے متعارف ہو چکے ہونگے۔ مگر اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور تعلیماتِ اسلامی میں اس کا کیا درجہ ہے؟ یہ بحث ہنوز تشنہ ہے۔ مشائخ صوفیاء کے حالات و سیر سے اور ان کی متداول اصطلاحات سے مسئلہ کا صرف ایک ہی رُخ نظر و بصر کے سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جانبازوں کا یہ گروہ اپنے خیالات، و افکار کے لحاظ سے اونچا ہے۔ سیرت کے لحاظ سے بلند ہے اور اس کا زندگی کے بارہ میں خاص زاویۂ نظر ہے۔ متعیّن اصطلاحیں ہیں۔ اور یہ کہ ان کی تگ و دو اور توجہات کا مرکزی نقطہ اللہ تعالےٰ کی ذاتِ گرامی ہے۔

لیکن یہ زاویۂ نظر کیا ہے، ان کے افکار و خیالات کس درجہ منطقی قدر و قیمت کے حامل ہیں؟ اور وہ کون بُنیادی اور اساسی رجحانات ہیں جو ان کو دوسروں سے ممتاز ٹھہراتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب دینا ابھی باقی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم متعلقہ تفصیلات سے تعرض کریں۔ پہلے تصوّف کی حقیقت پر غور کر لیجئے۔ اور مستشرقین کی ان تعریفات پر سرسری نظر ڈالتے چلئے۔ جو اُنھوں نے اس سلسلہ میں بیان کی ہیں۔ ڈاکٹر روفوس اپنی مشہور کتاب مطالعہ تصوّف میں کہتے ہیں:۔

" تصوّف کا اطلاق مذہب کی ایسی نوعیّت پر ہوتا ہے جس میں زیادہ زور اس تعلق کے براہِ راست شعور پر دیا جاتا ہے، جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان استوار ہے"۔

دوسرے لفظوں میں تصوّف کا موضوع اللہ تعالیٰ کا بلا واسطہ عرفان ہے

ایک صاحب اسے اللہ تعالیٰ کی جستجو وطلب سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایک صاحب نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے۔ تصوّف صرف جستجو اور طلب ہی کا نام نہیں۔ اس میں وہ خاص نظریہ حیات بھی داخل ہے جو جستجو اور طلب کے لئے منزل اور راستے کی تعیین کرتا ہے۔

کچھ حضرات تصوّف کو فلسفہ کا ردِّ عمل ٹھہراتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے جب عقل وخرد کی خشکی سے حرارتِ عمل پیدا نہیں ہوتی۔ ایمان میں زندگی اور داعیاتِ حیات نہیں اُبھرتے، تو اس کی تلافی کے لئے تصوّف میدان میں اُترتا ہے۔

اس رجحان کو تیرھویں صدی کے ایک یہودی متصوف ربی برگاس (Ruby Burgas) ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

"فلسفیوں کی نکتہ طرازیاں جس مقام پر ختم ہوتی ہیں۔ وہاں سے تصوّف کا آغاز ہوتا ہے"

بعض کا کہنا ہے، تصوف دراصل فلسفہ کا اس درجہ حریف نہیں جس درجہ روایتی مذہب کا ہے۔ جب اس میں جمود آجاتا ہے۔ جب عقائد بے جان ہوجاتے ہیں۔ جب اخلاقیات میں روح نہیں رہتی۔ اور عبادات وشعائر ٹھس ہوجاتے ہیں۔ تب تصوّف ایک مصلح عنصر کی حیثیت میں نمودار ہوتا ہے۔ اور ان سب میں حرکت واہتزاز کی برقی رو دوڑا دیتا ہے۔

یہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اور بلاشبہ ان سے تصوّف کے سمجھنے میں ایک گونہ مدد بھی ملتی ہے۔ مگر ان میں کوئی تعریف بھی جامع ومانع نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس میں براہِ راست تعلق باللہ پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ کوچۂ یار کی جستجو اور طلب سے تعبیر ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ فلسفہ کا ردِّ عمل ہے۔ بلکہ خود اس کی حیثیت ایک قسم کے فلسفہ کی ہے۔ جو اپنے آغوش میں

فلسفہ کی باریکی اور گہرائی تو رکھتا ہے۔ مگر اس کی خشکی اور خنکی نہیں۔ اسی طرح اس حقیقت کے مان لینے میں بھی قطعی تامل نہیں ہونا چاہئے۔ کہ اس کا تعلق فکر و عمل کے ایک خاص مرحلہ سے ہے۔ اس کی ضرورت اس وقت محسوس کی جاتی ہے۔ جب فلسفیانہ موشگافیاں، مدرسانہ بحثیں اور مقننین کی ظاہر پرستی مذہب ایسی جیتی جاگتی شئے کو مُردہ اور غیر متحرک (DAED) ادارہ کی صورت میں بدل دیتی ہیں لیکن اس وضاحت کے باوجود ہمیں کہنے دیجئے کہ اس سے تصویر کے تمام رُخ واضح نہیں ہو پاتے اور بالخصوص اسلامی تصوف پر تو ان تعریفات سے قطعی پوری پوری روشنی نہیں پڑتی۔ جو اپنے مزاج اور تاریخ کے اعتبار سے مستقل بالذات شے ہے۔ اس باب میں قصور ارباب فکر و دانش یا اہل علم کا نہیں۔ بلکہ اصل اشکال یہ ہے کہ تصوف اور اسلامی تصوف کی کوئی قطعی تعریف ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ کسی ایک ہی جچے تُلے اور متعین رجحان کا نام نہیں۔ بلکہ کئی رجحانات کا مجموعہ ہے۔ علاوہ ازیں اس میں مزید اُلجھن یہ ہے کہ یہ رجحانات بھی ایسے ہیں کہ ان کی دینی و عقلی قدر و قیمت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان حالات میں کوئی تعریف بھی ایسی نہیں ہو سکتی جو ایسی جامع، ایسی قطعی اور ہمہ گیر ہو کہ ان تمام رجحانات صحت کو گھیرے اور ان میں صحت و استواری کے مدارج کی تشریح و تعیین میں بھی مدد دے۔ لہذا ہماری رائے میں زیادہ محفوظ اور زیادہ مفید راہ یہ ہے کہ ہم تعریف کے چکر میں پڑنے کے بجائے تجزیہ سے کام لیں۔ یعنی ان تمام رجحانات کا الگ الگ جائزہ لیں جن سے اسلامی تصوف ترتیب پاتا ہے۔ اور اُن بنیادوں کی نشان دہی کریں۔ جن پر تصوف کے دلکشا محل کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس سے دو فائدے ہونگے۔ ایک تو تصوف کی تعیین و وضاحت کا مرحلہ آسانی سے طے ہو جائیگا۔ دوسرے ان رجحانات کے بارہ میں ہم یہ معلوم کر سکیں گے کہ اسلام نے کس حد تک ان کی تائید کی ہے۔ اور کس حد تک ان عناصر کی مخالفت کی ہے۔ نیز یہ کہ ان کی

عملی قدر و قیمت کا عالم کیا ہے؟

یہ عناصر کل چھ ہیں:۔

۱۔ انفرادیت

۲۔ تخصیص

۳۔ اخلاص

۴۔ معرفت یا نظریہ علم

۵۔ ترجیح آخرت

۶۔ ترجیح معانی

اب ان کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

انفرادیت انفرادیت سے ہماری مراد انفراد باللہ یا خلوت ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ راہ رو راہِ معرفت میں اپنی تمام تر توجہات کو اللہ تعالےٰ پر مرکوز کردے۔ ہر ہر لمحہ اسی کی یاد اور ذکر میں بسر ہو۔ ہر ہر فرصت اسی کی محبت و شوق سے معمور ہو۔ اور ذہن و قلب کی تمام تر توانائیاں اسی کو پانے، اسی کو چاہنے اور اسی کی تجلیات گوناگوں سے بہرہ مند ہونے کے لئے وقف کردی جائیں۔ ظاہر ہے اس آرزو کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان مکروہاتِ دنیا سے الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ نہ کرلے۔ اور ایسا گوشہ عافیت نہ ڈھونڈھ لے جہاں وہ اپنے کو بالکل یکسو محسوس کرے۔ جہاں کوئی چیز ذکر و فکر اور مجاہدہ و مراقبہ میں خلل انداز ہونے والی نہ ہو۔ تصوف کا یہ وہ مشترک عنصر (Common Feeling) ہے۔ جو تمام متصوفانہ مذاہب میں یکساں اہمیت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں اسی چیز نے تارک الدنیا سادھوؤں کی صورت اختیار کی۔ یہودیوں میں اسی عزلت خواہانہ

تصور نے احبار اور اہلِ قبالہ کو جنم دیا۔ اور یہی وہ شے تھی جس نے عیسائی دنیا میں رہبانیت کا روپ دھارا۔ سوال یہ ہے کہ کیا خلوت وانزوا کی یہ ذہنیت اسلامی ہے؟ کیا اس سے اسلام کے تمدنی تقاضوں کو گزند تو نہیں پہنچا۔ اور سب سے آخر میں آیا یہ نفسیاتی طور پر ممکن بھی ہے۔ کہ کوئی شخص دنیا کی دلچسپیوں سے علیحدہ رہ کر صحت مند ذہنی و فکری زندگی گذار بھی سکے۔

آئیے! ہم ان نکات پر علی الترتیب غور کریں:۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے رہبانیت کی مذمت کی ہے۔ اور اسے صاف اور کھلے انداز میں بدعت قرار دیا ہے۔ اور اس حقیقت کو مان لینے میں بھی قطعی پس و پیش یا تامل کی گنجائش نہیں ہے۔ کہ اسلام ہی وہ پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے دنیا کے چیلنج کو جرأت سے قبول کرنے کی دعوت دی ہے۔ یہی نہیں اس کے لئے قوانین، عبادات، فرائض اور حقوق انسان کا ایک نہایت ہی عمدہ اور متوازن نقشہ بھی پیش کیا ہے جو حد درجہ معقول ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ عمل بھی ہے۔ اور اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جو اغیار کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک صاحب نے بزعم خود اسلام کو اسی جرم کی پاداش میں مذاہب کی صف ہی سے نکال باہر کیا۔ کہ اس کا مزاج، اس کی ساخت اور کائناتِ انسانی کے بارہ میں اس کا نقطۂ نظر ایسی چیزیں ہیں جو روحانیت سے قطعی میل نہیں کھاتیں۔ ان کے خیال میں اسلام مذہبی شکل و صورت میں غیر وطنیت (SECOLARISM) کا حامی ہے۔ ہم انھیں اس سلسلہ میں معذور سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک چونکہ مذہب کو صرف روحانی اقدار پر مبنی ہونا چاہیئے تھا۔ اور ظاہر ہے اسلام کی جامعیت ہرگز اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی لہٰذا محض اس بنا پر یہ مجبور ہوئے کہ اس کو مذاہب کی صف سے نکال دیں۔

اسلام کی جامعیت کے معنی یہ نہیں کہ اس میں دین و دنیا کی کوئی تفریق موجود نہیں۔ اس میں جسدانی اور روحانی اقدار میں ثنویت تسلیم نہیں کی جاتی۔ اور یہ نہیں مانا جاتا کہ تہذیب و تمدّن کے صحت مند تقاضے اس عالم آب و گِل کی رونق اور گہما گہمی، علوم و فنون کا ارتقاء یا انسانی عزم و حوصلہ کی بلندیاں روحانیت کے منافی ہیں:

سوال صرف یہ ہے کہ کاروبارِ دنیا میں شرکت کا وہ اعلیٰ ترین (Ideal) طریق کیا ہے۔ جس سے معاشرہ کو اس کی مضرتوں سے بچایا جا سکے۔ جس میں رونق اور ہنگامہ ہائے طرب و انبساط تو ہوں۔ مگر روح مُردہ نہ ہونے پائے۔ جس میں ارتقاء و تقدم کے تقاضے تو پائے جائیں، مگر دل زنگ خوردہ نہ ہونے پائے۔ اور قلب و ضمیر کی وہ لطافتیں قائم رہیں، جو کسی زندہ تمدّن اور پاکیزہ طرزِ حیات کا سرمایۂ ناز ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اصل اشکال یہ نہیں کہ دُنیا کی نعمتوں سے بہرہ مندی جائز ہے یا نہیں۔ اسے ناپاک اور نجس سمجھ کر چھوڑ دینا چاہیے۔ یا پاکیزہ اور مقصود سمجھ کر حرزِ جاں بنانا زیادہ انسب ہے؟ اصل اشکال یہ ہے کہ دنیا میں ایک وقت خاص تک چونکہ بہرحال رہنا ہے۔ اور اس لئے سوچا جائے کہ وہ اسلوبِ حیات کون ہے جو زیادہ صحیح اور زیادہ برکتوں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہو۔

یہ سوال اس لئے حل طلب ہے کہ اس گلستانِ حیات میں جہاں پھول ہیں وہاں کانٹوں کی بھی کمی نہیں، جہاں رونق اور گہما گہمی ہے وہاں ویرانے اور ہولناک گڑھے بھی ہیں۔ جہاں علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کی استواریاں ہیں، وہاں بے راہ روی اور انحراف کی مثالیں بھی کم نہیں۔ ان حالات میں بے خطر دنیائے دوں کے سمندر میں کود پڑنا چاہیئے۔ اور بلا محابہ بغیر کسی تربیت

اخلاقی اور تحفظ کے اپنے کو اس گرداب میں پھینک دینا چاہیئے۔ یا اس طریق سے انسان دنیائے رنگ و بُو کے اس چیلنج کو قبول کرے کہ اس کا دامن طلب صرف پھول ہی چُنے، کانٹوں سے نہ اُلجھے۔ اور برکات ہی سمیٹے، نحوستیں نہیں۔ یعنی اس کا دل و دماغ علوم و فنون سے صرف روشنی ہی حاصل کرے۔ مادیت کی تاریکیوں سے اسے داغدار نہ کرے۔ اسی طرح اس کے حصّہ میں تہذیب و تمدّن کی استواریاں ہی آئیں۔ فسق و فجور کے داعیات سے سیرت و کردار کی سطح کو پست نہ ہونے دے۔

یہ ہے اصل سوال اور اصل اشکال۔ بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہنا چاہیئے کہ یہی وہ موڑ ہے جہاں رہبانیت اور اسلام کی راہیں جُدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ رہبانیت کی بنیاد عیسائیت کے اس اذعانی عقیدہ (DOGMA) پر ہے کہ دُنیا ناپاک اور نجس ہے۔ اور ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کو منہ لگایا جائے۔ یا اس کے بارہ میں ادنےٰ دلچسپی کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اسلام کا اس کے برعکس موقف ہے۔ کہ دنیا ناپاک اور نجس نہیں۔ رہنے کے قابل ہے۔ حصّہ لینے اور شرکت کے قابل ہے۔ بلکہ اس لائق ہے کہ اس کی مسرتوں میں اضافہ کیا جائے۔ اس کے ممکنات کو ترقی دی جائے۔ اور اس کے قافلہ ہائے ارتقاء و تقدم کو تیز تر کر دیا جائے۔ تحفّظ، احتیاط اور تربیت البتہ شرط ہے۔ یہی تحفّظ، احتیاط اور تربیت وہ عناصر ہیں جنھوں نے رل مل کر شریعت و قانون، یا فقہ اسلامی کی شکل اختیار کی ہے۔

رہبانیت سے اسلام کو جُدا کرنے والی دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام دنیا اور دنیوی خواہشات میں اُصولی فرق قائم کرتا ہے۔ دنیا کا مفہوم اس کے نزدیک یہ کارگاہِ حیات ہے۔ اور اس کارگاہِ حیات کو واسطہ اور ذریعہ کے

بجائے نصب العین قرار دینا اور اس کی ادنیٰ نعمتوں پر زندگی کی اعلیٰ اقدار کو قربان کر دینا خواہشاتِ دنیا کے مترادف ہے۔ اسلام یا اسلامی تصوف اس کارگاہِ حیات سے تو پوری پوری دلچسپی لیتا ہے۔ مگر اس کو اس کے درجہ سے بڑھا کر نصب العین کے درجہ تک پہنچا دینے کا حامی نہیں۔

یہ مسئلہ کا ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ تمام سامی مذاہب میں کم از کم بالعموم اور اسلام میں بالخصوص اللہ تعالیٰ کا تصور یہ ہے کہ وہ محبوب ترین ہستی ہے۔ عزیز ترین نصب العین ہے۔ اور ان تمام تر نزاہتوں کے باوجود اس لائق ہے کہ اس کو مانے اور اس کے اخلاق سے متجلی ہونے کے لئے مجاہدہ وریاضت کی ہر ہر صورت آزمائی جائے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا یہ تصوّر ہمارے ہاں موجود ہے۔ اور جب تک انسان کی تمدّنی جبلّت کے پہلو بہ پہلو انسان کے ضمیر و فطرت میں اسی اہمیت کا اور اسی قدر توانا، قوی تر یہ وجدان پایا جاتا ہے کہ اس ذاتِ گرامی کے ساتھ تعلقات عبودیت و محبت استوار کئے جائیں۔ اس وقت تک خلوت و انزوا، کی شرعی وعقلی ضرورت قائم رہے گی۔ اور مجاہدہ و مراقبہ کی وہ تمام شکلیں برقرار رہیں گی۔ جو اس مقصد کے لئے مفید ہوں۔ اس کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر غور فرمائیے کہ جب دنیا کا ادنیٰ نصب العین آپ کی تمام تر ذہنی و فکری قوتوں کو گھیر لیتا ہے۔ اور آپ کی توجہاتِ فکری کو ایک خاص مرکز پر اس طرح مرکوز کر دیتا ہے۔ کہ باقی دنیا کے جھمیلوں سے آپ بے نیاز اور غافل ہو جائیں۔ تو اللہ تعالےٰ کے عشق و محبت کے تقاضے کیا کچھ وسیع نہیں ہوں گے؟ اور کس درجہ آپ کے قلب و ذہن کی فراغتوں کا احاطہ نہیں کر پائیں گے۔

نصب العین کوئی ہو۔ بہر حال توجہ و التفات چاہتا ہے۔ یکسوئی اور فراغت چاہتا ہے بے شغل و غش جدوجہد اور سعی و کوشش چاہتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر

یہ کہ تڑپ اور جستجو چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ چیزیں خلوت و یکسوئی کے بغیر حاصل ہوسکتی ہیں؟ پھر اگر صوفیاء انہیں تقاضوں سے مجبور ہوکر خلوت کو پسند کرتے اور اپناتے ہیں۔ تو وہ اس نصب العین اور آرزو کی بلندی کے پیش نظر ان کو مطعون کیونکر ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن و حدیث میں اللہ کی محبت اور ذکر کے جو فضائل آئے ہیں۔ یا آنحضرت کی زندگی میں تعلق باللہ کی جو والہانہ مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ان کو اس بناء پر نظر انداز کرتے ہیں۔ کہ وہ سب معلوم اور مدون و متعیّن ہیں۔ اس طرح خود اسلامی نظام و عبادات میں خلوت و انزواء کے لطائف کی جو جھلک کبھی روزہ کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ کبھی نوافل کی صورت میں جلوہ آراء معلوم ہوتی ہے۔ کبھی اعتکاف کے رنگ میں پائی جاتی ہے۔ اور کبھی تہجد اور قیام اللیل کے انداز میں نظر آتی ہے اس کے بارہ میں بھی ہم وضاحت غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارا مقصود صرف اصول کی حد تک مسئلہ کی تشریح کرنا ہے۔ تفصیلات سے تعرض ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے۔

دوسری تنقیح یہ تھی کہ کیا خلوت گزینی اور عزلت و علیحدگی خلق کی صورت اسلام کے تمدنی و تہذیبی تقاضوں کے خلاف تو نہیں۔ اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ اگر پہلے نکتہ کی وضاحت کے دوران میں جن افکار کا ہم نے اظہار کیا وہ مستحضر ہیں اور قلب و ذہن نے پوری طرح اس کی روح کو سمجھ لینے اور پالینے میں کوتاہی نہیں کی، تو صورت مسئلہ نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے۔ کہ اسلام یا تصوف کا اشکال یہ نہیں کہ دنیا اور اس کے ممکنات ارتقاء کو قبول کیا جائے یا نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے سامنے جو حل طلب سوال ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کو اس کی خوبیوں کے ساتھ کیونکر حاصل

کیا جا سکتا ہے۔ نیز کس طرح اس کو عقبیٰ و آخرت کی حقیقی زندگی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ	اے پروردگار ہمیں دُنیا میں بھی خوبی سے
وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا	بہرہ مند کر اور آخرت میں بھی خوبی سے نواز
عذاب النار۔	اور دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھ۔

مزید وضاحت کی خاطر مندرجہ ذیل نکات ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہئیں :۔

۱۔ یہ کہ اصولاً اگرچہ تصوف کے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں۔ تاہم یہ دعوت تزکیہ اپنے مزاج اور ساخت کے اعتبار سے سب کے لئے یکساں قابل عمل نہیں۔ اس کے لئے خاص تعلیم، ذہن اور ظرف چاہیئے۔

۲۔ خلوت و عزلت گزینی کا مفہوم محققین کے نزدیک یہ ہے۔ کہ اس میں بعد مکانی ضروری نہیں یعنی یہ خلوت ضروری نہیں کہ مکانی ہو۔ بلکہ دنیا کی ہنگامہ آرائیوں میں شریک و سہیم رہنے کے باوجود بھی خلوت ممکن ہے۔ صحیح ترین پیرایۂ بیان میں یوں سمجھئے کہ اس سے مقصود ذہن و فکر کے انداز (ATTITUDE OF MIND) کی تبدیلی ہے۔ یا زندگی کے بارہ میں ایک خاص نقطۂ نظر کو اپنانا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ آپ چاہے کسی کام میں مصروف ہوں۔ اور کام کی کسی نوعیت میں مشغول ہوں۔ دل میں ہمیشہ اللہ تعالےٰ کے ذکر اور یاد کی شمع فروزاں رہے۔ اور یہ کوشش رہے۔ کہ ہمیں ہر ہر درجہ و مرتبہ کی برائیوں سے بچنا ہے۔ اور ہر ہر درجہ و مرتبہ کے حسنات کو اختیار کرنا ہے۔ ظاہر ہے اس غرض کے لئے جنگلوں اور ویرانوں میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ دنیا کی انہیں مشغولیتوں میں کچھ فرصتیں تلاش کرنے کی حاجت ہے۔ جن میں ذکر و فکر کے مجاہدات کو جاری رکھا جا سکے۔

اس مفہوم کو عارف قیشری نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :-

والعزلة فی الحقیقة اعتزال الخصال المذمومة فالتاثیر لتبدیل الصفات لا للتنائی عن الاوطان۔

اصل عزلت خصائل مذمومہ کو ترک کرنا ہے۔ یعنی عزلت بعد مکانی کا نام نہیں۔ تبدیل صفات سے تعبیر ہے

ابو علی دقاق کا کہنا ہے :-

البس مع الناس ما یلبسون وتناول مما یاکلون و انفرد عنهم بالسر۔

لوگ جو پہناوا اختیار کرتے ہیں وہی تم بھی اختیار کرو۔ کھانے پینے میں بھی امتیاز کی حاجت نہیں۔ امتیاز صرف قلب و اسرار کی تبدیلی ہے۔

اسی حقیقت میں اُنہوں نے ایک واقعہ کے ضمن میں بھی بیان فرمایا ہے۔
ایک صاحب بہرِ استفادہ ان کے پاس آئے۔ اور کہنے لگے۔ حضرت میں ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد آپ تک پہنچ پایا ہوں۔ آپ نے کہا :-

لیس هذا الحدیث من قطع المسافة و مقاساة الاسفار فارق نفسک بخطوة وقد حصل مقصودک۔

بھائی۔ استفادہ معرفت قطع مسافت اور سفر کی مشکلات سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کا تعلق محض قطع نفس سے ہے۔ چنانچہ نفس سے ایک قدم کی دوری اختیار کرو، معرفت آپ سے آپ حاصل ہو جائیگی۔

غرض یہ ہے کہ خلوت کا اعلیٰ مرتبہ بہر حال یہی ہے کہ انسان "کائن و بائن" رہے۔ یعنی بیک وقت اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات سے بھی تعلق رکھے، اور دل کے لطائف سے بھی بے گانہ نہ ہونے پائے۔

۲۔ وہ لوگ جو اس درجہ عالی ہمت نہ ہوں۔ کہ جلوت میں بھی خلوت آرائی کے لطف سے بہرہ مند رہیں۔ ان کے لئے بُعد مکانی کے اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ ان کی ذہنی سطح اتنی اونچی ہو کہ دینی علوم و فنون پوری

طرح سمجھ سکیں۔ اور عقائد و افکار کے معاملہ میں اس درجہ پختگی اور استواری حاصل ہو کہ نفس کی ابلہ فریبیوں کا اچھی طرح جائزہ لے سکیں۔ اور ان سے محترز او رمجتنب رہ سکیں۔ ہمارے نزدیک اس طرح کی خلوت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اصولِ صحت کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ یعنی ذکر و فکر یا مجاہدات کو صرف اسی حد تک جاری رکھا جائے۔ جس حد تک کہ ذہن و جسم کی شادابیاں اجازت دیں۔ یا جس حد تک کہ عبادت و مجاہدہ قلب و ذہن پر بار نہ ہوں۔

۴۔ خصوصیت سے قابلِ لحاظ بات خلوت کے سلسلہ میں یہ ہے۔ خلوت گزینی کی یہ صورت بھی عارضی ہونی چاہیئے۔ اور اس کی غرض و غایت صرف یہ ہونا چاہیئے۔ کہ سالک اپنے نفس کی خرابیوں کا نہایت یکسوئی اور غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لے سکے۔ اور اپنے کو اس طرح بدل سکے کہ جس وقت اس خلوت سے نکل کر جلوت میں آئے۔ اور لوگوں سے ملے جُلے۔ تو ان کے لئے اس کا وجود مفید و بابرکت ثابت ہو۔

اس سلسلہ کا آخری سوال یہ تھا کہ آیا یہ ممکن بھی ہے کہ خلوت گزینی نفسیاتی تسکین و طمانیت کے اسباب فراہم کر سکے۔ اور سالک کے لئے حقیقی دلجمعی و سکون کی دولت مہیا کر سکے؟ یہ سوال اس وجہ سے اُبھرتا ہے۔ کہ بقول ارسطو کے انسان حیوانِ اجتماعی ہے۔ جو بہرحال کسی نہ کسی معاشرہ اور ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی میں جیتا، بڑھتا یا تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اسی سے اس کے ذہنی و فکری صلاحیتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے یہ اخلاقی معیار اور سانچہ حاصل کرتا ہے۔ اور اسی معاشرہ و ماحول کی بدولت اس کو موقع ملتا ہے۔ کہ اپنی شخصیت کی بلندیوں اور صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر سکے۔ اور جس معاشرہ سے اس نے اب تک اتنا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس کو کچھ دے بھی سکے۔ یعنی اس کی تمدنی و تہذیبی سمتوں کو موڑ

سکے۔اس کے لئے صحت مند اخلاقی فضا پیدا کر سکے۔ اور اس کو نئے نئے افکار اور تصوّرات سے مالا مال کر سکے۔

ایسے اشخاص اگر گوشہ ہائے خلوت میں جا بیٹھیں گے تو ذکر و فکر کی مشغولیتیں کب تک ان کا جی بہلا سکیں گی۔ اور کب تک ان کی بے قرار طبیعت معاشرہ کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ تھلگ رہ سکے گی۔ کیا ان کا ذہن اس سے پریشان نہ ہو گا۔ اُن کا قلب توحش محسوس نہیں کرے گا۔ اور ان کا بھرپور اور پُر خروش انا معاشرہ میں لوٹ آنے کے لئے بے چین نہیں ہو جائے گا۔ اور یہی بے چینی بالآخر ان کے جذبہ خلوت میں مخل نہیں ہو گی۔

بلاشبہ یہ سوال اجتماعیات اور نفسیات کے لئے ٹیڑھا اور پریشان کن ہے۔ لیکن یہ انسانی شخصیّت کا ادھورا تجزیہ ہے۔ اور اس کی بنیاد اس غلط مفروضہ پر ہے کہ نفس کی تگ و تاز، اس کی دلچسپیاں، اور ترقی و بالیدگی کا تمام تر انحصار خارجی ماحول پر ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں نفس کے اندر بجائے خود ایک اقلیم افکار آباد ہے۔ ایک دنیائے تصوّرات ہنگامہ آرا ہے۔ اس کے باطن میں اپنے ہنگامے اور شورشیں ہیں۔ مقامات ہیں۔ منزلیں ہیں۔ حُسن ہے۔ دلآویزی اور دلبری کے انداز اور تیور ہیں۔ شرط یہ ہے کہ کوئی شخص بیرونی جاذبیتوں سے عنانِ توجّہ کو موڑ کر نفس کے اندر جھانک کر دیکھے، غور و تعمق کی خو ڈالے۔ اور اس بحرِ بیکراں میں ڈوب جانے کی لذت سے آشنا ہو۔ پھر دیکھئے کن کن لذّات سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اور کیا کیا لطائف اور گہر ہائے معانی ہاتھ آتے ہیں۔ اور اگر اس غور و خوض کا مقصد اللہ تعالےٰ کی ذات گرامی ہو۔ اور اس محبوب نصب العین کا حصول ہو جس کے جمال جہاں افروز کی ادنیٰ جھلک کا ظہور یہ گلستانِ حیات ہے۔ جس کو آپ خارجی و مادی دنیا سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو اندازہ کیجئے، یہی ذات اپنے عشاق اور دیوانوں

کے لئے دنیائے باطن میں کن کن دلچسپیوں کا سامان مہیا نہیں کر سکتی۔ اور انکے دل ویراں کے لئے آبادی و معموری کا کیا کیا اہتمام نہیں کر سکتی؟

دراصل اس سوال کا تفصیلی جواب کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں جو اصحاب حال ہیں اور وہ بھی عمل سے، بات چیت اور گفتگو و بحث سے نہیں۔ ہم اہلِ قال کے لئے اس سے زیادہ کہنے سُننے کی گنجائش نہیں۔ کہ نفسیاتی طور سے اس طرح کی خلوت لذّت آفریں ہو سکتی ہے۔ ثبوت میں ان ہزاروں پاکباز اور پاک نہاد انسانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے برسوں انسانی آبادی سے دور دنیاوی۔۔۔ ہنگاموں سے الگ تھلگ رہ کر زندگی گزار دی اور کبھی بھی حرفِ شکوہ و آرزو زبان پر نہیں لائے۔ ظاہر ہے یہ لوگ نہ تو مریضانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ نہ اتنے پاگل اور دیوانے تھے کہ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود اس طرزِ حیات کو سینے سے لگائے رہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو مالک بن مسعود نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا۔ سائل نے پوچھا تھا:۔

اما تستوحش وحدک — کیا آپ اس وحدت و خلوت میں احساس وحشت سے دوچار نہیں ہوتے؟

ان کا جواب یہ تھا:۔

ما کنت اری ان احداً یستوحش مع اللہ۔ — میں نہیں سمجھتا کوئی شخص اللہ تعالٰی کی محبت و معیت میں وحشت کیونکر محسوس کر سکتا ہے۔

یعنی جو آرام جان اور راحتِ جاں ہے۔ وہ تو دل کی گہرائیوں میں پوری سج دھج کے ساتھ جلوہ آرا ہے۔ پھر گھبراہٹ اور اضطراب کے کیا معنی؟

ایک آخری کھٹک یہ رہ جاتی ہے۔ کہ اگر خلوت و انزوا کی یہ برکات

ہیں تو صحابہ اس سے کیوں آشنا نہیں تھے اور انکی زندگی میں کیوں ایسی کیفیات کا پتہ نہیں چلتا جواب واضح ہے۔ انجیل کے مثالی پیرایۂ بیان میں یوں سمجھئے جس برات میں دولہا موجود ہو اس کو مجاہدہ و ریاضت کی کیا ضرورت ہے۔ جب آنحضرت کے عمل تزکیہ نے جلوت ہی میں ان لطائف سے ان کو بہرہ مند کر رکھا تھا جو انبیاء علیہم السلام کے بعد عموماً خلوت سے حاصل ہوتے ہیں۔ تو ان کو اس تدبیر کی حاجت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ تصوّف کا نصب العین دراصل اسی خلاء کو پُر کرنا تو ہے۔ جو انبیاء علیہم السلام کے بعد معاشرہ میں پیدا ہوجاتا ہے۔ مذہب کا اصلی اشکال یہ ہے کہ جب تک یہ نفوس قدسیہ زندہ رہتے ہیں جنھیں ہم انبیاء و رسل کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اس وقت تک یہ اپنے ماننے والوں میں عرفان وعمل کی شمعوں کو فروزاں رکھتے ہیں۔ اور تزکیہ و تربیت سے ان کی سیرت و کردار کو چمکائے رکھتے ہیں۔ لیکن جونہی ان حضرات کا انتقال ہوا، اور کچھ عرصہ اس پر گزر گیا۔ طبائع و قلوب میں تکدر پیدا ہوا۔ اور آخر آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہی جاہلیت اولیٰ لوٹ آئی۔ وہی دنیا کی محبت، مال و دولت کا عشق، تکلفات و نفسیات کا چسکہ دلوں پر مستولی ہوگیا۔ ایسے لمحوں میں قدرتاً ضرورت محسوس ہوتی ہے، ایسے ارباب ہمم کی، علمائے ربّانی اور صوفیائے کرام کی، جن کا نصب العین آخرت ہو، اللہ تعالےٰ کی خوشنودی ہو۔ مزید براں جنھوں نے مجاہدہ و ریاضت سے اپنے قلوب کو سنوار لیا اور مزکی کرلیا ہو، کہ میدانِ عمل میں اُتریں۔ اور اصلاح و تزکیہ کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیں۔ اگر تصوّف سے اصلاح معاشرہ کا یہ مقصد پورا ہوتا ہے۔ اور صوفیاء کے پاک نمونوں سے معاشرہ کے دنیاوی و مادی رجحانات میں خوش گوار اور صحت مند تغیّر پیدا ہوتا ہے، تب یہ زندہ، متحرک اور جاندار تصوّف ہے۔

اور ان کے حاملین کو ہم کامیاب صوفیاء کہیں گے۔ لیکن اگر اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تو یہ اور جو کچھ ہو صحت مند، جاری رہنے والا اور اعلیٰ تصوّف بہر حال نہیں ہے۔

بلا شبہ کچھ ایسے حضرات ضرور ہیں جو خلوت و انزواء کی دلچسپیوں میں اس درجہ کھو جاتے ہیں، کہ ان کے دلوں میں جلوت میں لوٹ آنے اور اصلاح و تزکیہ کے فرائض انجام دینے کے لئے کوئی طلب و آرزو ہی باقی نہیں رہتی۔ ان لوگوں کے بارے میں ہماری محتاط رائے یہ ہے کہ یہ ارباب ہمم میں سے نہیں ہیں۔ اور یہ کہ اپنے نفسیاتی حالات کی بناء پر انھیں قطعی معذور سمجھنا چاہیئے۔ یہ مانا کہ باطن کی دلچسپیاں اور جاذبیتیں ایسی گہری، ایسی عمیق اور پُر منفعت ہیں کہ کوئی شخص بھی ان سے آسانی کے ساتھ دست کش ہونا پسند نہیں کرے گا۔ لیکن مناسب تربیت کے بعد لطائف جلوت میں بھی قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہی تصوف کا نصب العین بھی ہے۔ اس کے لئے ذہن و قلب کی سلامتی اور ظرف و تحمل کی صلاحیت البتہ درکار ہے۔

تخصیص اس سے ہماری مراد صوفیاء کی اس امتیازی خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ کہ یوں تو ان کا کردار توازن و اعتدال کے ساتھ اُن تمام اخلاق و حسنات سے آراستہ ہوتا ہے، جن سے بہرہ مندی ایک اچھے فرد اور صالح معاشرہ کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض اقدار اخلاقی یا بعض حسنات میں ان کا پایہ نسبتہً بہت اونچا ہوتا ہے۔ جس میں انھیں مرتبہ اختصاص حاصل ہوتا ہے۔ اس میں یہ غایات اخلاق کو اس طرح اپنے روزمرہ کے عمل میں سمو لیتے ہیں۔ . . . . کہ جس سے دیکھنے والا خواہ مخواہ متاثر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو علوم و فنون کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیئے۔ ایک عام ڈاکٹر اور ایک متخصص (Specialist) میں کیا

فرق ہے؟ یا ایک عام سائنس دان اور محقق سائنٹسٹ (Scientist) میں کیا حدود امتیاز ہیں۔ یہی نا کہ ایک ڈاکٹر جسم انسان کے تمام عوارض کے بارہ میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔ لیکن کسی بھی مرض میں اس کا مقام اونچا نہیں۔ اور یہ متخصص وہ ہے جو تمام امراض کے بارہ میں تو بحیثیت مجموعی کچھ نہ کچھ جانتا ہی ہے اس کے علاوہ یہ کسی ایک مرض کا ایسا ماہر ہے کہ اس کے بارہ میں اس کی رائے سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ایک عام سائنس دان کے بارہ میں تصوّر یہ ہے کہ یہ طبیعیات کی تمام شاخوں سے تھوڑا بہت واقف ہے۔ لیکن متخصص وہ ہے جو اس اجمالی علم کے پہلو بہ پہلو سائنس کی کسی ایک شاخ سے متعلق ماہرانہ اور مجتہدانہ رائے رکھتا ہے۔

بالکل یہی انداز اخلاقیات وحسنات میں صوفیاء کا ہے۔ اگرچہ یہ تقویٰ شجاعت، سخاوت، امانت، رقّت، گداز وتاثر، انسانیت، شرافت، حیاء و عفاف ایسے تمام اوصاف سے کسی نہ کسی حد تک بہرہ مند ہوتے ہی ہیں۔ مگر ان کا جذبہ احسان صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ اور صرف انھیں نیکیوں میں محدود ہو کر اور سمٹ کر نہیں رہ جاتا۔ بلکہ یہ کسی ایک نیکی کو اس طرح درجہ کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔ کہ جس سے ان کی سیرت وکردار میں ایک طرح کا امتیاز سا پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر یہی وہ امتیاز وتخصص ہے جس کی بدولت ان کی شخصیت نسبتہً زیادہ اونچی زیادہ مؤثر اور زیادہ جاذب بن جاتی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ صوفیاء کا کمال یہ ہے کہ یہ اخلاق وحسنات میں غایات کو اپنی آراستہ وپیراستہ سیرت کا نقش ونگار ٹھہراتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سخاوت کی انتہائی حدود کو شجاعت کی آخری صورت کو حیاء وتعفف اور ایمان ورجاء کے کامل ترین تقاضوں کو یہ حضرات اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح

ایک طبیب خاص یا ایک ماہر طبیعیات کسی ایک ہی مرض کے علاج، طبیعیات کی کسی ایک ہی شاخ کے اپنانے میں علوم و تجربہ کے انتہائی حدود کو چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہی اس کا حد سے بڑھا ہوا کمال اور خوبی بھی ہے، جو دوسروں سے اس کو ممتاز کرتی ہے۔ اور لوگوں کی توجہات محبت و عقیدت کا مدار و محور ٹھہراتی ہے۔ صوفیاء بھی اسی درجہ کمال کی بدولت معاشرہ کی توجہات کو اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

اخلاقیات کے بارہ میں یہ اشکال بہت پرانا ہے کہ انسان کو بعض مخصوص نیکیوں میں درجہ کمال حاصل کرنا چاہیئے۔ یا تمام حسنات میں برابر کا شریک و سہیم ہونا چاہیئے، ارسطو نے توسط و اعتدال کے سنہرے اصول (GOLDEN MEANS) کو پیش کیا ہے۔ اور اسلام کا عمومی مطالبہ بھی معاشرہ کے ہر ہر فرد سے یہی ہے۔ کہ توسط و اعتدال کے تقاضوں کو ملحوظ رکھیں۔ اور ہر ہر نیکی کو اپنانے اور اپنی سیرت و کردار کا جزو بنانے کی کوشش کریں۔ لیکن اس میں جو دقت ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح غیر معمولی شخصیتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ اور اخلاق و حسنات کے اونچے نمونے نہیں پیدا ہو پاتے۔ جو معاشرہ کو متاثر کر سکیں۔ اور ان کے غیر اخلاقی رجحانات کو بدل سکیں۔ اسلام نے اس غرض کو پورا کرنے کے لئے عوام سے ہٹ کر اخلاق و حسنات کی کچھ اونچی سطحوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ جن پر فائز ہونا صرف خواص کا حصّہ ہے۔ کیونکہ توسط و اعتدال کی روش سے جو اخلاقی نمونے پیدا ہونگے۔ وہ لامحالہ متوسط درجہ ہی کے ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ اور اونچے درجے کے نہیں۔

اس سلسلہ میں قابلِ لحاظ نکتہ یہ ہے کہ علوم و فنون میں، کھیل کود میں آخر ناموری کن لوگوں نے حاصل کی۔ اور کن لوگوں نے اختراع و ایجاد یا ہمت و عزم کے علَم گاڑے۔ کن لوگوں کی مساعی سے سائنس کے عجیب عجیب معجزات

اور خوارق ظہور پذیر ہوئے۔ اور کن کن لوگوں کی توجہات اور کوششوں سے علوم و معارف کے قافلے آگے بڑھے۔ ظاہر ہے ان سب کمالات کا سہرا ان لوگوں کے سر ہے جنھوں نے علم و فن اور عمل و سعی کے عام اور متوازن حدود سے آگے بڑھ کر کمال و نبوغ کے دروازوں پر دستک دینے کی کوشش کی۔ اور توازن و اعتدال کی سطحوں سے کچھ اونچا اُٹھنا چاہا۔ ان لوگوں کا ذکر اس فہرست میں ہرگز نہیں آسکتا۔ جنھوں نے معمول کے مطابق اور توازن کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی زندگی بسر کی۔

علوم و فنون کی معرکہ آرائیاں ہوں یا اخلاق و حسنات کے سیرت و کردار کو چمکانے کا سوال۔ کھیل کود کے میدان ہوں۔ یا زندگی کی اُلجھنیں، ان میں جو لوگ دوسروں کو متاثر کرسکتے ہیں یا ذہنوں اور دلوں پر پوری طرح چھا سکتے ہیں۔ اور دوسروں کے لئے مثال اور نمونہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ وہ وہی ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو غیر معمولی طور سے برت کر دکھایا۔ اور سعی و فکر کے عام اور جانے بوجھے میدانوں سے آگے گذر کر جھنڈے نصب کئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے۔ یہاں صرف پہاڑوں کی سیر کافی نہیں ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی کو سر کرنے کی ضرورت ہے۔ چاند کے حسن و جمال اور روشنی سے دیدہ و دل کو مستنیر اور محظوظ کو لینے سے کام نہیں چلتا۔ اس پر کمندیں پھینکنا ہونگی۔ اور اس کو مسخر کرنا ہوگا۔ تب جاکر کہیں ناموری حاصل ہوگی۔

غرض یہ ہے کہ ارسطو کے سنہرے اُصول اخلاق ایک متوازن اور اوسط درجہ کے معاشرہ کو بلاشبہ پیدا کرسکتے ہیں۔ مگر غیر معمولی کردار و سیرت کے نمونے اس سے اُبھرنا مشکل ہیں۔ اسلام نے اس مشکل کو ملحوظ رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے جہاں تعلیمات میں عوام کے لئے اخلاق و حسنات کی حدیں مقرر کی ہیں۔ وہاں ارباب ہمم کے لئے بھی کچھ منزلوں کی تعیین میں کوتاہی نہیں کی۔ اور

انھیں منزلوں کی طرف بڑھنا۔ تخصیص یا اختصاص ہے ــــ جو صوفیاء کا طرۂ امتیاز ہے۔

کیا توازن واعتدال کے ساتھ غایات اخلاق یعنی درجاتِ کمال کو حاصل نہیں کیا جا سکتا؟ یہ اس سلسلہ کی آخری کڑی اور اہم سوال ہے۔ جواب یہ ہے کہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ صرف انبیاء کا حصہ ہے۔ عام انسانوں کا نہیں۔ ان کے لئے دو ہی راہیں کھلی ہیں۔ یا تو یہ جامعیت و توازن لئے ہوئے ہر ہر نیکی سے بقدرِ استطاعت بہرہ ور ہونے کی کوشش کریں۔ اور یا پھر انھیں کے بعض غایات و کمالات کی طرف قدم فرسا ہوں۔ تیسری کوئی صورت نہیں۔

اخلاص اعمال وحسنات میں یہ خوبی تصوف کی جان ہے۔ صوفیاء اس کا اطلاق کن کن لطیف معانی پر کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل انہیں کے اقوال کی روشنی میں دیکھئے۔ ابو علی دقاق کا قول ہے:۔

الاخلاص التوقی عن ملاحظۃ الخلق۔	اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ اعمال میں عارف مخلوق کی رائے سے بے نیاز ہو جائے۔

یعنی اللہ کی رضا اور خوشنودی مدِّنظر ہو۔ یہی نہیں اخلاص کی اعلیٰ ترین سطح یہ ہے کہ اعمال اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کی خاطر اس طرح آپ سے آپ صادر ہونے لگیں کہ خود جذبہ اخلاص پر غور وخوص کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ ابو یعقوب السوسی کا کہنا ہے:۔

متی شہد دا فی اخلاصھم الاخلاص احتاج اخلاصھم الی اخلاص۔	جب لوگوں کو اپنے اخلاص میں اخلاص کا احساس ہونے لگے تو انھیں تجدید اخلاص کرنا چاہئے۔

اخلاص کی علامات کیا ہیں؟ ذی النون مصری فرماتے ہیں:۔

ثلاث من علامات الاخلاص	اخلاص کی تین نشانیاں ہیں، عوام کی مدح و

استواء المدح والذم من العامة — قدح سے بے پرواہو جانا، اس حقیقت کو بھلا دینا
ونسیان رویۃ الاعمال و — کہ ہم نے کچھ اعمال اخلاص کی بنا پر کئے ہیں،
نسیان اقتضاء الثواب فی الآخرۃ — اور ثواب آخرۃ کے جذبہ کو فراموش کر دینا۔

کیا عوام وخواص کے درجہ اخلاص میں فرق ہے؟ ابوعثمان مغربی کا کہنا ہے:۔

الاخلاص مالا یکون للنفس فیہ — عوام کا اخلاص یہ ہے کہ ان کے محرکات اعمال میں
حظ بحال وھذا اخلاص العوام — نفس کا کوئی حصہ نہ ہو۔
واما اخلاص الخواص فھو یجری — اور خاص الخاص حضرات کا تقاضائے اخلاص
علیھم لا بھم فتبدو منھم الطاعات — یہ ہے کہ ان کے اعمال کا سرچشمہ اور محرک خود
وھم عنہ بمعزل ولا یقع علیھم — ذات باری ہو۔ بندگی و اطاعت کا ان سے سطح
رویۃ ولا بھا اعتداد۔ — آپ سے آپ صدور رہو۔ کہ گویا انھیں اس سے

کچھ غرض نہیں نہ یہ اپنے اعمال میں اخلاص کو دیکھیں اور ٹٹولیں۔ اور نہ اس کے لئے انھیں کوئی تیاری ہی کرنا پڑے۔

دیکھا آپ نے نقطہ نظر کی بلندی اور پاکیزگی! فقہاء تو نیکی کا صرف اونچا تصور ہی رکھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ کسی نیکی کو کیونکر انجام دینا چاہئے۔ اور اس سے زیادہ کے فن کے اعتبار سے وہ مکلّف بھی نہیں متکلمین نیکی کی تعیین میں کھو گئے۔ اشاعرہ نے کہا نیکی معقول المعنی نہیں۔ اور شریعت کے تابع ہے۔ معتزلہ نے ایک قدم بڑھ کر تصریح کی کہ نیکی کو باور کرنے کے لئے عقلی وجود نہیں۔ حکماء کا یہی مذہب ہے اور اس میں ان کی پرواز اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ نیکی کو نفس نیکی سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ کانٹ نے اخلاقیات کا یہی اونچا معیار پیش کیا۔ اور کہا کہ نیکی بجائے خود نیکی ہے۔ اور انسانی عقل اس پر شاہد ہے۔ لہذا قطعی اس لائق ہے کہ اسے سیرت و کردار کا جزو بنایا جائے۔

صوفیاء نے ان دونوں سے الگ ایک راہ اختیار کی۔ اُنہوں نے کہا یہ دونوں نقطہ ہائے نظر

اعمال میں وزن پیدا کرنے والی نہیں۔ اصل شئی جس سے نیکیوں میں وزن اُبھرتا اور روح پیدا ہوتی ہے اخلاص ہے۔ اعمال میں دیکھنے کی چیز یہ نہیں، کہ ان کے اچھا یا بُرا ہونے میں عقل کو دخل ہے یا شرع کو۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ان کا محرک کون ہے؟ کیا اعمال حسنہ اور عبادات میں شہرت، ریا اور جلبِ منفعت مقصود ہے۔ یا اللہ تعالےٰ کی خوشنودی اور رضا۔ پھر اس اخلاص کے بارہ میں بھی ان کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ اعمالِ حسنہ کو اس طرح اس سانچے میں ڈھل جانا چاہئیے۔ کہ آپ سے آپ بغیر کسی قصد و تعمد کے صادر ہونے لگیں۔ کیونکہ قصد و تعمد کا مطلب یہ ہے کہ ہنوز نیکیاں قلب و ضمیر میں رچی نہیں۔ اور نفس کی اصلاح اس درجے کی نہیں ہو پائی۔ کہ اس سے صرف حسن و خوبی ہی کی توقع کی جائے۔

اس سلسلہ میں باوجود انتہائی عقیدت کے جو ہمیں اس پاک نہاد گروہ سے ہے۔ ایک اہم شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اخلاص کے اس مرتبہ بلند پر فائز ہونا نفسیاتی اور عملی طور پر ممکن بھی ہے؟ کیا نیکیوں سے شعور و ادراک کو ہم کسی موڑ پر بھی الگ کر سکتے ہیں۔ اور ہم پر ایسی کیفیتیں فی الواقع طاری ہو سکتی ہیں۔ اور نفس و روح اصلاح و تزکیہ کی ایسی منزلیں طے کر سکتی ہے کہ جہاں قصد و تعمد کے شوائب اور تقاضے کلیتہً مفقود ہو جائیں۔

اور اگر یہ ممکن ہے۔ تو دوسرا شبہ یہ اُبھرتا ہے جو اس شُبہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ کہ پھر ان اعمال کو ہم نیکیاں کہہ بھی سکتے ہیں! یا دوسرے لفظوں میں اگر اخلاص کا اعلیٰ ترین مفہوم یہی ہے کہ اس کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو کیا ارادہ و تعمد کی اس نفی کے بعد خود اس جذبہ کی کوئی مقدار قلب و ذہن کے کسی گوشے میں بھی باقی رہ جاتی ہے۔ جسے ہم اخلاص سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس تضاد (CONTRADICTION) سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے کوئی صاحب حال اور صاحب علم بزرگ اس پر

روشنی ڈال سکیں۔ ہم بہر حال اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں۔ تطبیق کی ایک صورت یہ البتہ ہو سکتی ہے کہ صوفیاء کے ان اقوال کو جن میں اس مرتبہ بلند کی نشان دہی کی گئی ہے۔ محض پیرایۂ بیان قرار دیا جائے، اور ان سے مقصود یہ سمجھا جائے۔ کہ اصحاب تصوّف تا بہ حد امکان اخلاص کی اعلیٰ سے اعلیٰ منزلوں تک پہنچنے کی جدوجہد جاری رکھیں۔ اور ریاء وسمعہ کے تقاضوں کو اس طرح چھانٹتے چلے جائیں کہ آخر آخر میں وہ ختم ہو جائیں۔ اور ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ جہاں ان کا کوئی تعلق قصد و ارادہ کی پاکیزگی کو بگاڑ نہ سکے۔

معرفت یا نظریۂ علم

علم و معرفت کی عموماً تین سطحیں پائی جاتی ہیں:۔

(۱) اپنے گردوپیش کی جُزئیات کا جزئی علم، اس کا تعلق سطحِ حیوانی سے ہے۔

(۲) منطقی قضایا کو ترتیب دینا اور جزئیات سے بطور استقراء کے نتائج مستنبط کرنا یہ انسانی وصف ہے۔ جس میں تمام انسان شریک ہیں۔ اس کو پیش نظر رکھ کر انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی کلیات کے ادراک و فہم رکھنے والے حیوان کے ہیں۔

(۳) بغیر ترتیب قضایا کے ذہن انسانی پر بعض حقائق کا دفعۃً انکشاف۔ اس سے با اختلاف مراتب وہ تمام حضرات بہرہ مند ہیں۔ جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح فکر وتعمق کی گہرائیوں سے ہے۔ اور علم کی یہی صورت اس وقت زیر بحث ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم صرف منطقی استدلال کی تنگنائے ہی میں محصور نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق ایک اور بحر بے کراں سے بھی ہے۔ جس کی موجیں کبھی کبھی ساحلِ ذہن سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ اور علوم و معارف کے ایسے ایسے انمول موتی بکھیرتی رہتی ہیں۔ کہ جس پر منطقی عقل و خرد حیران و ششدر رہ جاتی ہے۔ طفرہ (JUMP)

جس کو اوّل اوّل نظام نے پیش کیا اور اب حیاتیات (BIOLOGY) کا مسلّمہ اصول ہے۔ صرف مادی ارتقاء کے سلسلہ ہی میں کام آنے والا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی کارفرمائیوں کے حدود ذہن وفکر اور تصوّرات و کشوف کی وسعتوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جہاں حیاتیات میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ارتقاء کی تمام کڑیاں ضروری نہیں کہ باہم پیوستہ اور معلوم و ہوں۔ وہاں اس طرح خیالات و افکار کے لئے بھی منطق و استدلال کی کڑیوں کا باہم مربوط و مسلسل ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ہم اشہب فکر کو ایک خاص میدان میں دوڑا رہے ہیں۔ اور وہ اس کو چھوڑ کر یکایک بغیر کسی سبب کے جست لگا کر ایک دوسرے میدان میں پہنچ گیا۔ جس کے عجائبؒ خوارق ایسے اچھوتے ایسے نادر ہیں اور افق ذہنی کو ایسی وسعتیں عطا کرنے والے ہیں کہ جو باقاعدہ سوچ بچار سے حاصل ہونے والے نہیں۔ چنانچہ بلند پایہ شعراء کے جتنے شہ پارے ہیں، اونچے مفکّرین کے جس درجہ تخلیقی کارنامے ہیں۔ اور علوم و فنون میں جتنے اہم موڑ ہیں، یہ سب اسی جستِ فکر کا کرشمہ ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس مقام تک پہنچنے کے لئے غور وفکر، ذہنی صلاحیتیں اور کدو کاوش ضروری ہے۔ بلکہ بمنزلہ اوّلیں شرط کے ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ صرف غور و فکر ہی سے علم و معرفت کی گرہیں کھلتی ہیں۔ بلکہ حقائق اشیائ کا کھوج لگانے کے سلسلہ میں کچھ موڑ ایسے بھی آتے ہیں۔ جہاں شعور و ادراک بے بس ہو جاتا ہے۔ اور ان کے بجائے کوئی دوسری قوت، دوسری ہی قسم کی صلاحیتیں آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑتی ہیں۔ اور ایسی منزلوں تک پہنچا دیتی ہیں۔ جن کا پہلے سے کوئی ادراک نہیں ہوتا۔ یہ وہ منزلیں ہیں۔ جہاں پہنچ کر ایک شاعر ایک مفکّر

اور غور و تعمق میں ڈوب جانے والا شخص ایسا محسوس کرتا ہے۔ کہ گویا اشیاء کی اوپری سطح سے گذر کر خود اشیاء کے باطن اور روح میں محو سیر ہے۔ حقائق اشیاء میں گھوم پھر رہا ہے۔ اور تجرد و محویت کے لئے ایسے عالم میں پہنچ گیا ہے۔ جہاں کی ہر شئی روشناس اور محرم راز معلوم ہوتی ہے۔

انگریزی کے ایک صوفی مذاق شاعر ٹینی سن نے اپنے بعض اشعار میں کچھ اسی قسم کے احساسات کی نشان دہی کی ہے۔ اور غور و تعمق کے کچھ ایسے ہی اطوار کا تذکرہ کیا ہے۔ جہاں جسمانی ذہن (BRAIN) کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور روحانی ذہن کے دریچے پوری پوری تابانی کے ساتھ کھل جاتے ہیں۔

ان کے ان بے مثال اشعار کا مفہوم قریب قریب یہ ہے :-

خیالات و احساسات کا یہ وہ مقدس اور بابرکت موڑ ہے۔ جہاں پہنچ کر جسمانی نفس کا سانس رک جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خون کی روانی بھی تھم گئی ہے بلکہ ہمارا جسم اگرچہ سو گیا ہے۔ تاہم باطن و روح کی بیداریاں برابر اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ اس وقت ہم کائنات پر باطنی آنکھ کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں جو اشیاء میں غضب کا تناسب و ہم آہنگی تلاش کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی۔ اور جو ہر شے میں ایک طرح کے طرب و انبساط کو جاری و ساری دیکھتی ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ براہ راست حقائق اشیاء میں مصروف خرام ہیں۔ اور ان کی زندگی کی تہوں میں تیر رہے ہیں۔

غور و فکر کے اس موڑ کو ہم حدس (INTUITION) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے آگے ایک اور درجہ ماورائے حدس کا ہے جس کا تعلق ولایت و نبوت کے معارف و حقائق سے ہے۔ صوفیاء نے اپنی اسی حقیقت کی طرف مختلف اصطلاحوں میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی :-

کبھی لوائح، لوامع اور خواطر کا پیرایہ بیان اختیار کیا ہے۔ اور کبھی مشاہدہ کے نام سے پکارا ہے۔ جب اس میں قطعیت کے عناصر ابھر آتے ہیں۔ تو اس مرتبہ علم کو عین الیقین کے وصف سے متصف کیا جاتا ہے۔

اس میں اور حدس (Intution) میں ایک اصولی فرق یہ ہے۔ کہ حدس تو آخر آخر میں بہر حال ذہن و فکر ہی کا کرشمہ ہے۔ لیکن علم کی یہ نوعیت جس کا تعلق معارف نبوت و ولایت سے ہے۔ اس میں آغاز (Origin) دوسری طرف سے ہوتا ہے یعنی اللہ تعالےٰ بعض حقائق کو ان لوگوں کے دلوں پر منکشف کر دیتا ہے۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ عنکبوت ۶۹ — اور جن لوگوں نے ہمارے لئے کوشش کی ہم انکی ضرور رہنمائی کریں گے۔ اور اپنے راستے دکھائینگے

اس مرتبہ علم پر جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اولیاء و صوفیاء فائز ہوتے ہیں۔ نبوت اس سے جداگانہ مرتبہ کی متقاضی ہے۔ اس کے معارف براہِ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ نجم — پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف جو وحی بھیجی سو بھیجی۔

واتل ما اوحی الیک (کہف) — اور وہ کتاب پڑھ کر سناؤ۔ جو تمہارے پروردگار نے بذریعہ وحی تمہاری طرف بھیجی۔

وحی ولایت اور وحی نبوت میں فرق نوعیت (Quality) کا ہے یا کمیت (Quantity) کا۔ اس سلسلہ کی یہ اہم بحث ہے۔ اور اس پر اختصار ہی سے سہی اظہار خیال بہر حال ضروری ہے —— موجودہ طبیعاتی انکشافات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نوعیت و کمیت کا اختلاف محض اصطلاحی ہے۔ اگر آپ پانی کو کھولاتے چلے جائیں تو گرمی اور کھولاؤ آخر آخر میں ایک ایسے فیصلہ کن نقطہ حرارت تک پہنچ جائے گا۔ جہاں پانی کی یکسر قلب ماہیت

ہوجاتی ہے۔ اور وہ پانی پانی نہیں رہتا۔ بلکہ بھاپ بن کر ایک زبردست قوت میں بدل جاتا ہے۔ اور بھاری بھرکم مشینوں کو چلانے لگتا ہے۔ اسی طرح حیاتیات کے میدان میں آئیے۔ ایک انڈے کو مناسب ماحول میں، مناسب حرارت پہنچائیے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہی بے جان انڈا چٹخے گا۔ اور اس میں سے جیتے جاگتے بچے نکل آئیں گے۔ جو انڈے کے مزاج اور نوعیت سے قطعی مختلف ہونگے۔ یہی حال ارتقاء کی دوسری صورتوں کا ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے۔ جس کو قرآن نے جنین کے متعلق ارتقائی منزلوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

ثم انشانا ہ خلقا آخر۔

کہ یہ قطرۂ آب ایک حقیر جرثومہ ہے۔ علقہ و مضغہ کی منزلیں طے کر کے یکایک زندگی کے ایسے طور میں داخل ہوجاتا ہے۔ جہاں سے عقل و خرد کے امتیازات ابھرنا شروع ہوتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جب مقدار و نوعیت مناسب ماحول اور شرائط کے تحت نوعیت میں اکثر و بیشتر بدل جاتی ہے۔ تو ان دونوں میں حقیقی اور بنیادی فرق نہ رہا۔ بلکہ مدارج اور مراتب کا فرق ٹھہرا۔

علوم نبوت و ولایت میں بھی فرق اسی انداز کا ہے۔ یعنی نبی ولی سے بمراحل اونچا، اور بہ مدارج بلند ہوتا ہے۔ حالانکہ دونوں میں جو علم کا انداز ہے وہ چنداں مختلف نہیں۔ کیونکہ دونوں استدلالی و منطقی علم کے بجائے الہام سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس مرحلہ پر اس نقطہ کو ذہن میں ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کہ کمیت کا یہ فرق بسا اوقات اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس پر بعض دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے نوعی فرق کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ولی ہزار مجاہدہ و مراقبہ کرلے جب بھی نبی یا رسول ہرگز نہیں ہوسکتا۔ مگر دونوں میں فرق درجہ و مرتبہ ہی کا رہے گا۔

وہ دوسرے پہلو کیا ہیں جو نبی و ولی کے علوم و معارف میں خطِ امتیاز کھینچتے ہیں؟ وہ دو ہیں:۔

(۱) نبی کا علم سراسر معروضی (Objective) ہوتا ہے اور ولی علم میں موضوعیت (Subjectivism) کی آمیزش سے پاک نہیں ہوتا۔

(۲) ولایت اکتساب سے تعلق رکھتی ہے۔ اور نبوت فیصلۂ ربوبیت سے۔

(۳) نبی تبلیغ حقائق پر مامور ہوتا ہے۔ لیکن ولی مامور نہیں ہوتا۔

(۴) نبی کا علم بجائے خود سند ہوتا ہے۔ اور ولی کے معارف خارجی کسوٹیوں کے محتاج۔

(۵) ولی اپنی روحانی پرواز اور سیر باطن میں اگر مقامات نبوت کے بالمقابل آتا بھی ہے تو ان مقامات پر نہ فائز ہی ہوتا ہے اور نہ ٹھہرتا ہی ہے۔ بلکہ تیزی سے گذر جاتا ہے۔ بخلاف نبی کے کہ وہ ان مقامات کی محرمانہ سیر بھی کرتا ہے، ان میں سے گذرتا بھی ہے۔ اور ٹھہرتا یا استقرار بھی حاصل کرتا ہے۔

(۶) دونوں کے پیرایہ بیان میں بھی فرق ہے۔ جہاں انبیاء کے اسلوب تبلیغ میں وضاحت اور تعیین ہوتی ہے۔ وہاں صوفیاء حقائق کے بیان کرنے میں اکثر رمز و اشارہ سے کام لیتے ہیں۔

اس پوری بحث کا حاصل بہرحال یہ ہے۔ کہ علوم و معارف کا ایک سرچشمہ ایسا بھی ہے، جو انسانی قلب و ذہن کی گہرائیوں میں پایا جاتا ہے۔ اور عقل و استدلال کے حدود کے ماوراء اور وحی نبوت سے ادھر علوم و معارف کے کچھ سوتے جاری ہیں۔ جن سے کہ ضمیر و وجدان کی تسکین ہوتی ہے۔

غزالی نے اس کی ضرورت پر نہایت حکیمانہ دلیل پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علوم نبوت کی اگر براہِ راست تصدیق ممکن نہیں۔ اور ایک ولی اور اللہ کا

بندہ اگر حقائق نبوت کو اپنی چشم باطن سے نہیں دیکھ سکتا تو پھر ان حقائق کو قطعی الثبوت کیونکر کہیں گے۔ آپ جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر کی صداقت خود اس کا پیغام ہے۔ اس کی دعوت کی منطقی استواریاں ہیں۔ اور زندگی کا وہ نقشہ ہے جسے آزمایا اور برتا جا سکتا ہے لیکن غزالی کی تسکین اس سے نہیں ہو پاتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری باتیں زیادہ سے زیادہ اغلبیت بخش سکتی ہیں۔ لیکن ان سے وہ عین الیقین قطعی حاصل نہیں ہو پاتا۔ جو حقیقت نبوت کو نکھار کر نظر و بصر کے سامنے لے آئے۔ اس مقصد کی تکمیل بہرحال بلا واسطہ تجربہ ہی سے ممکن ہے۔ ایسے تجربہ سے جو شک و ریب اور ظن و تخمین کے پردوں کو چاک کر کے شاہد حقیقت کو اپنے سامنے جلوہ گر پائے۔

ولایت کس حد تک معروضی علوم کی حامل ہوتی ہے۔ اور کس حد تک اس میں موضوعیت کی کارفرمائیوں کا دخل ہے، یہ سوال بھی کم توجہ و التفات نہیں چاہتا۔ مگر اس پر ہم چونکہ اپنی کتاب "افکار غزالی" میں کھل کر بحث کر چکے ہیں۔ اس لئے یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہوگا۔ غیر ضروری بھی، اور شاید غیر دلچسپ بھی۔ لہٰذا قارئین کرام بحث کے اس پہلو کو وہیں دیکھ لیں۔

ترجیح آخرت اسلام کا موقف دنیا کے مقابلہ میں کیا ہے؟ ہم اس کی تفصیل انفرادیت کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ اور تخصیص کے ضمن میں اس حقیقت کی بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ صوفیاء کا پاک نہاد گروہ وہ گروہ ہے جو اسلام کی عمومی اور متوازن دعوت کو ملحوظ و مرعی رکھنے کے ساتھ ساتھ اقدار روحانی و اخلاقی کو خصوصیت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ بلکہ انھیں اعلیٰ اقدار کے لئے جیتا اور مرتا بھی ہے۔ ترجیح آخرت کا مسئلہ اسی وضاحت و تفصیل کا ایک پہلو ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے۔ کہ یہ حضرات آخرت کو اس درجہ اہم، ضروری اور حقیقی سمجھتے

راس کے ہموم وافکار میں اس درجہ مستغرق اور مشغول رہتے ہیں کہ دُنیا کی
ورعارضی رعنائیوں کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی ان کو فرصت ہی نہیں ملتی۔
رتاؤ اس عالم رنگ و بو کے ساتھ ایسے شخص کا سا ہوتا ہے جو اس مرحلۂ عیش
، عبوری سمجھتا ہے۔ اور اس سے اسی قدر دلچسپی رکھتا ہے جس درجہ عارضی اور
، شئی سے رکھنا ضروری ہے، جسے اس کو پھاند کر آگے بڑھنا ہے۔ اور اسے
ں اور سدا بہار گلستانِ جمال میں داخل ہونا ہے جس کی جاذبیتیں اس سے
برلا ہ کر ہیں۔ جس کا حسن اور نکھار دائمی اور ابدی ہے۔ جہاں قربِ یار کی
یں ہیں اور اتصالِ حبیب کی بشارتیں ہیں۔ لیکن کیا اس کا مطلب یہ سمجھا جائے
لام عیسائیت کی طرح اس دنیا کو محض اور قطعی ناقابلِ اعتنا سمجھتا ہے۔ اور
، ترقیات کا ساتھ دینا نہیں چاہتا۔ تصوّف کے اس رجحان کا یہ مطلب
ہیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس باب میں اصل شئی یہ نہیں کہ آپ دنیا کی ترقیات کا
دیتے ہیں یا نہیں۔ یہ سوال بھی اصلی اور بنیادی نہیں کہ آپ کے دامن میں کس درجہ
سٹی ہوئی ہے۔ آپ کیا پہنتے ہیں۔ کیا کھاتے ہیں۔ اور کس درجہ معیشت کو اختیار
وئے ہیں۔ یہ تمام سوالات زیرِ بحث نہیں۔ تصوّف انسان میں تین طرح کی
، تبدیلیاں چاہتا ہے۔

(۱) یہ کہ اس دنیا کو بہرحال عارضی سمجھا جائے۔ اور نظر و التفات کے گوشے
ہ ترعقبیٰ و آخرت کے مہمات پر مرکوز رہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ زندگی و
، کا جتنا بھی اطمینان آپ کو یہاں حاصل ہے اس کے بارہ میں ہمیشہ یہ
، رکھئے کہ یہ عقبیٰ و آخرت کے مقابلہ میں بہرحال کم ہے اور ادنیٰ درجہ کا ہے۔

(۲) اس طرزِ فکر کا منطقی نتیجہ یہ نکلیگا اور نکلنا چاہیئے۔ کہ دنیا کے ساز و

سامان کے ساتھ اگرچہ وہ بہت زیادہ اور ڈھیر سارا ہو تعلق خاطر کی نوعیت نہ رہے۔ جو ایک دُنیا پرست کا طرۂ امتیاز ہے۔

وہ بلا محابا بنگلہ اور کوٹھی میں رہے۔ کاریں بیٹھے۔ اور ہوائی جہازمیں اُڑے۔ لیکن اس کے دل پر ان چیزوں کا کچھ اثر نہ ہو۔ یعنی ان چیزوں سے اس کی روحانیت متاثر نہ ہو۔ اس کی انسانیت پست نہ ہو۔ اور اس کی کیفیت کچھ اس طرح کی ہو، کہ اگر یہ چیزیں میسر ہیں، تب بھی خوش ہے۔ اور یہ چیزیں چھین لی گئی ہیں تب بھی خوش ہے۔ بلکہ زیادہ خوش ہے۔ کہ ذمہ داریوں کا بارِ گراں ہلکا ہُوا۔

(۳) آخری چیز جو تصوف چاہتاہے وہ یہ ہے کہ دنیا اور اس کے پورے ٹھاٹھ کو اس طرح اللہ کی خوشنودی کے لئے کام میں لایا جائے کہ اس میں حظِ نفس کو کوئی دخل نہ ہو۔ غزالی نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصّہ بیان کیاہے جس سے اس نقطہ کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایک عارف نے صوفیاء کے ایک گروہ کو کھانے پر بُلایا۔ اور دعوت کے لئے جس کمرہ کو منتخب کیا اس کو تا بحدِ مبالغہ سجایا حتیٰ کہ اس میں سینکڑوں شمعیں روشن کیں۔ صوفیاء کا یہ گروہ حسبِ وعدہ ان کے مکان پر پہنچا۔ اور جونہی کمرے میں داخل ہُوا، ان کی آنکھیں روشنی اور نور کے ان فواروں سے خیرہ ہوگئیں۔ اس سے ان کو سخت حیرت ہوئی کہ جس شخص کے عرفان وزہد کے اتنے چرچے تھے، یہ تو دنیا دار نکلا۔ میزبان نے اُٹھ کر ان کی غلط فہمی کو دور کیا۔ کہ اعزاز و تکریم کے ان تکلفات کا تعلق تمہارے جذبہ خشیت و خوف سے ہے۔ تقوے و زہد سے ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ یہ اعزاز فقرو پاکبازی کا اعزاز ہے، اشخاص و افراد کا نہیں۔ اور پھر فرمایا۔ تم میں سے ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ اُٹھے اور جس شمع کو دیکھے کہ اللہ کی خوشنودی کے لئے نہیں جلائی گئی ہے اس کو بجھا دے۔

اس طرزِ فکر سے رہبانیت کی قسم کے جو شبہات اسلامی تصوّف کے بارہ میں پیدا ہوتے ہیں انھیں ختم ہو جانا چاہیئے۔ اور سمجھنا چاہئے کہ اسلام یا تصوّف کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ ذہن و فکر سے متعلق بدرجہ غایت صحت مند اور خوشگوار تبدیلیاں روا رکھی جائیں اور بس۔

آخرت کے بارے میں تصوّف کا یہ رجحان خود ساختہ نہیں۔ قرآن سے ماخوذ ہے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:۔

(۱) وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (نحل ۴۱) — اور آخرت کا اجر و صلہ تو کہیں بڑھ کر ہے۔

(۲) وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ (انعام ۳۲) — اور اچھا گھر تو آخرت ہی کا گھر ہے۔

(۳) وَابْتَغِ فِيمَا اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ۔ (قصص) — اور جو کچھ تمھیں اللہ نے دے رکھا ہے اس سے آخرت کی بھلائی کا سامان فراہم کرو۔

(۴) وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (عنکبوت ۶۴) — اور دار آخرت کی زندگی ہی اصلی اور حقیقی زندگی ہے۔

جن لوگوں نے صوفیاء کے حالات و سوانح کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان میں اکثر ایسے ہیں۔ جو کھانے پینے اور رہنے سہنے کے جن معیاروں کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کا کوئی تعلق بھی بظاہر اس تعبیر و وضاحت سے نظر نہیں آتا۔ جو ہم نے ان کے دفاع و حمایت کے جوش میں اختیار کی ہے۔ کیونکہ ان میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جس کا لباس صاف ستھرا نہیں۔ جس کی غذا کافی اور صحت و توانائی کے لئے کافی نہیں۔ اور جن کی رہنے کی جگہیں اور طور طریق ایسے نہیں۔ جو دل کو بھائیں اور دیکھنے والے کو متاثر کریں۔ یہی نہیں یہ حضرات اسی کو فقر کا حاصل سمجھتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ شبہ بجا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم کہیں گے کہ نصب العین تصوّف ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی ہم نے تشریح کی ہے۔ مزید برآں اگر

تصوف کو ایک محرک اعلیٰ اور مؤثر ترین، عنصرِ حیات کی صورت اختیار کرنا ہے اور معاشرہ کے رجحانات کو بدلنا ہے۔ اور اہلِ دنیا کو آخرت کی طرف مائل کرنا ہے۔ تو پھر اس کی صحیح شکل یہی ہے۔ کہ حضرات صوفیا اس سابقہ ذوق و رجحان سے دستبردار ہوں اور ایک جیتا جاگتا اور اونچا تصورِ حیات اپنائیں۔ جو دلوں میں اللہ کی محبت پیدا کرے۔ اور دنیا میں خوبصورتی اور توازن کے ساتھ رہنا سکھائے۔

صوفیاء میں سے اکثر قدماء نے یہ اندازِ حیات کیوں اختیار کیا۔ اس کے بارے میں ہمارے نزدیک چار عذر پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

(۱) یہ دراصل اُس حد سے بڑھے ہوئے جذبہ دنیا داری اور دُنیا طلبی کے خلاف ایک ردِ عمل (REACTION) یا بغاوت تھی جس کے مسرفانہ تقاضے اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔

(۲) ایک حد تک اس میں ایسے رجحانات اور جذبات و عواطف کا بھی دخل تھا۔ جو بالکل ذاتی اور انفرادی نوعیت کے تھے۔

(۳) اس اندازِ زیست کو اوّل اوّل محض عارضی اور آزمائشی طور پر اختیار کیا گیا ہوگا۔ تاکہ نفس کی اچھی طرح تہذیب و اصلاح ہو سکے۔ لیکن کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد ان حضرات نے از راہِ تساہل اس اسلوبِ حیات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تصوّف اور اصلاح احوال کے لئے طرۂ امتیاز قرار دے لیا۔

(۴) جو لوگ ہموم آخرت کو نصب العین قرار دینگے۔ اور صرف اللہ تعالےٰ سے تعلق پیدا کرنے کی جدوجہد کرینگے۔ ان کا دنیا کے بارہ میں کسی نہ کسی حد تک متساہل ہونا مستبعد نہیں۔ بلکہ اگر یہ لوگ متساہل نہ ہوں تو البتہ تعجب آفریں ہے۔

ان نکات کو ذہن میں رکھئے تو شبہ کی شدتیں بڑی حد تک ختم ہو جائیں گی۔

غزالی نے بھی اس محبت و عقیدت کے باوجود جوان کو اس گروہ سے تھی اس کھٹک کو برابر محسوس کیا ہے۔ ان کا جواب اس سلسلہ میں اپنے آغوش میں جو پُرلطف طنز لئے ہوئے ہے وہ مطالعہ و غور کے قابل ہے۔ ان کا کہنا ہے۔ کہ ہم ایسے عبادِ دنیا کا تو احترام کرتے ہیں جو اقدار روحانی کو پامال کرتے ہیں۔ حظوظ نفس پر مٹے ہوئے ہیں۔ اور صبح و مسا اللہ تعالےٰ کی نافرمانیوں میں معروف ہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے۔ ان کے سر بفلک محل اور اونچے اونچے مکانات ہیں۔ اور رہنے سہنے کا انداز ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ایسے فقراء کو بنظرِ تحقیر دیکھتے ہیں، جو دولت آخرت سے مالا مال ہیں۔ لیکن امور دنیا میں متساہل ہیں۔ غزالی دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کو اس تساہل کے باوجود نہ صرف یہ کہ معذور انسان خیال کرنا چاہئیے بلکہ ان کو قابلِ صد احترام سمجھنا چاہئیے

ع
مبیں حقیر گدایانِ قوم راکیں قوم
شاہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

ترجیح معانی

اس سے قبل تصوّف کی جن خصوصیات سے تعرض کیا گیا ہے۔ ان کا تعلق صوفیاء کے کردار و عمل اور فکر تصوّر سے ہے۔ ترجیح معانی کا تعلق ان کے مخصوص انداز تعبیر سے ہے۔ یہ وہ ہمہ گیر عنصر ہے۔ جو قریب قریب دنیا بھر کے متصوفانہ ادب میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ادبیات میں ایک خاص قسم کا نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ اور عمق اور گہرائی اُبھر آئی ہے۔ اور جہاں تک مذہب کے اونچے فکری حقائق اور شعائر و رسوم یا تاریخ کا تعلق ہے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اس پیرایۂ بیان نے نہایت موزوں اور مؤثر ترین دلائل کی تخلیق کی ہے۔ ان دلائل کی تخلیق جو ارسطو کی منطق سے قطعی پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ پیرایہ بیان سراسر تمثیلی، مجازی اور اشارتی ہے۔ اس پیرایہ بیان سے کن حقائق کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے اور فکر و عقیدہ کے کون کون عقدے کھلتے ہیں اس کے لئے صوفیاء سے متعلق دراصل کتابیں پڑھنے کے لائق ہیں۔ جن میں خصوصیت سے ان کے عارفانہ مذاق کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔

یہ حضرات الفاظ کے ظاہری محمل سے کہیں زیادہ یہ دیکھنے کے عادی ہیں۔ کہ اس لباس ظاہری کے اندر وہ جسم معنوی کون ہے؟ جو اصل میں مقصود ہے۔ یہ سطحوں کو نہیں چھوتے، عمق اور گہرائی کو دیکھتے ہیں۔ چھلکے اور قشر سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر مغز کی مقدار کتنی ہے۔ چنانچہ تاریخ، شعائر و رسوم یا عبادات کے معاملہ میں یہ صرف ظواہر سے متاثر ہونے والے نہیں۔ بلکہ ان کے نقطۂ نظر سے ان چیزوں میں ان کا باطن ڈھونڈنا چاہیئے۔ ان کی روح تلاش کرنا چاہیئے، اور معانی کا کھوج لگانا چاہیئے جو مطلوب اصلی ہیں۔

ایک فقیہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ظاہری تفصیلات بیان کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور ان کے فلسفہ سے قطعًا تعرض نہیں کرتا۔ ایک متکلم صرف عقائد کی حد تک فکر و تعمق کی صلاحیتوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ لیکن تاریخ یا شعائر و رسوم کی کوئی تسلی بخش توجیہ بیان نہیں کرتا۔ ایک مؤرخ صرف واقعات بیان کرتا ہے۔ مگر ان گذشتہ حقائق کا ہماری موجودہ زندگی سے کیا تعلق ہے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔

اسی طرح ایک محدث صرف احادیث و روایات کی حد تک مسئلہ کی چھان بین کرتا ہے۔ مگر کسی مسئلہ کی گہرائی میں ڈوب کر اس کے اندر جو معنویت ہے اس کو تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

مگر صوفی جب ان مسائل پر گفتگو کرے گا تو اس کا انداز ان سے مختلف ہوگا۔

وہ نمازیں جو معنویتیں ہیں ان کی نشان دہی کرے گا۔ ان کے روحانی فلسفہ کو نکھار کر نظر و بصر کے سامنے لائے گا۔ اور بتائے گا ——— کہ عبادات کے اس نظام کو تقرب الی اللہ کے لئے کیونکر استعمال کیا جاسکتا ہے؟ نیز وہ بتائے گا کہ عبادات کو فکر و تعمق یا تدبر اور تاثر پذیری کی اعلیٰ قدروں پر کیونکر بدلا جاسکتا ہے۔

تاریخی حقائق کو صوفی صرف ماضی کا قصہ پارینہ خیال نہیں کرتا۔ بلکہ اس کو ہمیشہ اس طرح سمجھتا ہے۔ اور بیان کرتا ہے۔ کہ آج بھی ہم ان سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اور متاثر ہو سکتے ہیں۔

صوفی کے نزدیک آدم، شیث، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسےٰ یا آں حضرت کی ذات گرامی صرف شخصیتیں نہیں ہیں۔ بلکہ فکر و عمل کی کچھ حقیقتیں ہیں۔ کچھ نکات اور اسباق ہیں۔ یہ صرف افراد نہیں۔ اشارات مفاہیم اور معانی ہیں۔

تاریخ کے بارہ میں ایک صوفی کا اشکال دراصل یہ ہے کہ اگر اس کو ایک مؤرخ کی طرح وہ بھی صرف قصئہ ماضی سمجھے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس سے حاصل؟ جو چیز گذر چکی اس سے بحث کا فائدہ؟ صوفی ماضی اور گذشتہ واقعہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ یہ صاحب حال ہے اس لئے صرف حال ہی سے تعرض کرتا ہے۔ اس کے نزدیک دین کی پوری تاریخ اس لائق ہے کہ اس کو حال کے آئینہ میں دیکھا جا سکے۔ یعنی اس میں جو اشارات ہیں۔ جو عبر اور اسباق ہیں۔ اور جو روح اور معنویت کارفرما ہے اس کو اپنانے کی کوشش کی جائے۔ یہی دین کا حاصل اور مطلوب بھی ہے۔ اور تاریخ کے بارہ میں یہ نقطۂ نظر کچھ انوکھا یا عجیب و غریب نہیں۔ بلکہ

بعینہ وہی ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ چنانچہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس میں مختلف قوموں، نبیوں اور ان کے مخالفین کا جو ذکر ہے۔ اس سے مقصود صرف تاریخ بیان کرنا نہیں۔ بلکہ عبر و موعظت کے پہلوؤں کی نشان دہی کرنا ہے۔

اسی طرح رسوم و شعائر کی صوفی ایسے پیارے اور روح پرور انداز میں تشریح کرتا ہے۔ کہ جس سے یہ چیزیں مُردہ، نحس اور محض بے جان، اور بے مقصد تقلید و اتباع کا مظہر ہی نہیں رہتیں۔ بلکہ ان میں ایک طرح کی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں ان سے عمل و مجاہدہ کے داعیے اُبھرتے ہیں۔ اور اتباع و وابستگی کے تقاضے استوار ہوتے ہیں۔

اس اندازِ فکر اور اسلوب انشاء و تحریر کا انتہا پسندانہ نمونہ وہ ہے۔ جو ابن عربی کی نصوص الحکم یا فتوحات میں پایا جاتا ہے۔ اور نہایت متوازن اور معقول انداز یہ وہ ہے جس کے غزالی حامل ہیں۔ اس بنا پر جب ہم یہ کہتے ہیں، کہ صوفیاء الفاظ و ظواہر کے مقابلہ میں معانی کو ترجیح دیتے ہیں تو اس سے ہماری مُراد صرف غزالی اور ان کا منہاج فکر ہوتا ہے۔ جس میں معنویت کے ساتھ ساتھ ظواہر کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ غزالی میں دوسرے وجودی صوفیاء کے مقابلہ میں یہ توازن کیوں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف کی منزلیں طے کرنے سے پہلے یہ بہرحال ایک منجھے ہوئے عالم دین بلکہ سرخیل علماء تھے۔ اس لئے اُنھوں نے تصوف کی جس شاخ کو اپنایا ہے قدرتاً وہ ان کے ذوقِ اعتدال کے خلاف نہیں ہو سکتی تھی۔

ان کے نقطۂ نظر سے ترجیح معانی کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ یہ عبادات کی وضاحت میں رسوم و شعائر کی تعبیر میں یا معاملات کی تشریح و ترجمانی میں،

فقہی مسائل کے پہلو بہ پہلو ایسی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔ جن سے ایمان کے دواعی تازہ ہوتے ہیں۔ تذکر و تاثر کے عوامل کو تقویت ملتی ہے۔ اور شوق و ذوق کے قافلے سرگرم سیر نظر آتے ہیں۔

کتاب کا اصل موضوع بھی یہی ہے کہ امام غزالی نے فقہ میں تصوف کو کیونکر سمو کر بیان کیا ہے۔ اور اس طرح دونوں کو ایک ساتھ ملحوظ رکھنے سے فقہ و تصوف کی قدر و قیمت میں کس درجہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ امام اس لئے جانفزا اسے خوب آگاہ ہیں کہ فقہ و قانون میں اگر متصوفانہ عنصر معدوم ہو جائے تو پھر اس میں وہ زندگی وہ روحانیت، اور وہ معنویت باقی نہیں رہتی جو مقصود اسلام ہے۔ بلکہ پھر قانون و فقہ میں ایک انداز کا جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک طرح کی تنگ نظرانہ ذہنیت ابھرآتی ہے اور یہ سارا کارخانہ ہی بے جان اور ٹھس ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی نہیں پھر اس میں تعزیع در تعزیع اور حیل ایسی برائیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں جو کہ دنیا وہی قانون کا خاصہ ہیں تو دینی کا نہیں۔ اسی طرح اگر تصوف کو قید شریعت میں محصور نہ رکھا جائے اور اس کی فقہی و دینی حدود کی تعیین نہ کی جائے تو یہ تصوف بے راہ روی لحاد اور زندقہ کے راستہ پر ہولیتا ہے اور بجائے اس کے کہ سالک میں یمان و اخلاص کے جذبوں کو ابھارے، الٹا گمراہی و ضلالت کا باعث ثابت ہوتا ہے۔ گویا فقہ و تصوف میں تعلق و رشتہ کی وہی نوعیت ہے جو جسم و روح میں ہے۔ اگر فقہ کے احکام و مسائل میں یہ روح جاری و ساری ہے و جسم کا ڈھانچہ بھی قائم ہے۔ اور یہ روح نہیں ہے تو پھر یہ ڈھانچہ نہیں لاش ہے۔

اس کتاب میں ہم نے امام کے اسی پہلو کو خصوصیت سے دکھانے

کی کوشش کی ہے۔ ہم کہاں تک اس میں کامیاب رہے ہیں اس کا اندازہ تو اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہاں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند ابواب کے مندرجات کا خلاصہ ہم پیش کرتے ہیں تاکہ فتنہ کے بارہ میں ان کے اس منفرد و اچھوتے انداز فکر کا آپ کو کچھ کچھ اندازہ ہو سکے۔ نیز یہ معلوم ہو سکے کہ ایک خشک فقیہ اور صوفی و علیم فقیہ میں فرق و امتیاز کی کیا نوعیت ہے۔

مثلاً یہ جب مسائل نماز کا ذکر کرتے ہیں تو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس کے متعلقات بلکہ ہر ایک کی تائید میں قرآن و حدیث کی تصریحات پیش کر دیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ بتاتے ہیں کہ نماز کی روح اور حاصل کیا ہے۔ اس میں خشوع و تضرع کا کیا درجہ ہے۔ اور غفلت و سہو کس درجہ مضر ہے۔ پھر یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف جب نماز پڑھتے تھے تو ان پر شوق و محویت، یا خوف و خشیت الٰہی کا کس درجہ غلبہ و استیلا ہوتا تھا۔ نماز کے ضمن میں حضور قلب ان کا خاص موضوع ہے۔ فقہائے ظاہر کے نزدیک تو ایک شخص اگر صرف تکبیر تحریمہ کی حد تک حضور قلب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کے نزدیک حضور قلب پوری نماز میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ اس مرحلہ پر انھوں نے ایک نہایت لطیف بحث یہ چھیڑی ہے کہ عبادات و معاملات میں کیا فرق ہے؟ ان کا کہنا ہے کہ معاملات میں قصد و ارادہ کی پاکیزگی یا فکر و قلب کی یکسوئی اور اخلاص بلاشبہ شرط صحت نہیں مگر عبادات میں یہ چیزیں نہایت ضروری ہیں۔

نماز کے کیا لطائف باطنی ہیں۔ ان کی جس روح پرور انداز میں انھوں نے پردہ کشائی فرمائی ہے وہ اصل کتاب ہی میں دیکھنے کے لائق ہیں۔

صدقات کی بحث میں یہ صرف یہی نہیں بتاتے کہ صدقات کی حیثیت کیا ہے؟ کن حالات میں کن کن لوگوں پر یہ فرض ہیں۔ اور کہاں کہاں اور کن کن صورتوں میں مستحب ہیں یا ان کا محل و مصرف کیا ہے؟ کہ یہ سب بحثیں خالص فقہی انداز کی ہیں۔ ان کا اصلی موضوع یہ ہے کہ صدقات سے کس طرح ایک مکمل عبادت کا کام لیا جا سکتا ہے؟ مثلاً ان کے ہاں اس سلسلہ میں یہ بحث زیادہ اہم ہے کہ سرّ و اظہار میں سے کون صورت ایسی ہے جو زیادہ اخلاص و احسان کے نقوش کو ابھارنے والی ہے۔ دونوں کے دلائل کیا ہیں۔ اور کس دلیل میں باطن و قلب کے نقطۂ نظر سے زیادہ وزن ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو پھر یہ اسلاف کے طرزِ عمل کی ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جو نہایت درجہ دلنشیں، مؤثر اور ایمان آفریں ہیں۔

روزہ کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی روح و فلسفہ پر زیادہ زور دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جہاں کھانے پینے یا جنسی فعل سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، وہاں جھوٹ، غیبت اور ریا سے بھی اس کی حقیقت متاثر ہوتی ہے۔ اور برائیوں اور معصیتوں سے بھی اس کی صحت و اثر آفرینیوں میں فرق آتا ہے۔ امام روزہ کے سلسلہ میں اس حقیقت کو مختلف طریقوں سے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ جس طرح اس کا ایک ظاہر ہے اسی طرح اس کی ایک روح اور باطن بھی ہے۔ پھر جس طرح پانی کا ایک گھونٹ اور روٹی کا ایک بھورا اس کے ظاہر کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے ٹھیک اسی طرح غیبت و ریا کا ایک مظاہرہ اس کی روحانیت اور معنویت کو ملیامیٹ کر دینے کے لیے کیوں کافی نہیں؟ ان کا موقف یہ ہے کہ

عبادات میں معانی باطنہ کی نزاکتوں کا خیال رکھنا ظواہر کی رعایت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ عبادات تو عبارت ہی باطن و روح کی کیفیات سے ہیں۔

اسی طرح حج کی تفصیلات پر قلم اٹھاتے ہیں تو ایسے پیارے انداز میں کہ شوق و محبت اور عشق و وارفتگی کے قافلے آگے بڑھ کر قلم چوم لیتے ہیں۔ اس باب میں یہ ان تمام منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں عازم حج کو جو پیش آنی چاہئیں۔ اور پھر بتاتے ہیں کہ اخلاص و محبت کی ہر ہر منزل میں جذبات کی کیا نوعیت ہونا چاہیے۔ اور دل کی کیفیات کو کن امور پر مرکوز رہنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اس باب کا مطالعہ ہر اس شخص کو کرنا چاہیے جو حج کا ارادہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس عبادت کی سعادتوں سے صحیح معنوں میں بہرہ مند ہو۔ اس باب کو پڑھنے سے دو ہی تاثر قاری پر طاری ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارا مروجہ حج کس درجہ بے جان، کس درجہ بے روح اور کتنا بے کیف ہے۔ دوسرے یہ آرزو دل میں کروٹ لیتی ہے کہ اے خالق ہمارے دل میں اخلاص و احسان اور شوق و محبت کی وہی کیفیتیں ابھر سکیں جن کی غزالی کے عارفانہ قلم نے تصویر کھینچی ہے۔ دو لفظوں میں اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ غزالی حج کو کوچۂ یار میں حاضری قرار دیتے ہیں اور بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ کوئے یار میں حاضری کے وقت جس ادب، جس شوق، اور جس بے قراری کا ایک عاشق صادق کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بالکل انھیں کیفیات کا استحضار ان دیار میں حاجی کے لیے ضروری ہے۔

بالکل یہی انداز دوسرے ابواب کا ہے۔

غزالی کا اصل شاہکار فہم قرآن کا باب ہے۔ جس کو ہم نے عنوان سب

سے آخر میں رکھا ہے۔ حالانکہ اس کی اہمیتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس
مخزن ہدایت اور سرچشمۂ انوار باب کے تعارف ہی سے کتاب کا افتتاح کیا
جاتا کہ یہی حرف ، حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ہم نے ترتیب
کی اس تبدیلی کو بجبر اس لیے اختیار کیا ہے تاکہ آخر آخر میں ذہن و فکر کی
گرفت میں جو چیز باقی رہ جائے وہ اسی کی تفصیلات ہوں اور اسی کے
متعلق گہر ہائے معانی ہوں ۔ کوئی دوسری چیز نہ ہو۔ اور سچ یہ ہے کہ جس
کی لوح دل پر قرآن کی عظمت و گہرائی کے نقوش ثبت ہو گئے اس نے
دنیا کی تمام نعمتوں سے اپنا دامن طلب بھر لیا۔

اس باب میں امام نے کیا کیا گلفشانیاں کی ہیں اور فہم و تدبر کے کن
کن دروازوں پر دستک دی ہے ۔ اس کو کچھ اصل کتاب ہی میں دیکھیے۔
یہاں ذکر کریں گے تو لطف جاتا رہے گا ۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

تعلیماتِ غزالی

عبادات

اسرارِ طہارت

طہارت پاکیزگی اور طہارت کا اسلام میں کیا مقام ہے؟ اس سے متعلق حسب ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:

(۱) بنی الدین علی النظافۃ۔	دین کی بنیاد پاکیزگی پر رکھی گئی ہے۔
(۲) مفتاح الصلوٰۃ الطھور۔	پاکیزگی نماز کی کلید ہے۔
(۳) الطھور نصف الایمان	پاکیزگی نصف ایمان ہے
(۴) فیہ رجالٌ یحبّون ان یتطھروا واللہ یحبّ المطھرین (توبہ ۱۰۸)	اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور خدا پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔
(۵) ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم (مائدہ)	خدا تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تو تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے۔

ان کھلی کھلی باتوں سے اربابِ بصیرت نے معلوم کیا کہ باطن قلب کی پاکیزگی جسمانی پاکیزگی سے کہیں اہم ہے کیونکہ جب آں حضرتؐ

نے اس حقیقت کا اعلان فرمایا ہے کہ پاکیزگی نصف ایمان ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ پانی سے اعضاء و جوارح کو تو دھونا چاہیے اور پاک کرنا چاہیے مگر قلب و باطن کو بدستور غلاظتوں اور عفونتوں سے آلودہ رہنے دیا جائے اور اس کی پاکیزگی اور ستھرائی کا کوئی اہتمام نہ کیا جائے۔ شریعت مطہرہ کے بارے میں ایسا گمان کرنا بعید تر ہے۔

تطہیر کے مدارج

تطہیر کے دراصل کئی درجے ہیں اور جسمانی صفائی ستھرائی کا تعلق صرف پہلے درجے سے ہے۔ دوسرا درجہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اعضاء و جوارح کو گناہوں اور معصیتوں کے ارتکاب سے باز رکھا جائے۔

تیسرا درجہ یہ چاہتا ہے کہ قلب اخلاق مذمومہ اور بدترین رذائل سے محفوظ رہے۔

چوتھا درجہ انبیاء و صدیقین کا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسرار قلب میں اللہ تعالےٰ کے سوا ہر کسی کی دخل اندازیوں کا انکار کیا جائے۔ اس کو تطہیر سر کہتے ہیں۔ یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کسی شخص پر اللہ تعالےٰ کا جلال و عظمت پوری طرح منکشف ہو جائے لیکن یہ اس وقت تک حاصل ہونے والا نہیں جب تک کہ دل ما سواء اللہ سے کلیتہً پاک نہ ہو جائے۔ قرآن کریم میں ہے:

قل اللہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون (الانعام ۹۱)	اور کہہ دو خدا ہی پر ان کو چھوڑ دو بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں۔

کیوں اس لیے کہ ایک دل میں ایک ہی سودا اور جنون ہو سکتا ہے۔ یا اللہ تعالےٰ کی طلب و جستجو کا یا ما سواء اللہ کی تلاش کا۔

وماجعل اللّٰہ لرجل من قلبین فی جوفہ (الاحزاب) اور خدا نے کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے۔

ایمان کے مختلف مقامات میں ایک طرح کا تفاوت اور ترتیب پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ایک شخص اگر چاہتا ہے کہ سب سے اوپر کے درجے اور مقام پر فائز ہو تو پہلے اسے نیچے کے درجے سے گزرنا ہوگا۔ مثلاً جب تک کوئی شخص دل کو ذمائم اخلاق سے پاک نہیں کرتا اور اس میں محاسن اخلاق کی تخم ریزی نہیں کرتا۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک ہی جست میں تطہیر سر کے مقام رفیع تک رسائی حاصل کرے۔ اس کے لئے تو اسے تاحیات محنت کرنا پڑے گی۔ اور اپنے کو معاصی اور مباحات کی ہر ہر صورت سے دست کش رکھنا ہوگا۔ تب کہیں جا کر یہ مقام ملے گا۔ اب جس شخص کے سامنے درجات و مقامات کی یہ ترتیب نہیں ہے۔ وہ تطہیر و پاکیزگی کے اس مقام پر اٹک کر رہ جائے گا۔ جس کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہاتھ منہ دھویا جائے، غسل و استنجا کا اہتمام کیا جائے اور پہننے کے کپڑے صاف ستھرے رہیں۔ یہ شخص تطہیر ظاہر کی جزئیات میں کھویا رہے گا اور تاحد وہم وغلو انہیں میں الجھا رہے گا لیکن مطلق نہیں جان پائے گا کہ ان کے علاوہ بھی پاکیزگی کا کوئی اعلیٰ و ارفع مقام ہے۔

صحابہ کا ذوقِ تطہیر صحابہ کا ذوقِ تطہیر ظواہر سے کس درجہ بے نیاز تھا۔ اور وہ کس درجہ باطن و قلب کے سنوارنے میں منہمک رہتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت عمر ایسا جلیل القدر انسان اس میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ ایک عیسائی عورت کے گھڑے سے وضو کر لے۔ یہ تو ان کا حال تھا۔ عام صحابہ کی یہ کیفیت تھی کہ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے بلکہ کمال سادگی سے چکنائی

ے سنے ہوئے ہاتھ پاؤں کے تلووں سے پونچھ ڈالتے۔

اسی طرح اشنان (ایک طرح کا سفوف) کے استعمال کو مکروہ جانتے تھے زمین پر سجدہ کرتے، ننگے پاؤں گلیوں اور بازاروں میں چلتے، ان میں ایسے حضرات بھی تھے کہ براہِ راست زمین کو بچھونا قرار دیتے، اور طہارت میں صرف ڈھیلے پر اکتفا کرتے۔

حضرت عمر کا ارشاد ہے:

ماکنا نعرف الاشنان فی عصر رسول اللہ وانما کانت منادیلنا بطون ارجلنا۔

ہم صفائی کے لئے اشنان استعمال نہیں کیا کرتے تھے، ہمارے رومال تو بس ہمارے تلوے تھے۔

امور دنیا میں صحابہ کی یہی سادگی اور بے نیازی تھی جس کی وجہ سے کہا گیا کہ آنحضرت کے بعد اول اول جو بدعات رواج پذیر ہوئیں وہ یہ چار تھیں۔ چھلنی اور اشنان کا استعمال۔ دسترخوان کا التزام اور بھرپیٹ کھانا۔

توجہ باطن

توجہ باطن اور تزکیہ قلب کو صحابہ میں جو اہمیت حاصل تھی اس کا یہ اثر تھا کہ بعض ایسے امور میں بھی یہ تساہل کو اولیٰ سمجھتے تھے جن کو ظاہری پاکیزگی کے متممات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس اندیشے سے کہ مبادا ان چیزوں میں انہماک التفات الی اللہ کے آڑے نہ آئے۔ چنانچہ کچھ صحابہ کی رائے تھی کہ جوتے سمیت نماز پڑھنا افضل ہے۔ امام نخعی کہا کرتے تھے کہ:

وددت لوان محتاجا جاء الیھا فاخذ ھا۔

میں تو یہ چاہتا کہ کاش کوئی حاجت مند ان لوگوں کے جوتوں کو اٹھا لے جائے جو جوتا اتار کر نماز پڑھتے ہیں۔

غرض یہ تھی کہ جن لوگوں کو اس انداز کی ادنیٰ فکریں گھیرے رہتی ہیں وہ عبادت سے کیا لطف اندوز ہو سکیں گے۔

موجودہ دَور کا جذبہ تزئین و آرائش

یہ تو صحابہ کی سادہ زندگی تھی لیکن اب تو تزئین و آرائش کا جذبہ اس حد تک فروغ پا گیا ہے کہ لوگ رعونت و کبر کو نظافت و پاکیزگی سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ اور اس کو دین کی بِنا اور اساس ماننے لگے ہیں۔ اب یہ عروس اور دلہن کی طرح یوں بن ٹھن کر رہتے ہیں کہ گویا یہی حاصلِ حیات ہے۔ یہ تو ظاہر کا زنگ و روغن ہوا۔ باطن اور قلب کا یہ حال ہے کہ یہ رذائلِ اخلاق سے ملوث ہے۔ اور اس میں کیا نہیں؟ تکبر اور حبِ ذات کی جھلکیاں بھی ہیں۔ اور جہل و ریاکاری کی بدمستیاں بھی۔ مزید برآں شوائبِ نفاق کی اچھی خاصی مقدار بھی پائی جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان رذائل پر خوش ہیں۔ اور اگر آج کوئی شخص پہلی سی سادگی اختیار کرے مثلاً استنجا میں پانی استعمال نہ کرے، ننگے پاؤں گھومے پھرے، صحنِ مسجد میں کھلی زمین پر سجدہ ریز ہو جائے اور سجادہ و قالین کی پرواہ نہ کرے۔ یا کسی ایسے شخص کے برتن سے وضو کرے جو متقشف نہ ہو۔ تو یہ لوگ اس کے خلاف قیامت برپا کر دیں گے۔ اسے گندا اور غلیظ کہیں گے۔ یہی نہیں اس کے ساتھ کھانا پینا تک بند کر دیں گے۔ یعنی اب سادگی اور امورِ دنیا کے معاملہ میں تساہل غلاظت ہے، اور رعونت و کبر لطافت، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صوفیاء نے اس معاملہ میں جو غلو روا رکھا ہے۔ اور خواہ مخواہ منکرات اور برائیوں کو جو اپنا رکھا ہے ہم اس کی تائید کر رہے ہیں۔ حاشا اللہ ہمارا یہ مطلب نہیں۔ ہمارے نزدیک نظافت و تطہیر کا مسئلہ تفصیل چاہتا ہے۔ اور بغیر تفصیل کے اس بارہ میں کچھ کہنا

غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔

تکلف کے حدود

تفصیل یہ ہے کہ ستھرائی اور پاکیزگی و تطہیر کا یہ جذبہ یا زندگی میں تھوڑا بہت تکلف فی نفسہ اس میں کوئی عیب نہیں۔ اسلام ان چیزوں کو قطعی مباح اور جائز سمجھتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس نیت سے ان مباحات کا استعمال ہو رہا ہے اور کن احوال و کیفیات کے ساتھ یہ وابستہ ہیں۔ اگر نیت صحیح ہے اور احوال و کیفیات میں بھی کوئی شے کھٹکنے والی نہیں تو ان کے جائز ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اسلام ہر شخص کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔ بشرطیکہ اضاعت و اسراف کا کوئی اندیشہ لاحق نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص ان مباحات کو اصل دین سمجھتا ہے اور ان لوگوں کو بنظر تحقیر دیکھتا ہے جو اوائل اور قدما کی پیروی میں ان تکلفات کے عادی نہیں۔ تو یہ بلاشبہ ناجائز ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بناؤ سنوار میں لگا رہتا ہے اور تزئین و آرائش کو دکھاوے کی نیت سے اختیار کرتا ہے تو اس کو بھی درست نہیں مانا جا سکتا۔

نظافت ظاہری سے دست کشی کی شرط

غرض یہ ہے کہ جہاں تک اہل علم و عمل کا تعلق ہے ان کا شیوہ یہی رہنا چاہئے کہ ضرورت سے زیادہ ان امور میں دلچسپی نہ لیں اور عمر عزیز کو جو بہت ہی قیمتی جوہر ہے جسم و ظاہر کی تزئین میں ضائع نہ کریں۔ بلکہ اپنے کو ان امور کی تکمیل کے لئے وقف کئے رہیں جو ان سے کہیں زیادہ توجہ کے لائق ہیں۔ اس وضاحت سے ان لوگوں کو شبہ میں نہیں پڑنا چاہئے جو عبادات و زہد میں سست اور متساہل ہیں۔ ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ صحابہ و اتقیاء کی تقلید میں نظافت ظاہری سے دست کش ہو جائیں۔ کیونکہ وہ

اگر وضع قطع اور لباس و آرائش کے معاملہ میں تغافل برتتے تھے تو اس بنا پر کہ ان کو ایسے ایسے اہم امور انجام دینا تھے کہ اگر وہ ان چیزوں پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیتے تو کسی طرح بھی ان سے نہ نبپٹ سکتے۔ ان کے سامنے یہ اصول رہتا تھا، کہ زیادہ اہم کیا ہے۔ اور توجہ و التفات کی عنان کو پہلے کس طرف موڑنا چاہیئے۔ یہی مطلب ہے داؤد طائی کے اس قول کا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ داڑھی کے الجھاؤ کو دور کیوں نہیں کرتے۔ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ یہاں اتنی فراغت کسے حاصل ہے؟ یعنی دقائق باطن اتنی مہلت ہی کہاں دیتے ہیں کہ تکلفات ظاہر سے تعرض کیا جائے۔ لیکن ان لوگوں کا یہ حال نہیں اس لئے انہیں ترک مباحات کا مشورہ دینا سراسر غلط ہوگا۔

صحابہ کے غور و فکر کے مسائل

صحابہ و اتقیاء کن امور میں غور و فکر کرتے تھے اور کن رموز و نکات کی طرف ان کا ذہن ملتفت رہتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ ایک مرتبہ سفیان ثوری اپنے ایک دوست کے ساتھ جا رہے تھے کہ ان کی نظر اس پر اس حال میں پڑی کہ یہ بڑے انہماک اور تعجب سے ایک محل کی طرف نظریں گاڑے ہوئے ہیں۔ کہا یہی دلچسپی تو ان سرمایہ داروں کو اس ریاکاری پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ ایسے سربفلک محلات تعمیر کریں۔ ورنہ ہرگز ان کو جرأت نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے مال کو یوں بے دریغ صرف کریں۔ اور اسراف و تبذیر کے مرتکب ہوں۔ گویا صحابہ و اتقیا کا مذاق خاص یہ تھا کہ احتمالاتِ ریاء اور دقائقِ ظلم پر ان کی نگاہ رہے۔ رہی یہ بات کہ مسئلہ نجاست و تطہیر کی باریکیاں کیا ہیں۔ تو وہ ان کے بارے میں بہت کم سوچتے تھے۔

فضائلِ وضو

ایک حدیث میں آیا ہے :

من توضاء فاحسن الوضوء و صلی	جس نے وضو کیا اور اس کی تکمیل بھی کی
رکعتین لم یحدث نفسه فیهما	پھر اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ
بشئ من الدنیا خرج من ذنوبه	اس میں اس نے اپنے دل میں دنیا سے
کیوم ولدت امه ۔	متعلق کوئی بات چیت نہیں کی تو یہ گناہ

سے یوں بچ کر نکل گیا کہ گویا ابھی ابھی پیدا ہوا ہے اور تہمت گناہ سے بالکل بری ہے۔

آں حضرت نے ایک ایک بار بھی اعضا وضو کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اس کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ اور دو بار بھی دھویا ہے۔ اور فرمایا ہے جو دو دو مرتبہ ہر ہر عضو کو دھوتا ہے اس کو دُھرا اجر ملے گا۔ جب تین تین بار دھویا تو فرمایا :

هذا وضوئی و وضوء الانبیاء من	وضو میں یہ میرا طریق ہے یہی مجھ سے پہلے
قبلی و وضوء خلیل الرحمٰن ابراهیم	انبیاء کا طریق ہے اور خصوصیت سے
علیه السلام[۲] ۔	یہی طریق اللہ تعالےٰ کے دوست اور

خلیل ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔

وضو کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ کا ذکر بھی ہونا چاہئے۔ آنحضرت[۲] کا ارشاد ہے :

---

[۱] معنیٰ متفق علیہ ہے۔ [۲] روایت عبداللہ بن عمر

من ذکر اللہ عند وضوءہ طہر اللہ جسدہ کلہ ومن لم یذکر اللہ لم یطہر منہ الا ما اصاب الماء۔[1]	جو وضو کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے تمام جسم کو پاک کردیتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیتا تو اس کی طہارت اعضاءِ وضو ہی تک محدود رہتی ہے۔

اسلام میں پاکیزگی اور طہارت کا کیا درجہ ہے؟ اس کے بارے میں یہ حدیث یاد رکھئے:

ان الطاھر کالصائم۔[2]	طاہر اور صاف ستھرا رہنے والا روزہ دار کی طرح ہے۔

حضرت عمر کا کہنا ہے:

ان الوضوء الصالح یطرد عنک الشیطان۔	توجہ و اہتمام سے کیا ہوا وضو شیطان کو تم سے دور رکھے گا۔

---

[1] دارقطنی۔ [2] ابومنصور الدیلمی۔

نماز کی اہمیتیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا (نساء ۱۰۳)	بے شک نماز کا مومنوں پر اوقاتِ مقررہ پر ادا کرنا فرض ہے۔

حدیث میں ہے:

خمس صلوات کتبھن علی العباد فمن جاء بھن ولم یضیع منھن شیئاً استخفافا کان عند اللہ ان یدخلہ الجنۃ ومن لم یات بھن فلیس عند اللہ عھد ان شاء عذبہ و ان شاء عذبہ وان شاء ادخلہ الجنۃ۔[1]	پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض قرار دی ہیں۔ اب جو پانچ نمازیں ادا کرتا ہے اور ازراہِ استخفاف کوئی نماز چھوڑتا نہیں اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ لیکن جو پانچوں نمازیں نہیں پڑھتا۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا کوئی عہد و

اقرار نہیں چاہے تو اس پر سزا دے اور چاہے معاف کر دے اور جنت میں داخلے کی اجازت بخشے۔

نماز پانی کی طرح پاکیزگی بخشتی ہے

ایک دوسری حدیث میں ہے:

مثل الصلوٰۃ الخمس کمثل نھر بباب احدکم یقتحم فیہ کل یوم خمس مرات فما ترون

---

[1] ابن حبان

ذلک یبقی من درنہ قالوا لا شئ قال صلی اللہ علیہ وسلم فان الصلوٰۃ الخمس تذھب الذنوب کما یذھب الماء۔[1]

پانچ وقت نماز پڑھنا یوں ہے۔ جیسے تمہارے مکان کے سامنے ایک نہر بہ رہی ہو جس میں پانی کثرت سے ہو۔ اور تم روزانہ پانچ مرتبہ اس میں نہاؤ۔ تو کیا اس صورت میں میل باقی رہے گا؟ صحابہ نے کہا جی نہیں۔ آں حضرت نے ارشاد فرمایا نماز کا یہی حال ہے۔ جس طرح پانی سے میل دور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس سے گناہوں کے داغ دھبے سب دھل جاتے ہیں۔

نماز اور منافقین

مسلمانوں اور منافقوں میں نماز ہی ایک کامیاب فارق ہے:

بیننا وبین المنافقین شھود العتمۃ والصبح لا یستطیعونھا۔[2]

ہم میں اور منافقوں میں یہ فرق ہے کہ یہ لوگ عشاء اور صبح کی نماز میں حاضر نہیں ہو پاتے۔

نماز دین کا ایک اہم رکن ہے:

الصلوٰۃ عماد الدین فمن ترکھا فقد ھدم الدین۔[3]

نماز دین کا ستون ہے۔ سو جس نے اسے ترک کیا اس نے گویا اسے گرانے کی کوشش کی۔

آں حضرت سے پوچھا گیا کہ بہترین عمل کونسا ہے۔ آپ نے فرمایا:

الصلوٰۃ لمواقیتھا[4]

وقت پر نماز پڑھنا۔

---

[1] حضرت جابر سے مروی ہے۔
[2] سعید بن المسیب نے مرسلاً روایت کیا ہے۔
[3] بیہقی میں ہے۔
[4] احمد کی روایت ہے۔

تارک الصلوٰۃ کا حشر کن لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کے متعلق ایک حدیث سنئے:

من حافظ علی الخمس بالکمال طهورها ومواقیتها کانت له نوراً وبرهاناً یوم القیامة۔ ومن ضیعها حشر مع فرعون وهامان۔[1]

جس کسی نے پانچوں نمازوں کی اس طرح محافظت کی کہ پوری طرح وضو بھی کیا اور وقت پر پابندی سے نمازیں بھی ادا کیں۔ اس کو قیامت کے روز نور اور برھان عطا کیا جائے گا۔ اور جس نے نمازیں ضائع کیں ان کو فرعون اور ہامان کی معیت نصیب ہوگی۔

نماز اور کشائش رزق

نماز کی دنیاوی نفع مندیوں کی آں حضرت نے یوں تصریح فرمائی:

یا ابا هریرة مر اهلك بالصلوٰة فان الله یاتیك بالرزق من حیث لا تحتسب۔

اے ابو ہریرہ اپنے بال بچوں کو نماز کی تلقین کر۔ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ایسے ایسے طریقوں سے کشائش رزق کا سامان مہیا کرتا ہے جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ آسکیں۔

نوافل اسی وقت اندیاد اجر کا باعث ہوتے ہیں جب فرائض بھی ادا کیے جائیں۔ چنانچہ ایک عالم نے کیا خوب فرمایا ہے کہ نماز بھی تاجر کی طرح ہے کہ اگر اس کا راس المال محفوظ ہے تو نفع کی بھی امید کی جا سکتی ہے ورنہ نہیں۔

---

[1] ماخذ غیر معلوم۔

نظامِ ارکان

تعدیل ارکان بہت ضروری ہے۔ حدیث میں ہے:

مثل الصلوٰۃ المکتوبۃ کمثل المیزان من اوفیٰ استوفیٰ[1]

مفروضہ نماز ترازو کی طرح ہے جس نے پوری طرح تولا تو وہی پوری طرح اجر پانے کا مستحق بھی ہے۔

آنحضرت کی نماز

آنحضرت کیونکر اطمینان کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے اس کا نقشہ یزید الرقاشی نے یوں کھینچا ہے:

کانت صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستویۃ کانہا موزونۃ[2]

آنحضرت کی نماز میں تعدیل ارکان کی موزونیتیں اس انداز کی ہوتی تھیں۔ گویا انہیں تول تول کر ادا کیا گیا اور ان سب کا ایک مقررہ وزن ہے۔

نماز کی اصلی روح خشوع ہے اس کی نسبت سے اجر و ثواب کی مقدار کا تعین ہوتا ہے۔ آں حضرت کا ارشاد ہے:

ان الرجلین من امتی لیقومان الی الصلوٰۃ ورکوعہما وسجودہما واحد وان ما بین صلاتہما ما بین السماء والارض[3]

میری امت کے دو آدمی ایک ہی طرح کی نماز پڑھتے ہیں۔ اور بظاہر دونوں کے رکوع و سجود میں کوئی فرق و امتیاز دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن ان کے اجر و ثواب میں وہی تفاوت ہے جو آسمان اور زمین میں ہے۔

---

[1] ماخذ غیر معلوم [2] ابن المبارک سے روایت ہے [3] مسند ابن ابی اسامہ۔

نماز پڑھتے وقت اِدھر اُدھر جھانکنا کس درجہ مذموم ہے اس کے متعلق آنحضرت کی یہ حدیث ملاحظہ ہو:

اما یخاف الذی یحول وجھہ فی الصلوٰۃ ان یحول اللہ وجھہ وجہ حمار۔[1]

جو شخص نماز میں اپنے منہ کو اِدھر اُدھر گھماتا پھراتا رہتا ہے کیا وہ اس وعید سے نہیں ڈرتا کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو گدھے کی تھوتھنی سے نہ بدل دے۔

نماز کی اپنی شہادت عالمِ تمثیل میں

نماز جب انسانی صورت میں متمثل ہو کر آسمان کی طرف صعود کرتی ہے تو کیا کہتی ہے۔ اس کو حدیث میں اس پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے:

من صلی صلوٰۃ لوقتھا واسبغ وضوءھا واتم رکوعھا وسجودھا وخشوعھا عرجت بیضاء مسفرۃ۔ تقول حفظک اللہ کما حفظتنی ومن صلی لغیر وقتھا ولم یسبغ وضوءھا ولم یتم رکوعھا ولا سجودھا ولا خشوعھا عرجت وھی سوداء مظلمۃ تقول ضیعک اللہ کما ضیعتنی۔[2]

جس نے نماز اپنے وقت پر پڑھی وضو بھی اچھی طرح کیا رکوع وسجود میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور خشوع کا بھی خیال رکھا۔ اس کی نماز آسمان پر اس عالم میں پہنچے گی کہ اس کا رنگ نکھرا ہوا سفید ہوگا۔ یہ کہے گی کہ جس طرح تو نے میری حفاظت کی ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح تیری بھی حفاظت کرے۔ اور جس نے نماز کبھی وقت پر نہ پڑھی۔ وضو بھی اچھی طرح نہ کیا۔ رکوع وسجود میں بھی تغافل برتا اس کی نماز آسمان پر تاریکی

---

[1] صحیحین [2] طبرانی

وظلمت لئے ہوئے چڑھے گی اور کہے گی کہ جس طرح تو نے مجھے ضائع کیا اللہ تمہیں بھی اسی طرح ضائع کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت سلمان کہا کرتے تھے:

الصلوۃ مکیال فمن اوفی استوفی ومن طفف فقد علم ما قال اللہ فی المطففین۔

نمازوں کا ایک پیمانہ ہے۔ جس نے ناپ تول کی نزاکتوں کا خیال رکھا۔ اس کو اجر بھی اس لحاظ سے ملے گا۔ اور جس نے اس میں کمی کی۔ اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے کم تولنے والوں کے لیۓ کیا ارشاد فرمایا ہے۔

خشوع وخضوع

قرآن وحدیث میں خشوع وخضوع کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن میں ہے:

واقم الصلوٰۃ لذکری ۲۰/۱۴ — اور میری یاد کے لئے نماز پڑھا کرو۔

ولا تکن من الغافلین الاعراف ۲۰۵ — اور دیکھنا غافل نہ ہونا۔

ولا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکری ۴/۴۳ — اور جب تک تم نشے میں ہو نماز کے پاس نہ جاؤ۔

نشہ کئی طرح کا ہے اور نماز میں لہو وتغافل بھی ایک طرح کا نشہ ہی ہے

نشہ کئی طرح کا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہاں سکر ہموم دنیا سے تعبیر ہے۔ بعض نے اسے حب دنیا کے مترادف قرار دیا ہے۔ وہب کا کہنا ہے کہ اگرچہ اس سے مراد ظاہری معنی ہی ہیں۔ تاہم اس میں سکر دنیا کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں جو علّت مذکور ہے وہ یہ ہے:

حتی تعلموا ما تقولون ۔ — تاآنکہ جو تم کہتے ہو اس کا تمہیں احساس ہونے لگے

اور کتنے ہی نمازی ایسے ہیں جنھوں نے شراب چکھی تک نہیں لیکن ان کے تغافل وسہو کا یہ حال ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ نماز میں کس سے مخاطب ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔

آنحضرتؐ نے خشوع کی تعریف ان لفظوں میں ارشاد فرمائی ہے:

من صلی رکعتین لم یحدث فیہما — جس نے دو رکعت نماز اس حالت میں

بشیٔ من الدنیا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ۔[1]

پڑھی کہ حدیث نفس میں مبتلا نہیں ہوا اس کے تمام پہلے گناہ بخشے گئے۔

نماز کی حقیقت

نماز کی حقیقت کیا ہے اس کی پردہ کشائی بھی حضورؐ نے فرمائی ہے:

انما الصلوٰۃ تمسکن وتواضع وتضرع وتباؤس وتنادم وتضع یدایک فتقول اللھم اللھم فمن لم یفعل فھی خداج۔[2]

نماز اس کا نام ہے کہ تم مسکنت کا اظہار کرو متواضع رہو تضرع میں مشغول ہو آہ وزاری کرو اور اپنے کاموں پر ندامت کا اظہار کرو۔ پھر ہاتھ باندھ کر یا اللہ یا اللہ کہہ کر دعا مانگو۔ سو جو ان کیفیتوں سے دوچار نہیں ہوا اس کی نماز ناقص ہے۔

پہلے صحائف میں بھی نماز کی اس روح کو بیان کیا گیا ہے۔ کسی کتاب میں ہے:

لیس کل مصل تقبل صلاتہ انما اقبل صلاۃ من تواضع لعظمتی ولم یتکبر علی عبادی واطعم الفقیر الجائع لوجھی۔

ہر ہر عبادت گزار کی عبادت قبول نہیں کرتا۔ میرے ہاں تو اس کی عبادت مقبول ہے جس نے تواضع اختیار کی۔ اور میرے بندوں پر جبر نہ کیا۔ نیز بھوکے اور حاجت مند کو محض میری خوشنودی کے لئے کھانا کھلایا۔

نماز کا محرک اصل

عبادات میں اصلی محرک اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کے ساتھ وابستگی ہے۔ اگر یہ نعمت حاصل نہیں تو پھر

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ [2] ترمذی و نسائی۔

تمام عبادات لاحاصل ہیں۔ حدیث میں ہے:

انما فرض الصلوٰۃ وامر بالحج والطواف واشعرت المناسك لاقامة ذكر الله فاذا لم يكن في قلبك للمذكور الذي هو المقصود والمبتغي عظمة وهيبة فما قيمة ذكرك۔[1]	نماز کی فرضیت حج کا حکم اور مناسک کی وضاحت سب اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالٰے کے ذکر سے دل آباد ہوں۔ اور اگر اللہ کے ذکر سے دل خالی ہیں اور انہیں اس کی عظمت وہیبت کا کوئی نقش نہیں جو مقصود اصلی ہے تو پھر زبان

چلانے سے کیا فائدہ۔ ایسے ذکر کی کوئی قیمت نہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

واذا صليت فصل صلوٰة مودع۔[2]	جب نماز پڑھو تو یوں پڑھو کہ گویا زندگی کو الوداع کہہ رہے ہو۔

زندگی ہی کو نہیں نفس وخواہشات کو بھی۔ اور یوں معلوم ہو کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف بڑھ رہے ہو۔

اسی معنی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

یاایھا الانسان انک کادح الی ربك كدحاً فملاقيه (انشقاق ۶)	اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف پہنچنے میں خوب کوشاں ہے سو اس سے

جا ہی ملے گا۔

نماز میں غفلت وسہو نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ مناجات ہے اور مناجات کا تصور حضورِ قلب کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے [2] حاکم وبیہقی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

نماز کے وقت آنحضرتؐ کی کیفیت اللہ سے آشنائی اور دنیا سے بیگانگی

آں حضرت نماز کے وقت کس طرح ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف عنان توجہ کو پھیر لیتے تھے۔ اور کس طرح اپنی توجہات کو سمیٹ لیتے تھے اس کو حضرت عائشہ یوں بیان فرماتی ہیں:۔

کان رسول اللہ یحدثنا ونحدثہ فاذا حضرت الصلوٰۃ فکانہ لم یعرفنا ولم نعرفہ۔

آں حضرت ہم سے بات چیت میں مشغول ہوتے اور ہم ان سے محو گفتگو رہتے کہ اتنے میں نماز کا وقت آجاتا۔ اس وقت آپ اس طرح اُٹھ کھڑے ہوتے کہ گویا ہم میں اور ان میں کسی قسم کی جان پہچان ہی نہیں۔

کیوں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اسی یکسوئی کی متقاضی ہے۔

خود آں حضرت کا ارشادِ گرامی ہے:

لا ینظر اللہ الی صلوٰۃ لا یحضر الرجل فیہا مع بدنہ[1]

اللہ تعالیٰ ایسی نماز کو نظرِ قبولیت سے نہیں دیکھتا کہ جس میں حرکات جسم کے ساتھ دل کی جنبشوں کو شامل نہ کیا گیا ہو۔

خشوع وخضوع کی علامت

خشوع قلب کی علامت یہ ہے کہ نمازی کے اعضاء و جوارح سے بھی اس کا اظہار ہو۔

آں حضرت نے ایک صاحب کو دیکھا کہ نماز میں داڑھی سے کھیل رہے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا:

لو خشع قلب ھذا الخشعت جوارحہ[2]۔

اگر اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہوتا تو اس کا اثر اس کے اعضاء پر بھی پڑتا۔

---

[1] مسند الفردوس [2] مصنف ابن ابی شیبہ۔

رونا بھی خشوع کی ایک علامت ہے۔ سعید التنوخی کے متعلق مروی ہے کہ وہ نماز میں اتنا روتے کہ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

نماز میں بسا اوقات مکھی اس طرح چہرے پر آکر بیٹھتی ہے اور خشوع وخضوع کا امتحان لیتی ہے کہ سارا مزا ہی کرکرا ہو جاتا ہے۔ خلف بن ایوب کی عادت یہ تھی کہ مطلق اس کی پرواہ نہ کرتے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا مکھی کا منہ اور ناک پر بیٹھ جانا آپ کے لئے تکلیف دہ ثابت نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کیوں نہیں لیکن میں صبر و برداشت سے کام لیتا ہوں۔ اس صبر کی توجیہ آپ نے جو بیان کی وہ پڑھنے کے لائق ہے:

ان الفساق یصبرون تحت سواط السلطان لیقال فلان صبور ویفتخرون بذالک فانا قائم بین یدی ربی افاتحرک لذبابة۔

میں نے بعض فساق و فجار کے متعلق سنا ہے کہ وہ سلطان کی دی ہوئی کوڑوں کی سزا کو اس لئے ہنسی خوشی جھیل لیتے کہ ان کی بہادری کی تعریف کی جائے اور اس کا فخریہ ذکر بھی کرتے۔ تو کیا میں پروردگار کی حضوری میں ایک مکھی کی وجہ سے حرکت اور بے چینی کا اظہار کروں۔

ہمارے اسلاف کی نمازیں

ہمارے اسلاف نماز میں کیونکر ان نزاکتوں کا خیال رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے خاشع و خاضع رہتے تھے، اس کا اندازہ ان واقعات سے لگائیے۔ مسلم بن یسار کا قصہ ہے، ایک مرتبہ یہ بصرہ کی جامع مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک اس کا کوئی حصہ گر پڑا۔ ایک ہجوم اس حادثہ کو معلوم کرنے کے لئے دوڑا۔ مگر یہ بڑے سکون و دلجمعی کے ساتھ اپنی نماز میں مشغول رہے اور اس وقت ان کو واقعہ کی خبر ہوئی جب یہ نماز سے فارغ ہو چکے۔ اور لوگوں نے آکر بتایا

حضرت علی جب نماز پڑھنے لگتے تو خوف و خشیت سے چہرہ کا رنگ بدل جاتا۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کی یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا تم نہیں جانتے یہ وقت کس درجہ اہم ہے یہ وہ بار امانت ہے جس کو آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا گیا۔ تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔ لیکن انسان نے اٹھالینا منظور کر لیا۔

حضرت علی کے پوتے علی کے بارہ میں بھی مشہور ہے کہ وضو کرتے وقت ان کا رنگ فق ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو کہا کہ لوگو! تمہیں نہیں معلوم مجھے احکم الحاکمین کے دربار میں پیش ہونا ہے۔

حبر امت حضرت ابن عباس کا یہ قول اس سلسلہ میں فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے:

رکعتان مقتصدان فی تفکر خیر من قیام لیلۃ والقلب ساہ۔	درمیانے درجے کی دو رکعتیں جو تفکر و تدبر پر مشتمل ہوں اس قیام لیل پر بھاری ہیں جس میں قلب غیر حاضر ہو۔

نماز اور حضورِ قلب

توجہ الی اللہ اور قلب کی حضوری پر یوں تو بہت سے دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں مگر سرِدست اس اختصار پر قناعت فرمائیے۔ قرآن مجید میں ہے :

وَاَقِمِ الصلوٰۃ لذکری (طٰہٰ ۱۴) — اور میری یاد کے لئے نماز پڑھا کرو۔

ولا تکن من الغافلین (انفال ۲۰۵) — اور دیکھنا غافل نہ ہونا۔

یہاں جو غفلت سے روکا ہے تو ظاہر ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ نماز کے باب میں یہ بمنزلۂ حرام کے ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے :

من لم تنھہ صلوتہ عن الفحشاء والمنکر لم یزدد من اللہ الا بعداً۔ — جس شخص کی نماز اس کو فواحش اور برائیوں سے نہیں روکتی وہ نماز پڑھنے کے باوجود کچھ اللہ تعالیٰ سے دور ہی ہوتا ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ غافل کی نماز میں یہ صلاحیت ہی کہاں ہے کہ برائیوں سے روک دے۔ ایسا شخص اس حدیث کا مصداق ہے :

کم من قائم حظہ من صلاتہ التعب والنصب۔ — کتنے ہی نماز پڑھنے والے ایسے ہیں کہ ان کا حصہ نماز میں بس اتنا ہی ہے کہ اس سے تھکن اور کوفت حاصل کرتے ہیں۔

نماز کی اصلی بہرہ مندی اور دیگر فرائض میں بنیادی فرق

لیس للعبد من صلوتہ الا ما عقل منھا۔ نماز کی بہرہ مندیوں سے اسی قدر لطف اندوز ہونا ممکن ہے جتنا کہ کوئی شخص

س کو سمجھتا ہے۔

اس باب میں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ نمازی در اصل اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتا ہے۔ اور اس کے سامنے اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو پیش کرتا ہے۔ اب اگر دل پر سہو و غفلت کے پردے چھائے ہوئے ہیں تو خطاب و مناجات کا کیا محل ہے؟ دوسرے فرائض تو ایسے ہیں کہ ان میں حضورِ قلب اور توجہ و التفات شرط نہیں۔ جیسے زکوٰۃ کہ یہ بہرحال ادا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ادا کرتے وقت زکوٰۃ دینے والے کی توجہات میں یکسوئی اور حضور نہ پایا جائے۔ کیونکہ اس سے ایک تو حاجت مند کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے علاوہ ازیں نفس پر اس کی شدتیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی حال روزہ اور حج کا ہے۔ گو ان سے خواہشات کا زور کم ہوتا ہے۔ اور انسان بہرحال اللہ تعالیٰ کی راہ میں مصائب و تکالیف کا سامنا کرتا ہے۔ مگر نماز کا یہ حال نہیں۔ اس کا معاملہ ان عبادات سے قطعی مختلف ہے۔ کیونکہ اس میں تو حضور ہی سب کچھ ہے۔ یہی قرأت اور ذکر ہے۔ یہی رکوع و سجود اور قیام و قعود ہے۔ کیونکہ قرأت و ذکر تعبیر ہے مناجات و خطاب سے صرف الفاظ و حروف کا دُہرا دینا نہیں۔ اب ایک شخص اگر اللہ تعالےٰ سے دُعا مانگتا ہے اور کہتا ہے:

اھدنا الصراط المستقیم فاتحہ ۵ پروردگار! مجھے صراطِ مستقیم پر گامزن رکھ۔

تو سوال یہ ہے کہ غفلت و سہو کی صورت میں وہ کیا طلب کرتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟! اور یہ کیا مانگتا ہے؟؟؟ کیا دعا کی اس اہمیّت کا اس کو احساس ہے؟ جب نماز سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص اللہ تعالےٰ کا ذکر کرے۔ اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہو اور تضرع و الحاء سے دُعائیں مانگے تو وہ شخص کیونکر نماز سے عہدہ بر آ ہو سکے گا۔ جس کا دل افکارِ دُنیا میں ڈوبا ہُوا ہے۔ اور جس کا

قلب غفلت و سہو کے حجابات سے مستور رہے۔ نماز کی یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اس کا انکار ممکن نہیں۔ رکوع و سجود اور قیام و قعود اگرچہ جسمانی حرکات سے متعلق ہیں تاہم اس وقت تک یہ حرکات بھی عبادات کی شکل اختیار نہیں کر پاتیں جب تک ان کی تہ میں قصد و ارادہ اور حضورِ قلب کارفرما نہ ہو۔

نماز کا مابہ الامتیاز

نماز کا یہی وہ امتیاز ہے کہ جس کی بدولت اس کو اسلام و کفر میں فاصل ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کو تمام عبادات پر مقدم مانا گیا ہے۔ اور اس کے تارک کے لئے قتل کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ حضورِ قلب اور مناجات و ذکر ایسی خصوصیات ہی کی وجہ سے یہ دین کا اہم ستون بھی ہے۔ ورنہ صرف اعمالِ ظاہری اور حرکاتِ جسمانی کو یہ شرف حاصل کہاں۔ کہ اس کے ساتھ ایسی اہمیتیں وابستہ ہوں۔

فقہاء کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس پر ممکن ہے کہ کوئی کہدے، حضورِ قلب کو نماز کے لئے شرط ٹھہرانا اور یہ کہنا کہ اس کے بغیر نماز مقبول ہی نہیں ہوتی، تمام فقہاء کے مسلک کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ تو حضورِ قلب کو صرف تکبیرِ تحریمہ کے وقت ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کیفیت کا پوری نماز میں قائم رہنا ان کے نزدیک صحتِ صلوٰۃ کے لئے ضروری نہیں۔

قضا و عبادات میں فرق

اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ قضا کے منصب کے بارے میں یہ واضح ہے کہ یہ حضرات باطنی امور سے تعرض نہیں کرتے۔ نہ دلوں کو چیر پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور نہ طریقِ آخرت ان کا نصب العین ہی ہوتا ہے۔ انہیں تو ظاہر سے غرض ہے اور اسی ظاہر پر یہ احکام و مسائل کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ یہ اندازِ استدلال معاملات

میں تو حق بجانب مانا جا سکتا ہے۔ اور قتل و تعزیر سلطانی کے حق میں تو اس سے بلاشبہ مدد مل سکتی ہے۔ لیکن ابواب آخرت میں یہ طریق چلنے والا نہیں۔ عبادات میں تو لامحالہ دلوں کو دیکھا جائے گا اور نیت و قصد اور حضور قلب کے داعیات کا جائزہ لیا جائے گا۔

قدماء کا مذہب پھر یہ کہنا بھی علی الاطلاق درست نہیں کہ اس پر فقہاء کا اجماع ہے کیونکہ قدماء سے اس کے خلاف بھی منقول ہے۔ بشر بن حارث کہتے ہیں:

من لم یخشع فسدت صلاتہ۔ — جو نماز میں خشوع پیدا نہیں کرتا اس کی نماز فاسد ہے۔

حضرت حسن سے مروی ہے:

کل صلاۃ لا یحضر فیہا القلب فہی الی العقوبۃ اسرع۔ — جس نماز میں دل حاضر نہیں ہے وہ تو ثواب کے بجائے عقوبت کی زیادہ مستحق ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کا کہنا ہے:

من عرف من علی یمینہ و شمالہ متعمداً وھو فی الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ لہ۔ — نماز میں جو شخص یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے دائیں بائیں کون کون لوگ کھڑے ہیں اس کی نماز نہیں ہوتی۔

حضرت معاذ سے اسی معنی کی ایک اور حدیث بھی مروی ہے:

ان العبد لیصلی الصلوٰۃ لا یکتب لہ سدسہا ولا عشرھا وانما یکتب للعبد ما عقل منہا۔ — ایک بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو چھٹے اور دسویں حصے کے حساب سے اس کا اجر مترتب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس حساب سے مترتب ہوتا ہے کہ اس نے کل کتنی نماز سوچ سمجھ کر ادا کی۔

یہی نہیں عبدالواحد بن زید سے تو اس پر اجماع منقول ہے۔ اور وہ فقہاء جن کا حصہ زہد و ورع میں بھی برابر کا ہے۔ اور وہ علماء جنھیں علماء آخرت کہنا چاہیئے ان سے کثرت کے ساتھ ایسے اقوال کی روایت ہوئی ہے جن سے نماز میں قصد و ارادہ حضورِ قلب کی اہمیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

مقامِ فتویٰ کی احتیاطیں

ہاں مقامِ فتوے کی بات دوسری ہے۔ یہاں تکلیف ظاہری ہی پیشِ نظر رہتی ہے۔ اور اس میں بھی یہ اصول ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ یہ تکلیف اس حساب سے متعین ہو، کہ عوام کم سے کم کس درجہ کی پابندی کا التزام کر سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے سب لوگوں کو اس بات کا مکلّف نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کہ وہ حضورِ قلب کی کیفیتوں کو پوری نمازمیں قائم رکھیں کیونکہ ایسا کرنا تو صرف چند ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان کے لئے یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ یہ اس کو قائم رکھیں۔ چاہے ایک لمحہ کے لئے ہی سہی۔ یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت ہم ایسے حضرات کے بارہ میں یہ خیال نہیں رکھتے کہ ان کی بالکل وہی حیثیت ہے جو تارک صلوٰۃ کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے نماز بہرحال ادا تو کی ہے۔ اور حضورِ قلب کی پابندی کو قبول تو کیا ہے اگرچہ ایک پل ہی کے لئے۔

خطرہ کا پہلو

مگر ایک پہلو اس میں خطرے کا بھی ہے جو معمولی نہیں اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص جسے خدمت شاہی میں حاضر باش رہنے کا حکم ہے۔ اگر اس طریق سے حاضری دیتا ہے کہ جس سے اس عہدہ کی توہین ہوتی ہے عدم اعتنا ٹپکتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدمت کے بجائے یہ ادنیٰ تر اور حقیر تر مشاغل میں مصروف رہتا ہے۔ تو اس کی حالت اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ سنگین ہے جو سرے سے خدمت کی ذمہ داریوں کو قبول ہی نہیں کرتا۔

علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی لائق صد توجہ ہے، حضور قلب نماز کی روح اور عطر ہے۔ یہ جس مقدار میں بھی پایا جائے گا اسی نسبت سے نماز کی زندگی اور حیات کی تعیین ہو سکے گی۔ اور جس نسبت سے کوئی شخص اس سے محروم ہوگا۔ اسی نسبت سے گویا اس کی نماز میں زندگی کے آثار و علائم کی کمی ہو گی۔

بے جان اور بے کیف نماز لاش کی طرح ہے

پھر جس طرح جسمانی زندگی کا تصوّر ہمارے نزدیک یہ نہیں ہے۔ کہ ایک شخص زندہ تو ہو مگر چل پھر نہ سکے! اور ایک لاشے کی طرح خود اپنے ہی لئے ایک قسم کا بار ہو۔ اسی طرح عبادات میں ایسی بے کیف اور بے جان نمازیں کس مصرف کی ہیں جن میں روح اور زندگی کی نشاط انگیزیاں یکسر مفقود ہوں۔

وہ کیا باطنی کیفیتیں ہیں جن سے نماز کی تکمیل ہوتی ہے

قرآن وحدیث پر غور کیجئے تو ان معانی اور کیفیات پر کثرت سے آیات و احادیث ملیں گی جو نماز کو چمکاتی اور سنوارتی ہیں۔ مگر ان سب کا استیعاب ان چھ باتوں میں ہو جاتا ہے۔ (۱) حضورِ قلب (۲) تفہیم (۳) تعظیم (۴) ہیبت اور (۶) حیاء۔

حضورِ قلب کا مفہوم

حضورِ قلب سے ہماری مراد یہ ہے کہ دل جن معانی سے دورانِ نماز میں دوچار رہے ان کے علاوہ تمام جذبات و خواہشات سے خالی ہو جائے اور ایسا معلوم ہو کہ زبان سے جو کلمات جاری ہیں دل میں انھیں معانی کا ہجوم و وفور ہے۔

تفہیم اور ذوق و استعداد کے مختلف درجے

تفہیم اس سے آگے کی ایک منزل کا نام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام و معنی کے ساتھ اس کے مقتضیات کا احساس بھی دل میں موجزن ہو۔ یہ وہ مقام ہے جس میں کہ استعداد کے اختلاف سے لوگوں میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص میں فہم قرآن کا ذوق یکساں نہیں۔ کسی کسی کو تو نماز میں ایسے ایسے لطائف و نوادر سے سوجھتے ہیں — جو عموماً نہیں سوجھتے۔ اور یہ جو قرآن حکیم میں آیا ہے:

تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (عنکبوت ۴۵) (نماز) بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے

تو وہ تفہیم قرآن ہی کا تقاضا ہے کہ انسان برائیوں سے دست بردار ہونے کا تہیہ کر لیتا ہے۔

تعظیم کا تقاضہ

تعظیم، ان سے دونوں کیفیتوں سے جُداگانہ ایک کیفیت سے تعبیر ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے آقا سے مخاطب ہو۔ اس کا دل حاضر ہو اور یہ بھی سمجھ رہا ہو کہ اس کی زبان سے کن کلمات کا اظہار ہو رہا ہے۔ تاہم اس کا دل عظمت و احترام کے جذبات سے عاری ہو۔ نماز میں تعظیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے حضورِ قلب اور تفہیم کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے اکرام و کبریائی کا احساس بھی پایا جاتا ہو۔

ہیبت کی تعیین

ہیبت یہ ہے کہ نمازی دل میں خوف وخشیت کے جذبات کی فراوانیوں کو محسوس کرے۔ خوف وخشیت کے بارہ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس کا تعلق اسباب خسیسہ سے ہے۔ مثلاً کوئی شخص سانپ اور بچھو سے دہشت زدہ ہو۔ یا کوئی شخص کسی کی کج خلقی و کج ادائی سے خائف ہو۔ دوسرے وہ جس کا سرچشمہ اجلال و احترام ہے۔ یہاں یہ دوسری قسم مراد ہے۔

رجاء کا یہ معنی ہے کہ نمازی تعظیم و ہیبت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے ثواب و اجر کی توقع بھی رکھے۔ اور اس حقیقت پر بھی یقین رکھے کہ نافرمانی پر سزا و عقوبت کا لامحالہ سامنا کرنا پڑے گا۔

ثواب و اجر کی توقع

رجاء کا یہ مفہوم بھی ہے کہ نمازی تعظیم و ہیبت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے حسنِ اطاعت پر

ثواب واجر کی توقع بھی رکھے۔ اور اس حقیقت پر بھی یقین رکھے کہ نافرمانی پر سزا وعقوبت کا لامحالہ سامنا کرنا پڑے گا۔

تقصیر وکوتاہی کا اعتراف حیاء سے یہ غرض ہے کہ انسان اپنے دل میں عبادات کے دوران تقصیر وکوتاہی اور عجز وندامت کے اثرات برابر محسوس کرتا رہے۔ اور کسی وقت بھی یہ خیال نہ کرے کہ اس نے کما حقہٗ بندگی واطاعت کے تقاضوں کو پورا کر لیا ہے۔

ایک نفسیاتی راز کا انکشاف یہ تو ہوئیں وہ باطنی کیفیتیں اور لطائف جن سے کہ نماز کی روح نکھرتی اور مجلا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کیفیات کے حصول کا طریق کیا ہے۔ طریق زیادہ پیچیدہ نہیں ہے۔ مثلاً حضور قلب کی نعمت سے مالا مال ہونا ہو تو اس راز کو معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ دل کی توجہات کا محور و مدار کون چیز ہے اور وہ کیا شے ہے جس کی طرف اس کی باگیں مڑتی ہیں۔ کیونکہ دل کی فطرت یہ ہے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف راجع نہیں ہے۔ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اب یہ ساکن ہے اور اس کی حرکات و توجہات کا کوئی مرکز ہی نہیں رہا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے امورِ دنیا کو اپنا مطلوب قرار دے لیا ہے۔ لہٰذا اس مرحلہ پر انسان کو چاہیئے کہ وہ دل میں اس حقیقت کو اتارنے کی کوشش کرے۔ کہ زندگی کا ماحصل آخرت ہے دنیا اور امورِ دنیا نہیں۔ اور آخرت کی نعمتیں اس وقت تک حاصل ہونے والی نہیں جب تک بندگی واطاعت کا نفس کو عادی نہ بنایا جائے۔ جب اس قسم کی کیفیتوں کو بار بار دل میں بٹھایا جائے گا تو اس کا

بحیثیت مجموعی یہ اثر ہوگا۔ کہ دل حضور کی لذتوں سے بہرہ یاب ہونے لگے گا۔

تفہیم کے حصول کا طریق

اسی طرح تفہیم کی عادت ڈالنے کے لئے ضروری ہے کہ قلب کو معانی و لطائف قرآنی سے آشنا رکھنے کی سعی جاری رکھے۔ اور اس سلسلہ میں جو جو جذبات حائل نظر آئیں ان کے استیصال پر کمرِ ہمت باندھے اور پوری قوتِ فکری اور دلجمعی سے ان کا مقابلہ کرے۔ اس باب میں اصل نکتہ یہ ہے کہ جس نسبت سے اس محبوبِ حقیقی سے شغف و عشق اور تعلق خاطر ہوگا اسی نسبت سے اس کے ذکر اور یاد میں دل لطف محسوس کرے گا۔ اور اس کے امر و نہی کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ تعلق باللہ کا رشتہ استوار رہے تاکہ اس سے یہ سب نعمتیں آپ سے آپ حاصل ہو جائیں۔

تعظیم کا جذبہ دو طریق سے اُبھریگا

تعظیم دل میں علم کی دو کیفیتیں پیدا کرنے سے اُبھرتی ہے۔ پہلی کیفیت جس کو پیدا کرنا مقصود ہے یہ ہے کہ دل میں اجلال الٰہی کے دواعی کو بیدار کیا جائے۔ اور اس کی عظمت و توقیر کے نقوش کو مرتسم کیا جائے۔ کیونکہ یہی ایمان کی جڑ ہے۔ دوسرے اپنے نفس کے بارہ میں یہ رائے قائم کی جائے کہ یہ حد درجہ حقیر ہے۔ اور اپنے متعلق اس طرح سوچا جائے کہ اللہ تعالٰے کی ذاتِ گرامی ہی نے اس کو مرتبہ انسانیت تک پہنچایا ہے۔ اور اسی کی مہربانیوں اور عنایتوں سے یہ اس منصب رفیع تک پہنچا ہے۔ علم کی یہ دو کیفیتیں ایسی ہیں کہ ان کے استحضار سے انشاء اللہ خشوع و خضوع اور تذلل و انکسار کے جذبات خود بخود لوحِ قلب پر نمایاں ہوں گے۔

ہیبت وخوف کی ضیاء گستری

ہیبت وخوف کے جذبے اس وقت دل میں ضیاء گستر ہونگے جب یہ یقین راسخ ہو جائے گا کہ یہ سارا کارخانۂ قدرت اپنی محکمیوں اور استواریوں کے باوجود محض اللہ تعالےٰ کی مرضی پر قائم ہے۔ اسی کی قدرت وسطوت کا یہ کرشمہ ہے کہ اس نے ایک مادہ سے یہ عالم ہست وبود پیدا کر دکھایا ہے۔ اور وہ ایسا مستغنی ہے کہ اگر چاہے تو اس پورے عالم رنگ وبو کو ایک پل میں فنا کے گھاٹ اُتار دے۔ اور اس پر بھی اس کی بادشاہت اور صفات وجلال میں ذرہ برابر کمی واقع نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ انبیاء علیہم السلام اور بڑے بڑے اولیاء کرام اپنی بزرگی اور درجہ محبوبیت کے ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں کتنے آلام ومصائب میں گھرے رہتے ہیں۔ حالانکہ اگر اللہ تعالےٰ کو منظور ہو تو ان کا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ یہاں مرنے سے ادنیٰ اذیت برداشت کئے بغیر رہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ارادہ ومشیت کے سامنے دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

رجاء واُمید کے ولولے کیونکر دل میں پائے جاتے ہیں؟

رجاء واُمید کے ولولے اس طریق سے انسان کے دل میں پائے جاسکتے ہیں کہ اس کی نظر اس کے بے اندازہ لطف وکرم پر ہو اس کی گوناگوں عنائتوں اور بخششوں پر ہو۔ اور اس کے دل میں یقین واذعان کا رُخ اس مضمون کیطرف ہو کہ دیکھو اللہ تعالےٰ نے کس مہربانی سے ہمارے اعمال پر ہمیں جنت کے صلہ سے نوازنے کا وعدہ فرمایا ہے حالانکہ صلہ وانعام کی یہ صورت کیا کم تھی کہ ہم جب تک دنیا میں رہتے نیکی اور پاکبازی کی وجہ سے امن اور چین سے رہتے۔

تخلیق حیاء کے اسباب حیاء کی تخلیق اس احساس کے پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔ کہ اس کے فضل و کرم کے مقابلہ میں اپنی عبادات کے طول و عرض کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کس درجہ بے مایہ ہیں۔ نفس و قلب کے نقائص و عیوب کو نظر و فکر کے سامنے لایا جائے کہ ان میں اخلاص کی مقدار کتنی کم ہے۔ اور برائی اور شر کی طرف ان کے میلان اور رغبت کا کیا عالم ہے اور کس تیزی سے یہ نفع عاجل کی طرف لپکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے علم کی ہمہ گیریوں پر بھی نگاہ رہنی چاہیئے۔ اور یہ ماننا چاہیئے کہ وہ ہمارے مخفیاتِ قلب خطرات و وساوس سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ اور دل کی دھڑکنوں تک سے واقف ہے۔ اس اندازِ فکر سے انشاء اللہ حیا کی نعمت سے انسان بہرہ مند ہو سکتا ہے۔

اصل شئ ایمان ہے غرض ان لطائف باطن کو ابھارنا اور پیدا کرنا ممکن ہے اور سہل ہے بشرطیکہ ان کے اسباب و علل کو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ اور پھر قصد و ہمت سے ان اسباب و علل کو دور کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے۔ ان سب کا دراصل تعلق ایمان و نفس کی جان بخش کیفیتوں سے ہے۔ اگر یہ لطیفہ بیدار ہو گیا۔ اور شک و شبہ کی خلشیں دور ہو گئیں۔ تو پھر باطنی و نفسی زندگی خود بخود اصلاح پذیر ہو گی۔ ایمان اصل شے ہے اگر یہ جلوہ ریز ہے۔ تو خشوع و خضوع اور اخلاص و احسان سب کچھ ہے اور یہی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

حضورِ قلب کی نعمت کیونکر حاصل ہوتی ہے

ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالےٰ کی توقیر و تعظیم کا جذبہ پایا جائے۔ اور ہر ہر حالت میں رجاء و خوف کی نعمتوں سے بہرہ مند رہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی کوتاہیوں کے پیش نظر ہمیشہ حیاء و ندامت کے احساسات سے متاثر رہے۔ یہ ایمان کا ایسا تقاضا ہے کہ جس کی علیحدگی اور دوری کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص نماز تو ایسی عبادت ہے کہ اس میں ان لطائف کا پایا جانا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لئے جو کوئی شخص یہ دیکھے اس کا قلب اس نعمت سے محروم ہے اور یہ لطائف اس کی روح و قلب کو تازگی نہیں بخشتے تو اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ فکر و خیال کی دنیا میں ایک طرح کا انتشار ہے۔ اور قلب پر سہو و غفلت کے پردے چھائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز میں مناجات و ذکر سے وہ کیفیت حاصل نہیں ہوتی جو مقصود ہے۔

غفلت و سہو کے اسباب انکے مداوے کی چند تدابیر

سوال یہ ہے کہ خود اس غفلت و سہو کا سبب کیا ہے۔ صرف یہ کہ کچھ دوسرے جذبات و خیالات ایسے ہیں کہ دل پر جن کا قبضہ و استیلاً ہے۔ لہذا جب تک دل، ان کی گرفت اور قابو میں ہے حضورِ قلب اور یکسوئی کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ان جذبات و خیالات کے چنگل سے رہائی کی چند تدبیریں ہیں۔ جن کو اس سلسلہ میں آزما کر دیکھنا چاہیئے۔ اگر یہ جذبات و

خیالات کسی بیرونی اور خارجی اثر کی دخل اندازیوں سے اُبھرتے اور دل کو الجھاتے ہیں۔ تو اس کا علاج کچھ مشکل نہیں۔ ہمت و ارادہ کی بلندی و محکمی درکار ہے۔ نماز پڑھنے والے کو ایسی صورت پیش آنے پر چاہیئے کہ سمع و بصر کی قوتوں پر کچھ پابندیاں عائد کر دے۔ مثلاً نماز پڑھے تو آنکھیں بند رکھے یا گھر میں ایسے کمرہ میں یہ فریضہ ادا کرے کہ جہاں کچھ تاریکی ہو اس احتیاط کا خیال رکھے کہ اس کے سامنے کوئی ایسی چیز نہ ہو جو دل کی یکسوئی کو مٹانے والی ہو۔ بعض دفعہ نمازی کے سامنے کی جگہ کی کشادگی بھی انتشار فکر کا باعث ہوتی ہے۔ اس سے بچنے کی شکل یہ ہے کہ مسجد یا گھر کی دیوار کے قریب ہو کر نماز پڑھے تاکہ اس کے اور دیوار کے درمیان کی وسعتیں کم ہو جائیں۔ اور نظر و بصر کا پھیلاؤ وجہ انتشار نہ بن پائے۔ ایسے مقامات پر بھی نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ جن کا محلِ وقوع ہی ایسا ہے کہ جہاں شور و شغب اور ہنگامہ آرائیوں کا ہونا لازمی ہے جیسے بازار اور شوارع۔ منقش اور سجے سجائے مکانات بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ کیونکہ ان سے بھی جمعیتِ خاطر میں فرق آتا ہے۔ احتیاط کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ نمازی اپنی جانماز کا بھی جائزہ لے کہ کہیں رنگ و لون کی نقش آرائیاں اور شوخیاں ایسی تو نہیں کہ جن سے دل میں خلل پیدا ہوتا ہو۔ یہ ہیں وہ احتیاطیں اور تدبیریں کہ جن کو ملحوظ رکھنے سے دل حضورِ قلب کے لطف سے لذت یاب ہو سکتا ہے۔ حضرت عمر نماز کے لئے سکون و دلجمعی کو اس درجہ ضروری سمجھتے تھے۔ کہ ان کے سامنے اگر مصحف لٹک رہا ہو یا تلوار آویزاں ہو تو اس وقت تک نماز میں مشغول نہیں ہوتے تھے جب تک ان دونوں چیزوں کو ہٹا نہیں دیتے تھے۔

قلب کے اندر جاگزیں وساوس کا علاج یہ تدبیریں تو ایسی تھیں کہ جن کا تعلق ان موانع اور الجھاؤ میں ڈالنے والی چیزوں سے تھا جو ذہن و قلب سے باہر ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے خیالات و افکار بھی موجب خلل ہو سکتے ہیں۔ جو قلب و ذہن سے باہر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے۔ بلکہ جو دل کے اندر رہتے ہیں اور تشویش و انتشار پیدا کرتے ہیں۔ ان کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ نمازی فہم قرآن پہ دل کو مجبور کرے۔ اور بار بار توجہات کو معانی کے ادراک و تدبّر پہ مائل کرے۔ اور تکبیر تحریمہ سے پہلے یہ اچھی طرح سوچ لے کہ یہ کہاں اور کس کے حضور کھڑا ہونے والا ہے۔ اور اس مقام اجلال کے تقاضے کیا ہیں۔

آخرت کا تصوّر اس حقیقت پر بھی غور کرے کہ موت بہر حال آنے والی ہے۔ اور آخرت میں ایک ایک حرکت پر حساب ہونے والا ہے۔ اس تدبیر سے اُمید ہے کہ دل دوسرے الجھاؤوں سے مخلصی حاصل کرے۔ اور حضور و اخلاص کی انمول نعمت کو پالینے میں کامیاب ہو جائے۔

بیرونی علائق سے رستگاری کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل کو بیرونی چیزوں سے ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے۔ اور اس تعلق کی وجہ سے اس وقت تک الجھاؤ رہتا ہے جب تک کہ ان شواغل کا سدِّباب نہ کر دیا جائے۔ اس بناء برآں حضرت نے عثمان بن ابی شیبہ سے فرمایا:

انی نسیت ان اقول لک ان تخمر القدر الذی فی البیت[1] ۔ میں تم سے کہنا بھول گیا کہ گھر میں جو ہنڈیا رکھی ہے اس کو ڈھانک دو۔

---

[1] حدیث ابو داؤد میں ہے مگر اس میں مخاطب عثمان بن طلحہ ہیں۔

غرض یہ تھی کہ اتنی سی بات بھی دل میں کھٹک پیدا کرتی رہے گی۔

آنحضرت کا دستور

آں حضرت کا یہ دستور تھا کہ جہاں کسی چیز نے عبادات میں رکاوٹ ڈالی۔ یا اپنی طرف مائل کیا۔ آپ نے فوراً اس کو علیحدہ کر دیا۔ ایک مرتبہ ابوجہم نے ایک منقش چادر پیش کی۔ آپ نے نماز پڑھنے کے بعد اسے اُتار دیا اور کہا کہ میرے لئے وہی پُرانی چادر کافی ہے۔ اس سے میری نماز میں فرق آتا ہے۔ ایک دفعہ آپکے جوتے کا تسمہ پرانا ہو گیا تو آپ نے نیا بنوا لیا۔ لیکن ادھر توجہ مبذول ہوئی تو یہ بھی بارِ خاطر ہوا۔ آپ نے فرمایا وہی پرانے تسمے ٹھیک رہیں گے۔ ان سے توجہ و التفات کی باگیں دوسری طرف منعطف ہو جاتی ہیں۔

ایک صاحب کا ذکر ہے اُنھوں نے اپنے باغ میں نماز پڑھی۔ کھجور کا موسم جوبن پر تھا۔ ان کا ذہن جو اس کے حسین اور پھل سے بھرپور خوشوں کی طرف منتقل ہوا۔ تو ساری نماز اسی کی نذر ہو گئی۔ اُنھوں نے جونہی یہ محسوس کیا پورا باغ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے ڈالا۔

خواہشات و موانع کی کثرت کا علاج

ظاہر ہے کہ اس طرح کی تدبیریں اس وقت مؤثر ثابت ہو سکتی ہیں جب خواہشات کی مقدار کم ہو۔ اور ان میں اتنا زور اور شدّت بھی نہ پائی جائے۔ جس پر قابو پانا مشکل ہو۔ لیکن اگر صورتِ حال یہ ہو کہ خواہشات اور موانع کی کثرت ہے۔ تو پھر ان کا علاج اس نوع کے طریقوں سے ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں اگر آپ ایک خواہش کو روکیں گے۔ تو دوسری سر اُٹھائے گی۔ دوسری کا قلع قمع کرینگے تو تیسری اُبھرے گی۔ اور یہ سلسلہ یونہی قلب و دماغ کی یکسوئی پر حملہ آور ہوتا رہے گا۔ اس کو

ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ فرض کیجئے ایک شخص ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر فکر و مراقبہ کی گہرائیوں میں مستغرق ہونا چاہتا ہے، لیکن چڑیاں ہیں کہ وہ اس مقصد میں اس کو کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔ یہ مختلف شاخوں پر بیٹھ کر شور مچاتی اور چہکتی ہیں۔ وہ ایک کو اُڑاتا ہے تو دس اور آ بیٹھتی ہیں۔ اور پھر مل کر اس کے استغراق پر حملہ آور ہوتی ہیں۔

شجرِ نفس اور تمناو آرزو کی چڑیاں

بعینہٖ یہی حال انسان کے شجرِ نفس کا ہے۔ کہ اسکی ہزاروں شاخیں ہیں۔ اور ہر ہر شاخ پر تمناو آرزو کی ہزاروں چڑیاں ہیں۔ اب اگر اس کا معقول علاج ہو سکتا ہے تو یہی کہ اس درخت کو اُکھاڑ پھینکا جائے۔ اور حب دنیا کی کوئی آلائش دل میں نہ رہنے دی جائے کہ یہی ہر برائی کا منبع و مصدر ہے۔ اس کے سوا جو تدبیر بھی ہو گی ناکام رہے گی۔ کیونکہ جس شخص کا باطن حب دنیا پر مشتمل رہے گا۔ وہ کبھی بھی مناجات و عبادت کی لذتوں سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مسلمان کو چاہیئے کہ کوشش اور ہمت سے کام لے۔ اور اپنی عبادات کا جتنا حصّہ بھی بغیر دنیا کی طرف ملتفت ہوئے اور وسوسہ و افکار میں اُلجھے، انجام دے سکتا ہے انجام دے۔ اور جس قدر بھی سکون اور حضور قلب کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے فائدہ اُٹھائے اور یہ جان لے کہ دنیا کی طرف التفات اور عقبیٰ و آخرت کا خیال یہ دو مختلف جذبے ہیں۔ جن کی سمائی ایک ہی ظرف میں ممکن نہیں دل کو یوں سمجھو کہ گویا وہ سرکے کا بھرا ہوا پیالہ ہے۔ اب اگر اس کو شیرینی سے بدلنا ہے تو اس کے لئے ایک ہی چارۂ کار ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس میں عمدہ اور میٹھا پانی ملاتے جاؤ۔ اور اس کی

مقدار بڑھاتے جاؤ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ سرک کر ختم ہو جائے گا اور یہی مطلوب بھی ہے۔ ٹھیک اسی طرح دل میں ایک خیال دنیا کا ہے۔ دوسرے عقبیٰ اور آخرت کا ہے اور یہ سراسر تمہارے اختیار میں ہے۔ کہ تم عقبیٰ و آخرت کے خیالات کو تقویت دو۔ اور دنیا کی خواہشات و آرزوؤں کا قلع قمع کرتے رہو۔ تاآنکہ دل میں صرف عقبیٰ و آخرت کے تقاضے زندہ رہ جائیں۔

ارکانِ نماز ادا کرتے وقت کن کن چیزوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے

اذان اور ندائے اکبر

نماز کا اصل مقصد چونکہ ان معانی کا استحضار ہے جو حاصل دین ہیں اس لئے شرائط و ارکان ادا کرتے وقت ان میں کا ایک ایک معنی ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے۔ مثلاً جب اذان کی آواز کان میں پڑے تو احوالِ قیامت کا تصوّر کرو۔ اور دل کو یہ سمجھاؤ کہ یہ پکار آخرت و عقبیٰ کی پکار ہے۔ اس پر لبیک کہنا اور اس کے لئے ظاہر و باطن سے تیار ہونا نہایت ضروری ہے۔ پھر دل کو ٹٹول کر دیکھو۔ اگر اس سے ایک طرح کی مسرت و خوشی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں تو یقین رکھو کہ ندائے اکبر کے روز بشارت اور خوش بختیاں تمہارا خیر مقدم کریں گی۔ اذان میں یہی وہ لطف معنوی ہے۔ جس کی بنا پر آنحضرت بلال سے فرماتے :

ارحنا یا بلال۔ اے بلال اذان دے کر قلب و روح کی راحتوں کا سامان کرو۔

کیونکہ اس لئے کہ یہ ندا آوازۂ آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

نماز کے شرائط میں ایک ابتدائی اور بنیادی شرط طہارت ہے جس جگہ نماز پڑھنا ہو اسے پاک ہونا چاہیئے۔ لباس کا نجاست سے مبرا ہونا بھی لازمی ہے۔ اور جسم یا جلد انسانی کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہر طرح کی آلائش نجاست سے آزاد ہو۔ مگر اس ظرف و مکان کو تمہاری ذات سے کتنا دور کا تعلق ہے۔ لباس بھی اگرچہ جسم کے ساتھ وابستہ ہے۔ مگر تمہارا اصلی حصہ تو

نہیں۔ حتیٰ کہ وہ جلد جو تمہارے جسم کا ایک جز ہے تمہاری روح اور تمہاری اصلی حقیقت کی ترجمانی نہیں کر پاتی۔ وہ جوہر وہ لب لباب اور اصل حقیقت جس سے تم تعبیر ہو وہ تو روحِ باطن ہے۔ پھر جب ان سب چیزوں کا صاف ستھرا ہونا ضروری ہے تو روح باطن کی پاکیزگی کس درجہ اہم ہوگی! اس کا اندازہ کرو۔ اور کوشش کرو کہ اس کی تطہیر کا بندوبست کیا جائے۔ پھر جس طرح جسم اور لباس کو پانی سے دھویا جاتا ہے اسی طرح دل اندر باطن کے داغ دھبوں کو ندامت توبہ اور پرہیز و اجتناب کے عزم کے ساتھ دھویا اور صاف کیا جاتا ہے۔

پاکیزگی قلب کی اصلی اہمیت

دل کی پاکیزگی کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ یہی تو وہ مقام ہے جہاں تمہارے محبوب معبود کی نظریں پڑتی ہیں۔ کیونکہ وہ دلوں ہی کو تو دیکھتا ہے۔ مکان و ظرف اور لباس و جلد تو اس کے نزدیک محض ثانوی درجے کی چیزیں ہیں۔ اب اگر دل میں برائیاں ہیں۔ رسواکن جذبات و خواہشات کی بھیڑ ہے۔ اور ایسی چیزیں ہیں جن کو اپنے پروردگار و آقا سے چھپانا چاہئے۔ تو کس منہ سے اس کا سامنا کر سکوگے۔ اور اتنا تو ظاہر ہی ہے کہ اس کی نگاہ علم و ادراک سے تو کوئی چیز بھی چھپنے والی نہیں۔ لہٰذا تمھیں اس حقیقت کا احساس ہونا چاہئے کہ جب ظاہر کو پاک کیا ہے۔ تو باطن کی ناپاکیوں کو لئے ہوئے اس کے دربار میں حاضری دینا ٹھیک نہیں۔ مگر یہ احساس اس وقت اُبھرتا ہے۔ جب ندامت کے تقاضے پیدا ہوں حیاء و خوف کے دواعی دل کو گھیر لیں۔ اور توبہ و استغفار کے لشکر اقلیم دل کو فتح کرنے کی ٹھان لیں۔ ان کیفیات کا استحضار یوں ممکن ہے۔ جب تم خدا تعالیٰ کے سامنے جھکتے وقت

یہ خیال کرو کہ تم مجرم ہو۔ گناہ گار ہو۔ غلام آبق ہو۔ اور اب اس کے حضور معذرت و بخشش طلبی کی غرض سے پیش ہوئے ہو۔

استقبال قبلہ کا فلسفہ

استقبال قبلہ بھی نماز کی ایک ضروری شرط ہے۔ مگر کیا تم نے کبھی غور کیا کہ اس کی تہ میں کیا حقیقت پنہاں ہے؟ بظاہر تو اس کا مطلب یہی ہے کہ چہرہ کو تمام توجہات اور رخوں سے ہٹا کر صرف ایک جہت اور ایک رُخ پر مرکوز کر دیا جائے۔ لیکن اگر چہرے اور جسم کا رُخ بیت اللہ کی طرف مڑ جائے۔ اور خواہشات و نفس و قلب کا رُخ اللہ تعالےٰ کی طرف نہ مُڑے تو اس پر کیا فوائد مترتب ہونگے۔ اصلی مطلوب تو یہی تھا کہ خواہشات اور آرزوؤں کا قبلہ بدلا جائے۔ اور ان کے رُخ کو دُنیائے عاجل کی طرف سے ہٹا کر عقبیٰ و آخرت دائمی کی طرف موڑا جائے۔ اور اللہ تعالےٰ کی خوشی اور رضا کو مقصود و نصب العین ٹھہرایا جائے۔ تاکہ یہ دل پر حملہ آور ہو کر کبھی بھی اس کے سکون و اطمینان کو تباہ و برباد نہ کر سکیں۔ پھر جس طرح قبلہ رُخ ہونے کے لئے پورے جسم کو حرکت دی جاتی ہے۔ اور اس کو دوسری تمام سمتوں سے پھیر کر صرف ایک سمت پر لایا جاتا ہے۔ اسی طرح خواہشات اور آرزوؤں کے رُخ کو پھیرنے کے لئے بھی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ اور اس کو تمام ماسوا سے ہٹا کر ایک اللہ کی طرف پھیرنا اور لانا پڑے گا۔

قیام کا مقصد

قیام سے مقصود یہ ہے کہ تم اللہ تعالےٰ کے دربار میں کھڑے ہو اور تمہارا دل اور اس کی توجہات یکسر اللہ کی ذات یگانہ کی طرف مبذول ہیں۔ قیام کے وقت سر جو اشرف الاعضاء ہے اس طرح جھکا ہوا ہونا چاہئے کہ اس سے انکسار، تذلل اور اطاعت و

فرمانبرداری کا ترشح ہوتا ہو۔ یہ گویا اس بات کی علامت ہوگا کہ جس طرح سر جھکا ہے اسی طرح دل تکبر و رعونت کے ہر جذبے سے پاک ہے۔ قیام کے دوران میں یہ سمجھتے رہنا چاہیئے۔ کہ ٹھیک اسی طرح محاسبہ کے روز ہمیں اللہ تعالےٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اس لئے قیام کا انداز اس انداز کا ہونا چاہیئے جس سے وہی ادب وہی احترام اور خوف ظاہر ہو جو اللہ تعالےٰ کے حضور پیش ہونے کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ یہ نہ ہو سکے تو اس کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ نمازی اپنے کو کسی دنیاوی سلطان کے سامنے کھڑا ہؤا محسوس کرے۔

خشوع و خضوع پیدا کرنے کی تدبیر

نماز میں خشوع و اخلاص پیدا کرنے کی ایک تدبیر یہ ہے کہ پہلے تو نماز پڑھتے وقت اور کسی ایسے آدمی کا تصوّر کرے جو اس کی اصلاح دین کا خواہاں ہے۔ اور یہ محسوس کرے کہ وہ اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا ہے۔ پھر جب اس کی حرکات میں اس تصوّر سے توازن، سکون اور اطمینان پیدا ہو جائے اور یہ دیکھے کہ تمام اعضاء و جوارح اطاعت و فرمانبرداری اور عاجزی اور مسکنت کے سانچوں میں ڈھل گئے ہیں تو پھر اپنے نفس کو ملامت کرے کہ تو تو معرفت الٰہی اور محبت الٰہی کا مدعی تھا۔ یہ کیا بے حیائی ہے کہ اس کے بندوں سے تو ڈرتا ہے لیکن خود اس سے نہیں ڈرتا۔ حالانکہ مرد مومن کو صرف اسی سے ڈرنا چاہیئے۔ اور اسی کی شایان شان توقیر کرنا چاہئے۔

نیّت کی اہمیّت اور وسعت

قیام کے ساتھ ساتھ نیت کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ نیت کرتے وقت دل سے یہ عہد کرنا چاہیئے کہ ہمیں اس کی بہرحال اطاعت کرنا ہے۔ اس کی بندگی اور

عبادت سے دل کو تسکین ملتی ہے۔ نماز کے تمام تقاضوں کو پورا کرنا ہے اور ان تمام حرکات سے پرہیز کرنا ہے جن کو نواقض یا مفسداتِ صلوٰۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اخلاص اس اثنا میں ہمارا رہنما رہے گا۔ ہم اس ثواب واجر کے برابر اُمیدوار رہیں گے۔ اس کے عتاب سے ڈرتے رہیں گے۔ اور چاہتے رہیں گے کہ اس کے قرب واتصال کی لذتوں سے بہرہ مند ہوں۔ اور اس سے جب مخاطب ہونگے تو اپنے گناہوں پر نظر رہے گی اور اس حقیقت کا احساس رہیگا کہ ہم کس ذات گراں قدر سے مخاطب ہیں۔ اور کیسے مخاطب ہیں یعنی اس سے کیا مانگ رہے ہیں اور کیا طلب کر رہے ہیں۔

لیکن یہ کیفیت و احساسات اسی وقت دل میں اُبھر سکیں گے جب فی الواقع ان میں صداقت ہو۔ اور تمھارے اعضاء و جوارح سے اس کی تائید بھی ہو رہی ہو۔ جبین عرقِ انفعال سے تر ہو۔ کاندھے خوف وہیبت سے کانپ رہے ہوں۔ اور چہرے پر خوف و خشیتِ الٰہی سے زردی سی چھا رہی ہو۔

تکبیرِ تحریمہ کا مرحلہ

نیت کے بعد تکبیرِ تحریمہ کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کی کبریائی و عظمت کا اقرار کر رہے ہو۔ اس میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جس حقیقت کا اظہار تمھاری زبان سے ہو رہا ہے۔ آیا دل بھی اس سے متفق ہے یا نہیں کیونکہ اگر زبان سے تم نے اس کی بڑائی اور عظمت کا اظہار کیا مگر دل پر بدستور غیر اللہ کا رعب و دبدبہ طاری رہا تو گویا یہ عین نفاق ہوا۔ منافقین بھی تو آں حضرت کی رسالت کے معترف تھے۔ لیکن یہ اعتراف ان کے دل کی گہرائیوں کی ترجمانی نہیں کرتا تھا ــــ اس لئے اللہ تعالے نے انھیں کاذب ٹھہرایا۔ سوال یہ ہے کہ کیا تم بھی اس نفاق اور کذب کی

بیماری میں مبتلا ہو یا اس سے مخلصی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ مخلصی کی واحد صورت یہ ہے کہ توبہ و استغفار سے کام لو۔ اور اللہ تعالےٰ کی بخشش و کرم کے بارہ میں حسنِ ظن رکھو۔ نماز کا آغاز ان کلمات سے ہوتا ہے :

انی وجهت وجھی للذی فطر السموات والارض .... انعام ۷۹ — میں نے اپنا رخ یا چہرہ اس ذات اقدس کی طرف پھیر لیا۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ......

اللہ کی طرف رُخ پھیرنے کے معنی کیا یہ پہلا جھوٹ تو نہیں؟

ظاہر ہے کہ اس "وجہ" یا "رُخ" سے مراد جسمانی چہرہ نہیں۔ کیونکہ اس کی سمت تو قبلہ ہے۔ لامحالہ اس سے مراد دل کا چہرہ اور رُخ ہے۔ یہ کلمات ادا کرتے وقت دل کو ٹٹولنا چاہئے کہ اس میں کوئی سچائی ہے یا نہیں۔ کیا تم نے واقعی دل کے تمام جذبات و خواہشات کا رُخ اللہ تعالےٰ کی طرف پھیر دیا ہے۔ یا ہنوز تمھاری توجہات کا مدار وہی گھر کی چیزیں یا بازار کا ساز و سامان ہے۔ اور دل انھیں میں اٹکا ہوا ہے۔ اگر صورتِ حال یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پہلا جھوٹ ہے جو تم اللہ تعالےٰ کے سامنے بول رہے ہو۔ اور تمھاری جس نماز کا آغاز ہو رہا ہے وہ کذب و افترا پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دل کو پھیر دینے کا مطلب یہ ہے کہ تمام ماسوا سے دلچسپیاں ختم ہو جائیں اور صرف اسی کی ذاتِ گرامی مقصود و مطلوب ٹھہرے۔

یہ تاثر اگر دائمی شکل نہ اختیار کر سکے جب بھی نماز کے دوران تو بہرحال اسے قائم رہنا چاہئے۔ پھر جب تم نے حنیفاً کہا ۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں نے جو اپنا رُخ اللہ تعالےٰ کی طرف یکسو کر لیا ہے۔ تو اس بنا پر کہ میں

توحید کو ماننے والا مسلمان ہوں۔ جب یہ لفظ ادا ہوں تو ایک مرتبہ پھر دل کا محاسبہ کر لینا چاہئے۔ کہ یہ صحیح ہے؟ کیا تم واقعی مسلمان ہو۔ کیا تمھاری زبان اور ہاتھ کی اذیتوں سے دوسرے مسلمان محفوظ ہیں؟ اگر محفوظ ہیں تب تو کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ لیکن اگر تم ہر کسی سے برسرِ پیکار رہو اور ہر شخص سے تمھاری لڑائی ہے تو تمھیں سوچنا چاہئے کہ اس کی اصلاح کیونکر ممکن ہے۔

شرک خفی اسی طرح جب یہ کہو وما انا من المشرکین کہ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو شرک کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ تو یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ شرک کا اطلاق جلی اور خفی دونوں طرح کی صورتوں پر ہوتا ہے۔ اور شرک خفی میں یہ بھی داخل ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کے باوجود اس کے حقیر بندوں کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آرائی سے کام لو۔ چنانچہ اس آیت کا نزول ایسے ہی لوگوں کے حق میں ہوا ہے۔ جو اس کی عبادت تو کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی مدح و ستائش میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔

فمن کان یرجوا لقاء اللہ فلیعمل عملاً صالحًا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً (کہف ۱۱۰)	سو جس کو روز لقاء کا یقین حاصل ہے اسے چاہئے کہ نیک کام کرے اور اللہ تعالےٰ کی بندگی میں دوسروں کو شریک نہ قرار دے

و محیای و مماتی للہ رب العٰلمین پر یہ کلمات ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ میری زندگی اور موت اس اللہ کے لئے وقف ہے جو پوری کائنات کا پروردگار ہے۔ یہ اقرار معمولی اقرار نہیں۔ ایسے کلمات وہی شخص منہ سے نکال سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ جہاں تک میرے نفس کے تقاضوں کا تعلق ہے میرا وجود اور عدم برابر ہے۔ بلکہ میں سرے سے موجود ہی نہیں ہوں۔

مگر اپنے مولا و مالک کے حکموں کو بجا لانے کے لئے میں زندگی و نشاط کی تمام صلاحیتوں کے ساتھ آمادہ اور تیار ہوں۔ اب اگر اس اقرار کے ساتھ دنیا اور امور دنیا کی خاطر جینے کی خواہش دل میں کروٹ لیتی ہے تو یہ اقرار کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ بلکہ اسے تو ایک طرح کا انکار کہنا چاہیئے۔

تعوذ اور اللہ کے قلعوں کی طرف کوچ

اس کے بعد تعوذ کا مرتبہ آتا ہے۔ یہ بھی اقرار ہی کی ایک نوع ہے۔ اس میں تم کہہ سکتے ہو۔ اے پروردگار میں شیطان رجیم سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ تم شیطان کو اپنا دشمن تصوّر کرتے ہو۔ جو یہ نہیں چاہتا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خطاب کرسکو۔ کیونکہ وہ خود سجدہ نہ کرنے سے اس نعمت سے محروم ہو چکا ہے۔ اور صرف دشمن ہی تصوّر نہیں کرتے بلکہ اس کے مکائد اور گھاتوں سے بچنے کے لئے اس حصنِ حصین میں پناہ بھی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ جو تمھیں شیطان کے حملوں سے بچا سکے۔ مگر کیا یہ صرف کہہ دینے سے ہو جائے گا۔ نہیں جس طرح جنگ میں دشمن کے وار سے بچنے کے لئے محفوظ مقامات کی طرف کوچ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس بہت بڑے دشمن کی چالوں کو مات دینے کے لئے ضروری ہے کہ تم ذہن و فکر کو جنبش دو۔ اس کو موجودہ جگہ سے ہٹاؤ۔ اور اللہ تعالےٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے مضبوط قلعوں میں لانے کی کوشش کرو۔ اور اگر تم نے اللہ تعالےٰ کی پناہ میں آنے کا عہد بھی کیا اور شہوات و خواہشات کے جال میں بدستور پھنسے بھی رہے تو اس کا کیا فائدہ؟

توحید سب سے بڑا قلعہ ہے

اللہ تعالےٰ کا قلعہ یا حصنِ حصین کلمۂ توحید ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے:

لا الہ الا اللہ حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی۔ لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جو اس میں داخل ہو گیا وہ میری گرفت سے محفوظ ہو گیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحصن یا قلعہ میں پناہ حاصل کرنے والا کون ہے کیا وہ جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ یا وہ جو اس کی اطاعت میں شب و روز لگا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اول الذکر کو اللہ تعالے کی حفاظت میں آنے والا نہیں کہیں گے۔ کیونکہ وہ تو اب تک شیطان کی صفوں میں شریک ہے۔ دوسرا گروہ ہو سکتا ہے جس نے کہ اپنے کو اللہ تعالے کے سپرد کر دیا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد نبھانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

نماز میں شیطان کی دخل اندازیاں اس مرحلہ پر یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ شیطان بڑی ہی نازک تدبیروں سے کوشش کرتا ہے کہ نماز کی افادیت پر حملہ آور ہو اور اس عبادت کو جو دل کی زندگی کا بہت بڑا وسیلہ ہے ایک بے معنی عادت میں بدل دے۔ لہٰذا اس کی ان تمام گھاتوں کا محاسبہ ضروری ہے۔ اس کی تخلل اندازیوں کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ یہ ذہن کو ایسے ایسے مسائل میں الجھا دیتا ہے جو دینی ہیں اور اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ مگر یہاں مقصود نہیں۔ مثلاً ذکر آخرت اور اس کی جملہ تفصیلات۔ یا یہ خیال کہ مجھے فلاں فلاں نیک کام کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ حالانکہ اصل مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم کا جو حصہ ایک نمازی پڑھ رہا ہے۔ اس کے متعلقہ معانی اور تقاضے ذہن و فکر کی لوح پر مرتسم ہوں۔ اور وہ تاثرات اُبھریں جن کا قریبی لگاؤ ان آیات سے ہو سکتا ہے۔ پھر تلاوت قرآن کریم اور فہم قرآن کا یہ سلسلہ اس طریق سے جاری رہے کہ گویا زبان و قلب میں پوری پوری یگانگت پائی جاتی ہے۔ یہ نہ ہو کہ زبان سے تو کچھ ادا ہو رہا ہے اور دل کچھ اور ہی قسم کی

ھیرڑبن میں مصروف ہے۔ یا اور اور خیالات میں اُلجھا ہوا ہے۔

بان وقلب میں شتہ کی نوعیتیں

عموماً دل اور زبان میں جو رشتہ و تعلق ہے مطابقت یا عدم مطابقت کے اعتبار سے اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

پہلی یہ کہ نماز پڑھنے والے کا دل ہر نوع کے معنوی تاثر سے تہی ہے۔ ی نہیں بلکہ اس پر سہو و غفلت کی کیفیتیں طاری ہیں۔ دوسرے یہ کہ جہاں بڑھنے والے کی زبان میں حرکت ہے۔ وہاں اس کے دل و دماغ میں بھی جنبش ہے۔ اور وہ اس طرح کہ یوں زبان سے آیات کو سنتا اور سمجھتا ہے۔ جیسے بڑھنے والا کوئی دوسرا ہے۔ اور یہ ذمہ دار سامع کی حیثیت سے اللہ تعالےٰ کے ضور کھڑا ہے جس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ قاری جن آیات کی تلاوت لرے یہ ان پر غور کرتا جائے اور ان کو فہم و فکر کے دائروں کے قریب لاتا جائے۔ یہ وہ شخص ہے جس کا شمار اصحاب الیمین میں ہے۔

زبان قلب و ذہن کی ترجمان ہے

تیسری صورت اس سے آگے کے درجات سے متعلق ہے۔ اور اس سے آگے کے مقامات کی نشان دہی کرتی ہے۔ یعنی اس سے پہلے کہ زبان سے آیات قرآن حکیم کی تلاوت ہو قلب ان کے معانی و مطالب کا احاطہ کرچکا ہو۔ اور ظاہری ترتیب سے اگرچہ یہی عیاں ہوتا ہے کہ قلب زبان کا ترجمان ہے۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ زبان قلب و ذہن کی ترجمانی کے فرائض ادا کررہی ہے۔ ادراک و فہم کے ان دونوں درجوں میں جو فرق ہے۔ وہ بہت لطیف ہے اور اس کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اللہ تعالےٰ کے مقربین خاص ہیں۔ زبان کو تو اس رتبہ کی سزاوار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ یہ دل کی تعلیم و

تربیت کا اہتمام کرے بلکہ یہ فخر تو قلب و ذہن ہی کو حاصل رہنا چاہیئے۔ کہ زبان اس کے تاثرات وادراکات کی ترجمان ہو۔

فہم قرآن کی منزل کیونکر طے ہو؟ فہم قرآن کی یہ منزل نماز میں کیونکر طے ہو۔ اس کی تفصیل کو سورۂ فاتحہ کے معانی سے سمجھنے کی کوشش کرو۔

مثلاً تم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہو جس کا ترجمہ یہ ہے "خدا تعالیٰ کے نام کے ساتھ جو رحمٰن اور رحیم ہے"۔ تو تمھارے دل میں تاثر پیدا ہونا چاہیئے کہ تمام امور چاہے وہ دنیا سے متعلق ہوں چاہے دین سے اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ گرامی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے نام کے ساتھ معنی یہاں خدا تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ اس مقام پر اسم عین مسمی سے تعبیر ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اس حقیقت کے ماننے میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوگی کہ تمام انعامات اور بخششیں بھی اسی کی براہِ راست عنایت کا نتیجہ ہیں۔ اس کا اظہار کلمۂ الحمد للہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اس میں دوسروں کا احسان مند اور ممنون ہے۔ اور دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ اور یہ نہیں سمجھتا کہ بظاہر جو کام اس کے لئے دوسرے سرانجام دیتے ہیں۔ وہ بھی اسی کی تسخیر کا ثمرہ ہیں۔ تو اس کی تحمید اور تسمیہ میں اسی نسبت سے فرق آجائے گا۔ جس نسبت سے کہ اس کا التفات غیر اللہ کی طرف بڑھے گا۔ اس کے بعد "الرحمٰن الرحیم" کا ٹکڑا معرضِ فہم میں آئیگا۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کے انعامات گوناگوں کا نقش اُبھر آئے۔ اور انسان یہ محسوس کرنے کی کوشش کرے کہ اس کی رحمتوں کا

دامن کس درجہ وسیع ہے؟ اس طرح کے تاثر سے رجاء واُمید کے دواعی کو تحریک ہو گی۔ مگر یہ کافی نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خوف وخشیت کے جذبات بھی اُبھرنا چاہئیں۔ تاکہ ایمان میں توازن برقرار رہے۔ اس غرض کو مالک یوم الدین کے معانی پورا کرتے ہیں۔ پھر جب تم ایاک نعبد کہو۔ اور یہ اقرار کرو کہ اے پروردگار ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ تو اخلاص کی تجدید ہونا چاہئے۔ اور جب ایاک نستعین تک پہنچو۔ تو دل سے اپنی عاجزی کا اعتراف کرو اور یہ مانو کہ اے اللہ تیری مدد اور اعانت سے مجھے اس نیکی کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ اور اس مناجات وخطاب کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اس کے بعد اب اللہ تعالیٰ سے کچھ طلب کرنے اور مانگنے کا وقت آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا طلب کیا جائے اللہ تعالیٰ نے اس مشکل کو یوں آسان کر دیا ہے کہ خود وہ حکیمانہ کلمات بتا دیئے — کہ جن سے ہمارے مقصود و مدعا کا پتہ چلتا ہے۔ اور وہ ہیں "اھدنا الصراط المستقیم" ان میں اللہ تعالیٰ سے درخواست کی گئی ہے کہ ہماری رہنمائی فرما اور ایسی راہوں پر چلنے اور گام فرسا ہونے کی طاقت بخش جو تیری خوشنودی کی ضامن ہیں۔ جن پر چل کر ہم تیری رضا کو پاسکیں۔ اور تیرے قرب کو حاصل کر سکیں۔ پھر کمال عنایت سے اس کی مزید تشریح بھی خود ہی سمجھا دی۔ کہ یہ راہیں ان لوگوں کی راہیں ہیں کہ جن کے تتبع اور پیروی سے تم رضا و اطاعت کے اعلیٰ ترین مراتب تک پہنچ سکتے ہو۔ اور اس کے انعامات رنگا رنگ کے مستحق ہو سکتے ہو۔ جب سورۂ فاتحہ کی اس آیت تک پہنچو۔ اور یہ کہو کہ "صراط الذین انعمت علیھم" تو انبیاء شہداء اور صلحاء کی پاکیزہ زندگیوں پر ایک نظر ڈال جاؤ اور ان حضرات کے نقشِ قدم پر چلنے اور ان کے عملی نمونے سے فائدہ اُٹھانے کا عہد کرو۔ جن پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بخششوں اور رحمتوں

کی بارش فرمائی۔ اس طرح تمھارے مقصود و مدعا کی پوری پوری وضاحت ہو جائے گی۔ تمھارے عزائم میں پختگی آئے گی۔ اور تمھیں ان لوگوں کی اعلیٰ زندگیوں سے ایک طرح کی شہادت ملے گی۔ پھر یہ بھی کہو کہ اگر پیروی اور تمتع کا فخر حاصل کرنا ہے تو یہی وہ لوگ ہیں جو اس لائق ہیں۔ گمراہ اور وہ جن پر تیرا غضب بھڑکا ہرگز اس لائق نہیں ہو سکتے۔ ان کی راہ پر چلنے کے لئے ہم تیار نہیں۔ یہی مطلب ہے "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کا۔ یہ کہہ کر آمین کہو۔ اور قبول و اجابت کا انتظار کرو۔ یہ ہے وہ فہم قرآن جو نماز کی جان ہے۔ اس طرح تم نے اگر سورۂ فاتحہ کی تلاوت کی اور اس کے معانی پر غور و تدبر سے کام لیا تو اس حدیث قدسی کے مستحق ٹھہرو گے۔ جس میں آں حضرتؐ نے فرمایا ہے:

قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی	اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے صلوٰۃ
نصفین نصفاً لی و نصفها لعبدی	(یا فاتحہ) کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا
ولعبدی ما سأل۔	ہے۔ ایک حصّہ تو وہ ہے جس کا تعلق میرے

بندے سے ہے جس کو یہ پڑھتا اور طلب کرتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جس کا تعلق میری رحمتوں سے ہے۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے اس بندے کو وہ سب کچھ ملیگا جس کا یہ مطالبہ کر رہا ہے۔

(اس تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً) جب میرا بندہ الحمد للہ کہتا ہے تو میں جواب میں کہتا ہوں کہ میرے بندے نے میری تعریف کی اور میری حمد و ثنا میں مصروف ہوا۔

صلحاءِ امت اور اُن کا فہم و تدبرِ قرآن

صلحاء اور سلف کا یہ وتیرہ تھا کہ ہمیشہ قرآن کو سمجھ کر پڑھتے تھے۔ زرارہ بن اوفی کے بارہ میں روایت ہے جب وہ اثناءِ تلاوت میں فاذا نقر فی الناقور کے مقام تک پہنچے تو غش کھا کر ایسے گرے کہ پھر اس دنیائے دوں کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ابراہیم نخعی کے کانوں میں جب اذا السماء انشقت کی آواز پڑتی بے چین ہو جاتے اور کانپنے لگتے۔ عبداللہ بن واقد کا کہنا ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمر کو نماز پڑھتے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کیفیات و تاثرات کا غلبہ ہے۔ اور کیوں نہ ہو قرآن حکیم میں وعدہ بھی ہے وعید بھی۔ مواعظ و نصائح بھی ہیں اور انبیاء و رسل کا تذکرہ بھی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا بیان اور ان کی وضاحتیں بھی ہیں۔ اب جو ان سب چیزوں پر غور کرتا ہے اس کے لئے ان میں کا ہر ہر مضمون اور عنوان غور و فکر اور عبرت کا ایک خاص انداز اور رنگ چاہتا ہے۔

کیفیات و تاثرات کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان میں کمی بیشی ممکن ہے۔ اور ہر ہر شخص کا تاثر ایک ہی درجہ اور مرتبہ کا ہونا ضروری نہیں نہ یہ شریعت کا مطالبہ ہی ہے۔ کیونکہ فہم و فکر اور علم یا صفائے باطن کے پیمانے الگ الگ ہیں جو شخص زیادہ فہیم ہوگا زیادہ عالم ہوگا اور قلب و ذہن کی صفائی و پاکیزگی کے معاملہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہوگا اسی نسبت سے اس کے تاثرات اور کیفیات میں زیادہ گہرائی بھی ہوگی۔ اور اسی نسبت سے اس کا رنگ چوکھا اور شوخ ہوگا۔

آدابِ تلاوت۔ تلاوت آیات کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ قابلِ ذکر ہے

اور وہ یہ کہ پڑھنے کے انداز میں آواز کا اُتار چڑھاؤ معانی کے تابع ہونا چاہئے یعنی اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ آیات جن کا تعلق وعدے سے ہے ان کو پڑھتے وقت آواز میں بھی ایک نوع کی بشاشت کا اظہار ہو۔ اور وہ آیات جو وعید و عذاب کے بیان پر مشتمل ہیں۔ ان کو اس ڈھنگ سے ادا کیا جائے کہ ان سے خوف و خشیت کے اثرات مترشح ہوں۔ اسی طرح تحمید و تمجید کی آیات اس طریق سے پڑھنا چاہئیں کہ ان سے اللہ تعالےٰ کے جلال و جبروت اور قدرت و اختیار کے پہلو نمایاں ہوں۔ چنانچہ امام نخعی کا قاعدہ تھا کہ جب وہ ان آیات کی تلاوت کرتے جن میں اللہ تعالےٰ کی توحید کا تذکرہ ہے اور شرک کی نفی ہے۔ تو آواز کو ایسے آدمی کی طرح کہ جو بدرجۂ غایت شرمار ہا ہے پست اور دھیما کر دیتے۔ جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا کہ پڑھنے والا اللہ تعالےٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔ حتیٰ کہ شرک کا ذکر بھی ناگوار ہے۔

نماز میں قیام کی حکمت قیام کا فلسفہ یہ ہے کہ اس سے نمازی اس حقیقت کو جان پاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے قرب کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل ایک ہی کیفیت اور انداز پر اس کے حضور التفات و اخلاص کے تحفے پیش کرتا ہے۔ اور ایک ہی صورت میں اس کے سامنے قائم ہے۔ حدیث میں ہے:

ان اللہ عز وجل مقبل علی المصلی مالم یلتفت[1] — اللہ تعالےٰ کی توجہات عنایت اس وقت تک ایک نمازی کی طرف مبذول رہتی ہیں جب تک وہ ہمہ تن اس کی طرف ملتفت رہتا ہے۔

---

[1] ابوداؤد۔ نسائی۔ حاکم۔

گویا قیامِ قیامِ دل سے تعبیر ہے۔ ایک نماز پڑھنے والے کو ہمیشہ معلوم رہنا چاہئے۔ کہ اس کا تخاطب ایک ایسی ذات والاصفات سے ہے۔ جو پوری خشیت اور تعلق خاطر کی متقاضی ہے۔ اس لئے اگر دل اس نعمت سے محروم نہیں ہوگیا ہے۔ تو اس کا اظہار اعضاء و جوارح سے ہونا چاہئے۔ آں حضرت نے ایک صاحب کو دیکھا کہ نماز میں داڑھی سے کھیل رہے ہیں۔ اس پر فرمایا اور نہایت بجا فرمایا:

اما ھذا لو خشع قلبہ لخشعت جوارحہ۔ اگر اس کے دل میں خشوع جاگزیں ہوتا تو اس کے اعضاء پر بھی اس کا اثر پڑتا اور وہ بھی خاشع ہوتے۔

ابوبکر کا قیام حضرت صدیق کے بارے میں مروی ہے کہ وہ نماز میں یوں کھڑے ہوتے جیسے زمین میں میخ گڑی ہے۔ عبداللہ ابن عمر کی بابت مرقوم ہے۔ کہ ان کا قیام اس طرح ہوتا جیسے بے حس و حرکت لکڑی ہے۔ بعض رکوع میں جاتے تو ان کا رکوع اتنا طویل اور پرسکون ہوتا کہ ان کی پشت پر چڑیاں یہ سمجھ کر بیٹھ بیٹھ جاتیں، کہ ان میں زندگی نہیں۔ بلکہ یہ تو جمادات کی قسم کی کوئی چیز ہیں۔

تاثرات و کیفیات کا یہ انداز بالکل فطری ہے یہ کیفیت اور خشوع و خشیت اور تقاضائے اجلال و اکرام ایسی بات نہیں ہے۔ جس کے ثبوت پر آیات و حدیث پیش کرنے کی حاجت ہو۔ یہ تو فطرت کا مطالبہ ہے۔ جب چھوٹے چھوٹے ابنائے دنیا کے سامنے ہم متادب ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا احترام ہمارے اعضاء و جوارح کو متاثر کرتا ہے۔ تو یہ بات کس درجہ نامناسب ہے۔ کہ احکم الحاکمین اور بادشاہوں کے بادشاہ

کے سامنے پیش ہونے کا موقع ملے تو ہمارے ہاتھ پاؤں چلتے رہیں۔ اور جسمانی حرکات سے ادب و احترام کا شائبہ تک پایا نہ جائے۔ دراصل یہ بے اعتنائی اس بناء پر ہے کہ ہم اللہ تعالےٰ کے جلال سے ناواقف ہیں۔ اور اس بات کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ کہ ہمارے قلب و ضمیر کی ایک ایک حرکت اور کروٹ پر اس کی کڑی نگرانی ہے۔

رکوع و سجود کی حکمتیں رکوع و سجود میں دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو تواضع، عاجزی اور حقیر ہونے کا ہے۔ اور دوسرے اللہ تعالےٰ کی کبریائی علو اور بلندی کا ہے۔ اس لئے جب تم سجدہ میں جاؤ۔ تو یہ دونوں کیفیتیں دل میں پیدا ہونی چاہئیں۔ سجدہ اگر بغیر کسی حائل کے براہِ راست زمین پر ہو۔ تو اس میں جو خشوع اور تواضع ہے وہ فرش اور قالین پر سجدہ کرنے میں قطعاً نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر کرنا یہ مقصود ہوتا ہے کہ وہ سر جو تمام اعضاء پر فضیلت رکھتا ہے اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کی خاطر تم نے مٹی ایسی حقیر اور ادنےٰ چیز پر رکھ دیا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ یہی اس کا اصلی مقام بھی ہے۔ کیونکہ انسان کو مٹی سے ہی تو پیدا کیا گیا ہے اور اسی کی آغوش میں بالآخر لوٹنا ہے۔

دو دو سجدوں کا فلسفہ جب سجدہ کرو تو سبحان ربی الاعلیٰ تین مرتبہ کہو۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کی عظمت کا نقش دل پر بٹھانا ہے۔ اور یہ عیاں ہے کہ ایک مرتبہ اس کی عظمت و بزرگی کا اقرار کر لینے سے یہ حقیقت دل میں جمتی نہیں اس لئے اس کا کم از کم تین بار اعادہ ہونا ضروری ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں جوش میں آئیں گی۔ کیونکہ ان کا تعلق کبر و پندار کی کیفیات سے تو ہے نہیں۔ تذلل و عجز اور خاکساری و اقرار ضعف سے

ہے۔ دو دو سجدوں میں بھی یہی حکمت پنہاں ہے۔ کہ اس تاثر عبودیت و بندگی کو استحکام و استواری کے اور مواقع ملیں۔

تشہد کے باطنی تقاضے

آخر میں تشہد ہے۔ اس میں جو باطنی معانی پوشیدہ ہیں، ان کا تقاضا یہ ہے کہ نمازی پہلے تو نہایت ادب سے بیٹھے۔ پھر اللہ تعالےٰ کے لئے تمام پاکیزہ سنن اخلاق اور عادات کا اثبات کرے۔ اور کہے کہ تمام تحیات و صلوٰت اور طیبات اس کی ذاتِ بزرگ و متعال کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور وہی ساری کائنات کا مالک ہے۔ کوئی ان میں اس کا شریک اور ساجھی نہیں۔ پھر جب السلام علیک ایھا النبی کہے تو آں حضرت کا تصوّر کرے۔ اور ان کی شخصیت کریمہ کو نظر و بصر کے سامنے لائے۔ اور یقین رکھے کہ سلام و درود کے یہ تحائف ان کو پہنچائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد خود اپنے لئے اور دوسرے تمام صلحاء کے لئے سلامتی کی دعا مانگنا ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ کی توحید اور آں حضرت کی رسالت و نبوت کا اقرار کرنا ہے۔ اور ان کے ساتھ جو اسلام کا ایک رشتہ ہے اس کی تجدید کرنا ہے۔ اس تجدیدِ عہد کے بعد آخر میں ماثورہ دعاؤں کا پڑھنا ہے۔ اور اپنی حاجات و ضروریات کو اپنے آقا و مولا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ جن میں تواضع و خشوع و عاجزی کی پوری پوری آمیزش ہو۔

یہ ہے وہ نماز جو مطلوب ہے۔ اور جب یہ ادا ہو جائے تو اللہ تعالےٰ کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس نے اس اطاعت کی توفیق بخشی۔ اس ساری نماز میں یہ خیال قلب پر طاری اور مستولی رہنا چاہیئے۔ کہ شاید یہ ہماری آخری نماز ہو۔

صل صلوٰۃ مودع - یوں نماز پڑھو کہ گویا پھر نہیں پڑھنا ہے

اور اگر اس میں غفلت و سہو کی کوتاہیاں رہ گئیں۔ تو کہیں یہ مسترد ہی نہ کر دی جائے۔ اور اُلٹا موردِ الزام ہی نہ ٹھہرایا جائے۔

نماز کی ذمہ داریوں کا شدید احساس

یحییٰ بن وثاب نماز پڑھتے تو تھوڑی دیر کے لئے رکتے اس وقت ان کے چہرے سے حزن و ملال کا اظہار ہوتا۔ نماز سے فارغ ہوتے تو فکر و تردد سے ایسے نڈھال ہو جاتے جیسے بیمار ہوں۔ اور یہ انھیں کے ساتھ خاص نہیں۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ اور نماز کی روح کو سمجھتے اور اس پر مداومت اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نمازوں کا یہی عالم ہوتا ہے۔

نماز اور نعمتِ مکاشفہ

مزید برآں ایسی نماز کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان مکاشفات کی نعمت سے بہرہ مند ہو جاتا ہے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ بالخصوص سجدہ تو منبع الانوار ہے۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اللہ تعالیٰ کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے:

واسجد واقترب (علق ١٩) — اور سجدہ و قرب کی منزلیں طے کرتے رہو۔

کشف کے مدارج

ہاں یہ ضرور ہے کہ اسرار و رموز کائنات کی پردہ کشائی ہر ہر نمازی پر ایک ہی انداز سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں درجات و مراتب کا اچھا خاصہ تفاوت ہے۔ یہاں کئی چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دل کی قوت و ہمت کا کیا حال ہے۔ صفا و جلا کی کیفیتیں کیسی ہیں۔ اور دنیا کے گرد و غبار کی کتنی تہیں اس پر چڑھی ہوئی ہیں۔ پھر مکاشفہ کی نوعیت بھی مختلف افراد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ کسی پر

اس کی صفات اور جلال کے پردے فاش ہوتے ہیں۔ کوئی اس کے سنن و عادات کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ اور کچھ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ ان پر علم المعاملہ کے دقائق و اسرار واضح کئے جاتے ہیں۔ یہ مکاشفہ اس بات کی دلیل ہے کہ جہاں تک اللہ تعالےٰ کے فیوض و کرم کا تعلق ہے اس میں کبھی بخل نہیں ہوتا۔ رکاوٹ جب ہوگی بندوں ہی کی طرف سے ہوگی۔ ان کے دل کا زنگ اگر دور ہو جائے۔ اور یہ پوری قوت و ہمت سے اس آفتاب حقیقت کا سامنا کرنے پر تیار ہو جائیں۔ تو انوارِ حق کا منعکس ہونا ضروری ہے۔

مکاشفہ کی حقیقت

یہ سچ ہے کہ عام لوگ آسانی سے مکاشفہ کی اس نعمت کو تسلیم کرنے والے نہیں۔ کیونکہ اس میں انسان کی اس فطری کمزوری کو دخل ہے۔ کہ یہ ہر اس چیز کا انکار کرتا ہے جو محسوس نہیں اور مشاہدہ میں نہیں آتی۔ اور جس کو فی الحال اس کا علم و ادراک گرفت میں نہیں لا سکتا۔ چنانچہ اگر جنین میں شعور پیدا ہو جائے، اور اس کو یہ بتایا جائے کہ بطنِ مادر کے باہر بھی انسان بستے ہیں، تو وہ کھٹ سے انکار کر دیگا۔ اس لئے کہ اس کو ایسی کسی دنیا کا تجربہ نہیں۔ اسی طرح اگر ایک ننھے منے بچے کو بتایا جائے کہ زمین اور آسمان میں قدرت کے فلاں فلاں قاعدے اور قوانین کارفرما ہیں۔ اور کائنات کے اس ڈھانچہ میں یہ اسرار و رموز مضمر ہیں۔ تو وہ ہرگز ماننے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ بالکل یہی حال نچتہ فکر اور جاننے بوجھنے والے انسان کا ہے۔ وہ جن حالات و اطوار سے دوچار ہے ان کی صحت پر تو یقین رکھتا ہے۔ مگر جو کیفیات و احوال ابھی اس کی چشمِ ادراک کے سامنے نہیں آئے ان کی حقانیت اس کے نزدیک سراسر

مشتبہ ہے۔

ولایت قربِ الٰہی اور درجۂ نبوت

مثلاً ولایت اللہ تعالےٰ کے قرب وحضوری کا ایک مقام ہے اور ارتقاء انسانی کا ایک بلند ترین زینہ ہے۔ اب جو شخص اس لذت ونعمتِ خداداد سے محروم ہے اور اس کو انسانی روح کی اس پرواز کا کوئی تجربہ نہیں وہ نہیں جان سکتا کہ اس سے بھی آگے ایک مقام نبوت کا ہے۔ حالانکہ اس پورے عالم مادی وروحانی کو جن جن اطوار وکیفیات سے گزرنا ہے۔ اور ارتقاء وتقدم کی جن جن منزلوں کو طے کرنا ہے وہ گوناگون اور بہت ہیں۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی شخص صرف انھی چیزوں سے تعرض کرے۔ اور انھیں کیفیات وحالات کو تسلیم کرے جو فی الوقت درپیش ہیں۔ اور ان حقائق کو نہ مانے جن کی گرہیں مستقبل قریب یا بعید میں کھلنے والی ہیں۔ اس نوع کا انکار زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ جو علم کی تمام اقسام کو بحث ومناظرہ اور جھگڑے یا دربحث میں منحصر جانتے ہیں۔ اور تصفیۂ قلوب کے ذریعہ شکار مغیبات کے قائل نہیں۔ یہ لوگ اگر دلوں کو ماسوا اللہ سے پاک کریں۔ اور ہمہ تن اس کی جستجو اور طلب میں لگ جائیں۔ تو ان پر واضح ہو کہ اس راہ میں علم وادراک کے کتنے گلشن جان نواز ہیں اور معرفت وبصیرت کے کتنے گوشے ہیں۔ جو نظر وبصر کا ہدف بنتے ہیں۔ ایسے حضرات کہ جن کو مکاشفہ کا براہِ راست تجربہ نہیں ہے۔ اس کی حقیقت کا ایک گونہ ادراک ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ اللہ تعالےٰ پر محکم ایمان رکھیں۔ غیب کے قائل ہوں۔ اور نماز کو شعور وفہم کے ساتھ ادا کریں۔ حدیث میں آتا ہے

ان العبد اذا قام فی الصلوٰۃ رفع اللّٰہ سبحانہ الحجاب بینہ

اللہ تعالےٰ کا کوئی بندہ جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ان تمام پردوں کو

ويبين عبده ووجهه
وقامت الملائكة من لدن
منكبيه الى الهواء يصلون بصلوته
ويؤمنون على دعائه وان المصلي
ينثر عليه البر من عنان السماء
الى مفرق راسه وينادي مناد
لو علم هذا المناجي من يناجي ما
التفت وان ابواب السماء لتفتح
للمصلين وان الله يباهي ملئكته
بعبده المصلي۔

ہٹا دیا جاتا ہے جو اس میں اور اس کی ذات گرامی کے درمیان حائل ہیں اور یہ بندہ براہِ راست مواجہ الٰہی کے شرف سے مفتخر ہوتا ہے۔ فرشتے اس کے دائیں بائیں پھیلے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نماز کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اور اس کی ہر ہر دعا پر آمین کہتے ہیں۔ یہی نہیں نمازی پر نیکیوں کی آسمان سے بارش ہوتی ہے۔ اور پکارنے والا پکارتا ہے اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ کس سے مخاطب ہے تو قطعی دوسری طرف ملتفت نہ ہونے پائے۔ آسمان کے دروازے اس پر کھول دئے جاتے ہیں اور اللہ تعالےٰ اس کی عبادت وبندگی کا اظہار فرشتوں کے سامنے فخریہ کرتا ہے۔

یہاں مواجہ سے مراد کشف ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کی نمازیں

ذوقِ خشوع کی بہرہ مندی خشوع یا ڈر کا تعلق دراصل دل سے ہے۔ یہ یقین و اذعان سے اُبھرتا ہے۔ اور اس وقت پیدا ہوتا ہے جب جلال آلٰہی کا کچھ کچھ اندازہ ہو۔ جسے یہ نعمت ملی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاشع ہے۔ پھر یہ کیفیت و تاثر نماز ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ خشوع نماز میں بھی ہے اور خلوت میں بھی۔ دنیا کے ادنیٰ کاموں میں بھی قائم رہتا ہے اور عبادت وعقبیٰ کے امور میں بھی۔ کیونکہ اس کا موجب تو یہ خیال ہے کہ وہ ذاتِ گرامی ہر ہر آن اپنے بندوں کے احوال پر مطلع ہے۔ اور یہ کہ اس کا جلال ابدی ہے۔ اور یہ کہ جتنی بھی عبادت اس کی کی جائے گی اتنا ہی کم ہے۔ اس لئے کہ کوئی شخص بھی اس کے انعامات کے مقابلہ میں پوری طرح اس کی اطاعت و عبادت کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ یہ تاثر اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا رنگ جب ایک مرتبہ طبیعت میں رچ جاتا ہے۔ تو پھر ساری زندگی اسی رنگ میں بسر ہوتی ہے۔ اور کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزر پاتا کہ دل اس نعمت سے لطف اندوز نہ ہو۔

ربیع بن خثیم کا غضِ بصر ایک صاحب کا قصہ ہے کہ چالیس برس تک انھوں نے ازراہِ حیا سر اُٹھا کر آسمان کی طرف نہیں دیکھا ہے کہ مبادا ان کی کوتاہیوں پر اللہ تبارک و تعالیٰ ناراض و ناخوش ہو۔ ربیع بن خثیم کے متعلق مشہور ہے کہ اس شدت سے غضِ بصر کے اصول پر عمل پیرا تھے کہ لوگ انھیں اندھا سمجھتے۔ یہ جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

کے پاس آتے اور اطلاع کراتے تو ان کی لونڈی ان سے یہ کہہ کر تعارف کراتی کہ آپ کے نابینا دوست ملنے آئے ہیں۔ اس پر یہ ہنستے اور دروازہ کھول دیتے۔ کیا ان کا یہ فعل عبداللہ بن مسعود کی نگاہ میں لائقِ تعریف تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے۔ کہ جب ان کی نظریں ان پر پڑتیں تو یہ پکار اُٹھتے کہ قرآن نے جو مخبتین کو خوش خبری سنائی ہے اس کے مصداق تم ہی ہو سکتے ہو۔ بخدا اگر آں حضرت تمھیں دیکھ لیتے، تو خوش ہوتے۔ ایک دن عبداللہ بن مسعود کو ان کے ساتھ چلنے کا اتفاق ہُوا۔ جونہی ان کا گزر ایک لوہار کی دکان پر ہُوا۔ اور اُنھوں نے آگ سے دھکتی ہوئی بھٹیاں دیکھیں بے ہوش ہو گئے۔ جہنم کی آگ کا نقشہ اس طرح دل و دماغ پر چھایا رہا۔ کہ گھنٹوں اس کیفیت میں ساتھ رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ خوف و خشیت الٰہی کا نتیجہ ہے۔

ربیع کا قول ہے کہ میں جب نماز میں کھڑا ہوتا ہوں۔ تو میری توجہ صرف دو باتوں پر مرکوز رہتی ہے۔ اوّل یہ کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ دوم یہ کہ جواب میں مجھ سے کیا کہا جا رہا ہے۔

عامر بن عبداللہ کی نماز میں یکسوئی

عامر بن عبداللہ کی نماز میں یکسوئی کا یہ عالم تھا کہ گھر کا شور و غل قطعی اس میں خلل نہ پیدا کرتا۔ حتیٰ کہ ان کی لڑکی دف بجاتی اور گاتی، عورتیں چیخ چیخ کر باتیں کرتیں۔ اور یہ اس پر بھی سکون و اطمینان کے ساتھ نماز میں بغیر ادنیٰ تکدر کے مصروف رہتے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا نماز میں آپ کو حدیثِ نفس سے کبھی پالا پڑا ہے۔ کہا کہ نہیں۔ مجھ پر صرف یہ تاثر غالب رہتا ہے کہ اپنے مالک و آقا کے حضور کھڑا ہوں۔ اور مجھے اس کے ہاں حاضری دینا ہے۔ ان سے یہ بھی دریافت کیا گیا کہ نماز میں دنیا کے مختلف کاموں کا خیال ذہن میں آتا

ہے۔ ان کا یہ جواب تھا کہ میں اس کو پسند کروں گا کہ مجھ پر تیر و سنان کی بارش ہو اور میرا کام تمام ہو جائے، بہ نسبت اس کے کہ ایسے ایسے خیالات سے دل و دماغ کو پریشان کروں جو تمھیں ہر وقت گھیرے رہتے اور الجھنوں کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کے درجہ معرفت پران کا یہ قول دلالت کناں ہے:

لوکشف الغطاء ما ازددت یقیناً۔ — اگر کشف غطا بھی ہو جائے تب بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکے گا۔

نماز میں عمل جراحی مسلم بن یسار مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اس کا ایک ستون گر پڑا مگر یہ بدستور نماز پڑھتے رہے۔

ایک صاحب کے حصۂ جسم پر کہیں زخم ہو گیا اور وہ اتنا بگڑ گیا کہ اس کو کاٹ دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ طبیب سے کہا کہ اگر اس کا کاٹ دینا اتنا ہی ضروری ہے، تو اس وقت کاٹئے جب یہ نماز میں مشغول ہوں، کیونکہ اس حال میں ان پر کامل استغراق طاری ہوتا ہے۔ چنانچہ نماز ہی کی حالت میں جراحی کا یہ عمل انجام پذیر ہوا۔

نماز کا تعلق آخرت سے ہے نماز میں کیوں امور دنیا سے تعرض نہیں کرنا چاہئے۔ اس پر ایک عارف کا قول سنئے:

الصلوٰۃ من الآخرۃ فاذا دخلت فیہا خرجت من الدنیا۔ — نماز سراسر آخرت سے تعلق رکھنے والی ہے۔ اس لئے جہاں تم اس میں داخل ہوئے دنیا کی سرحد سے نکل گئے۔

نماز اور حدیث نفس ایک صاحب سے پوچھا گیا آپ نماز میں حدیث نفس کے عیب سے ملوث ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ نماز

کا کیا سوال ہے۔ میں تو عام حالات میں بھی نفس کی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ ایک بزرگ سے پوچھا گیا، آپ کو نماز میں نفس کی آرزوؤں کی طرف مائل ہونے کا موقع ملتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ نماز سے زیادہ کوئی محبوب مشغلہ ہی نہیں۔ کہ عنانِ توجہ ادھر مڑ سکے۔ جناب حضرت ابو درداء فرمایا کرتے تھے کہ عقلمندی یہ ہے کہ انسان نماز سے پہلے جس چیز کی چاہے آرزو کرے۔ اور جس چیز کی چاہے طلب میں مشغول رہے۔ لیکن جب نماز پڑھنے لگے۔ تو اس کا دل تمام آرزوؤں اور تمناؤں سے خالی ہونا چاہیئے۔

اختصار صلوٰۃ کی عارفانہ حکمت

بعض حضرات نے نماز ہی کو اس ڈر سے مختصر کر دیا تھا۔ کہ مبادا وسوسہ وخیال کی دخل اندازیوں سے یکسوئی میں فرق آئے۔ اور توجہ ورغبت کی وہ کیفیت قائم نہ رہ سکے۔ جس کا قائم رکھنا حاصل عبادت ہے۔ چنانچہ عمار بن یاسر نے ایک مرتبہ نماز پڑھائی۔ اور اس میں حد درجہ اختصار سے کام لیا۔ لوگوں نے اس پر کہا:

خففت یا ابا الیقظان۔ — اے ابا یقظان آپنے نماز میں قدرے تخفیف کر دی ہے۔

انھوں نے کہا یہ صحیح ہے لیکن کیا میں نے اس کے حدود وارکان میں کہیں کمی کی ہے۔ مقتدیوں نے کہا جی نہیں۔ آپ نے فرمایا میں نے سہو ونسیان کے اندیشہ کے پیش نظر ایسا کیا ہے۔ پھر تائید میں آنحضرت کی یہ حدیث پڑھی:

ان العبد لیصلی الصلوٰۃ لا یکتب له نصفها ولا ثلثها ولا ربعها ولا خمسها ولا سدسها ولا عشرها انما یکتب من صلوٰته ما عقل منها۔ — اللہ تعالیٰ کا بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو اس کا اجر اس حساب سے مرتب نہیں ہوتا کہ نصف ثلث ربع یا خمس وسدس وغیرہ کے پیمانہ سے اس کا اندازہ کیا جائے۔ بلکہ دیکھا یہ

جاتا ہے کہ کتنا حصّہ اس نے سمجھ سوچ کر ادا کیا۔

طلحہ، زبیر اور کئی دوسرے صحابہ کا طرزِ عمل یہی تھا کہ وہ ہلکی پھلکی نمازیں پڑھتے۔ اور عذر میں یہی توجیہ پیش کرتے کہ اس طرح ہم وسوسہ اندازی سے بچنا چاہتے ہیں۔

نماز مکمل کیونکر ہوتی ہے؟

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کی داڑھی کے بال پک جاتے ہیں۔ مگر انہیں یہ شعور کروٹ نہیں لیتا کہ اپنی نمازوں کو مکمل ہی کرلیں۔ پوچھا گیا کہ تکمیل سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس میں خشوع اور تواضع کا رنگ ہو۔ اور پوری پوری توجہ و طلب کی جھلک ہو۔ ابوالعالیہ سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا:

الذین ھم عن صلوٰتھم ساھون۔ اور جو نماز کے بارہ میں سہو اختیار کرتے ہیں۔

الماعون

آپ نے کہا کہ "سہو" سے یہ مقصود ہے کہ نماز پڑھنے والا نہ جانتا ہو کہ دو رکعت پر سلام پھیرا ہو یا ایک پر۔ جناب حسن کا کہنا ہے کہ اس سے یہ مقصود ہے کہ پابندیٔ وقت کا خیال نہ رکھا جائے۔ ایک بزرگ نے اس مفہوم کو اس لطیف انداز میں ظاہر کیا ہے۔ سہو سے یہ مراد ہے کہ نمازی اگر وقت پر یہ فریضہ ادا کرلے تو اس پر کوئی خوشی اور بہجت محسوس نہ کرے۔ اور اگر اس میں تاخیر ہو جائے۔ تو رنج اور افسوس سے دوچار نہ ہو۔

خشوع وخضوع کی تاثر پذیری

آنحضرت کیونکر اس کا اہتمام فرماتے تھے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے والوں میں خشوع وخضوع اور تاثر پذیری کی کیفیتیں قائم رہیں۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے۔ ایک مرتبہ آپ نے اثناء قرأت میں ایک آیت عمداً چھوڑ

دی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں سے پوچھا کہ تمھیں کچھ خبر بھی ہے کہ میں نے نماز میں کیا کیا پڑھا۔ سب چُپ رہے۔ عبداللہ بن ابی نے کہا۔ کہ حضور آپ نے فلاں فلاں سورۃ پڑھی۔ اور فلاں آیت کی تلاوت نہیں فرمائی۔ میں پوچھنے والا ہی تھا کہ کیا یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے۔ اس پر آں حضرت خوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ بے شک تمھارا دل نماز میں حاضر تھا۔ پھر حاضرین سے مخاطب ہوئے۔ اور ارشاد فرمایا:

ما بال اقوام یحضرون صلوٰتهم ویصفون صفوفهم ونبیهم بین ایدیهم لا یدرون ما یتلو علیهم من کتاب ربهم۔ الا ان بنی اسرائیل کذا فعلوا فاوحی الله عزوجل الی نبیهم ان قل لقومك تحضرونی ابدانکم۔ وتعطون السنتکم وتغیبون عنی بقلوبکم باطل ما تذهبون الیه۔[1]

ایسی قوموں کا کیا ہوگا کہ جو نمازوں میں حاضری دیتے ہیں۔ صف بندی بھی کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ ان کا نبی جو ان میں موجود ہے قرآن کریم کی کون آیت پڑھ رہا ہے۔ بنی اسرائیل نے بھی یہی حرکت کی تھی۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے ان کے پیغمبر کے ذریعہ کہلایا۔ کہ تمہاری حاضری جسموں اور زبانوں کی حاضری تو ہے۔ مگر اس کو دلوں کی حاضری نہیں کہہ سکتے۔ یاد رکھو تمھارا یہ خیال باطل ہے۔ اس طرح تم میری خوشنودی حاصل نہیں کر سکو گے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قرأت کے ساتھ ساتھ فہم معانی بھی ضروری ہے۔

۱؎ محمد بن نصر نے کتاب الصلوٰۃ میں مرسلاً ذکر کیا ہے۔

یہ ہیں وہ واقعات جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اللہ تعالٰی سے ڈرنے والوں کی نمازیں کس ڈھنگ کی ہوتی ہیں۔ اور ان میں کیفیت و معنویت کا رنگ کتنا گہرا اور چوکھا ہوتا ہے۔ اور یہ کہ صرف اعضاء و جوارح کی حرکات اور قیام و سجود کی تکرار سے زیادہ فائدہ اور منفعت حاصل ہونے کی اُمید نہیں۔ اصل چیز خشوع و خضوع اور عبرت پذیری اور تاثر ہے۔

امامت

امامت کی شرطیں اسلام نے امامت کے لئے کچھ شرائط کا ذکر کیا ہے۔ پہلی شرط یا مسئلہ یہ ہے کہ مقتدی اس پر مطمئن ہوں۔

حدیث میں ہے:

ثلاثۃ لا تجاوز صلاتھم رؤسھم، العبد الآبق وامرأۃ زوجھا ساخط علیھا وامام ام قوما وھم لہ کارھون۔	تین شخص ایسے ہیں کہ ان کی نمازیں انکے سروں سے اوپر اٹھ کر بارگاہ قبول تک نہیں پہنچ پاتیں۔ بھاگے ہوئے غلام کی، ایسی عورت کی کہ جس پر اس کا خاوند ناراض ہو اور ایسے امام کی کہ لوگ اس کو پسند نہ کرتے ہوں۔

امام کو اپنے سے زیادہ عالم کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے امام کے لئے چونکہ فقہ یا دین کے معاملہ میں زیادہ سمجھدار ہونا ضروری ہے۔ اس لئے نمازیوں میں اگر کوئی شخص معینہ امام سے زیادہ عالم اور فقیہ موجود ہے۔ تو اس کو نظر انداز کر کے خود جا نماز پر جا کھڑا ہونا ناجائز ہے۔ پہلے اس سے پوچھ لینا چاہیئے اور اس کو موقع دینا چاہیئے کہ یہ نماز پڑھائے۔ پھر اگر کسی سبب سے یہ امام نہ ہونا چاہے تب معینہ امام البتہ نماز پڑھا سکتا ہے۔

امامت کی ذمہ داری کو ایک دوسرے پر ٹلانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص امامت کی شرائط کو اچھی طرح ادا کر سکتا ہے۔ تو اس کو آگے بڑھ کر اس خدمت کو انجام دینے میں کوئی جھجک محسوس

نہیں کرنا چاہئے۔ ایک روایت میں ہے کہ پہلی قوموں کی بربادی کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں امامت کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اور ان میں کا ہر آدمی اس منصب کو دوسرے کے حوالے کر دینا ہی مناسب سمجھتا تھا۔ نماز اور عبادت ایسی نیکیوں میں یہ جھجک اور تکلف شرعاً ممنوع ہے۔ صحابہ کے بارے میں جو مروی ہے کہ ان میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو امامت کے معاملہ میں ایثار کو ترجیح دیتی تھی۔ تو یہ دوسری بات ہے۔ اس کا محرک تقویٰ اور ذمہ واری کا خوف تھا۔ فرائض سے بچنا اور احتراز کرنا نہیں تھا۔

امام مؤذن سے افضل ہے

دوسرے یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اذان و امامت میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کر لینے کا اختیار دیا جائے تو اسے امامت کو منتخب کرنا چاہئے۔ کیونکہ مؤذن ہونے سے امام ہونا کہیں فضیلت کی بات ہے۔ اس پر کئی دلائل ہیں۔ سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آں حضرت نے جب تک زندہ رہے اس پر مواظبت فرمائی۔ اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء حضرات ابوبکر، عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم نے اس سنت کو جاری رکھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ دلیل ہے۔ کہ جب خلافت پر جھگڑا ہوا تو اس کے لئے امامتِ صلوٰۃ ہی کو استدلال کا مبنیٰ ٹھہرایا گیا۔ صحابہ نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون اور اصل ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے رسول نے امامتِ صلوٰۃ کا منصب ابوبکر کے سپرد کیا۔ تو امور دنیا میں بھی سربراہی کا حق انھی کو پہنچتا ہے۔

وقت کی پابندی ضروری ہے

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ امام وقت کی پابندی کا خیال رکھے۔ اور یہ کوشش کرے کہ نماز اوّل وقت ہی پڑھے۔ چاہے زیادہ تعداد میں مقتدی جمع نہ ہوئے ہوں۔ چنانچہ

صحابہ کی عادت تھی کہ اگر دو ہی نمازی جمع ہو گئے تو انھوں نے تیسرے کا انتظار نہیں کیا۔ اور تین آ گئے تو چوتھے کی راہ نہیں دیکھی۔ اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت نماز فجر میں طہارت کی غرض سے پیچھے رہ گئے۔ عبدالرحمن بن عوف نماز پڑھا رہے تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ سلام پھیرنے کے بعد آنحضرت فوت شدہ رکعت پڑھ رہے ہیں تو ڈرے کہ مبادا آنحضرت خفا ہوں۔ لیکن آپ خوش ہوئے اور فرمایا:

احسنتم ھکذا فافعلوا۔ تم نے اچھا کیا یونہی کیا کرو۔

امام کو مؤذن کا انتظار بھی نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ یہ تو مؤذن کا فرض ہے کہ امام کا انتظار کرے۔ پھر جب امام آجائے تو کسی دوسرے کا انتظار غیر ضروری ہے۔

امامت اللہ کی خوشنودی کیلئے ہو

چوتھا اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ امام اپنے فرائض امامت کو محض اللہ تعالے کی خوشنودی کے لئے ادا کرے۔ اور اس پر کوئی صلہ یا معاوضہ قبول نہ کرے۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ کہ عثمان بن ابی العاص نے ایک مرتبہ مؤذن کا تقرر کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس کو اذان پر کوئی معاوضہ نہیں ملنا چاہئے۔ ہاں اگر مسجد کی کوئی وقف آمدنی ہے۔ یا بادشاہ کی طرف سے مسجد کے مصارف کے لئے کچھ رقم مخصوص ہے یا لوگ چندہ جمع کر کے امام کی خدمت کرنا چاہیں تو یہ دوسری بات ہے۔ اس کو ناجائز کہنا دشوار ہے تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں کراہت کا پہلو نمایاں ہے۔ پھر اس معاوضہ کی بھی یہ تاویل کی جائے گی کہ اس کا تعلق امامت صلوٰۃ سے نہیں ہے۔ بلکہ اس نگرانی اور مصالح مسجد کی دیکھ بھال اور اوقات کی پابندی وغیرہ سے

ہے جو امام کے ذمہ ہے۔

امام اور سیرت و عمل کی پاکیزگی

امام چونکہ شرعاً امین ہے۔ اس لئے اس پر یہ بھی لازم ہے کہ فسق و فجور سے محترز رہے۔ کبائر سے بچے اور صغائر پر اصرار نہ کرے۔ اور اس طرح کی صاف ستھری زندگی بسر کرنے کے لئے جدوجہد بھی کرے۔ کیونکہ اس کی حیثیت ایک شفیع اور نمائندہ کی سی ہے جس کو بہرحال ان لوگوں سے بہتر ہونا چاہئے جن کی یہ نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ نماز میں پوری پوری طہارت کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے ظاہری ناپاکیوں سے بھی بچنا چاہئے۔ اور اگر اثنائے نماز میں محسوس ہو کہ پاکیزگی کا یہ معیار قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اور وضو ٹوٹ گیا ہے۔ تو ادنےٰ شرم سے متاثر ہوئے بغیر اس کو پیچھے ہٹ جانا چاہئے اور کسی دوسرے کو امامت کے لئے آگے بڑھا دینا چاہئے۔ خود آنحضرت سے ثابت ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز میں انکو یاد آیا کہ غسلِ جنابت سے فراغت حاصل نہیں کی ہے۔ اس پر آپ فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ اور جب تلک نہا دھو کر نماز پڑھنے کے لائق نہیں ہوئے نماز نہیں پڑھی۔

کن لوگوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھنا چاہئے

بدرجۂ مجبوری کن لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور کن لوگوں کے پیچھے نہیں۔ اس کے بارہ میں حضرت سفیان کہتے ہیں:

صل خلف کل بر و فاجر الا مدمن	ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو۔
خمر او معلن بالفسوق او	سوائے اس شخص کے کہ جو باقاعدہ شرابی
عاق لوالدیه او صاحب بدعة	ہے یا علانیہ فسق و فجور کا مرتکب ہے یا
او عبد آبق۔	والدین کا نافرمان ہے۔ یا بدعتی ہے یا
	آقا سے بھاگا ہوا غلام ہے۔

پانچویں قابلِ رعایت چیز یہ ہے کہ امام نماز پڑھانے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ صفیں درست ہیں اور ان میں کہیں خلل تو نہیں ہے۔ پھر جب یہ اطمینان ہو جائے کہ سب کندھے سے کندھا ملائے اور ٹخنے سے ٹخنہ ملائے کھڑے ہیں تو نماز پڑھانا شروع کرے۔ اور اس وقت تک تکبیرِ تحریمہ نہ کہے جب تک مؤذن اقامت سے فارغ نہ ہو جائے۔ مؤذن کے لئے ضروری ہے کہ اذان و اقامت میں اتنا وقفہ رکھے کہ نمازی اتنے میں تیاری کرلیں۔ حدیث میں ہے:

لیتمہل المؤذن بین الاذان والاقامة بقدر ما یفرغ الاکل من طعامه والمتعصر من اعتصاره۔	مؤذن کو اذان و اقامت میں اتنی مہلت دینی چاہیئے کہ کھانے والا کھانے سے فارغ ہو جائے۔ اور جسے قضائے حاجت کرنا ہے وہ قضائے حاجت کرلے۔

غرض یہ ہے کہ جب کوئی نماز میں شریک ہو تو پوری یکسوئی کے ساتھ شریک ہو اور جسمانی یا روحانی طور پر کوئی الجھن ایسی نہ رہے جو فکر و ذہن کو مشوش رکھے۔

چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ امام تکبیر تحریمہ اور دوسری تکبیرات بلند آواز سے کہے۔ اگرچہ مقتدی اتنی ہی بلند آواز سے تکبیرات کا اعادہ کرے گا کہ جس کو وہ خود سُن لے۔ امام کو چاہیئے، نماز کے ساتھ امامت کی نیت بھی باندھے۔ تاکہ نماز پڑھانے میں جو فضیلت ہے اس سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں۔ اگر امام امامت کی الگ نیت نہیں باندھتا ہے تو بھی نماز ہو جاتی ہے۔

قرأت کے تین ضروری وظائف امام کو کیا پڑھنا چاہیئے اور کس انداز سے پڑھنا چاہیئے۔ اس کے لئے ان تین نکات کا ذہن میں رہنا ضروری ہے۔ قرآن کے تین ضروری وظائف ہیں :

وظیفۂ اولیٰ۔ امام کو چاہیئے کہ دعائے استفتاح اور تعوذ تو دل میں پڑھے۔ جیسے منفرد پڑھتا ہے۔ اور فاتحہ اور اس کے بعد کی سورت پہلی دو رکعتوں میں جہراً پڑھے۔ بشرطیکہ نماز صبح، مغرب اور عشاء کی پڑھ رہا ہو۔ آمین بھی اس کو پکار کر کہنا چاہیئے۔ اور مقتدی کو بھی چاہیئے۔ کہ اس معاملہ میں امام کی اقتداء کرے۔ آمین پکار کر کہنے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ امام کے ساتھ ساتھ کہے۔ یہ نہیں کہ جب وہ کہہ چکے تب کہے بسم اللہ جہراً پڑھنا چاہیئے یا نہیں اس میں اخبارات و روایات کا اچھا خاصہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن امام شافعی نے جہراً پڑھنے کو ترجیح دی ہے۔

وظیفۂ ثانیہ۔ امام کے لئے ضروری ہے کہ نماز میں تین سکنات یا وقفات اختیار کرے۔ پہلا وقفہ تکبیر تحریمہ کا ہے۔ تاکہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ سکے۔ اور یہ نسبتاً زیادہ طویل ہو گا۔

دوسرا وقفہ فاتحہ کے بعد ہونا چاہیئے۔ تاکہ مقتدیوں میں اگر کوئی فاتحہ کاملاً نہیں پڑھ سکا ہے تو اس اثناء میں پڑھ لے۔ تیسرا وقفہ اس وقت ہونا چاہیئے جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے۔ تاکہ تکبیر اور قرأت میں ایک گونہ فصل قائم رہے۔ لیکن یہ وقفہ حد درجہ مختصر ہو گا۔

وظیفۂ ثالثہ۔ یہ ہے کہ صبح کی نماز میں امام ان سورتوں کا انتخاب کرے جو ذرا طویل ہوں اور مثانی کے ذیل میں آسکیں۔ کیونکہ آں حضرت نے اسے پسند فرمایا ہے۔ دوسری رکعت میں البتہ اگر ایسی ہلکی پھلکی سورتیں بھی پڑھ

لیتا ہے جو بیس تیس آیات پر مشتمل ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مزید برآں ان سورتوں کو نماز میں پڑھنا اس لئے بھی مفید ہے کہ چونکہ ان کو عموماً دہرایا نہیں جاتا۔ یعنی یہ مثانی کے ضمن میں نہیں آتیں۔ اس لئے جب کبھی پڑھی جائیں گی۔ توجہ سے سنی جائیں گی۔ وعظ و نصیحت کے اعتبار سے زیادہ کارگر و مؤثر ثابت ہوگی۔

ظہر میں طوال مفصل میں سے کوئی سورت بقدر تیس چالیس آیات کے پڑھ سکتا ہے۔ گھر کی نماز میں اس سے کم آیات کے پڑھنے پر اکتفا کرے۔ اور مغرب میں اواخر مفصل میں سے کوئی سی سورت منتخب کر سکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے جو آخری مغرب کی نماز پڑھی۔ اس میں سورۃ مرسلات کی قرأت فرمائی۔

ایک اہم اصول باجماعت نماز میں تخفیف سے کام لینا چاہیئے

نمازوں کے سلسلہ میں اہم اصول یہ بھی ہے کہ اگر مقتدیوں کے ساتھ اور باجماعت نماز پڑھ رہا ہے۔ تو اس میں اسے تخفیف و اختصار سے کام لینا چاہیئے۔ اور اگر تنہا ہے تو اسے اختیار ہے کہ جتنی دیر تک چاہے پڑھے۔ حدیث میں ہے :۔

اذا صلی احدکم بالناس فلیخفف فان فیہم الضعیف والکبیر وذالحاجۃ واذا صلی لنفسہ فلیطول ماشاء۔	جب کوئی تم میں سے نماز پڑھائے۔ تو اسے تخفیف اختیار کرے۔ کیونکہ مقتدیوں میں کمزور، عمر رسیدہ اور صاحب ضرورت ہر نوع کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی تنہا پڑھتا ہے تو استطاعت و شوق کے تحت جس قدر چاہے نماز کو طول دے لے۔

اس اصول کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ کہ ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبل نے عشاء کی نماز پڑھائی تو اس میں سورۃ بقرہ شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوُا کہ ایک صاحب آخر تک نماز میں شریک نہ رہ سکے۔ اس پر جھگڑا ہوُا۔ آنحضرت نے حضرت معاذ سے برہم ہو کر فرمایا :-

افتان انت یا معاذ ؟ معاذ کیا تمہارا مقصد لوگوں کو فتنہ و آزمائش میں مبتلا کرنا ہے

نمازِ جمعہ کے فضائل

یوم جُمعہ کی اہمیتیں عبادات کے نقطہ نظر سے یہ بہت بڑا دن ہے۔ جو اسلام کے ساتھ خاص ہے۔ اور جو مسلمانوں کے نزدیک بدرجہ غایت احترام چاہتا ہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے :-

اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ (الجمعہ پ) جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو خدا کی یاد کے لئے جلدی کرو۔

اس کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس وقت ہر اس مانع سے روکا ہے اور ہر اس مشغلہ سے باز رہنے کی تلقین فرمائی ہے جو نماز جمعہ ادا کرنے میں حائل ہو۔

حدیث میں ہے :-

ان اللہ فرض علیکم الجمعۃ فی یومی ھذا فی مقامی ھذا۔ اللہ تعالےٰ نے اس دن اور اس مقام پر نماز جمعہ کو تم پر فرض ٹھہرایا ہے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے :-

من ترک الجمعۃ ثلاثاً من غیر عذر طبع اللہ علیٰ قلبہ۔ جس کسی نے بغیر کسی عذر کے نماز جمعہ ترک کی اللہ تعالےٰ نے اس کے دل پر مہر کر دی۔

یہ الفاظ بھی آئے ہیں :-

فقد نبذ الاسلام وراء ظھورہ اس نے گویا اسلام ہی کو پس پشت ڈال دیا۔

حضرت ابنِ عباس سے ایک شخص نے پوچھا۔ کہ اگر ایسا آدمی مرجائے۔

جس نے نہ کبھی نماز پڑھی ہو اور نہ جمعہ میں شرکت کی ہو۔ تو اس کے متعلق کیا فتویٰ ہے۔ آپؓ نے فرمایا۔ ایسا بدبخت جہنّم میں جائے گا۔ یہ شخص اتفاق سے پورا ایک مہینہ ان کے پاس آتا رہا اور یہی مسئلہ پوچھتا رہا۔ حضرت ابن عباسؓ کا جواب ہر مرتبہ یہی تھا۔ کہ اس کے لئے دوزخ کی آگ مقدر ہو چکی ہے۔

ایک حدیث میں اس کے فضائل سے متعلق آں حضرت نے ارشاد فرمایا ہے:۔

ان اھل الکتاب اعطوا	اہلِ کتاب کو بھی جمعہ کا دن ہی عبادت کے لئے
یوم الجمعۃ فاختلفوا فیہ	دیا گیا تھا لیکن انھوں نے اس میں اختلاف
وھدانا اللہ تعالیٰ لہ	کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کی توجہ ہٹا دی اور
واخرہ لھذہ الامۃ وجعلہ	ہمیں توفیق دی کہ ہم اس کو پالیں۔ یعنی ہمارے
عیداً لھم فھم اولی الناس	ہی لئے اس دن کو اللہ تعالیٰ نے اٹھا رکھا تھا.
بہ سبقاً واھل الکتابین	یہ دن بمنزلہ عید کے ہے۔ اس دن کو پا لینے اور
لھم تبع (۱)	اس میں عبادت کرنے کے معاملہ میں اہلِ کتاب
(الحدیث)	آگے ہیں اور عیسائی و یہودی ہم سے پیچھے ہیں۔

ایک حدیث میں جمعہ کو سفید اور چمکتے ہوئے آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔

ایک حدیث میں آنحضرت نے فرمایا ہے:۔

خیر یوم طلعت علیہ الشمس	وہ سب سے بہتر دن جس پر آفتاب ضوء افگن ہوا
یوم الجمعۃ۔	ہے جمعہ ہے۔

حضرت کعب کا کہنا ہے کہ جس طرح شہروں میں اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ

---

(۱) متفق علیہ۔

کو فضیلت بخشی ہے۔ اور مہینوں میں رمضان کو شرفِ قبولیت سے نوازا ہے۔ اسی طرح جمعہ کو منتخب فرمایا ہے۔

ابوابِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کے اسرار و دقائق

زکوٰۃ کیوں رُکنِ دین ہے؟ عشق و محبتِ الٰہی کی عملی کسوٹی

جو لوگ زکوٰۃ اس لئے ادا کرتے ہیں کہ انھیں طریق آخرت پر گامزن ہونا ہے۔ اور اپنے مولا و آقا کی رضا چاہنا ہے ان کے لئے ضروری ہے کہ چند نکات کو خصوصیت سے ذہن میں رکھیں۔ ان میں پہلا اور اہم نکتہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے مقصود کیا ہے۔ اسے کیوں وجۂ امتحان ٹھہرایا گیا ہے اور کیوں یہ اہمیت دی گئی ہے کہ یہ اسلام کا ایک رکن ہو۔ حالانکہ اس کا تعلق عبادت بدنیہ سے بالکل نہیں۔

اس لئے کہ جب کوئی شخص کلمۂ توحید کا اقرار کرتا ہے اور اللہ تعالےٰ کو اپنا معبود مان لیتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہی ذاتِ گرامی اس کا محبوب بھی ہے اس پر یہ جان چھڑکتا ہے اور اس کی دل سے پوجا بھی کرتا ہے۔ مگر کیا یہ تنہا اقرار باللسان اس اظہار محبت کے لئے کافی ہے؟ نہیں اسے عمل سے ثابت کرنا ہوگا۔ اور بتانا ہوگا کہ اس محبوب کی راہ میں یہ اپنی عزیز ترین چیز دل سے دست کش ہوسکتا ہے اور ان سب اشیاء کو چھوڑ سکتا ہے جو اس کے اخلاص میں رخنہ ڈالنے والی ہوں۔ یہ عزیز ترین چیز مال کے سوا اور کون ہوسکتی ہے۔ یہی وہ شے ہے جس کو تمام دنیا دیوانہ وار چاہتی ہے۔ کیونکہ دنیا کا سارا کارخانۂ عیش اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی نہیں لوگ اس کے ساتھ اس درجہ مانوس ہیں کہ موت کے تصوّر سے بھی خائف ہیں۔ حالانکہ اگر یہ اللہ تعالےٰ کو واقعی اپنے محبوب سمجھتے ہیں تو انھیں موت پر خوش ہونا چاہیئے کہ اس کے ذریعے فرقت کی گھڑیاں ختم ہو جاتی ہیں اور لقاء کے مواقعے میسر آتے ہیں۔ مال کو چونکہ عوام الناس میں یہ حیثیت حاصل ہے اس بناد

پر اللہ تعالیٰ نے اس سے اندازہ کرنا چاہا۔ کہ ان کے دلوں میں اس کے مقابلہ میں ہمارے لئے کتنی محبت ہے۔ یہ اس معشوق کا ساتھ دیتے ہیں۔ یا ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں اس امتحان و آزمائش کا ذکر ہے۔

ان اللّٰہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ — خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں اور اس کے عوض میں ان کے لئے بہشت تیار کی ہے

توبہ ۱۱۱

مالی ایثار کے درجے مقام صدیقی یا توحید

پھر اس مالی ایثار کے بھی کئی درجے ہیں۔ کچھ وہ اصحابِ توحید ہیں۔ جو مال و دولت کی تمام فراوانیوں سے دستبردار ہو گئے۔ اور اس قابل ہی نہ رہے کہ محصل آئے اور ان سے زکوٰۃ کا تقاضہ کرے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا قصّہ ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا۔ دو سو درہم میں کیا زکوٰۃ دینا چاہئے۔ اُنھوں نے فرمایا عوام کا مسئلہ بتاؤں یا خواص کا۔ عوام کو پانچ درہم اس میں سے الگ کر دینا چاہئے۔ رہے خواص تو ان کا مسئلہ یہ ہونا چاہئے کہ کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھیں۔

مالی ایثار کے اس تفاوت کا پتہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے طرزِ عمل سے چلتا ہے کہ اوّل الذکر نے تو اپنا سارا اثاثہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دیا۔ اور ثانی الذکر نے اپنا آدھا مال لا کر حضور کے قدموں میں ڈال دیا۔ حضور نے فاروق سے جب پوچھا کہ گھر کی ضروریات کے لئے بھی کچھ چھوڑ آئے ہو تو اُنھوں نے کہا۔ جی ہاں جتنا لایا ہوں اس کے لگ بھگ۔ صدیق رضؓ کا جواب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی محبت کے سوا گھر میں اور چیز نہیں رہنے دی۔ اس پر آپ نے فرمایا

بینکما ما بین کلمتکما۔ — تمہارے اجر و صلہ کی مقداروں میں اتنا ہی فرق ہے کہ جتنا تمھارے ان کلمات میں ہے۔ (الحدیث)

یعنی یہاں صدیق کا پلڑا بھاری رہا کہ انھوں نے اپنے محبوب پر وہ سب کچھ نچھاور کیا کہ جس کے وہ مالک تھے۔

مقام صدیقی سے ادھر کے کچھ زینے تابعین کی روش

زکوٰۃ کے حقوق وصدقات کی تشریح

کچھ وہ لوگ ہیں جن کا درجہ اہلِ توحید واخلاص سے ذرا کم ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جو اگرچہ سب کچھ محبوب کی راہ میں نہیں دیتے تاہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے زائد مال میں غربا، ومساکین واقربا، و اعزہ کا حصہ ہے۔ یہ مال و دولت جمع بھی کرتے ہیں تو اس نیت سے کہ خیر کے مختلف پہلوؤں میں خرچ کیا جائے۔ تنعم یا تعیش کو بہرحال یہ اختیار نہیں کرتے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو صرف زکوٰۃ دینے پر اکتفا نہیں کرتے۔ اور یہ خیال نہیں کرتے کہ صرف اس فریضہ کے ادا کر دینے سے جماعت وملّت کا ہر حق ان پر سے ساقط ہو گیا ہے۔ اور اب یہ اس چیز کے مکلّف نہیں رہے۔ کہ دیگر ضروریات قومی کے لئے اعانت ونصرت کا ہاتھ بڑھائیں۔ بلکہ یہ اس عقیدے کے حامل ہوتے ہیں کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق وواجبات کی ایک فہرست ہے۔ کہ جس پر کچھ نہ کچھ صرف ہونا چاہیئے۔ ان کا مسلک جمہور تابعین کے عین موافق ہے۔ نخعی عطاء مجاہد اور شعبی نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کے دائرے بہت وسیع ہیں۔ اور صرف زکوٰۃ ادا کر دینے سے کوئی مسلمان تمام حقوق اور انواعِ خیرات سے عہدہ برآ نہیں ہو جاتا۔ ان کا مدارِ استدلال اس انداز کی بہت سی آیات ہیں:۔

وآتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ — بقرہ ۱۷۷ — اور مال باوجود عزیز رکھنے کے خرچ کریں۔

ومما رزقنٰھم ینفقون — بقرہ ۳ — اور جو کچھ ہمنے عطا فرمایا ہے اسمیں سے خرچ کرتے ہیں

وانفقوا مما رزقنٰکم — بقرہ ۲۵۴ — اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کر لو۔

آیت زکوٰۃ سے آیاتِ صدقات کا عموم منسوخ نہیں ہوا ان کا کہنا ہے کہ آیت زکوٰۃ نے ان آیات کے عموم کو منسوخ نہیں کیا۔ اور اب بھی ایک دولت مند پر ایک غریب اور نادار کی مدد کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح کہ زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے واجب تھا۔ اس معاملہ میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ حاجت مند مہمان کی احتیاجوں کو دور کرنا فرض کفایہ ہے۔ کیونکہ یہ تو کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے کہ ایک مسلمان محض ناداری و افلاس کی وجہ سے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہاں ان احتیاجوں کو کیونکر پورا کیا جائے؟ اس میں البتہ اختلاف ہے۔

ایک صورت یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کچھ رقم حاجت مند کو دیدی جائے۔ تاکہ وہ سنبھل جائے اور کش مکش روزگار سے نکل جائے۔ دوسری صورت قرض دینے کی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرض دینا ایک ادنیٰ اور فروتر درجہ ہے۔

عوام صرف زکوٰۃ دینے پر اکتفاء کرتے ہیں ایک گروہ عوام کا ہے جو صرف زکوٰۃ دینے پر اکتفاء کرتا ہے۔ اور ایک پائی اس سے زیادہ خرچ کرنے کا قائل نہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن میں انفاق فی سبیل اللہ کا داعیہ بے حد کمزور پڑ گیا ہے۔ یا جن میں مال و دولت کی محبت فزوں تر ہے۔ اور جو عقبیٰ و آخرت سے بہت ہی کم لگاؤ رکھتے ہیں۔

دوسرا قابلِ لحاظ نکتہ ابوابِ زکوٰۃ میں دوسرا قابلِ لحاظ نکتہ یہ ہے کہ اس کے ادا کرنے میں جلدی کی جائے۔ اور آج کل پر نہ ٹالا جائے۔ اس سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ تمھارے دل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جذبہ کتنا قوی ہے۔ دوسرے یہ فائدہ ہے کہ تمھیں ان مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا

جسے بسا اوقات نفس خواہ مخواہ پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ نیکی اور خیر ایک باطنی تحریک اور قلبی میلان ہی تو ہے۔ اس کو غنیمت جاننا چاہیئے۔ خدا جانے کب دل میں دوسری خواہشیں اور خیالات بڑھ کر اس کا خاتمہ کر دیں۔ اور اس برکت و نیکی سے محروم ہی رہ جائے۔ اس لئے کہ جہاں دل میں ملائکہ خیر و خوبی کی خواہشوں کو اُکساتے رہتے ہیں وہاں شیطان بھی اپنی وسوسہ اندازیوں سے باز نہیں رہتا۔ اور وہ بھی فقر و افلاس کی ہولناکیوں سے ڈراتا رہتا ہے۔ اور کہتا رہتا ہے کہ اگر اسی طرح بے دریغی سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے رہے تو تمھارے پاس خود تمھاری ضروریات کے لئے بچے گا کیا۔

زکوٰۃ کیلئے ایک متعین مالی سال کی تعیین ضروری ہے

زکوٰۃ دینے کے لئے ایک متعین مالی سال کا مقرر کرنا ضروری ہے۔ اور کوشش کرنا چاہیئے کہ یہ ماہ یا تو محرم ہو یا رمضان المبارک ہو۔ محرم تو اس بناء پر کہ یہ اسلامی سال ہے۔ اور رمضان اس وجہ سے کہ اس سے کئی برکتیں وابستہ ہیں۔ آں حضرت کے بارے میں احادیث میں مذکور ہے کہ اسی مہینہ کو زکوٰۃ کے لئے منتخب فرماتے تھے۔ اور یوں بے دریغی سے اس میں فیاضی سے کام لیتے تھے اور اس طرح عطاؤ جود کا سلسلہ جاری ہوتا تھا کہ گویا داد و دہش کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ اسی رمضان میں لیلۃ القدر ہے اور اسی میں قرآن نازل ہوا۔ ذوالحجہ بھی اپنی برکات کے اعتبار سے موزوں مہینہ ہے۔

تیسرا نکتہ

تیسرا نکتہ جو یاد رکھنے کا ہے یہ ہے کہ زکوٰۃ میں اظہار اچھا نہیں جبقدر خفا اور اسرار ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اظہار میں ریاء و شہرت کا خدشہ ہے۔

اسی بناء پر آں حضرت نے فرمایا ہے :-

افضل الصدقة جهد المقل الی الفقیر فی سر۔	بہترین صدقہ اس غریب کا ہے جو گاڑھے پسینے کی کمائی سے فقیر کو دے اور چھپا کر دے۔

ایک عالم کا کہنا ہے :۔

ثلث من کنوز البر منہا اخفاء الصدقة۔	نیکی کے خزانوں میں تین چیزیں داخل ہیں۔ ان میں ایک صدقہ کو چھپا کر دینا ہے۔

ایک حدیث میں ہے :۔

ان العبد لیعمل عملاً فی السر فیکتبہ اللہ سراً فان اظہرہ نقل من السر وکتب فی العلانیة فان تحدث بہ نقل من السر وکتب ریاءً۔	اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ جب نیکی خفا و سر میں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو خفا و سر کے دفتر میں درج فرما دیتا ہے۔ پھر اگر اس کا بندہ اظہار کرے تو خفا و سر کے دفتر سے نکال کر اس کو ایسے دفتر میں لکھ دیتا ہے جس میں علانیہ نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور اگر اس کے بارے میں لوگوں میں چرچا کرنے لگے تو اس کا شمار ریاکاروں میں کیا جاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث میں ارشاد فرمایا ہے :۔

سبعة یظلہم اللہ یوم لا ظل الا ظلہ احدہم رجل تصدق بصدقة فلم تعلم شمالہ بما اعطت یمینہ۔	سات آدمی ایسے ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ اس دن اپنا سایہ ڈالیگا کہ جس دن اس کے سایۂ رحمت کے سوا اور کسی کا سایہ نہ ہوگا۔ ان میں ایک آدمی وہ ہے کہ جس نے اس طرح چھپا کر اللہ کی راہ میں دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہو پائی کہ داہنے ہاتھ نے کیا دیا۔

خود قرآن کریم سے اس کی تائید ہوتی ہے :۔

وان تخفوھا وتوتوھا الفقراء فھو لکم (بقرہ ۲۷۱)	اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو خوب تر ہے۔

ریاکاری سے بچنے کی تدبیریں

بعض لوگوں نے خفا و سر کے معاملہ میں حد سے زیادہ احتیاط کی ہے۔ مثلاً بعض نے یہ مناسب جانا کہ خیرات صرف اندھے اور نابینا کو دی جائے تاکہ وہ دینے والے کو نہ پہچان سکے۔ بعض نے یہ تدبیر کی کہ جو کچھ دینا ہے اس کو فقیر کی راہ میں ڈال دیا اور چل دیئے بعض نے جہاں کوئی فقیر بیٹھتا ہے رقم وہاں چھپا کر رکھ دی۔ کہ جب نظر پڑے اٹھالے۔ کسی نے سوتے میں چپکے سے فقیر کے کپڑوں میں چھپا دینے کو موزوں خیال کیا۔ اور کسی نے اندیشۂ ریا و شہرت سے بچنے کے لئے وکیل کی معرفت دینا پسند کیا تاکہ اصل معطی کا پتہ ہی نہ چل سکے۔

حب جاہ کا جذبہ حُبِ مال کے جذبے سے کہیں قوی تر ہے

غرض جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ انسان کو اپنے اعمال میں ریاکار نہیں ہونا چاہیئے۔ تو ہر کوئی کوشش کرے گا کہ اس سے احتراز کرے۔ کیونکہ یہ صحیح ہے کہ زکوٰۃ و صدقات سے بخل کا ازالہ اور مال و دولت کی محبت کا قلع قمع کرنا مقصود ہے۔ اور ایک حد تک زکوٰۃ دینے والا اس مقصد کو پا بھی لیتا ہے۔ رہا حُبِ جاہ کا جذبہ تو حُبِ جاہ کا جذبہ تو حبِ مال کے جذبے سے کہیں زیادہ قلب و ذہن پر قابو پانے والا ہے جو اس کے ساتھ ساتھ اُبھرتا اور پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر اس سے پیچھا چھڑوانے کیلئے کوئی ڈھنگ و ڈھنا اختیار کی جائے تو زکوٰۃ و صدقات کی عادت سے معتدبہ فائدہ حاصل نہ ہُوا۔

سروخفا کی فضیلت سے یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ کھلے بندوں زکوٰۃ دینا اور خیرات کرنا بہر حال ممنوع ہے۔ قرآن حکیم نے بعض حالات میں اس کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اس طریق کو پسند فرمایا ہے :۔

ان تبدوا الصدقات فنعما ھی ؕ ترجمہ اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے۔

صدقات وخیرات کے سلسلہ میں اعلان بعض حالات میں موزوں ہے

یہ حالات کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک حالت مثلاً یہ ہو سکتی ہے کہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینے کی ترغیب پیدا ہو۔ یہ مقصد بجائے خود قابل قدر ہے۔ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مانگنے والا بھرے مجمعے میں سب کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔ اور اس بات کی قطعاً پرواہ نہ کرے کہ اس سے اس کی عزّتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں صرف اندیشۂ ریا سے متأثر ہو کر اس کے سوال کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے کہ شریعت نے اگرچہ سر وخفا یا اعلان واظہار دونوں کو مختلف حالات میں جائز اور اولیٰ قرار دیا ہے۔ اور دونوں میں سے کسی کو بھی ناجائز نہیں ٹھیرایا۔ تاہم اعلان واظہار میں غوائل اور ہلاکتوں کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس بناء پر سخت احتیاط اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ زکوٰۃ دینے والے کو پہلے دل کے مختلف گوشوں کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہئیے۔ اور اس بات کا اطمینان کر لینا چاہئیے کہ کہیں قلب وذہن کی گہرائیوں میں ریاء وشہرت کے دواعی تو سر نہیں اُٹھا رہے ہیں۔ پھر وہ طریق اختیار کرنا چاہئے جو مناسب حال ہو۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ صدقات وخیرات کی نوعیت اموال واشخاص کے اختلاف سے بدل جاتی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص میں حب جاہ کا جذبہ قوی ہے تو اس کے لئے خفاء وسر ہی اولیٰ اور بہتر ہے۔ اس کو اعلان واظہار کے مواقع سے بچنا چاہئیے۔

چوتھا نکتہ

چوتھا نکتہ جو صدقات وزکوٰۃ کے ضمن میں نہایت ضروری ہے۔ یہ کہ "من واذی" سے انسان بچنے کی کوشش کرے۔ ورنہ صدقات کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور دینے والا یا معطی کسی اجر وصلہ کا مستحق ہی نہیں رہتا۔ قرآن حکیم میں ہے :۔

لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذیٰ (بقرہ ۲۶۴) — اپنے صدقات احسان رکھنے اور ایذا دینے سے برباد نہ کر دینا۔

منّ و اذیٰ کی عملی صورتیں لیکن یہ منّ و اذیٰ ہے کیا اور اس کا اطلاق کن کن صورتوں پر ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ منّ تو اس سے تعبیر ہے کہ کوئی شخص اپنے صدقات کا دوسروں سے ذکر کرے۔ اور اذیٰ یہ ہے کہ اس کو اچھالتا پھرے۔ حضرت سفیان نے اس کے دوسرے معنی کئے ہیں۔ ان کے نزدیک اذیٰ کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے صدقات میں کسی نوع کا شرعی بگاڑ پیدا ہو جائے۔ اور منّ یہ ہے کہ اس کا لوگوں سے تذکرہ کرے۔ ایک رائے یہ ہے کہ منّ اس چیز کا نام ہے کہ جس کو دیا ہے اس سے کام لے اور اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے۔ اور اذیٰ کی یہ شکل ہے کہ سائل کو فقر و افلاس کا طعنہ دے۔ اور عار دلائے۔ ایک خیال یہ ہے کہ منّ صرف جتانا ہی نہیں بلکہ شیخی بگھارنا بھی ہے اور اذیٰ یہ ہے کہ سائل یا فقیر کو ڈانٹ دیا جائے۔ حدیث میں ہے:۔

لا یقبل اللہ صدقۃ منان۔ — اللہ تعالیٰ منان کا یعنی منّ کے مرتکب کا صدقہ قبول نہیں کرتا۔

منّ کا تعلق درحقیقت دل سے ہے ہمارے نزدیک منّ کی ایک دوسری ہی توضیح ہے۔ اس کی جڑ دل میں ہے۔ اور اس کا تعلق ان کیفیات سے ہے۔ جو کسی شخص کے قلب میں پرورش پاتی ہیں۔ پھر اس کے بعد جو کچھ زبان یا جوارح سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اس جڑ اور اصل کا برگ و بار ہے۔ نتیجہ و ثمرہ ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ جب اس نے کسی فقیر یا سائل کی حاجت برائی کی ہے تو اس نے اس پر گویا بہت بڑا احسان کیا ہے۔ حالانکہ احسان اس غریب اور مفلس کا ہے کہ جس نے اس کا دیا ہوا مال قبول کر کے اس کو جہنم کے شعلوں سے

بچایا۔ اور موقع دیا کہ یہ اپنے مال و دولت کی پاکی کے ساتھ دل کی پاکی اور تطہیر کا سامان بھی فراہم کرے۔ اس لئے اسے بجائے احسان جتانے کے اُلٹا اس کا ممنون ہونا چاہیئے۔ فقیر اور سائل کا ہاتھ جو مدد و اعانت کے لئے بڑھتا ہے درحقیقت ایک بہانہ اور ذریعہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اس کے صدقات کو شرفِ قبول عطا کرنا چاہتا ہے۔ یہی مطلب اس حدیث کا ہے:۔

ان الصدقات تقع بید اللہ عز وجل قبل ان تقع فی ید السائل۔ صدقہ سائل کے ہاتھ لگنے سے پہلے اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں جاتا ہے۔

اذیٰ کی تعریف اذیٰ کا مطلب یہ ہے کہ مال و دولت کی دستبرداری پر راضی نہ ہو۔ اور اس کے دل میں اس نوع کے خیالات اُبھریں کہ وہ مقدس اور حاجت مندوں سے کہ جن کی طرف اس کا ہاتھ مدد و اعانت کے سلسلہ میں بڑھ رہا ہے کہیں بہتر اور فائق ہے۔ یہ دونوں غلط فہمیاں کھلی ہوئی جہالت و نادانی پر مبنی ہیں۔ اور زجر و توبیخ اور توہین و تحقیر یا سختی سے فقرا کے ساتھ پیش آنا یہ سب انھیں دو غلط فہمیوں کا لازمی اثر ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے انسان دل گرفتہ کیوں ہو غور کیجیئے کہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں مال و دولت کی ایک حقیر مقدار سے دست کش ہو جانا کیوں گراں گزرے جب کہ اس کے مقابلہ میں اس سے کئی گُنا زیادہ پانے کا یقین ہے۔ اور اگر یہ دست کشی اس بنا پر ہوتا ہے کہ اس کی خوشنودی اور اس کا حصول نصب العین ہے۔ یا کم از کم رذائل بخل سے بچنا مقصود ہے۔ اور نفس کی تطہیر غرض و غایت ہے۔ یا یہ اس لئے شکر گزار ہوتا ہے۔ کہ مزید ثروت و جاہ کی فراوانیوں کا طالب ہے۔ تب بھی یہ باتیں ایسی ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے دل گرفتگی کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

غنیٰ وثروت میں فساد کے پہلو

اسی طرح اگر اس شخص کو معلوم ہوجائے کہ غنی اور ثروت کی بہتات کے ساتھ کیا کیا خطرات لگے ہوئے ہیں۔ اور ایک غریب ومفلس شخص فرائض وواجبات کے اعتبار سے کس درجہ کم ذمہ واریوں سے عہدہ برآ ہونے کا مکلّف ہے۔ تو یہ غنی ومالدار ہونے کے بجائے مفلس ونادار ہونے کی تمنّا کرنے لگے۔ امراء وارباب ودولت کی زندگی کے اس خطرناک پہلو کی طرف آں حضرت نے اشارہ کیا ہے۔

هم الاخسرون ورب الكعبة — رب کعبہ کی قسم یہی لوگ زیادہ خسارہ پانے والے ہیں۔

فقال ابوذر من هم قال — ابوذر نے پوچھا یا رسول اللہ کون فرمایا۔ یہ جن کے پاس

الاكثرون مالاً۔ — مال زیادہ ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے کو فقیر وحاجت مند سے بہتر وفائق سمجھنا اور اس پر ناز کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ پھر یہ جذبہ اور بھی غیر معقول اور لغو ٹھہرتا ہے۔ جب اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ یہ دولت آئی کہاں سے ہے۔ کیا یہ اسی طبقہ کی سعی و محنت اور کاوش کا نتیجہ نہیں۔ جب کوئی شخص ان دو حقیقتوں پر غور کرے گا تو اس کی دلگرفتگی دور ہوجائے گی۔ اور استکراہ وتحقیر کا سلوک خوشی اور منت پذیری کے جذبہ سے بدل جائے گا۔

ایک سوال

یہاں قدرتاً ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ فقیر ومفلس کو محسن سمجھنا اور اپنی گرہ سے کچھ دے کر بھی یہ خیال کرنا کہ تعریف وستائش کے لائق یہ شخص ہے جس نے ہمارے صدقات وخیرات کو قبول کیا۔ آسان امر نہیں۔ اور اگر کوئی شخص اپنے جذبات کو اس طرح بدل بھی دے تو معلوم کرنے کی چیز یہ ہے کہ اس کی آخر علامت کیا ہے۔ کس طرح دل کی اس کیفیّت کو پہچاننا ممکن ہے؟

اس سوال کے دو حصّے ہیں۔ ایک حصہ دوا وعلاج سے متعلق ہے اور دوسرا

معیار و علامت ہے۔ جہاں تک علامت کا تعلق ہے۔ اس کا پا لینا مشکل نہیں۔ ایک شخص اپنے جذبات کا یوں جائزہ لے کہ اگر خدانخواستہ یہی شخص جس پر کہ اسنے احسان کیا ہے اور جس کی کہ اس نے آڑے وقت میں مدد کی ہے۔ اگر کبھی مخالف ہو جائے تو کیا اس سے اس کا رنج صرف بقدر مخالفت و عناد کے ہوگا۔ یا اسمیں غصہ و غضب کی اس مقدار کو بھی دخل ہوگا کہ یہ سخت احسان فراموش ہے۔ میں نے تو اس سے ہمدردی کا سلوک روا رکھا تھا۔ اور اس کی بدبختی کا یہ حال ہے کہ میری ہی مخالفت و دشمنی پر آمادہ ہے۔ اگر اس کا غضب صرف مخالفت و عناد کی حد تک بھڑکتا ہے۔ تو یہ کامیاب ہے ورنہ نہیں۔

علاج و دوا کے دو طریق
ہمارے اسلاف کا طریقِ عمل

علاج و دوا کے دو طریق ہیں۔ ایک ظاہری دوسرے باطنی۔ باطنی طریقِ اصلاح اس سے زیادہ کا متقاضی نہیں کہ انسان اس حقیقت کو سمجھے، دل میں بٹھائے اور ذہن کا جزو بنانے کی کوشش کرے کہ مال و دولت کی یہ فراوانیاں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں۔ اور اس میں سے جو کچھ بھی صدقات و خیرات کے ذریعہ نکلتا ہے اس میں میری بھلائی مضمر ہے۔ اس لئے فقیر و حاجت مند میرا محسن ہے کہ جس نے مجھے اس صلہ و اجر کا استحقاق کا بخشا ہے۔

ظاہری و عملی طریق یہ ہے کہ جب کوئی شخص خیرات کرنے لگے تو اپنے اعضاء و جوارح پر ایسی کیفیتیں طاری کرے۔ جس سے پتہ چلے کہ سائل وہ نہیں جس کی یہ مدد کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ خود یہ ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اس کی ممنونیت کا منتظر اور متوقع ہو۔ اپنے عمل سے ظاہر کرے کہ گویا ممنون یہ ہے۔ ہمارے اسلاف اور بالخصوص ان اسلاف میں کہ جن کے دلوں پر کڑی نگرانی رہتی تھی، ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جن سے صدقہ و خیرات کے معاملہ میں اس طریقِ عمل کی وضاحت ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض صلحاء

کے بارے میں مروی ہے کہ جب وہ کسی فقیر کو کچھ دیتے تو دست بستہ اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور درخواست کرتے کہ اسے ازراہِ کرم قبول فرمائیے۔ بعض اس انداز سے عطا کرتے کہ جس پر اُلٹا قبول کرنے کا شبہ ہوتا۔ حضرت عائشہ اور حضرت امِ سلمہ کی عادت تھی کہ اپنے آدمی سے کہہ دیتیں کہ حاجت مند جن کلمات سے ہمارے صدقہ کا خیر مقدم کرے ان کو یاد رکھنا۔ اور پھر ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ان کے حق میں دُعائیں مانگتیں۔ حضرت عمر اور عبداللہ بن عمر سے بھی اس طرزِ عمل کی تائید ہوتی ہے۔ غرض اس طرح کے اعمال سے دل متاثر ہوتا ہے۔ اور اس کے جذبوں اور خواہشوں کا رُخ پلٹتا ہے۔ صدقہ و خیرات کے بارہ میں یہ دقائق اسرارِ باطن سے متعلق ہیں۔ فقیہ اس کے مقابلہ میں اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرے گا۔ کہ اگر کسی شخص نے زکوٰۃ کو صحیح مقدار میں ادا کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ کسی شخص واحد کو حقِ ملک بھی ادا کر دیا۔ تو برأت ذمہ کے لحاظ سے اس پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔ اور یہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے نزدیک اس سے سبکدوش ہو چکا۔

پانچواں نکتہ پانچویں چیز قابلِ لحاظ یہ ہے کہ صدقات و زکوٰۃ کی مقدار بظاہر کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ دینے اور عطا کرنے والا اس کو کم ہی سمجھے اور اپنی نظروں میں حقیر و ادنیٰ ہی قرار دے۔ کیونکہ جہاں اس نے کمیت کو اہمیت دی اور اس سے زیادہ جانا عجب و کبر کے داعیوں نے سر اُٹھایا اور انسان کے دل میں پندار و غرور نے راہ پائی۔ اور یہی وہ آفت ہے کہ جس سے اعمال کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔

ویوم حنین اذا اعجبتکم کثرتکم — اور حنین کے دن جب تم کو اپنی کثرت پر غرور تھا۔
فلم تغن عنکم شیئاً (توبہ ۲۵) — تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی۔

اطاعات کس نوع کی ہوں ان کے متعلق قاعدہ یہ ہے کہ جس قدر ان کو کم سمجھا

جائے گا اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا اجر بڑھے گا۔ اور معصیت کے بارہ میں فیصلہ یہ ہے کہ جتنا کوئی اسے اہمیت دیگا اور ضروری و مفید خیال کرے گا۔ اس درجہ عنداللہ اس کا مقام فروتر اور گھٹیا ہو گا۔ ایک بزرگ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ کہ معروف یا نیکی تین باتوں سے تکمیل پاتی ہے۔ ایک یہ کہ اسے بہرحال ادنیٰ و حقیر جانے۔ دوسرے اس میں تعجیل اور جلدی سے کام لے اور تاخیر روا نہ رکھے۔ اور تیسرے یہ کہ اس میں پورے پورے ستر اور اخفاء کو ملحوظ رکھے۔

استعظام من و اذیٰ سے مختلف شئی ہے استعظام یا کسی نیکی یا معروف کو زیادہ اہمیت دینا من و اذیٰ سے قطعی مختلف ہے۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان مثلاً مسجد بنوائے یا رباط کی بنیاد رکھے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں اس بات کی گنجائش تو ہے کہ یہ اس معروف کو اپنا بہت بڑا کارنامہ شمار کرے اور بہت بڑی نیکی سمجھے۔ لیکن من و اذیٰ کا ذرا بھی احتمال اسمیں نہیں۔ اس بنا پر اس طرح کہ برائی کو کبر و پنداری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی اثر اندازیوں کے حدود صرف زکوٰۃ و خیرات ہی تک ممتد نہیں۔ بلکہ جملہ عبادات اس کی زد میں ہیں۔

اس کا علاج اس نفسیاتی بیماری کا علاج بھی پہلی بیماریوں کی طرح دو طریق سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو اس علم و احساس سے کہ اس نے جب جود و سخا یا بذل و عطا کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کے مقابلہ میں بہت ہی کم اور حقیر ہے۔ اور اس لائق ہے کہ کبر و نخوت اور عجب و ناز کے بجائے اس پر شرم آئے۔ ندامت و حیا سے گردن جھک جائے۔

دوسرے عملاً خجالت و ندامت کے اظہار سے کہ اس نے تو اتنا کچھ دے رکھا تھا اور سر سے پاؤں تک بخششوں اور نعمتوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر جب اس کے

دئیے ہوئے بہت سے مال و دولت سے اسی کی راہ میں بہت کچھ لٹا دینے کا وقت آیا تو بخل نے ہاتھ پکڑا اور بہت ہی کم مقدار دینے کی اجازت دی۔ اور اس معاملہ میں اقل قلیل پر قناعت کرنا مناسب جانا۔ حالانکہ آخرت کا خیال دل میں جاگزیں رہنا چاہئے تھا۔ اور اس حقیقت پر غور ہونا چاہئے تھا کہ دولت کے یہ انبار اور ڈھیر اسی کے عطا کردہ تو ہیں۔ اور ہماری حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ ہم اس کے امین و متصرف ہیں۔ ورنہ جہاں تک اصل مالک ہونے کا تعلق ہے۔ وہ تو اسی کی ذاتِ گرامی ہے۔ پھر جب اس کا مطالبہ ہے۔ اور وہی مالک اصلی ہم سے مانگ رہا ہے۔ تو ہم بخل کرنے والے کون ہیں۔ اور ہمیں یہ کیونکر حق پہنچتا ہے کہ ذرا بھی حیص بیص یا ہچکچاہٹ کا اظہار کریں۔ غرض اس نوع کے احساسات اور شعور پیدا کرنے اور حیاء و انکسار، ندامت و خجالت کی کیفیات طاری کرنے سے اس مرض کا استیصال ہوجاتا ہے۔

چھٹا نکتہ چھٹی بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ چیزیں دی جائیں جو عزیز ترین ہوں عمدہ ہوں۔ اور جائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انھیں صدقات و خیرات کو شرفِ قبول سے نوازا جاتا ہے جو طیب و جائز ہوں۔ ناجائز طریقوں سے حاصل شدہ مال قبول تو کیا ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے غضب و غصہ کی گرفت سے بچ جائے تو یہی غنیمت ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں کس حد تک احتیاط مناسب ہے کہ جس مال میں ناجائز ہونے کا ادنیٰ شبہ بھی ہو۔ یا کسی حرام و ناجائز کی ملاوٹ یا آلائش کی کھٹک بھی ہو تو اس کو صدقہ و خیرات کے طور پر نہیں دینا چاہئے۔ کیونکہ یہ صحیح معنوں میں اس کے دائرہ ملک ہی میں نہیں آتا۔ اور اسی بناء پر اس کا صدقات کی حد میں شمار ہونا ہی خارج از بحث ہے۔

طوبیٰ لعبد انفق من مال اکتسبہ من غیر معصیۃ۔ — اللہ تعالیٰ کے اس بندے کیلئے جس نے اپنے اس مال میں سے خرچ کیا کہ جس کو کسی ناجائز طریق سے حاصل نہیں کیا۔

مشتبہ مال سے خیرات دینا سوءِ ادب ہے

یہی نہیں کہ ایسا مشتبہ مال مقبول نہیں ہوتا۔ اور اس پر اجر و ثواب مترتب نہیں ہوتا۔ اصل خطرہ سوءِ ادب کا ہے۔ اس کو یوں سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ اگر آپ اپنے مہمان کے سامنے کھانے پینے کی کوئی ایسی چیز رکھ دیں جو خود آپ کو ناپسند ہے تو اس کا اثر مہمان پر کیا پڑے گا۔ کیا وہ متاثر نہیں ہو جائے گا اور آپ کی اس بدتمیزی پر احتجاج نہیں کرے گا۔ پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ آخرت و حقیقی کے احترام کا خیال کئے بغیر دنیا کی پنچ میں تو اچھی اچھی اور قیمتی چیزیں تو اپنے استعمال کے لئے رکھ دی جائیں اور ادنیٰ اور نکمی چیزیں خدا تعالیٰ کی راہ میں دی جاتی ہیں۔ انسان کی اسی کمزوری کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

يا ايها الذين امنوا انفقوا من طيبات ما كسبتم ومما اخرجنا لكم من الارض ولا تيمموا الخبيث منه تنفقون ولستم باخذيه الا ان تغمضوا فيه۔ بقرہ ۲۶۷

مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لئے زمین سے نکالتے ہیں ان میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو اور بری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا کہ اگر وہ چیزیں تمہیں دی جائیں تو بجز اس کے کہ (لیتے وقت) آنکھیں بند کر لو ان کو کبھی نہ لو۔

ساتواں نکتہ

ساتواں نکتہ بھی کم اہم نہیں ہے — وہ یہ ہے کہ خیرات دیتے وقت اس چیز کا خیال رکھیے کہ کون گروہ استفادہ کر رہا ہے۔ اور اس استفادہ کی کتنی اہمیت ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ یوں تو قرآن حکیم نے صدقات کے آٹھ مصارف ذکر کئے ہیں۔

گو یہ آٹھوں افادہ و افادیت کے لحاظ سے برابر نہیں۔ بلکہ ان میں مراتب و درجات کا اچھا خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ اس لئے اولیٰ اور بہتر طریق یہ ہے کہ ان میں ترجیحی پہلو کا خیال رکھا جائے۔ اور وہ یہ ہیں:

اوّل صرف ان لوگوں کی طرف دستِ اعانت بڑھایا جائے جو اتقیاء ہیں۔ اور دنیا سے سروکار نہیں رکھتے جن کا نصب العین آخرت ہے۔ واسی کے لئے شب و روز وہ کوشاں ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کا دینے والا بھی گویا ان کی اس کوشش اور جدوجہد میں بالواسطہ شریک ہے۔

لا تاکل الا طعام تقی ولا یاکل طعامک الا تقی۔ صرف اتقیاء کے کھانے میں شریک ہونا چاہیے اور انہیں لوگوں کو کھانا چاہیے جو پاکباز و متقی ہیں۔

ایک اور حدیث اس مضمون کی ہے:

اطعموا طعامکم الاتقیاء واولوا [illegible] معروفکم المؤمنین۔ اپنا کھانا [illegible] لوگوں کو [illegible]

یعنی اپنی دعوتوں میں [illegible] لوگوں کو شریک کیا جائے [illegible] اور معروف [illegible] ہے۔

بعض علماء کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ صدقات کے سلسلے میں نظر و صرف صوفیاء کو اپنے بذل و جود و سخا کا مرکز قرار دیتے۔ اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ اس توجہ تخصیص کا سبب کیا ہے؟ تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ یہ وہ حضرات ہیں جن کا نصب العین اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو پوری یکسوئی کے ساتھ قرب و منزلت کے درجات گوناگوں کے حصول کے درپے ہیں۔ ان کی اگر مدد نہ کی جائے تو اس سے انکی یکسوئی اور اخلاص میں خلل آئے گا۔ جو ریاضت کی جان اور روح ہے۔ اس لئے ہم اگر انھیں کے ایک آدمی کی توجہات کو اللہ تعالیٰ کی طرف لگائے رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایسے لوگوں پر خرچ کیا جائے جو

---

۱ ابوداؤد۔ ترمذی

۲ ابن المبارک سے مروی ہے

دنیائے دوں کے سوا اور کوئی نصب العین نہیں رکھتے۔

حضرت جنید کے سامنے کسی نے یہ جواب پیش کیا تو انھوں نے بدرجۂ غایت پسند کیا اور فرمایا کہ یہ لطیف بات وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جن کو ولایت کی چاشنی اور ذوق سے حصۂ وافر ملا ہو۔

اہلِ علم کی دستگیری

دوم۔ اہلِ علم کی خصوصیت کے ساتھ دستگیری کی جائے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہونگے کہ بالواسطہ

عبداللہ بن مبارک کا طرزِ عمل

دوائی علم کی سرپرستی کی جا رہی ہے۔ جو بجائے خود ایک بہترین عبادت ہے۔ بشرطیکہ طلب علم کا یہ جذبہ صادق اور اللہ تعالےٰ کے لئے ہو۔ عبداللہ بن مبارک ہمیشہ اپنے صدقات و معروفات کو علماء کے لئے وقف رکھتے۔ ان سے ایک مرتبہ عرض کیا گیا کہ آپ اپنے معروفات میں تعمیم سے کیوں کام نہیں لیتے۔ آپ نے فرمایا۔ انبیاء کے بعد علماء سے بہتر مجھے کوئی گروہ نظر نہیں آتا۔ میری رائے میں ان کو علم کی طرف متوجہ رکھنا فرائض میں داخل ہے۔ اس لئے کہ یہ گروہ اپنی روزمرہ کی ضروریات میں اُلجھا رہا۔ تو حصول علم کے لئے اپنی کوششوں کو کیونکر جاری رکھ سکے گا۔ ان کو دنیا کی کھکھیڑ سے بچائے رکھنا اور ان کے لئے سکون و فراغ کے قیمتی لمحے مہیا کرنا کہیں اولیٰ ہے۔

اپنی عنایات کا مرکز اللہ کے شکر گزار بندوں کو ٹھہرانا چاہیئے

سوم۔ ایسے ایسے اہلِ توحید و تقویٰ کو سخاء وجود کا مرکز ٹھہرایا جائے۔ جو اسباب و وسائل کو ہیچ جانتے ہوں۔ اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ منعم حقیقی اللہ تعالےٰ کی ذات بابرکات ہے۔ ان کی نظر ظاہر دینے والے ہاتھ پر نہ ہو بلکہ مشیت ایزدی کی اس جنبش و تحریک پر کہ جس کی بدولت اہلِ ثروت کے دلوں میں عطاؤ اعانت کے جذبات اُبھرتے ہیں۔ اس لئے انھیں جب کچھ ملے اور یہ دیکھیں کہ کوئی

ان کی حاجت روائی پر آمادہ ہے۔ تو بجائے اسکے کہ اس کیلئے ان کی زبان سپاس کھلے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں۔ اور یہ خیال رکھیں کہ یہ شخص تو محض ایک واسطہ اور وسیلہ ہے۔ اور وہ بھی مجبور اور یہ اللہ تعالیٰ کی بخششوں کا نتیجہ ہے یعنی یہ تو اس کے کرم خاص کی کرشمہ سازی ہے کہ اس نے ہمارے لئے اس کے دل میں یہ خیال ڈالا اور اسباب و ذرائع مہیا کئے تا آنکہ یہ اس قابل ہوا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ اس توفیق الٰہی سے محروم رہتا اور کچھ دینے پر تیار نہ ہوتا۔ ایسے لوگوں کا یہ یقین اور ایمان و تقوےٰ کا یہ مقام کہ اسباب کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ اور مسبب الاسباب ہی کو سب کچھ جانتے ہیں۔ زبان شکریہ سے کئی درجہ بڑھا ہوا ہے۔ اور معطی کے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ زبانی تعریف اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک شخص گوشت پوست کے اس ٹکڑے کو حرکت دیدے اور ایسے کلمات کا اظہار کرے جو اس کے دل میں نہیں ہیں۔ اور جو شخص براہ راست اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکریہ ادا کرتا ہے وہ گویا حقیقتاً ان احسانات کی قدر و قیمت کو پہچانتا ہے اور ان کو منعم حقیقی کی کرم گستری کا نتیجہ گردانتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ نہیں چاہتا کہ ان احسانات کو اس کے بندوں کی طرف منسوب کرے۔

شکر و سپاس الٰہی کی ایک مثال

شکر و سپاس ایزدی کا یہ جذبہ مختلف لوگوں میں مختلف رنگ کا ہوتا ہے۔ ایک شخص کے بارہ میں روایت ہے۔ کہ آں حضرت نے اس کی غربت و افلاس کے پیش نظر اس کی کچھ مدد کرنا چاہی اور جس شخص کے ہاتھ امدادی رقم بھیجی اسے تاکید کی کہ اس کے جواب میں وہ جو کچھ بھی کہے یاد رکھنا اور بتانا۔ چنانچہ جب وہ واپس آں حضرت کی خدمت میں پہنچا تو اس نے بتایا کہ اس کی زبان سے بے ساختہ یہ دعائیہ الفاظ نکل رہے تھے:۔

الحمد لله الذي لا ينسى من ذكره ولا يضيع من شكره اللهم انت لم تنس فلانا فاجعل فلانا لا ينسى ذلك[1]	اس پروردگار کی حمد و تعریف ہے جو نہ تو لوگوں کو بھولتا ہے جو اس کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں اور نہ ان لوگوں کو ضائع کرتا ہے جو اس کے شکرگزار رہتے ہیں۔ پروردگار! میرا کام ... تو نے مجھے نہ بھلایا تو فلاں کو بھی ایسی توفیق عطا کر کہ میری طرف سے غافل نہ ہونے پائے۔

آنحضرت نے یہ دعا سنی تو بہت مسرور ہوئے کیونکہ اس کے جذبۂ شکر نے [illegible] آنحضرت [illegible] حضرت کا احسان [illegible] اس نے [illegible] کبھی اپنے [illegible]

ایک شخص نے آنحضرت سے [illegible]

دوسری مثال [illegible] اس نے جواب میں کہا:—

اتوب الى الله وحده ولا اتوب الى محمد[2]	میں ایک اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں محمد کی طرف نہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت نے فرمایا: ٹھیک کہا ہے۔ اس نے حق کو پہچان لیا ہے۔

شکرگزاری کی تیسری مثال اسی طرح کا واقعہ حضرت عائشہ سے نقل ہے جب افک کے بعد آیات برات کا نزول ہوا **جو توحید پر مبنی ہے** تو حضرت ابوبکر فرط مسرت سے جھوم گئے۔ فرمایا کہ بیٹا! اٹھو اور آنحضرت کے سر پر بوسہ دو۔

حضرت عائشہ نے کہا:—

---

[1] بیہقی نے معناً اس کو روایت کیا ہے۔

[2] احمد و طبرانی۔

واللہ لا افعل ولا احمد الا اللہ — بخدا میں ہرگز نہیں کرونگی مجھے تو صرف اپنے رب کی تعریف کرنا ہے جس نے میری پاکدامنی کی توثیق فرمائی۔

شکر و سپاس کا یہ رُخ خالصۃً توحید پر مبنی ہے اور وسائط و ذرائع کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا شیوۂ کفر ہے۔

واذا ذکر اللہ وحدہ اشمأزت قلوب الذین لا یؤمنون بالآخرۃ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ہم یستبشرون (زمر ۴۵) — اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تو ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں۔ اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں۔

گویا جس شخص کا ایمان وسائل و وسائط کی غیر مشروط اہمیت کا قائل ہے اس میں شرک خفی کے شوائب ضرور پائے جاتے ہیں۔

ان شرفاء کی بھی مدد کرنا چاہیئے چھپا کر۔ صدقات و خیرات کے لئے ایسے لوگوں کو تلاش کیا جائے جو اپنے افلاس کو کسی پر ظاہر نہیں کرتے ازراہِ تعفف دستِ سوال دراز نہیں کرتے نہ شکوہ اور شکایت زبان پر لاتے ہیں۔ دراصل یہ شرفاء ہیں جن کی گردش زمانہ نے آسائش و خوش حالی کو چھین لیا ہے۔ ایسے ہی مستحقین کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

یحسبہم الجاہل اغنیاء من التعفف تعرفہم بسیماہم لا یسألون الناس الحافا (بقرہ ۲۷۳) — نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے اور تم قیافے سے ان کو صاف پہچان لو گے حاجتمند ہیں اور لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگ سکتے۔

اہلِ خیر کو چاہیئے کہ اپنے اپنے قریہ اور گاؤں اور اپنے اپنے محلوں میں ایسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں جو دیندار ہیں۔ شرفاء ہیں۔ ان کی مدد کرنا ان لوگوں کی مدد کرنے سے کہیں افضل ہے جو گلی بندوں بھیک مانگتے

ہیں۔ یا علانیہ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں۔

عیالدار بھی مستحق توجہ ہیں

پنجم۔ عیالدار یا ایسے لوگوں کو مستحق گردانا جائے۔ جنھیں محبوس یا مجبور ٹھہرایا جائے۔ جو طریق آخرت پر گامزن تو ہونا چاہتے ہوں مگر بیماری یا کسی دوسری رکاوٹ کی وجہ سے ایسا نہ کر پاتے ہوں۔ اور معنیً اس آیت کا مصداق ہوں۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ (بقرہ ۲۷۳) — ان حاجت مندوں کے لئے جو خدا کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔

ان کی مدد کرنا اس لئے ضروری ہے کہ یہ پا شکستہ اور مصائب و تکالیف میں ایسے جکڑے ہوئے ہیں کہ کسی جدوجہد کے لائق ہی نہیں۔ حضرت عمر انہی مصلحتوں کے پیش نظر عیالداروں سے خصوصیت کے ساتھ رعایت فرماتے تھے۔ آنحضرت کا طریق خاص یہ تھا کہ عموماً کثرت عیال کو ملحوظ رکھتے اور یہ دیکھتے کہ کس شخص کی ضروریات کی کیا کیفیت ہے۔

اعزہ واقارب کی مدد میں دوگونہ ثواب ہے

ششم۔ ایک اہم مد اعزہ واقارب کی ہے۔ ان کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دوگونہ ثواب کے مستحق ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بھی دیا اور ایک عزیز کی قرابت کا بھی خیال رکھا۔ حضرت علی فرمایا کرتے تھے۔ میں اپنے بھائی پر ایک درہم خرچ کروں یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ دوسروں پر بیس درہم خرچ کئے جائیں۔ اور اگر اپنے عزیز و برادر پر بیس درہم خرچ کرنے پڑیں تو اس کو اس سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں کہ اجانب پر سو درہم خرچ کروں۔ اسی طرح اگر ضرورت اس بات کی متقاضی ہو کہ اپنوں پر سو درہم خرچ کئے جائیں۔ تو میرے نزدیک یہ ایک غلام کو آزاد کر دینے سے کہیں بہتر ہے۔

اس زمرے میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو اگرچہ حسب ونسب کے اعتبار سے تو عزیز نہیں ہیں۔ مگر اس نقطۂ نظر سے ضرور عزیز او ربھائی ہیں۔ کہ عقبیٰ اور آخرت کے معاملہ میں ہم ذوق اور ہم مشرب ہیں۔

یہ ہیں وہ دقائق یا نکات جن کا یاد رکھنا ضروری ہے اور جن کو ملحوظ رکھتے ہوئے صدقات وخیرات کی تقسیم ہونا چاہئے۔ آخری نکتہ اس سلسلہ کا یہ ہے کہ ان اقسام میں جو ہم نے بیان کی ہیں مدارج اور مراتب کا عظیم فرق پایا جاتا ہے۔ اس بناء پر ارباب خیر کو چاہیئے کہ ہمیشہ اعلیٰ درجے کے خواہاں رہیں۔ جو فائق تر اور اعلیٰ ہے۔ ادنیٰ کے درپے ہونا ان کے شایانِ شان نہیں۔ اگر کوئی شخص ایسا مل جائے۔ جس میں یہ سب صفات پائی جائیں تو سبحان اللہ اس کی مدد کرنا تو گویا اجر و ثواب کے بہت بڑے ذخیرے پر ہاتھ مارنا ہے۔ غرض یہ ہے کہ تلاش اور ٹٹول بہر حال جاری رہنا چاہیئے۔ اگر کوئی مستحق مل جاتا ہے تو دوہرا ثواب ہے۔ ایک عطاء وجود کا دوسرے مستحق پالینے کا۔ اور اگر موزوں آدمی نہیں ملتا ہے جب بھی ایک اجر تو مل ہی رہیگا۔

استحقاقِ زکوٰۃ کی معنوی شرطیں

زکوٰۃ وصول کرنے والوں کی روحانی واخلاقی ذمہ داریاں

جس طرح زکوٰۃ دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی روح و معنویت کو سمجھے اور اس کے مطابق زکوٰۃ دے۔ اسی طرح شریعت نے قابض یعنی زکوٰۃ وصول کرنے والے پر بھی بہت کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ اور اور اس پر بھی لازم ٹھہرایا ہے کہ صدقات وخیرات حاصل کرتے وقت کچھ روحانی واخلاقی ذمہ داریوں کو محسوس کرے۔

یہ ذمہ داریاں پانچ قسم کی ہیں:۔

پہلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرے

پہلی ذمہ داری کہ اللہ تعالےٰ نے صدقات و معروفات کے اس نظام کو کیوں قائم فرمایا ہے۔ کیا اس کا مقصد صرف کسی نادار کی دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ نہیں انسان کو اس دنیا میں لانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ یہاں کی دلچسپیوں اور جھمیلوں میں پڑکر اپنے نصب العین کو نہ بھول جائے بلکہ اس بات پر ایمان رکھے کہ اسے اپنے آقا و مولا سے تعلق و ربط پیدا کرنا ہے اور اس دُنیا کے بعد ایک اور عالم میں پہنچنا ہے۔ اسے اس فکر کے سوا اور کوئی فکر نہیں ہونا چاہئے۔ یہی اس کی زندگی کا ماحصل اور غرض و غایت ہے۔ یہ اسی میں لگا رہے۔ اور اسی کے لئے جئے اور مرے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (ذاریات ۵۶) — اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔

لیکن یہ عالم رنگ و بُو جس میں ہمیں ڈال دیا گیا ہے ایسا ہے کہ خواہشات گوناگوں اور شہوات بوقلموں کی نیرنگیوں سے متاثر ہوئے بغیر کوئی رہ نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس فکر اور لگن میں فرق آتا ہے۔ اور قلب و ذہن کی یکسوئی قائم نہیں رہ پاتی۔ اور ایک لحاظ سے ایسا ہونا اس کائنات کے لئے ضروری بھی ہے۔ تاہم حکمت الٰہیہ نے اموال و دولت کی فراوانیوں کے لئے ایسا نظام وضع فرمایا ہے کہ اس سے توجہ الی اللہ کے نصب العین کو باقی رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور وہ یوں کہ ایک طرف تو کچھ لوگوں کو درہم و دینار سے نوازا دوسری طرف ان کو حکم دیا کہ اپنے مال میں غریبوں اور ناداروں کو بھی شریک کریں۔ تاکہ ان کے دلوں کا فراغ اور طبائع کا اطمینان مجروح نہ ہونے پائے۔ اور یہ اپنے نصب العین کی طرف برابر بڑھتے رہیں۔

اس نظام میں امراء کو بھی غیر ضروری تشویش سے نجات مل جاتی ہے۔ اگر وہ اپنی زائد دولت کو سمیٹنے، جمع رکھنے اور بڑھاتے رہنے کے جنون کے بجائے صرف کرتے رہیں اور اہلِ حاجت میں بکھیرتے اور منتشر کرتے رہیں تو ان کو بھی راحت و آسائش کے ایسے مواقع ملتے رہیں گے جن میں اللہ تعالےٰ کے ساتھ اپنے تعلقات عبودیت کو استوار کرتے رہیں۔ گویا زکوٰۃ و خیرات کی اس تقسیم سے دو گونہ فائدے میسر ہیں۔ سرمایہ دار تو اس بنا پر آخرت کی تیاری میں لگا رہے گا۔ کہ اسے فاضل دولت کی فکر دامنگیر نہیں۔ اور وہ اس کے باوجود پوری پوری فراغت قلبی محسوس کرتا ہے۔ اور ایک مفلس و نادار اس وجہ سے خوش ہو گا کہ اس کا فاقہ و تنگدستی ترقیات روحانی میں حائل و مانع نہیں۔ دولت کی یہ منصفانہ تقسیم اور زکوٰۃ و معروفات کا یہ حکیمانہ نظم و نسق اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے کہ جس کا جواب نہیں ہو سکتا۔

دوسری ذمہ داری

علاوہ بریں ایک فقیر و حاجت مند کو نہ صرف شاکر و قانع رہنا چاہیئے۔ کہ اس کی یہ حالت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اس نے اس کو دولت سے محروم رکھ کر دنیا کے شر سے بچا لیا ہے۔ اور فتنہ و ابتلا کی ہلاکت آفرینیوں سے نجات دیدی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا کرم خاص اور بخششیں یہ نہیں کہ اس نے کن کن لذائذ سے اسے بہرہ مند کیا۔ بلکہ یہ ہے کہ کن کن فتنہ سامانیوں سے باز رہنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اس حقیقت پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ یہ صدقہ و زکوٰۃ کی شکل میں جو کچھ پائے اس کو اطاعت الٰہی کا ایک ذریعہ اور وسیلہ قرار دے۔ معصیتوں اور نافرمانیوں پر خرچ نہ کرے۔ کیونکہ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے انعامات کی صراحۃً توہین کرنا ہے۔ اور اس کا منکر ہونا ہے۔

تیسری ذمہ داری ایک ذمہ داری اس پر یہ عائد ہوتی ہے کہ معطی کا شکریہ ادا کرے۔ اس کے لئے دعا کرے۔ اور اس کی تعریف میں دریغ نہ کرے۔ لیکن یہ شکر و سپاس صرف اس حیثیت سے ہونا چاہئیے کہ یہ صاحب جو معطی ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ہم تک پہنچانے کا محض ایک ظاہری وسیلہ یا ذریعہ ہیں حقیقۃً معطی یا دینے والے نہیں۔ کیونکہ دراصل دینے والا اور بخشنے والی ذات تو اللہ تعالےٰ کی ہے۔ اس حیثیت پر بھی اس کا شکریہ اس بنا پر ضروری ہے۔ کہ اسلام نے ایسے وسائل و ذرائع کو مناسب اہمیت دی ہے۔ چنانچہ آنحضرت کا ارشاد ہے:۔

من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔	جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ خدا تعالےٰ کا بھی شکر گزار نہیں ہو سکتا۔

اس سے بھی زیادہ لائق غور یہ نکتہ ہے کہ خود اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کے اعمال پر ان کی تعریف فرمائی ہے۔ حالانکہ وہ خالق ہے اور اس نے انسان کو اعمالِ حسنہ کی توفیق بخشی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

نعم العبد انہ اواب۔	بہت خوب بندے تھے اور وہ خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ ص ۳۰

آنحضرت نے خصوصیت سے اس بات کی تلقین فرمائی ہے کہ نیکی اور معروف کے جواب میں نیکی اور معروف ہی کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

من اسدی الیکم معروفاً فکافئوہ فان لم تستطیعوا فادعوا لہ حتیٰ تعلموا انکم قد کافاتموہ۔	جو کوئی تم سے اچھا سلوک کرے تم بھی جواب میں اس سے اچھا سلوک کرو۔ اور اگر صحیح صحیح قدم نہ اٹھا سکو تو اس کے حق میں کم از کم دعا ہی کرو تا کہ تمھیں اتنا تو معلوم ہو کہ کس حد تک تم نے اس کے احسان کا جواب دیا ہے۔

چوتھی ذمہ داری شکر وسپاس کا ایک تقاضا یہ ہے کہ قابض کو جو چیز دی گئی ہے اس پر تنقید نہ کرے نہ اسے حقیر جانے۔ اگرچہ اسمیں کچھ عیوب و نقائص ہی پائے جاتے ہوں۔ نیز دینے والا کسی مجبوری سے اگر عطاء وجود کے سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکے تو اس پر اسے ملامت نہ کرے۔ یہی نہیں بلکہ عنداللہ اور عندالناس اس کے عطیہ کو اہم اور بڑا سمجھے۔

ان تصریحات سے معلوم ہُوا کہ قابض ومعطی کے وظائف جُدا جُدا ہیں۔ یعنی جہاں قابض کا فرض یہ ہے کہ جو کچھ بھی ملے اس کو غنیمت جانے اور اس کی قدر و قیمت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے۔ وہاں معطی پر لازم ہے کہ جتنا کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے ڈالے اسے حقیر و مستحقر جانے۔ سپاس و شکر اور دعا و ستائش کے ان داعیات کو ہم نے جو کچھ پہلے کہا ہے اس کے متناقض نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ جب ہم وسائل و ذرائع کی اہمیت کو گھٹاتے ہیں تو ہماری غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ سارے انعامات اور بخششوں کا جو اصل سبب اور ذریعہ ہے وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اور مسلمان اسی حقیقت پر ایمان رکھے کہ حقیقۃً تعریف کے لائق اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی ہی ہے۔ پھر جب ذرائع و وسائل کے وزن کو ہم بیان کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان کا بھی بہر حال شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ تو ہمارے سامنے یہ اصول ہوتا ہے کہ کہیں شکر گزاری اور منت پذیری کا وہ لطیف احساس انسان میں ختم نہ ہو جائے۔ جو اخلاق کی جڑ اور سرچشمہ ہے۔

اس سلسلہ میں اصل گمراہی یہ ہے کہ کوئی شخص ان درمیانی ذرائع میں پڑ کر اس اصلی ذریعہ اور سبب کو فراموش نہ کر دے جس کی وجہ سے یہ تمام ذرائع حرکت میں آتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ ذرائع و وسائل دنیوی کو جائز اہمیت تو دینا چاہیئے۔ مگر ان کو آخری اور حقیقی ذریعہ قرار نہیں دینا چاہیئے۔

پانچویں ذمہ داری قابض کی ذمہ داری کا تقاضا یہ بھی ہے کہ صرف حلال و طیب ہی پر قناعت کرے۔ چنانچہ اگر یہ دیکھے کہ مال مشتبہ ہے تو اس سے دامن بچائے اور ہرگز قبول نہ کرے۔

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً و یرزقہ من حیث لا یحتسب (طلاق ۲) اور جو کوئی خدا سے ڈرے گا وہ اس کے لئے رنج و محن سے مخلصی کی کوئی صورت پیدا کر دیگا۔

کس قسم کا مال مشتبہ یا مشکوک ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کرو کہ بادشاہوں کے عمال اور سپاہی عموماً حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھتے۔ یہ ایک مثال ہے مقصود مخصوص طبقہ کو متہم کرنا نہیں۔ جس کی کمائی میں کبھی حرام کی کثرت ہو اس سے پرہیز لازم ہے۔ ہاں اگر حلال میسر نہ ہو۔ اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہ رہے کہ اس مال پر اکتفا کیا جائے۔ جو ملا ہے۔ تب بقدرِ ضرورت اس سے فائدہ اُٹھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن معطی یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ ایسا مال اس کی زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہو سکتا۔

چھٹی ذمہ داری خصوصیت سے قابلِ رعایت چیز یہ ہے کہ صدقات کو قبول کرنے سے پہلے دو باتوں کا یقین حاصل کرے۔ اور ان کی طرف سے بالکل یکسو ہو جائے۔ ایک یہ کہ فی الواقع یہ اس کا استحقاق رکھتا ہے اور اسے یہ رقم لے لینا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ جو کچھ یہ پا رہا ہے یہ کہیں اس کی ضرورت سے زائد تو نہیں۔ اس میں اس حد تک احتیاط درکار ہے۔ کہ اگر دینے والا استحقاق سے زیادہ دینے کی کوشش کرے تو اسے قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہیئے۔ مثلاً اگر مسافر ہے تو صرف زادِ راہ پر کفایت کرے۔ اس میں سواری کا کرایہ وغیرہ بھی شامل ہے۔ اور اگر جہاد پر روانہ ہو رہا ہے۔ تو صرف اس حد تک امداد حاصل کر سکتا ہے۔ جس حد تک کہ اس کی مجاہدانہ ضروریات کا تقاضا ہے۔ اس میں گھوڑا۔ اسلحہ اور ضروری خرچ داخل سمجھئے۔ زیادہ کی لالچ نہیں رکھنا چاہیئے۔ لیکن اس سے زیادہ کی ٹھیک ٹھیک

تشریح کیا ہے اس کی تعیین میں آخذ اور قبول کرنے والا ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف زہد و ورع کا رجحان اسے اس پر مجبور کریگا۔ کہ کفایت کی حدود مقرر کرتے وقت تضیق اور تنگی سے کام لے۔ دوسری طرف نفس کا میلان یہ چاہے گا کہ رخصت کے استعمال میں جس قدر بھی ڈھیل اور تساہل برتا جا سکے برت لیا جائے۔ پھر ان دونو نقطہ ہائے نظر کے بین بین کئی مقامات اور درمیانی منزلیں ہیں۔ ایک حاجتمند اور محتاج ان میں سے کس مقام پر آٹے۔ کس منزل کو اپنائے۔ اور کس درمیانی شکل پر قناعت کرے۔ یہ ایسی الجھن ہے جس کو صرف اس کی اجتہادی قوتیں ہی سلجھا سکتی ہیں۔ دوسرے کوئی شخص اس سلسلہ میں اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ لہذا اس کو چاہئے کہ اپنی ضرورتوں کا جائزہ لے۔ اپنے استحقاق کو تولے۔ اور پھر جب اسے اندازہ ہو جائے کہ فی الواقع اسے امداد و اعانت حاصل کرنا ہے۔ تو صرف بقدرِ کفایت ان تبرعات سے بہرہ مند ہو۔ اور حرص و آز کی خواہشوں کو زیادہ پھیلنے کا موقع نہ دے۔ ماہ و سنین کی اصطلاحوں میں گفتگو کی جائے تو اگر کوئی شخص سال بھر کے لئے غذا کا اہتمام کر لیتا ہے۔ تو یہ رخصت کی آخری حد ہے۔ چنانچہ آنحضرت کا معمول بھی یہی تھا کہ اپنے اہل و عیال کے لئے سال بھر کا انتظام فرما لیتے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایک مہینہ بھر کی ضروریات کے لئے سامان مہیا کر لیتا ہے۔ یا صرف ایک ہی دن کے لئے فراغ و اطمینان چاہتا ہے۔ تو تقوے کے اعتبار سے یہ زیادہ صحیح ہے۔ علماء کا اس بارہ میں اختلاف رائے ہے کہ مال ماخوذ کی مقدار کیا ہونا چاہئے۔ یعنی کس حد تک ایک حاجت مند کو صدقات و خیرات میں سے بطیب خاطر قبول کرنا چاہئے۔ ایک گروہ جو تقلیل و تضیق کی طرف مائل ہے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ اسے شب و روز کے ضروری مصارف سے متجاوز نہیں ہونا چاہئے۔ ان کے سامنے آن حضرت کی یہ حدیث ہے :-

انه صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن السوال الغنی فسئل غناہ فقال غداء وعشاء۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو سوال کرنے سے روک دیا جو غنی ہو۔ پوچھا گیا کہ غنی کے حدود کیا ہیں۔ فرمایا صبح اور شام کا کھانا اگر ایک شخص کے پاس موجود ہے تو وہ غنی ہے۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ غنی یہ ہے کہ کوئی شخص نصاب زکوٰۃ تک کی مالیت رکھتا ہو۔ کچھ لوگوں کی رائے میں اگر کسی کے پاس پچاس درہم یا اس قیمت کا سونا پایا جاتا ہے تو یہ غنی ہے۔ ان کا استدلال عبداللہ بن مسعود کی اس حدیث سے ہے:-

من سال ولہ مال یغنیہ جاء یوم القیمۃ وفی وجہہ خموش۔ فسئل وما غناہ قال خمسون درھما اوقیمتہا من الذھب۔[2]

اگر کوئی شخص غنی ہونے پر بھی دستِ سوال دراز کرتا ہے کہ اس کے ہاں اتنا مال ہے تو قیامت کے دن ایسی حالت میں پیش ہوگا کہ اس کے چہرہ پر زخم ہونگے۔ دریافت کیا گیا ہے کہ غنا کیا ہے۔ فرمایا پچاس درہم یا اس کے لگ بھگ سونا۔

بعض حضرات نے غنا کے مفہوم میں توسیع کا خیال رکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ اراضی خرید لینا غنا ہے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی شخص اتنی رقم حاصل کرتا ہے۔ کہ اس سے مزروعہ زمین خریدی جاسکے۔ تاکہ عمر بھر اسی پر گزر بسر ہوسکے۔ تو یہ جائز ہے اور یہ وہ غنا ہے کہ اس کے بعد سوال کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح اگر اتنی رقم کوئی حاصل کرتا ہے کہ اس کو نفع مند کاروبار میں لگا سکے تو یہ غنا کی وہ حد ہے کہ اس کے بعد سوال وطلب کی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی اصول کے پیشِ نظر

---

[1] ابوداؤد وابنِ حبان۔

[2] ترمذی

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے۔

اذا اعطیتم فاغنوا۔ جب دو تو اتنا دو کہ وہ آئندہ کے لیے بے نیاز ہو جائے۔

اس توسیع کے خیال سے بعض نے غنا کی یہ تعریف کی۔ کہ جس سے کوئی شخص اپنی پہلی مالی حیثیت پر لوٹ آئے۔ چاہے دس ہزار درہم کی خطیر رقم ہو۔ لیکن اس کو حدودِ اعتدال سے بہر حال متجاوز نہ ہونا چاہیے۔

ابو طلحہ کا ایثار

ابو طلحہ کے متعلق مذکور ہے کہ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کا ایک باغ نماز میں یکسوئی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اور اس طرح عبادت میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ تو ارادہ کیا کہ اسے اللہ کی راہ میں دے دیا جائے اس پہ آں حضرت نے فرمایا کیوں نہ اسے اپنے اقربا کے سپرد کر دو ظاہر ہے کھجوروں کا ایک باغ بڑی حد تک بے نیاز کر دینے والا ہے۔ اس طرح حضرت عمر سے متعلق روایت ہے آپ نے ایک غریب اعرابی کے سوال کرنے پر ایک اونٹنی مع ایک بچہ کے بخش دی۔ تقلیل و توسیع کی ان صورتوں میں متوازن صورت یہی ہے۔ کہ سال بھر کے لیے گھر میں کھانے پینے کا سامان فراہم کیا جائے۔ اس سے زیادہ کی خواہش اسراف میں داخل ہے۔ اس سے کم میں عسرت و تنگدستی کا خطرہ ہے۔ جیسا کہ آنحضرت کے طرزِ عمل سے پتہ چلتا ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص تورع اور تقوٰی کا خواہشمند ہے۔ تو یہ دوسری بات ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ علماء ظاہر سے اس معاملہ میں کچھ دریافت نہ کرے۔ بلکہ یکسر دل کی طرف رجوع ہو۔

استفت قلبك وان افتوك وافتوك۔ اپنے دل سے پوچھو۔ اگرچہ مفتی تمھیں دوسرا ہی فتوٰی دیں۔

کیونکہ ان فتووں میں کہیں اطلاق ہے، کہیں قیود اور شرائط کا جھمیلا ہے اور کہیں شبہات کی ریل پیل ہے۔ ان سے ایسے شخص کو کچھ حاصل نہیں۔ جو سلوک و معرفت کے جادہ پر گامزن اور آخرت کو منزل ٹھہرائے ہوئے ہے۔

آخری ذمہ داری

آخری نکتہ اس سلسلہ کا یہ ہے۔ کہ جب کوئی شخص کسی سے اپنا حق طلب کرے۔ تو اس کو استحقاق سے زیادہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ صاحب مال سے وضاحت کے ساتھ پوچھ لیا جائے۔ کہ آپ جو کچھ دے رہے ہیں۔ یہ کہیں میرے واجبات سے زیادہ تو نہیں۔ یہ نہایت ضروری سوال ہے۔ جس کو لوگ اکثر یا تو نادانی کی وجہ سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور یا پھر فکر میں تساہل نارما سے کام لیتے ہیں۔

تقسیمِ صدقات کا صحیح انداز کونسا ہے؟

اِخفار یا اظہار

جو لوگ طریقِ اخلاص پر چلنے والے۔ اور رضائے الٰہی کے جویاں ہیں اُن میں اس امر میں اختلافِ رائے ہے۔ کہ صدقات کی تقسیم کس انداز سے ہونا چاہیے۔ کیا اخفار نفس و روح کے حق میں زیادہ بہتر ہے یا اظہار سے رغبت و طلب کے دواعی میں تحریک پیدا کی جا سکتی ہے۔ ایک گروہ اخفار کو بہتر قرار دیتا ہے اور دوسرا اظہار کو۔ ہم دونوں کے دلائل کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں۔ کہ اس میں کیا کیا آفتیں پنہاں ہیں۔ اور پھر یہ بتائیں گے کہ ان میں صحت و وزن کیسے حاصل ہے؟

جو لوگ اخفار کے حامی ہیں۔ اُن کے نزدیک اِس میں پانچ معانی ایسے ہیں جو خصوصیت سے قابلِ لحاظ ہیں۔

اخفار کے دلائلِ خمسہ

(۱) اس سے آخذ اور حاجتمند کا بھرم قائم رہتا ہے۔ اور مروت و عزتِ نفس کو ٹھیس نہیں لگتی۔ کیونکہ بصورتِ دیگر یہ خطرہ ہے کہ اس تعفف و وقار سے وہ محروم ہو جائے گا جس کی وجہ سے معاشرہ میں اُس کی ایک حیثیت ہے۔

(۲) اِس سے عوام الناس کے حسد و رشک سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور اُن کی زبانیں سوءِ ظن اور غیبت کا ارتکاب نہیں کر پاتیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ

اختیار نے ہمیشہ اس کا پاس اور لحاظ رکھا ہے

ابو سختیانی کا قول ابو ایوب سختیانی کا کہنا ہے "میں بسا اوقات اس لیے لباس فاخرہ نہیں پہنتا کہ مبادا میرے پڑوسیوں میں اس سے رشک و حسد کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ ایک زاہد کہتے ہیں میں بعض اشیا اس بنیاد پر استعمال نہیں کرتا۔ کہ اس سے میرے بعض بھائیوں کو نفسیاتی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ابراہیم التیمی نے ایک مرتبہ نیا کرتہ پہن لیا۔ اس پر بعض جاننے والوں نے پوچھا کہ یہ کہاں سے حاصل ہوا۔ انھوں نے کہا کہ خیثمہ نے دیا ہے۔ اور اور اگر مجھے یہ پہلے معلوم ہوتا۔ کہ تم اسے پہچانتے ہو تو میں ہرگز نہ پہنتا۔

(۳) ایک فائدہ اس میں یہ ہے کہ اس سے چوری چھپے نیک کام انجام دینے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اور یہ ایک اچھا جذبہ ہے۔ اسرار کے بارہ میں یہ معلوم رہنا چاہیے۔ کہ یہ مرحلہ اسی وقت تک اسرار ہے۔ جب تک دو شخصوں تک محدود رہے یعنی معطی اور حاجتمند تک۔ ان سے آگے بڑھا تو پھر اظہار کی حدود میں داخل ہوگیا۔ جو ناپسندیدہ ہے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے اس کا اندازہ ان واقعات سے لگائیے۔

اسرار و اظہار میں عملی فرق ایک صاحب نے ایک عالم کو بھرے مجمع میں کچھ دینا چاہا۔ تو انھوں نے معذرت کی۔ اور قبول نہ کیا۔ ایک دوسرے نے خلوت میں پیش کیا۔ تو انھوں نے لے کر رکھ لیا۔ پوچھا گیا۔ کہ حضرت! اس میں کیا مصلحت ہے؟ انھوں نے فرمایا پہلی حرکت سوء ادب کے مترادف تھی۔ اس لیے میں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اور دوسرے طریق میں چونکہ حسن ادب ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے اس کی قدر کرنا ضروری تھا۔

ایک صوفی کی ایک صاحب نے برسر عام خدمت کرنا چاہی۔ انھوں نے

قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور جو کچھ وہ دینا چاہتے تھے۔ اُس کو نہیں پر لوٹا دیا۔ وجہ دریافت کی گئی۔ تو فرمایا۔ تم نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کیوں ٹھہرانا ضروری خیال کیا۔ میں نے صرف اس شرک کو تمہارے مُنہ پر دے مارا ہے۔

سفیان کہا کرتے تھے۔ کہ اگر مجھے کسی شخص کے متعلق یہ یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے صدقات کا چرچا نہیں کرتا تو مجھے قبول کر لینے پر کوئی عذر نہیں ہوتا۔

(۴) علانیہ صدقات قبول کرنے سے مومن کی تذلیل ہوتی ہے۔ کیونکہ مومن کے لیے ضروری ہے۔ کہ اس عزت و آبرو کے جوہر نفیس کی ہر قیمت پر حفاظت کرے۔

(۵) اخفاء میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے آخذ یا لینے والا دوسروں کو شریک ٹھہرانے کے خدشہ سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ خدشہ اس حدیث کی بنا پر ابھرتا ہے۔

من اُھدی لہ ھدیۃ و عندہ قوم فھم شرکاءہ فیھا۔

جس شخص کو کوئی ہدیہ بھیجا جائے۔ وہاں حالے کہ اُس کے پاس کچھ لوگ بھی بیٹھے ہیں تو اس ہدیہ میں اُس کا بھی ساجھا ہے۔

اظہار کے دلائل

جن حضرات کے نزدیک اظہار افضل ہے۔ اور جو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ صدقات کے بارہ میں بات چیت اور گفتگو کرنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی مضائقہ نہیں بلکہ خوبیاں ہیں اُن کے نزدیک ان میں چار معانی ایسے پائے جاتے ہیں۔ جو اخفاء میں پائے نہیں جاتے۔

(۱) کھلے بندوں صدقات وصول کرنے میں انسان خلاص کا زیادہ لحاظ رکھتا ہے۔ یعنی اپنی حالت کو چھپاتا نہیں۔ بلکہ کوشش کرتا ہے کہ ریا کاری

(۱) عقیلی ـ ابن حبان ـ طبری

کے دواعی سے بچا رہے۔

(۲) اس سے جاہ و منزلت کا پندار جاتا رہتا ہے۔ عبودیت کا اظہار ہوتا ہے اور حاجتمند گویا ہر نوع کے کبر و دعوائے استغنار سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے ایک عارف نے اپنے ایک مرید سے کہا کہ اگر تمھیں صدقہ یا خیرات کی کوئی چیز قبول کرنا ہی پڑے۔ تو اس میں اظہار سے کام لے۔ کیونکہ تیری حالت دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس سے دینے والوں کی نظروں سے گر جائے گا۔ ایک اعتبار سے یہ اخفا ہی ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ تو اہل دولت و ثروت سے کوئی توقع ہی نہ رکھ سکے گا۔ دوسرے اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اہل ثروت تمھارے صدق کی بنا پر تجھ سے محبت کرنے لگیں گے۔ اس میں بھی خیر کا یہ پہلو پنہاں ہے کہ اس سے اُن کو فائدہ پہنچے گا۔

(۳) عارف کی نظریں اللہ تعالیٰ کی توحید پر جمی رہتی ہیں۔ اور وہ سرّ و اظہار میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ اس کے نزدیک اگر کوئی مخلوق میں سے حاضر ہے۔ تو کچھ ہرج نہیں۔ غائب ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ بلکہ احوال کے اس اختلاف ہی کو یہ شرک ٹھہراتا ہے۔ اصل مقصود تو اللہ کی ذات ہے اور وہ چونکہ حاضر و شاہد ہے۔ اس لیے اظہار میں کیا مضائقہ ہے؟

توحید کی اصلی روح

یہی وہ نکتہ ہے جو اس حکایت میں مضمر ہے۔ ایک بزرگ سے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ اپنے مریدوں میں سے ایک کو خصوصیت سے چاہتے تھے۔ اور اس کی طرف اُن کا میلان زیادہ رہتا تھا۔ اس پہ اُن کے دوسرے مریدوں کو قدرتاً رنج تھا۔ کہ شیخ کی خدمت و توقیر میں تو ہم سب برابر ہیں۔ لیکن ان کا گوشۂ چشم کچھ ادھر زیادہ ملتفت رہتا ہے۔ شیخ نے اُن کی اس کمزوری کو بھانپ لیا۔ اور اپنے اس مرید کی خوبیوں کو ظاہر کرنے

کی خاطر ان سب کو ایک ایک مرغا دیا۔ اور کہا کہ اس کو ایسی جگہ لے جاکر ذبح کرو۔ جہاں خلوت ہو۔ اور کوئی تمہیں دیکھ نہ رہا ہو۔ سب نے مرغا لے لیا۔ مگر اس مرید نے معذرت کی۔ اور کہا کہ صاحب میں ایسا نہیں کرسکتا۔ شیخ نے وجہ دریافت کی تو اس نے کہا۔ جناب ایسی کونسی جگہ ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ شاہد و ناظر نہیں۔ شیخ مسکرایا اور کہا کہ تمہاری اسی توحید کی وجہ سے میں تم سے محبت رکھتا ہوں۔

(۴) اس میں ایک بیّن فائدہ یہ ہے کہ اس طرح سنت شکر اور تقاضائے امتنان کی پیروی ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (ضحٰی۔ ۱۱)	اپنے پروردگار کی نعمتوں کا ذکر کرتے رہنا۔

کتمان نعمت گناہ ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے اس کو بخل کے ساتھ تعبیر کیا ہے

اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (نساء۔ ۳۷)	جو لوگ بخل اختیار کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل پر ابھارتے ہیں اور اللہ نے جو کچھ دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔

ایک حدیث میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

اذا انعم اللّٰہ علی عبد احب ان تری نعمتہ علیہ (۱)	اللہ جب اپنے کسی بندے پر احسان کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کے اثرات کو اس پر دیکھے

ایک بزرگ سے متعلق روایت ہے کسی نے اُن کو چوری چھپے کچھ دینا چاہا۔ انھوں نے اس کے اظہار پر اصرار کیا۔ اور کہا کہ چونکہ یہ امور دنیا میں سے ہے۔ اس لیے اس میں اعلان و اظہار ہی اولیٰ ہے۔ اور سر و خفا ان امور میں افضل ہے جو آخرت سے متعلق ہوں۔

---

(۱) احمد۔ ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے۔

اعلان و اظہار کی اسی خوبی کے پیش نظر کئی احادیث میں ادائے شکر پر ابھارا گیا ہے۔ اور اسے بجائے خود ایک طرح کی نیکی مانا گیا ہے۔

من لم یشکر الناس لن یشکر اللہ عز و جل۔	جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہ کیا، وہ اللہ عز و جل کا کیونکر سپاس گزار ہو سکتا ہے؟
من اسدی الیکم معروفا فکافئوہ فان لم تستطیعوا فاثنوا علیہ بہ خیرا وادعوا لہ حتی تعلموا قد کافاتموہ۔	جو شخص تم پر احسان کرے تم اس کا بدلہ دینے کی کوشش کرو۔ اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے اس کی تعریف ہی کرو اور اس کے لیے دعا ہی مانگو۔ یہاں تک کہ تمہیں یقین آجائے کہ تم اس حق سے سبکدوش ہو گئے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار مہاجرین نے ان الفاظ میں کیا۔

یا رسول اللہ ما رأینا خیرا من قوم نزلنا عندھم فاسموا الاموال۔ حتی خفنا ان یذھبوا بالاجر کلہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم کلا ما شکرتم لھم واثنیتم علیھم فھو مکافاۃ (ترمذی و مستدرک)	یا رسول اللہ ہم اس میں اپنے لیے کوئی بھلائی نہیں دیکھتے، ہم ایسی قوم کے مہمان ہوئے جنھوں نے مال تجارت تک میں ہمیں شریک کر لیا ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں سارے اجر کو ہی نہ سمیٹ لیں۔ آپ نے فرمایا۔ تم نے جو اس پر ان کا شکریہ ادا کیا یا تعریف کی ہے۔ تو یہی اُن کا صلہ ہے۔

اخفاء و اظہار میں اصل معیار ہر ہر انسان کی نفسی کیفیت ہے

اس اختلاف رائے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا تعلق نفس مسئلہ کے اختلاف سے ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمیں علی الاطلاق یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ کہ صدقات کے اخذ و قبول میں اعلان بہتر ہے یا اخفاء بلکہ

یہ دیکھنا چاہیے۔کہ نیتوں کا کیا عالم ہے۔ اور محرکات وعوامل کی کیا صورت ہے۔ پھر یہ نیتیں بھی ایسی نہیں کہ ان کے بارہ میں کوئی کلیہ وضع کیا جا سکے۔ یہ بھی حالات واشخاص کے اختلاف سے بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے ایک ایسے شخص کے لیے جو اخلاص کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے دل کو ٹٹولے، قلب وضمیر کے محرکات کا اچھی طرح سے جائزہ لے۔ اور یہ دیکھے کہ کہیں شیطان کے جال میں تو گرفتار نہیں ہو گیا ہے۔ اور نفسانیت کے مکر وفریب نے تو پھانس نہیں لیا ہے۔ یہ اصول ہمیشہ مدِ نظر رہنا چاہیے کہ اعلان واخفار دونوں طریق ایسے ہیں کہ ان میں شیطان اپنی تدبیروں اور گھاتوں میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور دونوں ایسے ہیں کہ ان میں خطرات کا گمان ہو سکتا ہے۔ مگر باایں ہمہ ہمارے نزدیک طریقِ اخفار وسر میں اس کی تلبیس و شرارت کے مواقع نسبتہً زیادہ ہیں۔ یعنی جو شخص چوری چھپے صدقات وخیرات کو قبول کرتے ہیں۔ اور اخفار وسر کو مرجح سمجھتے ہیں اُن کے تحت الشعور میں جہاں یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ اس سے جاہ ومنزلت کے اسباب و ذرائع کی توہین ہوتی ہے۔ انسان لوگوں کی نظروں میں ذلیل وخوار قرار پاتا ہے۔ اور حُبِ نفس کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی وہاں منعم اور دینے والے کی نسبت اس طرح کے خیالات پرورش پاتے ہیں کہ گویا یہ بہت بڑا محسن ہے۔ اور ایسا محسن ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو فقرار کی کتنی ہی ضرورتیں اور حاجتیں دھری کی دھری رہ جائیں۔ علاوہ ازیں اس میں یہ قباحت بھی ہے کہ ممکن ہے۔ اخفار وسر کے معاملہ میں اس کا فیصلہ اخلاص پر مبنی نہ ہو۔

نیتوں کو جاننے کا پیمانہ علم وفقر بجائے خود قابلِ احترام ہے

سوال یہ ہے کہ اس صورت میں نیتوں کو جانچنے اور پرکھنے کا صحیح پیمانہ کیا ہے۔ پیمانہ یہ ہے کہ یہ محض یوں سوچے کہ اگر کسی کو اس کی حقیاجوں کا علم ہو جائے۔ تو کیا اس صورت میں اُسے چور رنج پہنچے گا۔ یا اذیت محسوس ہوگی

آیا یہی کیفیت اُس وقت بھی قائم رہے گی جب اسے معلوم ہو کہ اس جیسے کسی دوسرے حاجتمند کا راز فاش ہوا ہے۔ اور اُسے تکلیف محسوس ہوئی ہے۔ اور اس کی طرح اس کے کسی دوسرے بھائی بند کی عزت و آبرو کو افشار کا خطرہ لاحق ہوا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی نیت صحیح ہے۔ اور اس کی احتیاط درست ہے۔ لیکن اگر دوسرں کی عزت و آبرو اُس کو اتنی عزیز نہیں ہے۔ جس قدر کہ اپنی عزیز ہے۔ تو پھر یہ اخفار کے معاملہ میں اخلاص کی نعمت سے بہرہ مند نہیں۔ کیونکہ علم و نفقر کی تذلیل اس بنا پر مذموم نہیں کہ اس کا تعلق کسی خاص شخص سے ہے۔ بلکہ اس بنا پر ہے کہ علم و فقر بجائے خود احترام کے لائق ہیں۔ اس لیے سچا عالم اور سچا فقیر وہی ہے۔ جو علم و نفقر کی تذلیل پر ہر حالت میں رنجور ہو۔ چاہے اُس کا تعلق اس کی ذات سے ہو۔ اور چاہے ان اوصاف سے کوئی دوسرا متصف ہو۔

حدیثِ صوم

روزہ کی اہمیت

رمضان کا روزہ ربعِ ایمان میں داخل ہے کیونکہ اس کے بارہ میں آنحضرت کا ارشاد ہے:

الصوم نصف الصبر (۱)		روزہ آدھے صبر کے مترادف ہے۔
الصبر نصف الایمان (۲)		صبر نصف ایمان کے برابر ہے

پھر اس میں مزید خصوصیت یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اور اس لحاظ سے اس کو تمام عبادات سے ممیز قرار دیا ہے۔ حدیث میں ہے:

یضاعف کل حسنۃ بعشر امثالہا، الی سبع مائۃ ضعف الا الصیام فانہ لی وانا اجزی بہ (۱)	ہر نیکی کا اجر دس گنا سے زائد تک ہے لیکن روزہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ یہ میرے لیے مخصوص ہے۔ اس لیے اس کے اجر کی تعیین میرے ذمہ ہے۔

قرآن کریم کی ایک آیت میں بھی اس چیز کی طرف اشارہ ہے:

انما یوفی الصابرون بغیر حساب۔	جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا۔

اور چونکہ روزہ کو نصف صبر کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عبادت کی ایسی نوعیت ہے۔ کہ جس میں ناپ تول، اور حساب دریاضی کی حد

---

(۱) ترمذی۔ (۳) بخاری و مسلم۔

(۲) الحلیہ لابی نعیم۔

بندیوں کو دخل نہیں۔

اس سے بڑھ کر اس کی فضیلت کا اندازہ اس حدیث سے لگائیے۔

والذی نفسی بیدہ لخلوف فم الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک الخ (۱)	اس ذاتِ گرامی کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ صائم کے منہ کی بو اللہ کے ہاں مشک کی شمیم فرحت آفریں سے کہیں زیادہ پاکیزہ ہے۔

روزہ رکھنے والے کے لیے جنت کا ایک مخصوص دروازہ ہوگا۔ جس میں صرف وہی داخل ہو سکے گا۔ آں حضرت کا ارشاد ہے:

للجنۃ باب یقال لہ الریان لا یدخلہ الا الصائمون وھو موعود بلقاء اللہ تعالیٰ فی جزاء صومہ۔ (۲)	جنت میں ایک دروازہ "ریان" نامی ہے جس میں روزہ داروں کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہو پائے گا۔ روزہ داروں سے، اللہ تعالیٰ کے دیدار کا بھی وعدہ ہے۔

روزہ کو امتیاز کیوں حاصل ہے

سوال یہ ہے روزہ کی فضیلت اس درجہ کیوں ہے؟ اور اس کو دیگر عبادات پر یہ امتیاز کیوں حاصل ہے۔ اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ دوسری تمام عبادات ایسی نہیں کیونکہ ان عبادات کو ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔ لیکن روزہ کا تعلق یکسر انسان کے باطن سے ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا۔ اور کوئی نہیں معلوم کر سکتا کہ فلاں شخص روزہ سے ہے یا نہیں ہے۔

دوسرے یہ اس سے جتنا شیطان قابو میں آتا ہے۔ اور جس قدر اس کی راہیں بند ہوتی ہیں۔ اور کوئی عبادت اس معاملہ میں اس کی ہمسر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ شیطان اور

---

(۱) بخاری و مسلم۔

(۲) مسلم و بخاری۔

اس کی کارفرمائیاں اس سے زیادہ کیا ہیں کہ شہوات و خواہشات کا سب سے بڑا وسیلہ ہیں۔ کہ جس کو آلۂ کار بنا کر یہ انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ اور روزہ سے چونکہ یہ سارا کارخانہ ہی طبیعت و اقتضار کے دائرہ سے نکل کر اطاعت و فرمانبرداری کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اور اس کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں شیطان کی قوتوں کو فتح کرنے اور قلع قمع کرنے سے یہ مطلب بھی ہے۔ کہ آپ نے اللہ کی طرف نصرت کا ایک قدم بڑھایا اور جب آپ نے اس کی طرف قدم بڑھایا تو اس کے صلہ میں اس کی رحمتیں بھی جوش میں آ جاتی ہیں۔

ان تنصروا اللہ ینصرکم و یثبت اقدامکم (محمد-،)

اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو ثبات بخشے گا۔

روزہ کے اسرار اور معنوی شرطیں

روزہ کے تین مدارج روزہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس سے متعلقہ مدارج کی تفصیل معلوم کی جائے اس کے تین معروف درجے ہیں۔

صوم عموم۔ عوام کا روزہ۔

صوم خصوص۔ خواص کا روزہ۔

صوم خصوص الخصوص۔ یا اُن لوگوں کا روزہ جو اللہ کے خاص الخاص بندے ہیں۔

صوم عموم سے مراد یہ ہے کہ صائم کم از کم اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرے۔ یعنی کھانے پینے یا جنسی تقاضوں کی حد تک اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرے۔

صوم خصوص۔ اِس سے کچھ زیادہ کا طالب ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ ہاتھ پاؤں، ناک، کان اور لسان تمام اعضاء و جوارح اپنے کو کسی معصیت سے آلودہ نہیں ہونے دیں گے۔ اور صائم اس بات کا پابند ہو گا۔ کہ ان کو ہر طرح کی آلودگی اور فجور سے بچائے رکھے گا۔

صوم خصوص الخصوص کا تقاضہ اس سے بھی آگے کی منزل کا ہے۔ اِس سے یہ مقصود ہے۔ کہ دل افکار ماسوی اللہ سے بالکل آزاد ہو جائے گا۔ اور فکر و تدبر کی تمام صلاحیتوں کا بجز خدا کی ذات اور امورِ آخرت اور کوئی مدار و محور نہیں رہے گا۔ اسی کی محبت، اُسی کی دُھن اور اُسی کا نام اور اُسی کا ذکر اس کا وظیفۂ حیات ٹھہرے گا۔

اس منزل میں اخلاص و رسوخ کس درجہ کا ہونا چاہیے۔ اس پر یوں غور کیجیے کہ جہاں عوام کا روزہ کھانے پینے کی اشیاء سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہاں ان کے ہاں اس کی نزاکت کا یہ حال ہے۔ کہ اگر کسی نے دنیا کے بارہ میں ذرا سوچ لیا تو بھی روزہ کی برکات سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

دنیا کی تعریف اربابِ قلوب کے نقطۂ نظر سے

دنیا کے لفظ سے دھوکا میں نہیں پڑنا چاہیے یہ دنیا جو اربابِ قلوب کے لیے بمنزلہ افطار کے ہے۔ وہ ہے جو کسی طرح بھی زادِ آخرت نہ بن سکے۔ اور عقبیٰ میں کام نہ آسکے۔ اس میں دین کا کوئی پہلو مدِ نظر نہ ہو۔ اور وہ دنیا جو بہر حال آخرت کا توشہ ہے۔ اور عقبیٰ کی بھلائیوں کا پیش خیمہ ہے اس کو دین ہی کا ایک ضروری حصّہ سمجھنا چاہیے۔ اس نظامِ خصوص الخصوص میں قدم دھرنے سے یہ لازم آتا ہے۔ کہ صائم اس عالمِ ذلیل اور کارخانۂ فلک کے ہر فکر اور ہر تشویش سے مخلصی حاصل کر لے۔ یہاں تک کہ اگر دن کے وقت اس نے اپنی افطاری سے متعلق غور کر لیا، تو محض اتنا کرنے سے اس کا نام گنہ گاروں کی فہرست میں لکھ لیا گیا۔ یہ مرتبۂ بلند آسانی سے حاصل ہونے والا نہیں۔ اس پر انبیاء علیہم السلام فائز ہوتے ہیں، صدیق فائز ہوتے ہیں۔ اور ان حضرات کو ان سے بہرہ مندی کے مواقع میسر ہوتے ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ کے مقربین خاص ہیں۔

صومِ خصوص کا نقشہ اور شرائط

اس مقام و درجہ کی دیگر تفصیلات کیا ہیں؟ اس پر مزید حاشیہ آرائی ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ قصہ زبانی جمع خرچ اور قیل و قال سے متعلق نہیں۔ بلکہ کچھ حکایت عمل سے تعلق رکھنے والی کیفیت ہے۔ جس کی حقیقت عمل اور صرف عمل ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔ دو لفظوں میں اس کیفیت کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص کلیۃً اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور ارادہ و

ہمت کی پوری پوری قوتوں کے ساتھ غیر اللہ سے اپنا رُخ پھیر لے۔

صوم خصوص، جس کو ہم صوم صالحین سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ہے کہ روزہ دار اپنے اعضاء و جوارح کو ہر طرح کی آلودگی و آلائش معصیت سے بچائے رکھے اس کی تفصیل چھ امور کی تکمیل چاہتی ہے۔

امر اول۔ نظر و بصر کو مخصوص رکھا جائے۔ اور کوشش کی جائے کہ اس کا ہدف نہ تو کوئی ناجائز و مکروہ بات ہو اور نہ کوئی ایسا منظر ہو جو اپنی طرف الجھا لے اور یادِ الٰہی کو بھلا دے۔ آں حضرت کا ارشاد ہے:

النظرة سهم مسموم من سهام ابليس لعنه الله فمن تركها خوفا من الله اتاه الله عز وجل ايمانا يجد حلاوته في قلبه۔ (۱)	غیر محرم عورت کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا ابلیس مردود کے تیروں میں کا ایک زہر بلا تیر ہے۔ سو جو کوئی اللہ کے خوف سے اس سے باز رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی اس نعمت سے مالا مال کرے گا جس کی شیرینی یہ یہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے:

خمس يفطرن الصائم الكذب والغيبة والنميمة واليمين الكاذبة والنظرة بالشهوة۔ (۲)	ان پانچ چیزوں سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، جھوٹ، چغلی، غیبت، جھوٹی قسم اور شہوت بھری نظریں۔

امر ثانی۔ زبان کو اس سے متعلقہ عیوب سے باز رکھا جائے۔ جیسے ہذیان، جھوٹ غیبت، چغلی، فحش گوئی، سخت کلامی، جھگڑا، اور ریاکارانہ کلمات۔ ایجابی صفات

(۱) مستدرک۔

(۲) ازدی نے ذکر کیا ہے۔

اس میں یہ پیدا ہونے چاہییں کہ لایعنی امور میں سکوت کو ترجیح دے ۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے ۔ اور تلاوتِ قرآن مجید میں مصروف و منہمک ۔

غیبت کے بارہ میں حضرت سفیان کا قول ہے :

الغیبۃ تفسد الصوم — غیبت روزہ میں خلل پیدا کرتی ہے ۔

مجاہد سے مروی ہے ۔

خصلتان یفسدان الصیام الغیبۃ والکذب ۔ — دو خصلتیں ایسی ہیں جو روزہ کو بگاڑ دیتی ہیں ۔ ایک غیبت ، دوسرے جھوٹ ۔

آں حضرت فرماتے ہیں :

انما الصوم جنۃ فاذا کان احدکم صائما فلا یرفث ولا یجھل وان امرء قاتلہ او شاتمہ فلیقل انی صائم انی صائم (۱) — روزہ صائم کے لیے بمنزلہ سپر کے ہے سو جو کوئی تم میں سے روزہ رکھے وہ نہ تو فحش گوئی کرے ، نہ لڑے جھگڑے اور اگر اُس سے کوئی للکار یا گالی گلوچ پر اکسائے تو یہ کہہ کر ٹال جائے کہ بھائی میں تو روزہ سے ہوں ، میں تو روزہ سے ہوں ۔

امر ثالث :۔ کان کے پردوں پر کوئی ایسی آواز دستک نہ دے ۔ جو معصیت کی طرف بلانے والی ہو ۔ ممنوع اور حرام چیزوں کی طرف ملتفت ہونا کتنا بُرا ہے ۔ اس کا اندازہ اس آیت سے کیجیے کہ قرآن نے اس میں ہر طرح جھوٹی باتوں کو سُننے اور سود کھانے والے کو ایک ہی صف میں رکھا ہے ۔

سمّٰعون للکذب اکّٰلون للسحت ۔ (مائدہ - ۴۲) — یہ جھوٹی باتیں بنانے کے لیے جاسوسی کرنے والے اور سود کھانے والے ہیں ۔

دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے :

---

(۱) بخاری و مسلم ۔

لولا ینھاھم الربانیون و الاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت ۔ (مائدہ ۔ ۶۳)

بھلا اُن کے مشائخ اور علماء اُن کو گناہ کی باتوں اور حرام کھانے سے منع کیوں نہیں کرتے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کسی کی بُرائی بیان کرنا گناہ ہے اِسی طرح اس پر خاموش رہنا اور سُننا بھی معصیت ہے۔

چنانچہ خود قرآن کا کہنا ہے۔

انکم اذا مثلھم (نساء ۔ ۱۴۰)

ورنہ تم بھی انہیں جیسے ہو گے۔

المغتاب والمستمع شریکان فی الاثم ۔ (طبرانی)

غیبت کرنے والا، اور اُس کو آویزہ گوش بنانے والا دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔

امر رابع :- یہی بقیہ اعضا کا حکم ہے۔ ہاتھ پاؤں اور جسم کے دوسرے کل پرزے ہر طرح کی معصیت سے مجتنب رہیں۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے دن بھر پیٹ میں مثلاً حرام چیز نہ جانے دی۔ مگر افطاری کے قریب معدہ کو حرام سے پُر کر لیا۔ تو یہ پرلے درجے کی بے وقوفی ہوگی۔ اور اس پر عربی کی یہ مثل صادق آئے گی۔

بنیٰ قصرا وھدم بلدۃ

ایک محل تعمیر کیا لیکن پورا شہر ملیا میٹ کر کے

روزہ کی حقیقت معدہ کو حرام سے بھرنے سے پہلے روزہ کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اکل حلال سے روکا ہے۔ اور پاکیزہ و طیب چیزوں پر پابندی عائد کی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ کھانے پینے کی وہ مباح اشیاء جن سے روزانہ کام و دہن کی تواضع کا کام لیا جاتا ہے۔ ان میں بھی اقل قلیل پر اکتفا کیا جائے۔ تاکہ صبر و برداشت کی قوتوں کو نمو حاصل ہو۔ اور ایک مسلمان اس لائق ہو کہ ہر نوع کے ابتلاء کا کامیابی کے ساتھ سامنا کر سکے۔ چہ جائے کہ اکل حرام کی اجازت دی جائے۔ ایسا شخص جو رمضان میں بھی بُرائی سے باز نہیں آتا۔ اُس کی مثال ایسے مریض

کی سی ہے جس کو طبیب نے زیادہ کھانے سے روک رکھا ہو۔ مگر یہ بدپرہیز کم کھانے کے بجائے زہر کھا تک لے۔ اور مہلکات تک سے اجتناب نہ کرے۔ اب جو حال ایسے شخص کا ہو سکتا ہے۔ وہی حال اس روزہ دار کا ہوگا۔ جو روزہ بھی رکھتا ہے اور الم غلم سب کھا بھی جاتا ہے۔ اور مطلق لحاظ نہیں رکھتا۔ کہ اللہ تعالیٰ کن چیزوں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اور کن سے باز رکھتا اور روکتا ہے۔

ایسے شخص کے حق میں آں حضرت نے فرمایا ہے:۔

کم من صائم لیس له من صومه الا الجوع والعطش!

کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ ان کو روزہ سے بجز بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں

کیا روزہ میں کھانے پینے کے تعیشات کا معمول جاری رہنا چاہیے؟

امر خامس :۔ افطاری کے وقت اتنا تو بہرحال کھانا ہی چاہیے۔ کہ جس سے جسم و جان کا رشتہ قائم رہے۔ اور عبادات پر قوت و استحکام پیدا ہو۔ لیکن اس طرح رنگا رنگ کے کھانوں سے دستر خوان سجانا اور ڈٹ کے کھانا کہ پیٹ کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ اور خواہش وطلب کی ہر ہر نوعیت پوری ہو۔ یہ ایسی عادت ہے کہ اس سے روزہ کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ اس کی تہ میں جو فلسفہ کارفرما ہے۔ وہ تو یہ ہے کہ شہوات و رغبات کے زور کو توڑا جائے اور جذبات و خواہشات کے طوفانوں پر قابو پایا جائے۔

ظاہر ہے یہ غرض تقلیل غذا ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ زیادہ کھانے اور پرتکلف افطاری سے نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں روزہ رکھنے والوں میں عموماً جو کھانا صبح و شام کھایا جاتا ہے۔ رمضان میں اس کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اس کے لیے مخصوص تیاریاں کی جاتی ہیں۔ اور ایسی ایسی عمدہ چیزیں پکائی اور کھائی جاتی ہیں۔ جو سال بھر پکائی اور کھائی نہیں جاتیں۔ ان حالات میں روزہ میں تقویٰ کی کیفیتیں پیدا ہوں اور خواہشات

نفس پر اقتدار حاصل ہو تو کیونکر؟ جب دن بھر بھوک اور پیاس کی شدتوں کو تیز کیا جائیگا اور افطاری کے وقت بوقلموں کھانوں سے پیٹ بھر لیا جائے گا۔ تو اس سے کسر شہوات کا مقصد تو کیا پورا ہو گا۔ اُلٹے یہ اندیشہ ہے کہ نفس اور فربہ ہو جائے اور شیطان زیادہ کامرانی سے اس پر قبضہ جما سکے۔ اِس لیے روزہ کی روح کا تقاضہ یہی ہے۔ کہ صائم اتنا ہی کھائے اور وہی کچھ کھائے جس کا وہ عموماً عادی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھرے پُرے پیٹ سے زیادہ اور کوئی چیز مبغوض نہیں۔

اِس کے علاوہ یہ بھی روزہ کے آداب میں داخل ہے۔ کہ روزہ گذارنے اور بہلانے کی غرض سے دن کو سوئے نہیں۔ بلکہ اس کی اذیتوں کو سہتا اور جھیلتا رہے۔ اور جسم کو اس ریاضت میں گھلاتا رہے۔ تاکہ اس میں استطاعت پیدا ہو۔ اور یہ آسانی سے تہجد پڑھ سکے۔ اور اوراد و اشغال کے جاری رکھنے میں کوئی کسل اور دقت محسوس نہ کرے جب اس انداز سے کوئی روزہ رکھے گا۔ تو توقع ہے کہ اس پر ملکوت کے دروازے کھل جائیں گے۔ اور شیطان اس کے فکر و ضمیر کے گرد نہ تو چکر لگا سکے گا۔ اور نہ اپنی ابلہ فریبیوں ہی سے اسے متاثر ہی کر سکے گا۔ لیلۃ القدر سے ہی یہی اسرار ملکوت کا وا ہونا مراد ہے۔ قرآن میں ہے۔

انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر (القدر۔ ۱) ہم نے اس کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔

رمضان میں جذبات کا کیا عالم ہونا چاہیے! حسن بصری کی تصریحات

لیکن اس کے لیے تقلیل غذا اور معدہ کا خالی ہونا شرط ہے۔ ورنہ یہ سیرشکمی ایسا حجاب ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ملکوتیت کروٹ نہیں بدل سکتی۔

امر سادس :- افطار کے بعد دل میں اضطراب و رجا کی ملی جلی کیفیات ہونی

چاہییں، اِس لیے کہ کوئی نہیں جان سکتا۔ کہ اس کی یہ کاہش اور محنت اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوئی ہے یا مسترد ہو جانے کے لائق ہے۔ اور اس کا اس عبادت اور ریاضت سے مقبول بندوں میں شمار ہونے لگا ہے یا اُن لوگوں میں ہے کہ ریا و سمعہ نے اُس کے عمل کو کالعدم قرار دے دیا ہے۔ یہ کیفیت صرف روزہ ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر ہر عبادت سے فراغت کے بعد مومن کے جذبات کا یہی عالم ہونا چاہیے۔

چنانچہ بڑے بڑے اتقیاء اور صوفیاء نے انہی کیفیات کے نشو ونما پر زور دیا ہے۔

حسن بصری کا ایک مرتبہ ایسے لوگوں پر گذر ہوا جو ہنسی اور مذاق کی محفلیں جمائے ہوئے بیٹھے تھے۔ اور بڑی بے فکری سے قہقہے لگا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا تمھیں کچھ معلوم ہے۔ یہ کون مہینہ ہے۔ یہ ماہِ رمضان ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے امتحان کا ایک میدان ٹھہرایا ہے جس میں کچھ خوش قسمت تو ایسے ہیں جو گوئے سبقت لے جانے میں کامیاب ہیں۔ اور کچھ ایسے بدنصیب ہیں۔ جن کے پلے ناکامیوں کے سوا کچھ نہیں پڑا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کشفِ غطا سے کام لے۔ اور ان کی بصیرت کی آنکھیں کھول دے تو کامیاب و کامران اپنی خوش بختیوں میں فرحاں مصروف ہو جائے۔ اور خائب و خاسر کو اتنی مہلت بھی نہ ملے کہ اپنی بداعمالیوں پر غور کر سکے۔

مقصد یہ ہے کہ رمضان ایسی سعادت ہے کہ اس سے بہرہ مندی کی صورت میں بے شمار مسرتیں ہیں۔ جن سے صائم دوچار ہیں۔ اور اس سے محرومی کی حالت میں بے شمار حسرتیں ہیں۔ جن سے نمٹنا ہے۔ لہذا ہنسی اور ٹھٹھے کی قطعی گنجائش نہیں اور تم کیسے ناقدرا اور ناشکرے ہو۔ کہ ایسے قیمتی لمحے یوں لہو و لعب میں کھو رہے ہو۔

احنف بن قیس بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس پر بھی روزہ رکھتے تھے۔ ان

سے کہا گیا کہ اس سے آپ کے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا۔ اور رہی سہی سکت بھی جاتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا یہ درست ہے۔ لیکن اس پر بھی تو غور کرو کہ کشتیٔ عمر ساحل تک پہنچنے ہی والی ہے۔ اور یہ مسافت علاوہ اس کے کہ دور دراز کی ہے کٹھن بھی ہے۔ اس کی تیاری کرنا ضروری ہے۔ پھر اس راہ میں صبر و برداشت اس سے کہیں سہل ہے۔ کہ اللہ کی غضب ناکیوں کا مقابلہ کیا جائے۔

معانی باطنہ اور فقہاءِ ظاہر و باطن میں فرق

یہ ہیں وہ معانی باطنہ کہ جن کو روزوں میں ملحوظ رکھنا لازم ہے اور جن کے بغیر ان میں کیفیت و لطف پیدا نہیں ہو پاتا۔ اس پر اگر کوئی کہہ دے کہ فقہاء تو اس قدر سختیاں اور شرائط عائد نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو کہتے ہیں۔ کہ اگر ایک شخص کھانے پینے میں شرعی احتیاط کا خیال رکھتا ہے۔ اور جنسی تقاضوں سے بھی بچا رہتا ہے۔ تو اس کا روزہ بغیر کسی شبہ اور کھٹک کے صحیح ہے۔ سوال یہ ہے کہ فقہاء کی اس یقین دہانی کے بعد ان دقائق کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں۔ کہ فقہاءِ ظاہر اور علماءِ باطن کا دائرۂ بحث و فکر الگ الگ ہے۔ فقہاء صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہ ظاہر کی حد تک دلائل و شرائط کی تفصیل بیان کر دیں۔ ان پر یہ فرض قطعاً عائد نہیں ہوتا۔ کہ معانی باطنہ کا کھوج لگائیں اور بتائیں کہ جھوٹ یا غیبت کا مثلاً روزہ کی روحانیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ برخلاف علماءِ باطن کے کہ یہ اس بات کے مکلف ہیں۔ کہ عبادات کی روح بھی متعین کریں۔ اور اس کے لوازم و شرائط کی چھان بین بھی کریں۔ رہی یہ بات کہ ان امورِ باطنہ کی اہمیت کیا ہے؟ تو اس کا اندازہ فریقین کے دلائل سے کیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ فقہاء کے دلائل نسبتہً زیادہ کمزور ہیں۔ اور علماءِ باطن جن حقائق پر زور دیتے ہیں۔ ان کا موقف زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے۔

فقہاء اور علماءِ ظاہر کے مخاطبین الگ الگ ہیں

پھر ایک فرق یہ بھی ہے کہ دونوں کے مخاطبین الگ الگ ہیں اور دونوں کے مقاصد جُدا جُدا ہیں۔ یعنی فقہاء کی اگر یہ کوشش ہے کہ اس گروہ کو دین کی موٹی موٹی حقیقتیں سمجھائیں جو دنیائے دنی پر مٹا ہوا ہے۔ اور دین کی جانب سے بالکل غافل ہے۔ تو علمائے باطن کا مخاطب وہ طائفہ ہے جو فرائض کی حد تک گو پوری طرح لیس ہے مگر اس پر قانع نہیں۔ بلکہ مزید ترقیات کا خواہاں ہے۔ اور مزید درجات کا طالب ہے۔ ایک فرق دونوں میں یہ ہے کہ فقہاء کی پرواز زیادہ سے زیادہ تصحیح اعمال تک ہے۔ آگے نہیں۔ لیکن اربابِ قلوب، قبولیت کے جویاں ہیں۔ بلکہ ان کا نصب العین شریعت سے بھی متجاوز ہو کر وصول و اتصال کی سرحدوں تک رسائی حاصل کرنا ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

روزہ کا اولین اور بنیادی مقصد

یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان کے نزدیک روزہ کا اولین اور بنیادی مقصد تخلق باخلاق اللہ ہے، اور اللہ کے اخلاق کے ساتھ ہمرنگ ہونے کے معنی مقامِ صمدیت تک پہنچنا ہے۔ اور ملائکہ کی صف میں کھڑا ہونا ہے۔ یہ ملائکہ کیا ہیں؟ ایک ایسی مخلوق جو گناہ اور معصیت کے پھیر میں گرفتار نہیں۔ بلکہ جس کا وظیفۂ حیات ہی اطاعت و بندگی ہے۔ لہٰذا انسان جس قدر خواہشات سے اونچا اُٹھے گا۔ اُسی نسبت سے صفتِ ملکوتیت سے متصف ہوگا اور جس نسبت سے ہوس و آز کے پھندوں میں پھنسے گا۔ اُسی نسبت سے ملائکہ سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اب جب روزہ کے معنی اربابِ قلوب کے نزدیک یہ ٹھہرے کہ اس کے ذریعہ مقامِ صمدیت سے تعلق پیدا کرنا ہے۔ تو روزہ کے اس تصور پر یہ حضرات کیونکر مطمئن ہو سکتے ہیں۔ کہ ایک وقتِ خاص تک تو روٹی کا ایک بھورا اور پانی کا ایک قطرہ بھی حلق کے اندر نہ جانے پائے۔ لیکن جب وہ وقت گذر جائے تو پھر پیٹ

کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہے۔ جو بھر نہ جائے۔ اور یہ کہ دستر خوان کھانوں کی تمام قسام سے آراستہ ہو۔ کیونکہ اگر روزہ کا مفہوم اِسی قدر ہوتا۔ تو آں حضرت کیوں ارشاد فرماتے:-

کم من صائم لیس لہ من صومہ الا الجوع و العطش۔	کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں۔ کہ جن کو روزہ سے بجز بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔

روزہ رکھنے اور اُس کی روح کو نظر انداز کرنے اور نہ رکھنے اور اُس کی روح کو برقرار رکھنے میں کیا فرق ہے!

اسی حدیث کے پیش نظر بعض علماء کا کہنا ہے:-

کم من صائم مفطر وکم من مفطر صائم۔ (کچھ ایسے روزہ دار ہیں۔ جو مفطر کے حکم میں ہیں اور کچھ ایسے مفطر ہیں۔ کہ روزہ کی برکات سے بہرہ مند ہیں۔)

یعنی وہ مفطر جو روزہ نہ رکھنے کے باوجود روزہ کی برکات سے بہرہ مند ہیں۔ وہ حضرات ہیں۔ جو اگرچہ کھانے پینے کے معاملہ میں روزہ کی پابندیوں کے مکلف نہیں تاہم اُن کے اعضاء و جوارح مکمل روزہ سے ہیں۔ اُن کے کان غیبت سے آشنا نہیں، اُن کی زبانیں بیہودہ گوئی اور ہرزہ سرائی سے کلیتہً مجتنب ہیں۔ اور اُن کی نظریں عفاف و پاکیزگی کردار کی پوری طرح آئینہ دار ہیں۔ اسی طرح صائم مفطر کے حکم میں وہ گروہ ہے۔ جو بظاہر روزہ سے ہے۔ اور بھوک اور پیاس کی شدتوں کو سہتا اور جھیلتا بھی ہے۔ مگر اپنے اعضاء و جوارح کو معصیت و نافرمانی سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یہی نہیں بلکہ اس معاملہ میں پرلے درجے کا متساہل ہے۔ ان دونوں میں جو نمایاں فرق ہے۔ اس کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے اس مثال پر غور کیجیے۔ وہ شخص جس نے روزہ رکھا اور اس کی روح کو نظر انداز کیا۔ وہ اس آدمی کی طرح ہے کہ جس نے اعضاء وضو پر تین تین بار مسح تو کیا۔

گر دھویا نہیں۔ اور جس نے روح کے تقاضوں کو سمجھا اور برائیوں سے اپنا دامن عمل بچایا۔ اس کی مثال ایسے شخص کی ہے کہ جس نے کہ ایک ہی مرتبہ اعضاء وضو کو دھویا۔ اور تین تین بار دھونے کی شرط پوری نہیں کی تاہم پاکی کے لوازم کو پورا کیا۔ اس شخص کی نماز عنداللہ مقبول ہوگی۔ اور وہ شخص جس نے گو تین مرتبہ مسح کیا مگر اعضاء کو دھو کر پاک نہیں کیا۔ اس کی نماز مقبول ہونا تو کجا۔ الٹے باز پرس کا سبب بنے گی اور اس کے منہ پر ماری جائے گی۔ روزہ میں اس معنویت کا خیال رکھنا اس بنا پر ضروری ہے کہ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہے جس کا صحیح استعمال لازمی ہے۔

آں حضرت کا ارشاد ہے:

ان الصوم امانة فليحفظ احدكم امانته۔ (۱)

روزہ ایک امانت ہے سو چاہیے کہ تم اس کی حفاظت کرو۔

ایک حدیث میں آتا ہے۔ جب آپ نے مذکورہ تحت آیت پڑھی۔

ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اہلہا۔ (نساء ۔ ۵۸)

خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو۔

تو اپنے کانوں اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

السمع امانة والبصر امانة۔ (۲)

کان بھی اللہ کی امانت ہے اور آنکھ بھی اللہ کی امانت ہے۔

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ نظام عبادات میں۔ ایک حصہ ظواہر کا ہے

(۱) خرائطی نے مکارم الاخلاق میں ذکر کیا ہے۔

(۲)

اور ایک باطن کا۔ ایک بمنزلہ قشر اور چھلکے کے ہے ۔اور ایک لب لباب اور روح و اصل کے ۔ پھر باطن کے بھی کئی کئی درجے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تم ان میں کس چیز کو پسند کرتے ہو۔ کیا ظواہر پر اکتفار کرتے ہو یا عبادات کی گہرائیوں میں اترتے ہو ۔ اور اس گروہ میں شمار ہوتے ہو ۔ جو دین کے معاملہ میں عقل و حکمت سے کام لیتا ہے ۔

اسرارِ حج

حج کے فضائل واہمیت

حج ایک ایسی عبادت ہے۔ جو عمر میں ایک ہی بار فرض ہے۔ مگر ایسی اہم ہے کہ اگر ایک شخص استطاعت رکھتا ہے۔ اور اس پر بھی بغیر کسی عذر شرعی کے اس سے محروم رہتا ہے۔ تو آں حضرت کا ارشاد ہے کہ اس طرح کے مسلمان کے لیے مسلمان رہنا ضروری نہیں۔ یہ چاہے جس ملت میں اپنا نام لکھوالے۔

من مات ولم یحج فلیمت ان یهودیا وان شاء نصرانیا۔ (۱)

جو اس حال میں مرا کہ اس نے ترک حج کیا۔ وہ جس حال میں چاہے مرے۔ اللہ کو اس سے کچھ غرض نہیں۔ چاہے یہودیت پر مرے چاہے عیسائیت پر۔

حج کی ایک کھلی ہوئی فضیلت یہ ہے کہ اسلام کے پروان چڑھنے اور کمال تک پہنچنے کی خوشخبری اسی موقع پر سنائی گئی۔

یعنی اس آیت کا نزول انہی مبارک ایام میں ہوا۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ (مائدہ — ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کردیا ہے۔ اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی ہے۔ اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔

جس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ جو شخص حج سے محروم ہوا وہ دین ہی کی برکات

کاملہ سے دست کش ہوا۔

اِس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

واذن فی الناس بالحج یاتوك رجالاً وعلیٰ کل ضامر یاتین من کل فج عمیق ۔ (حج - ۲۷)	اور لوگوں میں حج کے لیے ندا کر دو۔ کہ تمہاری طرف پیدل اور دُبلے دُبلے اُونٹوں پر جو دور دراز رستوں سے چلے آتے ہوں سوار ہوکر چلے آئیں ۔

حدیث میں ہے :

من حج البیت و لم یرفث و لم یفسق خرج من ذنوبه کیوم ولدته اُمّه(۱)۔	جس نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اور اس میں نہ تو گالی گلوچ سے کام لیا اور نہ کسی فسق کا ارتکاب کیا۔ یہ گناہوں سے یوں پاک ہوگیا کہ جیسے ابھی ابھی اس کی ماں نے اُسے جنا ہے۔

اس دن کی برکات کو دیکھ کر شیطان کا کیا حال ہوتا ہے ۔ اس کا نقشہ آنحضرت نے اس حدیث میں کھینچا ہے ۔

ما رؤی شیطان فی یوم اصغر ولا ادحر ولا احقر ولا اغیظ منه یوم عرفة(۲)	شیطان جس قدر عرفہ کے دن چھوٹا، ذلیل راندۂ درگاہ اور غضبناک دیکھا گیا ہے، اور کسی دن نہیں دیکھا گیا۔

ایامِ حج میں شیطان کا اضطراب اولیاء اللہ کا مشاہدہ

بعض اولیاء مقربین کا مشاہدہ ہے کہ اُنھوں نے فی الواقع اپنے مکاشفات میں شیطان کو ان دنوں دیکھا ہے ۔ کہ بُرے حالوں میں ہے ۔ اُن کا کہنا

---

(۱)

(۲) مالک نے ابراہیم بن ابی عبلہ سے روایت کیا ہے ۔

ہے کہ اس کو بہت بڑا صدمہ اس بات سے پہنچتا ہے۔ کہ حجاج کرام اتنی طویل طویل مسافتیں طے کر کے، بغیر کسی دنیوی غرض کے اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ اخلاص دنیا کے بارہ میں ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح اس کے لیے مسلمانوں کا تعاون، اتحاد اور اس طرح ایک برادری کی صورت میں نمودار ہونا بھی ناقابل برداشت ہے۔ مزید براں یہ روحانی اذیت بھی اس کو مارے ڈالتی ہے۔ کہ یہاں آکر ہر ہر مسلمان حسن خاتمہ کی دعائیں مانگتا ہے۔ جن کا قبول ہوجانا زیادہ اغلب ہے۔

اس کے فضائل و مناقب میں کئی احادیث آئی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے۔

حجة مبرورة خير من الدنيا وما فيها۔ وحجة مبرورة ليس لها جزاء الا الجنة (۱)	حج مبرور دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔ اور حج مبرور کی جزا جنت ہی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

استكثروا من الطواف بالبيت فانه اجل شئ تجدونه في صحفكم يوم القيامة و اغبط عمل تجدونه۔	بیت اللہ کا کثرت سے طواف کرو۔ کیونکہ قیامت کے روز، اس سے زیادہ جلیل القدر اور خوش کن عمل اور کوئی تمہارے مجموعۂ اعمال میں لکھا نہیں پایا جائے گا۔

سلف صالحین کا قاعدہ تھا۔ کہ اگر جہاد کے قافلے روانہ ہوتے تو اُن کی باقاعدہ مشایعت کرتے، اور حجاج بیت اللہ گھروں کو لوٹتے تو اُن کا خیر مقدم کرتے ان کی پیشانیوں پر بوسہ دیتے اور اُن سے دعائی اور مخلصانہ درخواست کرتے۔ اس سے اس قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے۔ جو قدماء کے دلوں میں حج کے متعلق تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ حج صرف ایک عبادت ہی نہیں بلکہ ایک مخصوص عبادت ہے۔

---

(۱) بخاری و مسلم

حج کے بعد مکہ میں ٹھہر جانا افضل ہے؟

علمائے حقانی میں وہ لوگ حد درجہ محتاط ہیں جو مکہ میں زیادہ قیام پسند نہیں کرتے۔ ان کے سامنے تین مصلحتیں ہیں۔ مکہ میں زیادہ دیر تک ٹھہرنا دائمی شوق کو کم کر دیتا ہے حضرت عمر کا حکیمانہ طرزِ عمل

اول:- یا تو وہاں رہنے سے بیت اللہ کے ساتھ انس بڑھے گا۔ اور اس کا نتیجہ ہوگا۔ کہ دل کی بے تابی اور بے کلی رفع ہو جائے گی۔ حالانکہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے قلب کی ان کیفیاتِ اضطراب کو باقی رہنا چاہیے۔ تاکہ اس کے ساتھ احترامِ قبلہ کا جذبہ قائم رہے۔ اور یا پھر دل بھر جائے گا۔ اور یہاں ٹھہر جانے والا ایک طرح کی اکتاہٹ سی محسوس کرے گا۔ ظاہر ہے یہ دونوں باتیں مناسب نہیں۔ یہی وجہ ہے جب لوگ حج سے فارغ ہو چکتے تو حضرت عمر پکار کر فرماتے۔

یا اھل الیمن یمنکم، ویا اھل الشام شامکم، ویا اھل العراق عراقکم،

اے اہلِ یمن تم تو یمن سدھارو، اور شامیو! تم شام کی راہ لو، اور عراقیو تم اپنے عراق میں پہنچو۔ یہاں کوئی رہنے نہ پائے۔

ثانی:- یہاں نہ ٹھہرنے کا ایک فائدہ یہ ہے۔ کہ اس طرح دوامی شوق میں تحریک ہوتی ہے۔ اور ایک مسلمان یہ چاہتا ہے کہ یہاں آنے جانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے۔ اور قرآن میں جو بیت اللہ کو مثابۃً للناس قرار دیا گیا ہے۔ تو اسی حکمت کے پیشِ نظر کہ یہ وہ مرکزِ شوق ہے جہاں پلٹ پلٹ کر اور بار بار آکر شتاقانِ

زیارت جائیں گے۔ اور سیر نہیں ہوں گے۔ بلکہ لوٹیں گے تو پہلے سے زیادہ بے چینیوں کو لیے ہوئے۔ اس کیفیتِ اضطراب کو ایک بزرگ نے یوں بیان کیا ہے۔

کہ اگر تم اپنے ملک میں ہو۔ اور تمہارا دل بیت اللہ کی محبت میں تڑپ رہا ہے۔ تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم بیت اللہ کے قرب میں رہو۔ اور دل کہیں اور اُلجھا ہوا ہو۔

مکّہ مکرّمہ میں نیتوں پر بھی مؤاخذہ ہے

حضرت عبداللہ بن مسعود کا ایمان افروز استدلال

ثالث :۔ کچھ لوگوں نے اس بنا پر یہاں قیام کو مناسب نہیں سمجھا۔ کہ بہ تقاضئے بشری معصیتوں اور غفلتوں کا امکان ہر وقت موجود ہے لیکن یہ جگہ ایسی پاک اور اعلیٰ ہے کہ یہاں معمولی فروگذاشت بھی اللہ تعالیٰ کے غصہ و غضب کا سبب بن سکتی ہے۔ عبداللہ بن مسعود کا کہنا ہے۔ کہ نیت پر کسی جگہ بھی مواخذہ نہیں۔ جب تک کہ یہ نیت عمل کی صورت اختیار نہ کرلے۔ لیکن یہ مقام ایسا ہے۔ کہ یہاں بُری نیت پر بھی گرفت ہے۔ استدلال اس آیت سے :

ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم۔ (الحج - ۲۵)

اور جو اس میں شرارت سے کجروی کرنا چاہے۔ اُس کو ہم درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

یعنی مجرد ارادہ بھی اگر صحیح نہیں تو باز پرس کی مستحق ہے۔

حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے۔

ان اذنب سبعین ذنبا بوکیۃ احب الی من ان

میں رکیہ میں رہ کر ستر گناہ عمل کا ارتکاب کر ڈالوں۔ یہ میرے لیے نسبتۃً زیادہ پسندیدہ

اذنب ذنبا واحدا بمکۃ ۔ — ہے لیکن یہ گوارا نہیں کہ مکہ میں رہ کر ایک گناہ بھی سرزد ہو۔

رکیہ طائف و مکہ کے مابین ایک منزل کا نام ہے ۔ جہاں انھوں نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔

ان تصریحات سے یہ نہ سمجھنا چاہیے ۔ کہ اگر کوئی شخص بیت اللہ کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے ۔ اور ان تمام لطائف و ظائف کا خیال رکھتا ہے، جن کا ذکر ہوا تب بھی یہاں قیام مناسب نہیں ۔ بلکہ اگر کوئی شخص مکہ میں رہتا بھی ہے ۔ اور اس کی برکات سے بہرہ مند بھی ہے ۔ تو اس سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہے! یہی وہ حقیقت ہے ۔ جس کی طرف آں حضرت نے اشارہ کیا ہے ۔

انك لخير ارض الله و احب بلاد الله تعالیٰ الی ولولا انی اخرجت منك لما اخرجت — اے مکہ! تو اللہ تعالیٰ کی بہترین اور محبوب ترین سرزمین ہے ۔ اور اگر مجھے یہاں سے زبردستی نکالا نہ جاتا تو میں نکلنا گوارا نہ کرتا ۔

مدینے کے فضائل

دیارِ حبیب کی برکتیں مکہ مکرمہ کے بعد مدینہ سے بڑھ کر خیر و برکت کی اور کوئی جگہ نہیں - اس میں اعمال و حسنات کا درجہ کہیں زیادہ ہے آں حضرت نے نماز کے بارہ میں فرمایا ہے :

صلوٰۃ فی مسجدی ھٰذا	میری اس مسجد میں ایک نماز پڑھ لینا دوسری
خیرٌ من الف صلاۃ فیما سواہ	مسجدوں میں ہزار نماز پڑھنے سے بھی بہتر ہے -
الا المسجد الحرام - (۱)	ہاں مسجد حرام کا درجہ اس سے بھی زیادہ ہے -

اور یہ خصوصیت صرف نمازوں کو ہی حاصل نہیں اس میں کا ہر ہر عمل اور ہر ہر نیکی المضاعف اجر چاہتی ہے - مزید برآں یہاں رہ جانے اور زندگی گذارنے میں جو لطف ہے - آنحضرت نے اس کی طرف خصوصیت سے ارشاد فرمایا ہے -

من استطاع ان یموت	جو مدینہ میں تمام عمر رہ سکتا ہے اسے رہنا
بالمدینۃ فلیمت فانہ ان یموت	چاہیے - کیونکہ جو کوئی بھی اس سرزمین میں مریگا
بہا احسن الا کنت لہ شفیعا	میں قیامت کے روز اس کی سفارش کروں گا -
یوم القیامۃ - (۲)	

بیت اللہ، مدینۃ الرسول اور مسجدِ اقصیٰ کے فضائل تو احادیث میں آئے ہیں - اور باقی مقامات کا ذکر نہیں - اس کے یہ معنی ہیں - کہ وہ سب درجہ و رتبہ میں مساوی

---

(۱) متفق علیہ -

(۲) ترمذی -

ہیں۔ اور کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ ایسے اسلامی سرحدات اور مقامات کے جہاں مجاہدین کی نگرانی اور سرگرمیاں ہوں البتہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ ان جگہوں میں جہاد کی تیاری کرنا اور رہنا مدینہ سے افضل شمار کیا جائے گا۔

باقاعدہ سفر کی صعوبتوں کو جھیل کر کہاں کہاں جانا چاہیے۔ اس سے متعلق آنحضرت کا ارشاد ہے۔

حدیثِ شدِّ رحال کی تشریح اس میں مشاہدِ انبیاء اور مقابرِ اولیاء داخل نہیں

لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد۔ المسجد الحرام و مسجدی ھٰذا والمسجد الاقصٰی

(تین مسجدوں کے علاوہ شدِ رحال منع ہے۔ مسجد حرام، میری یہ مسجد اور مسجد اقصیٰ)۔

اس سے بعض علماء نے یہ سمجھا ہے۔ کہ بڑے بڑے مشاہد اور انبیاء و صلحاء کے مزارات بھی اسی میں داخل ہیں۔ لہٰذا ان کی زیارت کے لیے جانا بھی ناجائز ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث کا مقصد صرف یہ بتانا ہے۔ کہ سوا ان تین مساجد کے اور کسی مسجد کی طرف زیارتِ اجر کی غرض سے رُخ کرنا اس بناء پر ممنوع ہے۔ کہ چاہے وہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہوں۔ رُتبہ و درجہ میں تو بالکل برابر ہی ہیں۔ اس لیے خصوصیت سے ان کو مقصودِ سفر قرار دینے سے فائدہ؟

رہے بڑے بڑے مشاہد یا اتقیاء و صلحاء کے مقابر کی زیارت تو اس کا اس حدیث سے کیا تعلق! جب کہ زیارتِ قبور خود مامور بہ ہے۔

کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا و لا تقولوا ھجرًا۔ (۲)

پہلے میں نے تمہیں قبروں پر جانے سے روکا تھا۔ لیکن اب تم جاسکتے ہو مگر اس شرط کے ساتھ کہ نامناسب کلمات استعمال نہ کرو۔

---

(۱) متفق علیہ۔ (۲) مسلم۔

پھر غور طلب یہ نقطہ ہے کہ دنیا بھر کی مسجدیں تو سب اجر و ثواب میں برابر ہیں اور تمام شہروں اور قصبوں کا بھی یہی حکم ہے۔ یعنی سب شہر اللہ کے شہر اور سب قصبے اللہ کے قصبے ہیں۔ اس لیے یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں۔ کہ کوئی مسلمان ایک شہر سے چلے۔ زحمت سفر برداشت کرے۔ اور کسی دوسرے شہر کی مسجد میں عبادت کی غرض سے پہنچے۔ لیکن مشاہد اس حکم میں داخل نہیں۔ کیونکہ ان میں کا ہر ہر مشہد برکت و سعادت کے اعتبار سے مختلف ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰ اور یحییٰ علیہم السلام میں جو مرتبہ و درجہ کا تفاوت ہے وہی تفاوت ان کے مزارات کی زیارت میں ہے۔

جب یہ ثابت ہوگیا۔ کہ اس حدیث کو مزاراتِ انبیاء پر چسپاں کرنا درست نہیں اور بدرجۂ غایت محال ہے۔ تو علماء و صلحاء کی قبروں کی زیارت بھی ممنوع نہ ٹھہری۔ یہاں تک تو شدِ رحال اور سفر کا بیان تھا۔

سوال یہ ہے کہ اپنے شہر یا قصبہ کو چھوڑ

ترکِ وطن اور اختیارِ وطن میں دینی مصلحتوں کو ترجیح دینا چاہیئے!

کر کہیں دوسری جگہ رہائش کے لیے جانا، یا مقیم ہو جانا کیسا ہے؟ اگر سفر سے یہ مقصود نہیں کہ گھر سے باہر نکل کر علمی استفادہ کیا جائے تو ہر شخص کے لیے یہی موزوں ہے کہ اپنے ماحول کو ہرگز نہ چھوڑے۔ بشرطیکہ اس کا یہ ماحول اس کے حق میں سازگار ہو۔ اور یہاں رہ کر روح و فکر کے کسی زیاں سے دوچار نہ ہو۔

لیکن اگر اپنے اصلی وطن یا ماحول میں اس نوع کی سازگاریاں میسر نہیں تو پھر دوسری جگہ منتقل ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ دوسری جگہ کہیں ہو۔ اس کا انتخاب دینی لحاظ سے ہونا چاہیے یعنی دیکھنا یہ چاہیے۔ کہ یہ جگہ غیر معمولی چہل پہل اور شہرت تو نہیں رکھتی۔ یہاں رہنے

سے دین کے تقاضوں میں خلل تو پیدا نہیں ہو گا۔ اور دل کی فراغت اور یکسوئی کو نقصان تو نہیں پہنچے گا۔ اور یہاں رہ کر بندگی و عبادت کے مواقع تو خوب خوب ملیں گے

حدیث میں ہے۔

البلاد بلاد الله عز وجل والخلق عباد الله فای موضع رأیت فیه رفقا فاقم واحمد الله تعالیٰ۔	شہر سب اللہ کے شہر ہیں۔ اور مخلوق سب اللہ کی مخلوق ہے۔ سو تمہیں جہاں بھی سہولت ہو وہیں رہو لیکن اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش میں لگے رہو۔

ایک اور جگہ روایت ہے۔

من بورك له فی شیٔ فلیلزمہ ومن جعلت معیشة فی شیٔ فلا ینتقل عنہ حتی یتغیر علیہ	جس کسی کے لیے کوئی شے بابرکت ثابت ہو۔ وہ اس کو چھوڑے نہیں۔ اور جب کسی کے لیے معیشت کی کوئی صورت مقرر کر دی گئی ہو

تو اس سے وہ دست کش نہ ہو، جب تک کہ معیشت کی یہ صورت خود بخود بدل نہ جائے۔

ترکِ وطن اور سفیان ثوری

سفیان ثوری کے بارہ میں روایت ہے۔ کہ ایک مرتبہ کندھوں پر تھیلا رکھے اور ہاتھوں میں جوتا اٹھائے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ کہ اتنے میں کسی نے پوچھ لیا۔ کہاں کے ارادے ہیں۔ کہا کہ ایک ایسے گاؤں کا قصد ہے جہاں چیزیں نسبۃً ارزاں ہوں۔ کہا گیا کہ آپ کو بھی یہ فکر لاحق ہے؟ جواب میں کہنے لگے۔ کیوں نہیں۔ تمہیں ہمیشہ ایسی جگہ رہنا چاہیے جہاں بطن و معاش کے تقاضوں کے لیے کم از کم جد و جہد کرنا پڑے۔ جہاں ہموم و افکار کی یلغار برائے نام ہو، تم اپنے دینی مطالبوں کو آسانی سے پورا کر سکو جہاں تمہارا دین محفوظ رہے اور جہاں کھانے اور پینے کی ادنیٰ خواہشات دین کی سلامتی پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

اسی طرح کا ایک اور قصّہ بھی ان سے متعلق مشہور ہے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ میں اب تک یہ طے نہیں کر سکا۔ کہ کہاں رہوں۔ ایک صاحب نے خراسان کا ذکر کیا۔ فرمایا۔ وہ تو مذاہب فاسدہ اور آرا مختلفہ کا مرکز ہے۔ ان سے کیونکر نمٹ سکوں گا۔ ایک نے کہا۔ شام کو کیوں نہ مشرف فرمائیے۔ کہنے لگے۔ اس میں شہرت کی وجہ سے مجھ پر انگلیاں اُٹھیں گی۔ اور اسی سے میں گھبراتا ہوں۔ پھر کسی نے عراق کا نام لیا۔ اس پر اُن کا یہ اعتراض تھا۔ کہ جگہ بے شک عمدہ ہے مگر امراء و سلاطین اور بڑے بڑے جبابرہ کا مسکن ہے۔ وہاں ضعیفوں اور درویشوں کا کیا کام۔ آخر میں مکہ معظمہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی۔ تو اُن کا کہنا تھا۔ کہ وہاں کی عظمت و برکت کے کیا کہنے مگر گرانی ایسی ہے کہ جیب اس کی متحمل نہیں۔ اور گرمی اور تمازت کا یہ عالم ہے کہ مجلس کر رکھ دے۔

حج کے آداب اور اس سے متعلقہ اسرار

حج کے متعدد آداب ہیں۔ ان کا ملحوظ و مرعی رکھنا نہ صرف ضروری ہے۔ بلکہ ان کے بغیر کوئی شخص اگر چاہے بھی تو اس کی روح سے اور کیفیتوں سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اس طرح کی یکسوئی کہ دل ہمہ تن ذکر و تعظیم شعائر میں مصروف رہے

اول :- نفقہ اور زادِ راہ بہرحال حلال و طیب ہونا چاہیے۔ اور اپنے کاروبار اور سفر و رفیقوں سے کچھ اس طرح فراغت حاصل کرکے روانہ ہونا چاہیے کہ دل میں کوئی تشویش اور فکر نہ رہے۔ اور انسان پوری پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ کے ذکر اور تعظیم شعائر میں اپنا وقت صرف کر سکے۔ یہ اس لیے کہ عموماً مختلف نیتوں اور مقاصد کو لیے ہوئے لوگ حج کا قصد کرتے ہیں اور ان مقامات میں پہنچکر بھی دنیا کی طرف سے یکسو نہیں ہو پاتے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے۔

اذا کان آخر الزمان خرج الناس الی الحج اربعة اصناف سلاطینهم للنزهة واغنیاؤهم للتجارة وفقراؤهم للمسئلة وقراؤهم للسمعة[1]

آخری زمانہ میں چار قسم کے لوگ حج کے ارادہ سے نکلیں گے سلاطین و امراء تو محض سیر و تفریح کی غرض سے، اغنیاء اور ارباب ثروت تجارت کو فروغ دینے کیلیے فقراء بھیک مانگنے کی خاطر۔ اور قاری و حفاظ ریا و شہرت کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کیلیے

(۱) ابو عثمان الصابونی نے کتاب المائتین میں ذکر کیا ہے۔

اس میں آنحضرت نے ان تمام اعتراضات کو بیان فرمایا ہے۔ جن کا تعلق سراسر دنیا سے ہے۔ اور جو اس درجہ مضر ہیں کہ ان سے چھٹکارا نہ حاصل کرنے کی صورت میں تقاضائے حج ہی سے دور ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اور اس مقصدِ عظیم ہی کے فوت ہو جانے کا ڈر ہے۔ جو ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے۔ بالخصوص اس شخص کو تو حج کی برکات سے قطعی محروم خیال کرنا چاہیے جو دوسروں کے لیے اجرت پر حج کرتا ہے۔ اور اس کو ایک طرح کا پیشہ سا بنا لیتا ہے۔ کیونکہ اس نے اُجرت کے ذریعہ دنیا کا سودا کرنا چاہا۔ اور ادنیٰ کے عوض اعلیٰ سے دست بردار ہونا گوارا کیا۔ اصحاب قلوب اور اربابِ ورع و تقوٰی نے اس نوع کی جسارت کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص ذاتی طور پر زادِ راہ نہیں رکھتا۔ اور اس نیت سے کسی دوسرے سے مانگ لیتا ہے کہ خود تو بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہونے کی سعادت حاصل کرے گا۔ اور حج میں اس کا نائب اور قائم مقام ہو کر گویا اس کا معاون اور مددگار ثابت ہوگا۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں اس نے دنیا کے ذریعہ آخرت کا معاملہ نہیں کیا، بلکہ دنیا کو آخرت کا وسیلہ ٹھہرایا ہے۔ اور یہ بالکل جائز ہے۔ ایسے ہی حج کے بارہ میں آنحضرت کا ارشاد ہے۔

یدخل اللہ سبحانہ بالحجۃ الواحدۃ ثلاثۃ الجنۃ الموصی لہا والمنفذ لہا ومن حج بہا عن اخیہ۔

اللہ تعالیٰ ایک ہی حج کے سلسلہ میں تین شخصوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ ایک وصیت کرنے والے کو، ایک اس کو جو اس وصیت کو پورا کرتا ہے اور ایک اس کو جو اپنے بھائی کی طرف سے حج کرتا ہے

اس شخص کی مثال ام موسیٰ کی سی ہے۔ کہ اس نے اپنے ہی بیٹے کو اُجرت پر دودھ پلایا۔ حالانکہ دودھ پلانا خود اس کے فرائض میں داخل تھا۔ اس بنا پر حج بدل کو ہم ناجائز نہیں کہتے۔ اور نہ مکروہ ہی جانتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مطلوب

اجرت، زادِ راہ اور دنیاوی آسائشیں نہ ہوں۔ بلکہ خود حج ہو اور بیت اللہ کی زیارت ہو۔

زادِ راہ کی فراوانی تاکہ امورِ خیر میں دل کھول کر خرچ کر سکے

ثانی :۔ زادِ راہ میں فراوانی اور توسع کا خیال رہے۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے سلسلہ میں دل پر کسی طرح کی تنگی محسوس نہ کرے۔

بلکہ جہاں ضرورت محسوس ہو اسراف و تبذیر سے دامن بچاتے ہوئے بے خوف خرچ کرے۔ اسراف سے ہمارا مطلب ہے کہ کام و دہن کی تواضع میں اور عمدہ عمدہ کھانے پینے کی چیزوں پر تو بے جا صرف نہ کرے۔ یہ نہیں کہ فی سبیل اللہ اور امورِ خیر پر خرچ کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ کیونکہ اس معاملہ میں تو اصول یہ ہے کہ جتنا خرچ کیا جائے اتنا ہی بجا اور موزوں، یا رہ آور اور نتیجہ خیز۔ یعنی نیکی کے کاموں میں اسراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہی معنوں میں حضرت عمر کا قول ہے۔

من کرم الرجل نادۃ فی سفرہ۔ — زادِ سفر کا عمدہ اور زیادہ ہونا شرافت وکرم کی دلیل ہے۔

آں حضرت کا ارشاد ہے:

الحج المبرور لیس لہ جزاء الا الجنۃ فقیل لہ یا رسول اللہ ما بر الحج فقال طیب الکلام و اطعام الطعام (۱) — حجِ مبرور کی جزا جنت سے اِدھر اُدھر کوئی چیز نہیں۔ پوچھا گیا۔ یا رسول اللہ حج مبرور کیونکر ہوتا ہے؟ فرمایا بات چیت میں شائستگی ملحوظ رکھنے اور غریبوں کو کھانا کھلانے سے۔

فسق و فجور سے احتراز

ثالث :۔ بے ہودہ گوئی اور فسوق و جدال سے کلیۃً کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے

---

(۱) حاکم

مگر سوال یہ ہے کہ بے ہودہ گوئی کا اطلاق کن کن حرکات پر ہوتا ہے۔ یہ ایک جامع لفظ ہے۔ اِس میں ہر لغو اور فحش بات داخل ہے۔ حتیٰ کہ عورتوں کے بارہ میں جنسی گفتگو اور اُن کے حُسن و جمال سے متعلق اشارات و کنایات میں تغزل و دُبالنہ ذکر بھی ممنوع ہے۔ اور ایسی تمام باتیں اس کے دائرہ میں داخل ہیں۔ جو نفسی ہیجان پر منتج ہوں۔ فسوق سے مراد ہر وہ حرکت ہے جو اطاعتِ الٰہی سے روگردانی پر مجبور کرے۔ اور جدال کہتے ہیں لڑائی جھگڑے میں مبالغہ کرنے کو۔ اور ہر اُس خصلت اور اقدام کو جس سے حسد و کینہ کے جذبات اُبھریں۔ اور طبیعت کی یکسوئی اور اطمینان جاتا رہے۔ نیز انسان حسنِ اخلاق کی نعمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ حضرت سفیان کا قول ہے۔

من رفث فسد حجّه ، جس نے بیہودہ گوئی سے کام لیا۔ اس کا حج باطل ہوگیا۔

آں حضرت نے بات چیت اور باہمی گفتگو میں شائستگی کو اتنا اہم قرار دیا ہے کہ اس کے بغیر حج پروان نہیں چڑھتا۔ اور نہ اس کے اعلےٰ تقاضے ہی پورے ہوتے ہیں۔ اِس لیے حجاج پر لازم ہے کہ اپنے رفقائے سفر کے ساتھ بدرجۂ غایت نرمی سے پیش آئیں۔ ان پر اعتراض نہ کریں۔ اور نہ کوئی ایسی بات کہیں کہ جس سے اُن کے دل آزردہ ہوں۔ یہی نہیں ہر نوع کی اذیت کو برداشت کریں۔ اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ کہ حُسنِ خلق اسی برتاؤ کا متقاضی ہے۔

سفر کی وجہ تسمیہ اور حضرت عمرؓ کا حکیمانہ قول انسانی اخلاق کا حقیقی پیمانہ سفر ہے

بعض اہلِ لغت کا کہنا ہے کہ سفر (جس کے معنے واضح ہونے کے ہیں) سفر اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس میں

انسان اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور تصنع اور بناوٹ کے پردے چاک ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا دورانِ سفر میں ساتھیوں کے ناگوار اور نامرغوب طرزِ عمل سے گھبرا نہیں جانا چاہیے۔ بلکہ حتی المقدور ان کو برداشت کرنا چاہیے۔ اس موضوع پر حضرت عمر کی یہ بات کس درجہ حکیمانہ ہے۔ کہ سفر اخلاق و مروت کا بہترین معیار ہے۔ ایک صاحب نے اُن کے سامنے کسی شخص کے مکارمِ اخلاق کی بہت تعریف کی۔ اس پر آپ نے فرمایا:

هل صحبته في السفر — کیا تمھیں اس کے ساتھ سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔

اُس نے کہا۔ جی نہیں۔ آپ نے فرمایا۔
"تب تو اُس کو ٹھیک ٹھیک نہیں پہچان پایا۔"

رابع:۔ **مناسکِ حج پیدل چل کر طے کرنا چاہئیں** — مناسکِ حج پیدل چل کر طے کرے۔ اور سواری سے حتی الامکان کنارہ کش رہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔

يا بنى حجوا مشاة — اے میرے بچو! حج کرو تو پیدل چل کر

کیونکہ اس میں ثواب زیادہ ہے۔ بالخصوص جب کلام سنا جاتا ہے اور وہاں سے واپس آنا ہو۔ تو پیدل ہی چلنا چاہیے۔

حضرت عمر، علی اور عبداللہ بن مسعود نے اسے اتمامِ حج سے تعبیر کیا ہے۔

واتموا الحج والعمرة لله۔ (البقرہ - ۱۹۶) — اور خدا کی خوشنودی کے لیے حج و عمرہ کو پورا کرو۔

بعض علماء کی یہ رائے ہے۔ کہ سواری کا اہتمام افضل ہے۔ اس لیے کہ اس میں بہرحال کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس لیے بھی اس سے سکونِ قلب کی نعمت میسر

رہتی ہے۔ اور طبیعت میں سفر کی مشکلات سے کد نہیں پیدا ہوتا۔ ہمارے نزدیک اس میں اور پہلی صورت میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہاں ایک باریک فرق ہے۔ جسے ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ اگر پیدل چلنا آسان ہو۔ تو اس کے افضل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور اگر اس سے ضعف اور نقاہت بڑھے تب سواری کا انتظام کر لینا بہتر ہے۔ جیسے کہ مسافر کے لیے روزہ افضل ہے مگر مریض کا یہ حکم نہیں۔ وہ اس صورت میں اس کی برکات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جب کہ اس سے کسی مضرت کے لاحق ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

سواری کی شکل میں محمل و ہودج کی ممانعت اور اس کا فلسفہ۔ اس کا تعلق امراء و سلاطین سے ہے

خامس:۔ سوار ہو تو اونٹ پر محمل و ہودج کی قسم کی کوئی چیز نہ ہو۔ اس میں دو مصلحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ناقہ یا اونٹ کو خواہ مخواہ زحمت میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے۔ اور اس پر غیر ضروری بار نہیں لادنا چاہیے۔ کہ شفقت علی خلق اللہ کا یہی تقاضہ ہے۔ دوسرے آراستہ و پیراستہ محمل و ہودج کی رسم امراء و اغنیاء کے تکلفات اور تہذیب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے اس سے احتراز ضروری ہے۔ آنحضرت کے بارے میں احادیث میں آتا ہے۔

حج رسول اللّٰہ علی راحلۃ وکان تحتہ رحل رث وقطیفۃ خلقۃ قیمتہا اربعۃ دراهم

آپ نے ناقہ پر حج کیا۔ لیکن اس حال میں کہ اس پر جو کجاوہ رکھا تھا وہ پرانا اور بوسیدہ تھا اور اس کے نیچے کا جو نمدہ تھا اس کی قیمت چار درہم سے کیا زیادہ ہوگی؟

(۱)

بعض علماء کی رائے میں تفاخر کی یہ بدعت حجاج کی رائج کردہ ہے۔ اس نے سب سے پہلے محمل زریں اور پر تکلف ہودج کا استعمال کیا۔ اگرچہ اس کے عہد پر آشوب

میں بھی اس بدعت کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں ہو پائی۔ سفیان ثوری کے والد ماجد کا کہنا ہے کہ میں کوفہ سے حج کی غرض سے نکلا۔ اور قادسیہ تک برابر دیکھتا رہا۔ راستے میں بہت سے اغنیاء ملے۔ اور کئی قافلوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ لیکن ان سب میں دو محملوں کے سوا اور کوئی محمل نظر نہیں آیا۔

عبداللہ بن عمر نے ایک غریب حاجی کو دیکھا کہ خود سامان کے بورے اٹھائے ہوئے چلا آرہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کو حجاج کے تنزل و اہتمام کے باوجود زیادہ اجر ملے گا۔

وضع قطع میں سادگی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور تفاخر و زینت سے بچنا چاہیے

سادس :- حج کے لیے نکلے تو ایسے لباس میں اور وضع میں کہ جس میں پر زینت و تفاخر نہ پایا جائے۔ بلکہ اگر لباس دریدہ، بال پریشان اور چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا ہو تو یہ انداز اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور اگر ٹھاٹھ اور سج دھج کو قائم رکھتا ہے۔ تو یہ خطرہ ہے کہ کہیں زمرۂ متکبرین میں نہ لکھا جائے۔ اور صلحاء و مساکین کے گروہ سے خارج نہ کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے آنحضرت نے تصنع اور تکلف سے منع کیا ہے۔ اور آشفتہ حالی اور ننگے پاؤں چلنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ وضع اس درجہ پسند ہے کہ اس پر یہ کہہ کر فرشتوں کو متوجہ کرتا ہے۔

انظروا الی زوار بیتی و قد جاءونی شعثا غبرا من کل فج عمیق۔

میرے گھر کے زائرین کو دیکھو کہ کس طرح آشفتہ اور غبار آلود حالت میں دور دراز کی مسافت طے کرکے میرے پاس آئے ہیں۔

اسی مناسبت کے پیش نظر حضرت فاروق نے امراء جنود کو خصوصیت سے ہدایت کی۔

اخلولقوا واخشوشنوا۔ — پُرانی چیزیں استعمال کرو اور موٹا جھوٹا پہنو

مناسک کے سلسلہ میں جانوروں سے تلطف اور نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیئے

سابع :- جانور کے ساتھ نرمی اور تلطف کا برتاؤ کرے۔ یعنی نہ اس پر اتنا بوجھ لادے جو اس کی استطاعت سے باہر ہو۔ اور نہ اس کو استراحت اور سونے کی غرض ہی سے استعمال کرے۔ کیونکہ اس سے بھی اس کو تکلیف پہنچتی ہے۔ یہی سبب ہے اہلِ تقویٰ نے ہمیشہ اس سے گریز کیا ہے۔ یہ نہ تو اس پر سوتے ہیں۔ اور نہ زیادہ عرصہ تک اس پر سوار ہی رہتے ہیں۔ آنحضرت کا ارشاد ہے۔

لا تتخذوا ظهور دوابكم كراسي۔ — اپنے جانوروں کی پشت کو کرسیاں نہ تصور کرو۔

مسلمانوں کے دائرۂ الفت وحسنِ سلوک کی وسعتیں حیوانات سے برتاؤ کی عارفانہ مثالیں

جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کے کئی قصے مذکور ہیں۔ جو یاد رکھنے کے لائق ہیں۔ ایک بزرگ کے متعلق مروی ہے۔ وہ جب کرایہ پر جانور لیتے تو پہلے یہ طے کر لیتے کہ میں راستے میں کہیں اُتروں گا نہیں۔ پھر جب معاملہ طے ہو جاتا اور یہ سوار ہو چکتے تو راستے میں اُترتے ہوئے، اور جانور کو آرام پہنچاتے ہوئے چلتے، اس طرزِ عمل سے اُن کی غرض یہ ہوتی کہ جانور کو آرام پہنچانے کا ثواب اُن کے کھاتے میں لکھا جائے۔ کرایہ پر دینے والے کے کھاتے میں نہیں۔

ابو الدرداء کا اونٹ مرنے لگا تو اُنہوں نے کہا۔

يا ايها البعير لا تخاصمني الى ربك فاني لم اكن احملك — اے اونٹ! خدا کے ہاں میرے معاملہ کی شکایت نہ کرنا کیونکہ میں نے تم پر تمہاری

فوق طاقت ۔ قوت سے زیادہ بوجھ لادنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

عبداللہ بن المبارک کہیں جا رہے تھے ۔ ایک صاحب نے کہا میری یہ کتاب لیتے جائیے اور فلاں صاحب کو پہنچا دیجیے ۔ انھوں نے کہا ۔ مجھے اُونٹ والے سے مشورہ کر لینے دو ۔ اگر اُس نے اجازت دی ۔ تو میں لے جا سکوں گا ورنہ نہیں ۔

سفرِ حج میں بشاشت اور انشراحِ قلب کی کیفیتیں تازہ رہنی چاہیئیں

ثامن :۔ اثنائے سفر میں نفس و قلب کی بشاشت قائم رہے یہ مصارف سے طبیعت میں تکدر نہ پیدا ہو ۔ اور اگر مال یا قربانی کے جانور کے سلسلہ میں کسی قسم کا نقصان پہنچا ہو تو اس سے گھبرائے ۔ کہ یہ بھی قبولیتِ حج کے علائم میں ہے ۔ حج جہاد کی مانند ہے ۔ جس طرح اس میں ہر ہر قدم پر ثواب و اجر کی بارش ہوتی ہے ۔ اور اس راہ کے شدائد برکات کا موجب ہوتے ہیں ۔ ٹھیک اسی طرح اس میں بھی تکالیف و محن برداشت کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں امڈ آتی ہیں ۔ قبولیتِ حج کی ایک علامت یہ بھی ہے ۔ کہ حاجی اپنے رفقاء اور ساتھیوں کا جائزہ لیتے رہیں ۔ اور اگر دیکھیں کہ ان میں دین کا ذوق و شوق کم ہے ۔ اور محض دنیا طلبی ان کا مقصود ہے تو اُن کو چھوڑ دیں ۔ اور ایسے رفقاء تلاش کریں جو نیک اور صالح ہوں ۔ اسی طرح ایسی مجالس میں بیٹھنے سے احتراز کریں ۔ کہ جن میں لہو و لعب کا غلبہ ہو اور اُن کے بجائے نشست و برخاست کے لیے ایسے حلقے پسند کریں ۔ جن میں ذکر و بیداری کا چرچا ہو ۔

بحیثیتِ مجموعی حج کن کن اسرار و اعتبارات کا حامل ہے؟

سب سے پہلے حج کے متعلق سمجھنے کی چیز یہ ہے۔ کہ دین میں اس کی اہمیت اور مقام کیا ہے! پھر اس کے لیے طلب و ذہن میں شوق و عشق کی ایک دنیا پیدا کرنے اور لبسانے کا مسئلہ ہے۔ اس کے بعد عزم و ارادہ میں تحریک پیدا کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ پھر یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے۔ کہ کون کون علائق ایسے ہیں جو راہ میں مانع ہیں۔ اور ان پر قابو پانے اور ان سے رستگاری حاصل کرنے کا کیا طریق ہے۔ پھر جب یہ ابتدائی منزلیں طے ہو چکیں۔ تو پھر احرام کا کپڑا خرید ا جائے زادِ راہ کا اہتمام کیا جائے۔ اور یہ دیکھا جائے، کہ راحلہ یا سواری کا کیا بندوبست ہوگا۔ اس کے بعد اللہ کا نام لے کر بس چل کھڑا ہونا چاہیے۔ اور بادیہ پیمائی کے لیے طیار ہو جانا چاہیے۔ جب میقات کا سامنا ہو تو احرام باندھنا چاہیے۔ اور تلبیہ کا التزام کرنا چاہیے۔ پھر اس مرکزِ شوق یعنی مکہ مکرّمہ میں پہنچکر ان تمام افعال کو پورا کرنا ضروری ہے۔ جو کتبِ حدیث و فقہ میں مذکور ہیں۔

یہ سب امور حج کے لوازم ہیں۔ اور ان میں ایک ایک ایسا ہے کہ اس میں تذکرہ و عبرت کے نشان ہیں، تنبیہہ و اشارہ کے علائم ہیں۔ شرط یہ ہے کہ طبیعت نصیحت پذیر رہے۔ ارادہ صادق اور مخلص ہو۔ اور ذہانت و فطانت سے بہرہ وافر ملا ہو۔ چند لفظوں میں اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم اس کے اسرار کے بارہ میں کچھ اصولی اور بنیادی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ ان کی اہمیت اگر سطحِ ذہن پر مرتسم ہو گی۔ تو بقیہ تمام اسرار و رموز کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔

حج یا منزلِ شوق کی اولیں منزل نصب العین کی تعیین، وصول الی اللہ کی اہمیت

اب اِس سلسلہ کی بنیادی چیز حج کے مقام و موقف کی وضاحت ہے۔ اور اس وضاحت کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ کہ پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ کہ ہماری ساری دینی جد و جہد اور تگ و تاز کا مقصد وصول الی اللہ ہے۔ پھر جب یہ حقیقت اچھی طرح ذہن میں آ جائے۔ تو وصول الی اللہ کے اُس طریق کا سُراغ لگانا چاہیے جس پر چل کر ہر ہر دور میں اتقیاء و صلحاء کامیابی و کامرانی کی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔ جب اِس نقطۂ نگاہ سے حقیقتِ ادیان کا کھوج لگایا جائے گا۔ تو یہ بات نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ کہ یہ نعمت بجز شہوات و خواہشاتِ نفسانی سے کنارہ کش ہونے کے حاصل ہونے والی نہیں۔ جس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہے کہ جب تک کوئی شخص تکلفات سے ہٹ کر ضروریات پر قناعت اختیار نہیں کرتا اور اپنی تمام حرکات و سکنات کا رُخ اللہ کی طرف نہیں پھیر دیتا۔ اُس وقت تک اِس رُتبۂ بلند پر فائز نہیں ہو سکتا۔

یہی وہ نکتہ تھا کہ جس کی طرف گذشتہ اُمتوں کا ذہن منتقل ہوا۔ اور اُنھوں نے وصول الی اللہ کی خاطر دنیا کے اسباب و وسائل کو یکسر تج دیا۔ اور پہاڑوں اور جنگلوں کی راہ لی۔ اور مخلوق سے اگرچہ بیزار ہوئے۔ مگر خالق سے اُنس و محبت کے رشتوں کو استوار کر کے رہے۔ یہی وہ عابد و زاہد ہیں۔ کہ قرآن نے جن کی تعریف فرمائی ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔

یہ اس لیے کہ اُن میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

(مائدہ - ۸۲)

ان لوگوں نے آخرت کی راہ میں بڑے بڑے مجاہدے کیے مشقتیں جھیلیں، اور اللہ کی محبت میں نفس کی ہر ہر لذت کو چھوڑا۔ اور تکلیف و آسائش کی ہر ہر صورت سے انحراف کیا۔

پھر ایک دور ایسا آیا۔ کہ اخلاص و تجرد کے یہ جذبات سرد پڑ گئے خشوع و خضوع کا یہ طریق اپنی افادیت کھو بیٹھا۔ اور اللہ کی مخلوق اس کی ذات و صفات کی طرف رجوع ہونے کے بجائے شہوات و خواہشات پر ٹوٹ پڑی اس وقت شان ربوبیت نے اصلاح و ہدایت کے لیے آنحضرت کو مبعوث فرمایا۔

کیا وصول الی اللہ کے لیے رہبانیت کا طریق اختیار کرنا چاہیے؟

اسلام میں رہبانیت کا بہترین بدل حج و جہاد ہے

آپ کے سامنے بھی چونکہ یہی نصب العین تھا۔ کہ خلق اللہ کو از سر نو طریق آخرت پر گامزن ہونے کی دعوت دی جائے۔ اور انبیاء و رسل کے سنن کو تازہ کیا جائے۔ اس غرض کے لیے آپ نے اسلام کے نام سے ایک لائحۂ عمل پیش کیا جس سے یہ نصب العین بخوبی طرح پورا ہو سکتا تھا۔ لیکن کیا یہ لائحۂ عمل پہلوں کی طرح رہبانیت لیے ہوئے تھا! نہیں۔ یہ مجاہدہ و عمل کی ایک دوسری ہی صورت تھی۔ جو ترکِ دنیا سے بہت مختلف تھی۔ چنانچہ آپ سے پوچھا گیا۔ کہ آپ کے دین میں سفر و بادیہ پیمائی کی اجازت ہے۔ اور آپ دنیا سے علیحدگی اور رہبانیت کو جائز سمجھتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا۔

ابدلنا اللہ بہا الجہاد والتکبیر علی کل شرف۔	اللہ نے رہبانیت کے بدلے ہمیں جہاد و حج کی نعمتوں سے مشرف فرمایا ہے۔

سیاحت و جنگلوں میں گھومنا پھرنا جو رہبانیت کا ایک ضروری جزو ہے اس کے بارہ میں ارشاد فرمایا:

هم الصائمون - میری امت کے سیاح روزہ رکھنے والے ہیں -

گویا اللہ تعالیٰ نے کمال مہربانی سے اُمت کو رہبانیت کے شدائد سے بچا لیا ہے۔ اور اس کے عوض وہی اجر، وہی ثواب اور وہی اخلاص و یکسوئی اور وہی ایثار حج کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ بیت عتیق کو اپنی ذات پر دلالت کناں ٹھہرایا اور اپنے بندوں کو حکم دیا۔ کہ اس کو اپنا مقصود اور منزل سمجھیں۔ اور شوق و ذوق سے دور دراز کا سفر طے کر کے اور سفر کی صعوبتیں جھیل کر پہنچیں۔ اور اس کی زیارت و طواف سے بہرہ مند ہوں۔ پھر اس کے تمام گرد و پیش کو حرم قرار دیا۔ اور شکار وغیرہ کی ممانعت کی۔ اور حاضری کے لیے اسی طرح کی وضع و کیفیت اور ادب و احترام متعین کیا۔ جو زائرین بڑے بڑے بادشاہوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ دل میں اس کی جلالت، قدر اور عظمت کا نقش بیٹھے۔ اور دل میں اپنی عاجزی، انکسار اور عبودیت کا احساس نشو و نما پائے۔

کعبہ پر بیت اللہ کا اطلاق بطور رمز و اشارہ کے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی صمدیت کا کون احاطہ کر سکتا ہے!

بیت اللہ کے متعلق اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کہ رمز و اشارہ کے طور پر یہ مقصود و نصب العین ہے تاکہ شوق و وارفتگی کی کیفیات کو اس کی وجہ سے ابھارا جا سکے لیکن اس سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ کہ ذاتِ خداوندی کو کوئی چار دیواری ٹھیرا یا ہے۔ یا کوئی شہر اس کی صمدیت کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اعمالِ حج میں اصل شے اپنی عبودیت اور غلامی کا غیر مشروط طور پر اعلان ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان میں کی بعض چیزیں ایسی ہیں جو بظاہر عقل و فکر کی گرفت میں آنے والی نہیں۔ یہی نہیں نفس و قلب کو ان سے کسی طرح کی موافقت اور دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔ صفا و مروہ

کے درمیان سعی یا رمی جمار ایسی رسمیات اسی قبیل سے ہیں۔ ان کی تہ میں بجز اطاعت وفرماں برداری اور بجز عبودیت وغلامی کے اقرار واعتراف کے اور کوئی حقیقت مضمر نہیں۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیجیے۔ کہ دوسری تمام عبادات ایسی ہیں کہ ان میں نفس و روح کی دلچسپی کا اچھا خاصا سامان موجود ہے۔ مثال کے طور پر روزہ کو لیجیے۔ اس میں اگرچہ ایک گونہ کلفت پائی جاتی ہے۔ لیکن تسکین کا یہ عظیم پہلو بھی تو موجود ہے۔ کہ اس سے شہوات کا زور ٹوٹتا ہے۔ یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور نفس انسانی خواہشات وجذبات کی سطح سے اونچا اٹھتا۔ اور ملکیت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اسی طرح نماز کو دیکھیے کہ اس میں رکوع وسجود کی کیفیتیں کس درجہ پر معنی ہیں۔ ان سے تواضع کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا تصور ابھرتا ہے۔ ظاہر ہے۔ یہ تمام کیفیتیں ایسی ہیں۔ کہ دل ودماغ ان سے مانوس ہے۔ بخلاف صفا ومروہ کے درمیان دوڑنے اور جمرات کو کنکریاں مارنے کے کہ ان میں نفس وقلب کے لیے دلچسپی کا بظاہر کوئی سامان نہیں۔

رسمیات حج کا فلسفہ

عبادت کی یہ نوعیت جو عقل ودانش کی گرفت میں نہ آسکے اس لیے اسلام نے ضروری ٹھہرائی۔ تاکہ انسان میں اطاعت محض کا تصور پیدا کیا جائے۔ اور اسے بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے اتباع وفرمانبرداری میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے۔ جہاں عقل وادراک کی رہنمائی سے دستکش ہونا پڑتا ہے۔ اور ایک کام صرف اس لیے انجام دینا پڑتا ہے۔ کہ پروردگار کو پسند ہے۔ مقصد یہ ہے۔ کہ انسان میں اللہ کی غلامی اس کی بندگی اور رقیت کے جذبات اس درجہ نمایاں ہوں۔ کہ وہ اس کی پکار اور دعوت پر، طبیعت ونفس کے رجحان کو نہ دیکھے، نہ عقل وفہم کے اشارات کا انتظار کرے۔ بلکہ خود اس دعوت، اس امتحان اور اس آزمائش میں اتنی لذت پاتے اور اتنی معقولیت اور وزن محسوس کرے۔ کہ

عقل وخرد کی تائیدات کی ضرورت ہی نہ رہے۔ ادھر ندائے الٰہی کان میں پڑے اور ادھر بندۂ مطیع لبیک کہہ کر اطاعت پر کمربستہ نظر آئے۔ یہ اس لیے کہ اگر اطاعت وانقیاد کا یہ مقامِ بلند حاصل نہ ہوا۔ اور انسان عقل وبصیرت کی رہنمائیوں کا اسی طرح دست نگر رہا۔ اور نفس وطبیعت نے اسی آواز پر کان دھرا۔ اور اسی دعوت کو قبول کیا۔ تو پھر کمال عبودیت کا وہ مرتبہ تو حاصل نہ ہو سکا۔ جہاں اطاعت محض اطاعت کی خاطر، اور بندگی صرف بندگی کے لیے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ شرف مناسکِ حج کو بخشا ہے کہ اس کے ذریعہ اطاعت کے اس تصور کی تکمیل ہو جائے جس میں عقل وفکر کی مجبوریوں کو کوئی دخل نہیں۔ اور جو اللہ کے احکام کو بجائے خود اتنا مؤثر اور اس درجہ لائقِ توجہ قرار دیتا ہے۔ کہ سوائے ماننے اور عمل کرنے کے چارہ نہیں۔

مزید براں اسلام نے رسومِ حج اور مناسکِ حج کے سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ داعیاتِ عقل سے اس بے گانگی کو اس لیے بھی روا رکھا کہ انسانی اعمال کی سطح کو ہوائے نفس کی سطح سے اونچا رکھا جا سکے۔ اور اللہ کے بندوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے۔ کہ ان کی باگ اس اور اس کی زمام شریعت کے ہاتھ میں ہے عقل وخرد اور جذبہ وخواہش کے ہاتھ میں نہیں۔ تاکہ ان کی روزمرہ کی زندگی اسی اصول پر چلے اور اسی سانچے میں ڈھلے۔

داعیاتِ شوق کے تقاضے

یہ تو ہوا مناسکِ حج کے بارہ میں عمومی نقطۂ نظر جس سے کہ اس کی اہمیت ومقام کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس کے بعد شوق کا مرتبہ ہے۔ یعنی جب یہ فلسفہ ذہن کے ہر ہر گوشہ پہ استیلاء حاصل کرلے تو اب داعیاتِ شوق کو اکسانا چاہیے۔ اور یہ فرض کرنا چاہیے کہ پتھر کی یہ چاردیواری مالک الملک کا گھر ہے اور جو اس کے لیے دور دراز کی مسافتیں

طے کرکے آتا ہے، مال و دولت خرچ کرتا ہے، اور جان کو جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ اس دنیا میں وہ گویا لقائے الٰہی کا متمنی ہے۔ پھر جس درجہ اس دنیا میں یہ خیال قلب و ذہن پر قابو پائے گا۔ اور اللہ تعالےٰ سے ملاقات کرنے اور اُسے دیکھنے کا جذبہ بڑھے گا۔ اُسی نسبت سے دار الجزار میں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے بہرہ مند ہوگا۔ یوں اس کی رحمتیں یہاں بھی بے تاب ہیں۔ اور یہاں بھی جلوہ فرمائی سے کسی طرح سے دریغ نہیں۔ مگر آنکھیں کہاں ہیں جو دیکھ سکیں۔ اور اس کے جمالِ جہاں سوز کی تاب لا سکیں۔

دیکھنے کا یارا اور دید کی صلاحیتیں تو صرف اُس وقت پیدا ہوں گی۔ جب سُرمۂ شوق آنکھوں کو جِلا بخشے گا۔ اور اُس کے گھر کی زیارت اور لقار سے دل سرور حاصل کرے گا۔ حج بیت الحرام تو اس کی ذات اور اُس کی محبت سے ایک گونہ تعلق کا نام ہے۔ اور عاشق صادق جب اس تعلق میں پختہ ہوگا۔ اور بایں شوق اور بایں داعیہ اس کا طواف کرے گا۔ اور لبیک لبیک کی صدائیں بلند کرے گا۔ اور سمجھے گا کہ دیارِ محبوب کے گرد گھوم رہا ہے۔ اور اس کی گلی کوچے کی سیر میں حیران و سرگردان ہے۔ تو یہ نسبتِ شوق، دارِ آخرت میں اُس کی رہنما ہوگی۔ اور حسب وعدہ یہ دیدار و لقار سے سرفراز ہو کر رہے گا۔

جب شوق کا یہ مرحلہ طے ہو جائے گا۔ اور دل و دماغ اس کی شمیم انگیزیوں سے معطر ہو جائے گا۔ تو اس کے بعد پھر عزم اور اس کے تقاضوں کا درجہ ہے۔

شوق کے بعد عزم مگر یہ عزم کیا ہے؟ یہ نام ہے تجدیدِ اخلاص کا یعنی اس داعیہ کا، کہ ایک حاجی بیت اللہ کے مقصد و ارادہ سے نکلے اور اہل و عیال اور وطن

کی مفارقت برداشت کرے۔ تو یہ سمجھ لے کہ اس کے سامنے ایک مقصد ہے اور اس عظیم مقصد کو کسی قیمت پر بھی یہ ریا و شہرت کی آلائشوں سے داغدار نہیں ہونے دیگا۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کیا برائی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص گھر سے تو بظاہر اس نیت سے روانہ ہو۔ کہ کعبہ تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ اس کی حرمت و احترام کو قائم رکھنا ہے۔ اور اس کی زیارت سے دیدہ و دل کی ٹھنڈک کا سامان مہیا کرنا ہے۔ مگر بباطن مقصود کوئی دوسری ہی شئے ہو۔ حج کے معاملہ میں یہ ریاکاری، اس کے سارے اجر کو برباد کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے اس سے احتراز ضروری ہے۔

قطع علائق کی منزل اور زادِ راہ کی نوعیت

آخر میں قطع علائق کی نوبت آتی ہے اور قطع علائق کے یہ معنی ہیں کہ انسان تمام واجب الادا چیزوں کی طرف سے یکسو ہو جائے۔ اور جو جس کو دینا ہے دیدے اور جو لوٹانا ہے لوٹا دے۔ اور ہر ہر معصیت سے تائب ہو کر حج بیت اللہ کا قصد کرے۔ کیونکہ اگر کوئی واجب الادا شئے ادا نہ ہوئی۔ یا ہر ہر برائی سطح دل سے نہ مٹی۔ اور شوقِ معصیت کا وہی عالم رہا۔ تو پکارنے والا پکار کر کہے گا۔ ظالم! تو مالک الملک کے دربار میں حاضری دینے کی غرض سے پا بہ رکاب ہے۔ اور اپنے اجر و ثواب کی ساری پونجی یہیں ضائع کر دینے پر تلا بیٹھا ہے۔ کیا دل کی اس کیفیت پر تمہیں شرم نہ آئے گی۔ کہ اس حال میں اس کے حضور اپنے کو پیش کرو۔ کہ دل نے ابھی علائق سے رستگاری حاصل نہیں کی۔ بلکہ گناہوں سے رغبت و شوق کے رشتے اسی طرح قائم ہیں۔ اور پیچھے کا خیال بھی بدستور دامن گیر ہے۔ اس صورت میں حج کی برکات تو کیا حاصل ہوں گی۔ بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ کہیں علاوہ مالی نقصان اور جسمانی تکالیف کے دربارِ خداوندی سے نکال باہر نہ کیے جائیں۔

مکمل قطع علائق کا یہ مطلب ہے کہ اس سفر کو سفرِ آخرت سمجھے۔ اور جو وصیت کرنا ہے کر جائے۔ کیونکہ کون جانتا ہے پھر مراجعتِ وطن کی نعمتیں حاصل ہونگی یا نہیں۔

یہاں تک جن منازل کا تعلق تھا وہ قلب و ذہن سے تعلق رکھتی ہیں جب یہ سب طے ہو چکیں۔ تو پھر زادِ راہ کی فکر کرنی چاہیے۔ اور اس میں اس پہلو کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ کہ یہ زادِ راہ سراسر حلال وطیب مال پر مشتمل ہو۔ ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ پھر یہاں ایک نکتہ اعتبار ہے۔ اور وہ یہ کہ جس طرح اس زاد کے سلسلہ میں ایسی ہی چیزیں عموماً منتخب کی جاتی ہیں۔ جو راستہ میں آب و ہوا کی تاثیر سے خراب نہ ہوں اور آخری منزل تک برقرار رہیں ٹھیک اسی طرح سفرِ آخرت کے لیے بھی ایسے ہی توشہ اور زاد کی حاجت ہے۔ کہ جو احوال قبر تک ساتھ دے سکے۔ اور ریا و شہرت کی آمیزشوں سے جس میں بگاڑ یا فساد کی بو نہ پائی جائے۔

سواری کا اہتمام۔ آخرت کی سواری لحم و شحم کی سواری نہیں، ایمان و اعمال کی سواری ہے

زادِ راہ کے بعد رحلہ یا سواری کی تلاش ہو گی جب سواری سامنے آئے۔ تو اللہ کا شکر ادا کرے۔ کہ اس نے یوں سفر کی آسانیوں کا اہتمام فرمایا۔ اور حیوانات کو اس کے تابع فرمان کرایا۔ اس مرحلہ پر بھی اسے اس خیال کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ کہ یہ سفر سفرِ عقبیٰ کی طرف ایک قدم ہے۔ یہ اس کی تمہید اور طیاری ہے پھر جس طرح سفرِ حج کے لیے ایک مضبوط اور مناسب سواری کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دورِ دراز کی اس مسافت کے لیے بھی ایک سواری چاہیے۔ جس پر اس کا جنازہ اٹھے۔ اور کامیابی و کامرانی سے اللہ کے دربار میں پہنچا یا جائے۔ مگر عقبیٰ کی

یہ سواری لحم و شحم کی سواری نہیں اور گوشت و پوست کی مرکب نہیں ۔ بلکہ ایمان و اعمال کی سواری ہے ۔ لہذا ہمیں ہر طرح اطمینان کر لینا چاہیے ۔ کہ اس کے اعمال و ایمان اس معیار اور انداز کے ہیں ۔ کہ اللہ کے ہاں اُسے سُرخروئی کے ساتھ پہنچا سکیں عقبیٰ اور آخرت کا یہ خیال اور تیاری ہر ہر منزل اور موڑ پر اس لیے ضروری ہے ۔ کہ اس سے ہر شخص کو دوچار ہونا ہے ۔ اور اس سے کسی صورت میں بھی مفر نہیں ۔ علاوہ ازیں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ حج کا یہ سفر یا دوسرے سفر تو محض مرتبہ شک ہی میں ہیں ۔ ہو سکتا ہے کوئی شخص بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہو ۔ اور ہو سکتا ہے کہ اونٹ پر سوار ہونے سے پہلے ہی کوچ آخرت کی نوبت آجائے ۔ پھر جب اس مظنون سفر کے لیے ایک گونہ طیاری اور اہتمام میں فکر و تردد ضروری ہے ۔ تو اس سفر کے لیے کہ جو قطعی اور یقینی ہے کیوں اہتمام نہ ہو ۔

احرام دراصل کفن ہے احرام کی چادریں خریدے تو کفن کا تصور دیدۂ عبرت کے سامنے لائیے ۔ اور کچھ اس طرح کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جائے ۔ کہ اسے اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے ۔ اور یہ لباس اسی حاضری کی تیاری ہے جس طرح حج کا یہ لباس عام ملبوسات سے مختلف ہے اور یہ وضع صبح و شام کے پہناوے سے الگ اور جُدا ہے ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں جانے کا بھی اسی نوع کا پہناوا ہے ۔ نہ جس کو سیا جاتا ہے اور نہ جو سوئی اور تاگے کا رہین منت ہے ۔

شہر سے نکلے تو یہ سمجھے کہ اس نے بال بچوں کی جو جدائی گوارا کی ہے ۔ احباب کو چھوڑا ہے ۔ اور گھر اور وطن کو خیرباد کہا ہے ۔ اس کی دنیاوی غرض کے لیے نہیں ۔ بلکہ محض اس مالک الملک کی خاطر اور یقین رکھے کہ یہ سفر دنیاوی سفروں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا ۔ یہ اپنے مقاصد، نصب العین اور جلالت قدر کے اعتبار سے

اِن سب پر فائق ہے۔ اس راہ کا راہی وہ ہے۔ جس کو پکارا گیا۔ اور اُس نے اس پکار کو دل کے کانوں سے سُنا۔ جس کے دل میں شوق و محبت کے جذبات کو اُبھار آگیا اور وہ ان جذبات کے زیرِ اثر چل کھڑا ہوا۔ جسے قطع علائق پر آمادہ کیا گیا۔ اور وہ اس پر دل و جان سے آمادہ ہو گیا۔ گویا یہ اس پاکباز زمرۂ زائرین میں شمار ہوتا ہے۔ جس نے خلائق سے مُنہ موڑا۔ اور رب البیت کی دید کے لیے تمام مشقتوں اور مشکلوں کو برداشت کیا۔

اِن جذبات و مقاصد کو لیے ہوئے جب ایک اپنے شہر سے روانہ ہوتا ہے۔ پُر امید رہنا چاہیے۔ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ کہ وہ منزلِ مقصود تک پہنچا ہی دے گا۔ اس بنا پر نہیں کہ اس کے اعمال اس قابل ہیں کہ ان کا لحاظ کیا جائے۔ یا اس کا یہ جذبہ اس لائق ہے کہ اس کی تکمیل ہونی چاہیے۔ بلکہ محض اس بنا پر کہ اس کا فضل و کرم اس کا مقتضی ہے۔ ہاں اس رجاء کے ساتھ ساتھ موت کا ڈر اور ہول بھی دل سے نکال دینا ضروری ہے۔ کہ اس کے لیے کوئی وجہ جواز پائی نہیں جاتی۔ کیونکہ موت اس کے سوا اَور کیا ہے؟ کہ جس گھر کے قصد سے نکلے ہیں اب اُسی گھر جا رہے ہیں۔ اور پھر اس کا یہ وعدہ بھی ہے۔

ومن یخرج من بیتہ مُہاجِرًا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہٗ علی اللہ (نساء۔ ۱۰۰)	اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے پھر اُس کو موت آ پکڑے تو اُس کا ثواب اُس کے ذمہ ہو چکا۔

سفرِ حج اور سفرِ آخرت میں مماثلت

بادیہ میں قدم دھرے اور اس کے لق و دق صحراؤں کو طے کرے تو اس کی ہولناکیوں

کو سفرِ آخرت کی ہولناکیوں پر قیاس کرے۔ اور یہ خیال کرے کہ جس طرح یہاں ہر لمحہ پکڑے جانے اور گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے اسی طرح آخرت کی پہلی ہی منزل قبر میں نکیرین کے سوالات کا اندیشہ ہے۔ پھر جس طرح یہاں درندے اور بچھو اور سانپوں کی کثرت ہے۔ اسی طرح قبر میں بھی بے شمار حشرات الارض ایسے ہو سکتے ہیں۔ جو جسم انسان کو لپیٹ جائیں۔ اور ڈسیں۔ اسی طور پر بادیہ کی وحشت کو قبر کی وحشت قرار دے۔ اور یہاں کے ہر ہر خوف و خطر کو مستقبل میں بدل دینے کی کوشش کرے۔ احرام و تلبیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان نے اللہ کی دعوت قبول کر لی ہے اور اس کی پکار سُن لی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ احرام باندھنے اور لبیک کہہ دینے سے واقعی اس کا دل اللہ کے دربار میں حاضر ہو گیا ہے۔ اور اس کی اس حاضری کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا بھی گیا ہے۔ اس لیے جہاں یہ لبیک لبیک کی دلنواز صدائیں بلند کرے۔ وہاں اپنے کو رجاء و خوف کے بین بین محسوس کرے۔ اور اس اندیشہ سے برابر دل کو مشوش بھی رکھے کہ مبادا اس کے جواب میں یہ نہ کہہ دیا جائے کہ تمہارا یہ تلبیہ ہمیں منظور نہیں۔

سفیان بن عیینہ کی تاثر پذیری سفیان بن عیینہ کی روایت ہے کہ علی بن حسین نے حج کا قصد کیا۔ جب احرام باندھا اور اونٹنی پر سوار ہوئے تو چہرہ فق ہو گیا۔ رنگ زرد پڑ گیا۔ اور سارے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ باوجود انسانی کوشش کے بھی مُنہ سے لبیک لبیک کے کلمات نہ نکل سکے۔ لوگوں نے پوچھا۔ آپ تلبیہ کیوں نہیں کہہ رہے ہیں۔ فرمایا ڈرتا ہوں کہ مبادا لبیک کے جواب میں لا لبیک نہ کہہ دیا جائے۔ اور ایک مرتبہ تو ہمت کر کے لبیک کہہ بھی دیا۔ لیکن فوراً غش کھا کر گر پڑے۔ روایت میں ہے کہ دورانِ حج میں اُن کی برابر یہی کیفیت رہی۔

احمد بن ابی الحواری کا کہنا ہے کہ اسی قسم کا قصہ ابو سلیمان امدارانی کا بھی منقول ہے۔ اُنھوں نے احرام باندھا اور ایک میل تک چلے۔ لیکن تلبیہ نہ کہہ پائے۔ یہاں تک کہ اُن پر بے ہوشی طاری ہوئی۔ ہوش آیا تو کہنے لگے۔ اے احمد! ایک مرتبہ حضرت موسٰی سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے ظالموں سے کہہ دو کہ میرا کم ہی ذکر کریں اور یہ اُٹھتے بیٹھتے ریاکاری سے میرا نام نہ لیں۔ کیونکہ میں ان کی حرکتوں سے بیزار ہوں۔ اور ان کے مشغلۂ ذکر پر انھیں اپنی رحمتوں سے اُور دور کر دیتا ہوں۔

احمد! جو شخص ناجائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال سے حج کرتا ہے۔ اُس کے تلبیہ پر اُسے یہی جواب ملتا ہے۔ کہ میں تیرے تلبیہ کو قبول کرنے والا نہیں جب تک تو ناجائز مال کو حقداروں کو واپس نہ لوٹا دے۔

جب حدودِ مکہ میں داخل ہو۔ تو اُس وقت اللہ کا شکر ادا کرے۔ کہ اس نے حرم تک رسائی کی توفیق بخشی۔ پھر جس طرح یہ اس کے گھر میں امن و اطمینان سے پہنچ گیا ہے۔ اِسی طرح توقع رکھے۔ کہ آئندہ بھی اس کے عقاب سے محفوظ رہے گا۔ اکثر حالات میں تو اسے پر امید ہی رہنا چاہیے۔ کیونکہ پروردگار عالم کا کرم عام ہے اور اس کی بخششوں کی کوئی حد و انتہا ہی نہیں۔ لیکن اس قرب مکانی پر اپنے کو اسے اہل بھی ثابت کرنا چاہیے۔ اور سمجھ لینا چاہیے۔ کہ اگر اس نے اس قرب کے حدود کا خیال نہ کیا، اس سے لطف اندوز نہ ہوا، اور اس کے آداب کو مرعی و ملحوظ نہ رکھا۔ تو قرب ذات کا تحمل کیونکہ ہوگا۔

بیت اللہ کا سامنا طواف ایک نوع کی نماز ہے
یہ جسم کی دوڑ نہیں قلب و فکر کی تگ و تاز ہے

پھر جب نظریں بیت اللہ کی چار دیواری پر پڑیں۔ تو دل پر اس کی عظمت کا گہرا نقش اُبھر آنا چاہیے۔ اور اُمید رکھنا چاہیے۔ کہ جس طرح اس کے گھر کی زیارت سے

بہرہ مندی ہوئی بیت اللہ کا احترام و اجلال اسی انداز سے ہونا چاہیے کہ گویا حق تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو۔ اسی ڈر، اسی رعب اور اسی اخلاص و نیازمندی کا اظہار ہونا چاہیے۔ کہ جو اس مناسبت پر ضروری ہے۔ حج کے یہ مبادی اور یہ مناسک چونکہ سب کے سب احوالِ آخرت سے حد درجہ مشابہت رکھتے ہیں۔ اس لیے ہر ہر لمحہ اور موڑ پر آخرت کی کیفیات کو سامنے رکھنا چاہیے۔

طواف ایک نوع کی نماز ہے۔ اس لیے اس میں وہی خوف، رجا اور تعظیم و محبت ہونا چاہیے جو نماز کی خصوصیات ہیں۔ یہ بیت اللہ کے گرد چکر یا اللہ کے گھر کے گرد پھیرے۔ دراصل تشبہ ہے اُن ملائکہ کے ساتھ جن کے طواف کا مدار و محور عرش الٰہی ہے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے۔ کہ یہ جسمانی حرکت ہے۔ اور طواف سے مراد کعبہ کے گرداگرد جسم کی ایک دوڑ ہے بلکہ روح کا ایک طواف ہے اور قلب و فکر کے پھیرے ہیں۔ اس لیے ان کا آغاز بھی ذکر رب سے ہونا چاہیے اور اختتام بھی اس پر ہونا چاہیے۔ بیت اللہ کے بارہ میں اس حقیقت کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ یہ دنیا میں بمنزلہ ایک مثال اور رمز کے ہے۔ اور اس سے مراد ایسا مرکزِ شوق و عشق ہے جو عالم ملکوت میں ہے۔ اور یہ آنکھیں اُسے دیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتیں۔ ہاں بعض مرتبہ اہلِ کشف پر اس کی گرہ کشائی البتہ ہوئی ہے اور وہ حج کی صحیح روح کو اپنانے کی وجہ سے اس کی دید اور طواف سے ضرور مالامال ہوتے ہیں۔ یہ مرکزِ شوق و عشق وہی بیت معمور ہے جس کے متعلق بعض روایات میں اس انداز سے اشارات ملتے ہیں۔ کہ اس کعبے کے مقابلے میں آسمانوں پر بھی ایک کعبہ ہے۔ جو ملائکہ کا محل طواف ہے۔ اور چونکہ یہ انسان کے بس میں نہیں ہے کہ اس بیت معمور تک رسائی حاصل کر سکے۔ اور اس کے گرداگرد ذکر و شوق کے چکر کاٹ سکے۔ اس لیے اسے صرف اسی چیز کا مکلف ٹھہرایا گیا

ہے۔ کہ اس بیت اللہ کا طواف کرے جو اس کے مشابہ ہے۔ اور اسی کی ترجمانی کرتا ہے۔

حدیث میں ہے:

من تشبہ بقوم فھو منھم۔ (۱) — جو جن لوگوں کا تشبہ اختیار کرتا ہے وہ انہیں میں شمار ہوتا ہے۔

بیت اللہ اور بیت معمور سے بھی آگے کی ایک منزل جہاں خود کعبہ زائرین کعبہ کے گرد گھومتا ہے

اس سے آگے کا بھی ایک مقام ہے جو لوگ اس طواف ظاہری کو اس ملکوتی و باطنی طواف کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اور انھیں کیفیات کو قلب و ذہن پر طاری کر لیتے ہیں۔ اور یہ سمجھنے لگے ہیں۔ کہ زمین و آسمان کا کعبہ یا بیت معمور تو محض ایک رمز ہے۔ ہماری توجہات کا اصل ہدف براہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ تو یہ وہ خوش قسمت لوگ ہیں کہ خود کعبہ اُن کا طواف کرتا ہے۔ اور ان کے گرد گھومتا ہے۔ جیسا کہ بعض اولیاء اللہ نے اپنے مشاہدات و مراکبات میں محسوس کیا ہے۔

حجر اسود کو بوسہ دینا بیعت و اطاعت کے رشتوں کو استوار کرنے کے مترادف ہے

استلام یا حجر اسود پر بوسہ دیتے وقت یہ خیال رہنا چاہیے۔ کہ یہ ایک نوع کی بیعت و اطاعت ہے۔ جس کا براہ راست تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حج کرنے والا اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہے کہ آئندہ زندگی میں اس سے سرتابی و سرکشی کا ظہور نہیں ہونے پائے گا یہی مطلب ہے ابن عباس کے اس قول کا۔

---

(۱) ابو داؤد۔

الحجر الاسود یمین اللہ عز وجل فی الارض یصافح بہا خلقہ کما یصافح الرجل اخاہ۔ (۱)

حجر اسود زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے جس کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں سے اسی طرح مصافحہ کرتا ہے جس طرح ایک بھائی اپنے بھائی سے کرتا ہے۔

استارکعبہ کو پکڑ کر اور ملتزم کعبہ سے لپٹ کر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرب الٰہی کے خواہاں اور جویاں ہیں۔ اور اس کی برکات کو حاصل کرنا اور اپنے میں سمونا ہے۔ نیز اس گھر کے مالک و آقا کے دامن کو پکڑ کر اس سے عفو و مغفرت کا طالب ہونا ہے۔ یہ فعل بعینہٖ اس شخص کا سا ہے۔ کہ جو کسی دوست سے اپنی کسی لغزش اور غلطی پر مخلصانہ معذرت کرتا ہے۔ اور معافی چاہتا ہے کہ اس کیفیت کو دل میں اچھی طرح راسخ کرے۔ اور اللہ تعالیٰ سے بار بار گناہوں کی بخشش مانگے۔ اور اپنی دعاؤں میں یوں ظاہر کرے۔ کہ گویا سوا اس کی ذاتِ گرامی کے اور کوئی ملجا و ماویٰ نہیں، کوئی ٹھکانا اور پناہ گاہ نہیں۔ اسی کے عفو و کرم پر بھروسہ ہے اور وہی اس لائق ہے۔ کہ مستقبل کے امن و اطمینان کا ضامن و کفیل ہو۔

صفا و مروہ کے مابین سعی کا مطلب

صفا و مروہ کے مابین سعی اور بار بار آنے جانے کا مطلب یہ ہے کہ حج کی سعادت سے بہرہ مند ہونے والا۔ ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے۔ کہ اب اُسے اپنے مالک اور رب کی رحمتوں کا شدید انتظار ہے۔ یہ اس تردد اور حیص بیص میں اس کے صحن خانہ کے چکر کاٹ رہا ہے۔ کہ اس کی عبادت مقبول ہوئی یا نہیں۔ اس کی محنت، اس کا ایثار اور عمل خود اس کی نظر میں کوئی وزن رکھتا ہے یا نہیں۔ کہ جس کے لیے اس نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور جھیلا ہے۔ یا پھر یہ سب بے چینی اور

---

(۱) عبداللہ بن عمر سے مروی ہے۔

تر وہ یوم حساب کی بے چینیوں کے مماثل ہے۔ اور اس گھڑی کی یاد دلاتی ہے۔ جب اعمال کی ترازو نصب کی جائے گی۔ اور چشم زدن میں یہ بتا دیا جائے گا۔ کہ عمل کے دونوں پلڑوں میں زیادہ بھاری کون ہے۔ نیکیوں کا یا برائیوں کا۔ ظاہر ہے جب دل کی یہ کیفیت ہو تو بے چینی اور اضطراب کو رفع کرنے کے لیے چکر کاٹے ہی جاتے ہیں۔ یہ عین انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔

میدانِ عرفہ مناظر قیامت کی تصویر ہے عرفہ کے وسیع و عریض میدان میں ایک بھیڑ انسانوں کی ٹھہرتی ہے۔ بو قلموں آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اور مختلف زبانوں میں دعائیہ کلمات ادا کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی مناظر قیامت کی ایک تصویر ہے۔ اور عرصۂ حشر کی ایک مثال ہے۔ جس طرح وہاں متعدد قومیں اپنے اپنے انبیاء کے جھنڈوں تلے جمع ہوں گی۔ اور بخشش و شفاعت کے لیے چیخ پکار کریں گی۔ اسی طرح یہاں ایک ہنگامہ بپا ہے۔ اور ہر ہر دل اور زبان پر عفو و طلب کا ورد ہے۔ اس مقام پر چاہیے کہ انسان کمال تضرع اور ابتہال سے کام لے۔ اور پختہ یقین رکھے۔ کہ اس کی رحمتیں اس کو ڈھانپ کر رہیں گی۔ اور اس کے فضل و کرم سے اس کو بے نیل مرام واپس نہیں لوٹایا جائے گا۔ انشاء اللہ اس یقین کے ساتھ اگر یہ منزل طے ہوئی تو کامیابی مقدرات میں سے ہے کیونکہ یہاں سوال صرف ان کی ایک دعا کا نہیں۔ بلکہ یہ وہ موقع ہوتا ہے۔ جب دنیا بھر کے ابدال، اوتاد کی ایک جماعت اس دعا میں شریک ہوتی ہے۔ ان سب کی نظریں اس بابِ اجابت پر مرکوز ہوتی ہیں۔ اور ان کے دلوں سے مجموعی طور پر جو صدا بلند ہوتی ہے وہ بھی عفو و بخشش کی پُر اثر صدا ہوتی ہے۔ اور دراصل اسرارِ حج میں کا ایک اہم سر یا اس کی خوش بختیوں کا ایک عظیم پہلو یہی ہے۔ کہ اربابِ قلوب، احباب ہمم اور پاکیزہ ترین نفوس خدا جانے کہاں کہاں سے آ کر یہاں جمع ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ

نکلتا ہے کہ فیوضِ صحبت و دعا کے انمول مواقع ہر ہر شخص کو بغیر کسی تلاش و جستجو کے میسر آتے ہیں۔ یہ صحبت کس درجہ بابرکت ہے۔ اس کا اندازہ ایک عارف کے مندرجہ ذیل قول سے لگائیے۔ کہ اس سے بڑھ کر محرومی کی اور کوئی صورت نہیں کہ عرفات میں حاضری کا اتفاق ہو۔ اور یہ یقین حاصل نہ ہو کہ اللہ کی رحمتیں عام نہیں ہوں گی۔ اور انسان یہاں سے خائب اور خاسر ہو کر لوٹے گا۔

رمی جمار کا فلسفہ۔ یہ اس رسمِ عشق و شوق کا اعادہ ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے شیطان کے جھانسوں میں آنے سے انکار کیا اور کنکریوں سے اس کی تواضع کی

رمی جمار یا کنکریاں مارنے کی رسم کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ جب مناسکِ حج میں مصروف ہوئے تو ان مقامات پر شیطان نے اُن کے دل میں وسوسہ اندازی شروع کی۔ اور ان کو اد لئے حج سے باز رکھنا چاہا۔ مگر وہ مردِ حق آگاہ اور مردِ حق پرست اس کے جھانسوں میں کب آنے والا تھا! انھوں نے اس کے جواب میں زمین سے چند کنکریاں اُٹھائیں اور اس کے مُنہ پر دے ماریں۔ جب سے یہ رسمِ عشق و شوق قائم ہوئی کہ یہ ہر حج کرنے والا وساوسِ شیطان کے خلاف اظہارِ نفرت و بیزاری کے طور پر رمی جمار پر عمل پیرا ہو۔ اگرچہ اس کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو۔ اور اگرچہ اس کو بہکانے کے لیے شیطان اس کے سامنے نہ آئے۔ اس سے دو مقصد پورے ہوتے ہیں۔ ایک تو اس سے حضرت ابراہیمؑ کی سنت تازہ ہوتی ہے۔ اور دوسرے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و امتثال کا یہ جذبہ کسی عقلی مجبوری کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور نہ کسی سمجھ میں آنے والے فلسفہ پر مبنی ہے۔ بلکہ یہ خالص عبودیت کا مظاہر ہے۔ اور شوق و وجدان کا تقاضہ ہے۔ اس لیے جب جمرات کو ہدف ٹھہرانے کا یہ موقع میسر آئے تو فی الواقع یہ تصور قائم کرنا چاہیے کہ میں شیطان سے نبرد آزما ہوں۔ اور اس

سے سخت بیزار ہوں شیطان کے لیے اس سے زیادہ مایوس کن اور ہولناک بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ اللہ کا کوئی بندہ محض نشۂ اطاعت میں سرشار ایسی ایسی رسموں میں بھی اطاعت و فرمانبرداری کا بڑھ بڑھ کر ثبوت دے رہا ہے جن سے بظاہر کوئی معقولیت وابستہ نہیں۔

قربانی کے جانور کا ذبح کرنا بھی منجملہ اُن عبادات سے ہے کہ جن سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔

مدینہ یا مرکزِ عشاق کے آداب اور احتیاطیں جہاں کے ہر پیچ و خم پر آں حضرت کے نقوشِ پا کی شوخی جلوہ گر ہے

ان سب مناسک سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت سے بہرہ مند ہونا ہے۔ اس مرحلہ پر کن کن کیفیات کا دل میں ابھرنا ضروری ہے۔ اور کن کن جذبوں کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ جونہی نظریں اس کے در و دیوار پر پڑیں۔ تو ذہن کو اس مبارک دور کا تصور کرنا چاہیے جب اللہ تعالیٰ نے اس مقام کو آں حضرت کا مہجر ٹھیرایا۔ اور جب اس بلادِ طیبہ کو یہ شرف بخشا کہ احکام و فرائض کی تبلیغ و اشاعت کا یہ منبع و سرچشمہ قرار پائے۔ یعنی یہیں آنحضرت نے زندگی کا بیشتر حصہ گذارا۔ یہیں لوگوں کے سامنے اُسوۂ حسنہ کی مثال قائم کی۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں منکرین سے لڑائیاں ہوئیں۔ اور جہاں فتح و نصرت کے دروازے آپ پر وا ہوئے۔

پھر یہی وہ جگہ ہے۔ جو آں حضرت کے جسدِ اطہر کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اور یہی وہ خاکِ پاک ہے جس نے آپ کے دو وزیروں اور ساتھیوں کو شرفِ رفاقت سے نواز رکھا ہے۔

جب یہاں پہنچنے کی سعادت نصیب ہو۔ تو یہ سمجھ کر اس کی گلی کوچوں میں قدم دھرنے چاہئیں کہ یہاں کے ہر پیچ و خم پر آنحضرت کے نقوشِ پا کی شوخی جلوہ فرما ہے

لہٰذا یہاں چلو تو خوف، احتیاط اور احترام کے ملے جلے جذبات لیے ہوئے۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے۔ کہ یہاں گھومنے پھرنے میں آزادی نہیں بلکہ یہاں اس خشوع اور اس کیفیت کو زندہ کرنا ہوگا۔ کہ جو آنحضرت اپنی چال میں ملحوظ رکھتے تھے۔ اس طرح چلنا ہوگا۔ اور اس نقطۂ نظر سے اس کی گلی کوچوں کی سیر کرنا ہوگی۔ یہ مقام ادب ہے۔ اور اس نزاکت کا احساس برابر یہاں رہنا چاہیے۔ کہ مبادا کسی گستاخی سے ہمارے اعمال ساقط الاعتبار اور بے مصرف نہ ہو جائیں۔ پھر اُن لوگوں کی یاد دلوں میں آنا چاہیے جو آپ کے فیوضِ صحبت سے مشرف ہوئے۔ جنھوں نے آپ کے کلمات طیبات کو، اپنے کانوں سے سُنا۔ اور آپ کے روئے انور کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس پر تاسف اور اظہارِ افسوس ہونا چاہیے کہ ہم ان مواقع سے محروم رہے۔ پھر یہ محرومی تو اس بنا پر گوارا بھی ہے کہ اس میں ہماری مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں لیکن اس محرومی کے بارہ میں سوچنا چاہیے جو اس وقت حاصل ہوگی جب ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے آں حضرت سے کہا جائے گا کہ ان لوگوں کی سفارش کے لیے آپ بے تاب نہ ہوں۔ آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کن کن بدعات کو اپنایا۔ اور دین کے نام پر کن کن خرافات کو سینے سے لگائے رکھا۔ اس وقت حضور کو ہماری سفارش سے دست بردار ہونا پڑے گا اور کہنا پڑے گا۔

سحقًا سحقًا۔ (۱) اگر ایسا ہے تو ان کا رحمتِ حق سے دور رہنا ہی اچھا ہے

ان خیالات کے ساتھ ساتھ رجا و امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ جس پروردگار نے حج کی توفیق بخشی ہے۔ اور بغیر کسی دنیوی غرض کے گھر سے نکلنے کا موقع عطا کیا ہے۔ اس کی رحمتیں بغیر کسی رکاوٹ کے حاصل ہو کے رہیں گی۔

مسجد نبوی و مزار پر حاضری کی کیفیات و آداب جب مسجد نبوی کا منظر دلنواز سامنے آئے۔ اور اس میں قدم دھرنے کی سعادت

---

(۱) متفق علیہ

حاصل ہو۔ تو پھر اس طرح کا نقشہ نظر و بصر کے سامنے پھر جانا چاہیے کہ یہ وہ مقام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کی سجدہ گاہ قرار دیا۔ جس میں مسلمانوں کے پہلے اور بہترین گروہ نے عبادت کے فرائض انجام دیے۔ اور یہی وہ مقام ہے کہ زندہ حضرات میں سے بہترین اور چیدہ افراد جہاں صبح و شام اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ اور جو مرنے والوں میں سے بہتر اور اعلیٰ ترین ہستیوں کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ لہذا یہاں آنے کا جب اتفاق ہو۔ تو خشوع و عظمت کے جذبات کا ان پر پورا پورا غلبہ و استیلاء ہونا چاہیے۔ اور کیوں نہ ہو یہ تو جگہ ہی ایسی ہے۔ کہ ہر ہر دل جس سے متاثر ہو۔ اور ہر ہر مومن جہاں وفور کیفیات سے مست ہو۔ اویس قرنی کے بارہ میں ابو سلیمان کی روایت ہے۔ کہ جب یہ مدینہ آئے۔ اور ان سے کہا گیا۔ یہ ہے آنحضرت کا مزار۔ تو ان پر غش طاری ہو گیا۔ جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے۔ باللہ مجھے کسی طرح یہاں سے نکالیے۔ میں ایسی جگہ ہرگز نہیں رہنے کا۔ جہاں محمد رسول اللہ مدفون ہوں۔

مزار پر حاضری دینے کے آداب یہ ہیں۔ کہ مومن نہ تو روضہ کی دیوار کے بالکل قریب کھڑا ہو۔ اور نہ اس کو چھوئے۔ بلکہ ذرا فاصلہ پر ادب و احترام سے کھڑا ہو کر دیدہ و نگاہ کے لیے سامان لذت فراہم کرے۔ اور یہ سمجھے کہ گویا آنحضرت کی زندگی ہی میں اُن کے سامنے حاضر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

ان اللہ تعالیٰ وکل بقبرہٖ ملکا یبلغہ سلام من سلم علیہ من امتہ۔ (۱)	اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کی قبر پر ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جس کے فرائض میں یہ داخل ہے۔ کہ درود و سلام بھیجنے والے کا سلام و درود اُن تک پہنچا دے۔

---

(۱) نسائی۔ ابن حبان اور حاکم۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رہے کہ درود وسلام تو اُس شخص کا بھی آں حضرت تک لے جایا جاتا ہے، جو مدینہ سے باہر ہے۔ اس لیے جس نے وطن اور مال کو محض اس شوق کی بنا پر چھوڑا اور شدائدِ سفر برداشت کیے۔ کہ آں حضرت سے شرفِ ملاقات حاصل کرے گا۔ وہ اگر یہاں آکر روضۂ اقدس کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے۔ اور درود وسلام کے تحائف بھیجتا ہے تو اس کے پہنچ جانے اور خلعتِ قبول پانے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس حدیث کے یہ معنی ہیں۔ کہ آں حضرت کو زائرین کے آنے اور زیارت کرنے کی باقاعدہ اطلاعات دی جاتی ہیں۔ روضۂ اقدس کی دیوار کو چھونا اور اس پر بوسہ دینا۔ اس لیے ممنوع ہے کہ یہ یہود ونصاریٰ کی سنت ہے جس سے مسلمانوں کو بہر حال مجتنب رہنا چاہیے۔

منبرِ رسول کو دیکھ کر کس انداز کا نقشہ فکر ونظر کے سامنے آنا چاہیے

اس کے بعد مسجدِ نبوی میں منبرِ رسول کی زیارت کرنا چاہیے۔ اور چشمِ تصور کے سامنے یہ منظر لانا چاہیے۔ کہ گویا آں حضرت اس پر تشریف فرما ہیں۔ اور مہاجرین وانصار کے مختلف گروہوں نے آپ کو گھیر رکھا ہے۔ آپ وعظ فرما رہے ہیں۔ اور ان میں اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی روح پھونک رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ اسرار واعتبارات کہ مناسکِ حج میں جن کی رعایت ضروری ہے۔ جب ان سے انسان فارغ ہو چکے تو اُس کو اپنے قلب وجگر کا جائزہ لینا چاہیے۔ اور دیکھنا چاہیے۔ کہ کیا اس کا دل انھیں کیفیات سے معمور ہے۔ کیا دنیا سے بیزار ہوا ہے۔ اور دارالبقاء سے اس کی محبت بڑھی ہے۔ اور آیا اس کے اعمال شرع کی ترازو میں پورے اُترتے ہیں۔ اگر یہ کیفیات دل میں موجود ہیں۔ تو اس کا حج قبول ہوا۔ اور اس کا نام زمرۂ محبوبین میں لکھا گیا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو پھر اندیشہ ہے کہ کہیں اس کو سوا غضب وپشیمانی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس محرومی سے ہر ہر مسلمان کو محفوظ رکھے

ذکر و دُعا

فضائلِ ذکر

تلاوتِ قرآن کے بعد ذکر سے بڑھ کر اور کوئی عبادت نہیں۔ اس کے متعلق قرآن میں جا بجا تصریحات آئی ہیں۔

فاذکرونی اذکرکم۔ (سورۂ بقرہ - ۱۵۲)	سو تم مجھے یاد کیا کرو۔ میں تمھیں یاد کیا کروں گا۔
اذکروا اللہ ذکرا کثیرا (احزاب - ۴۲)	اللہ تعالےٰ کو بہت بہت یاد کرو۔
و اذا افضتم من عرفات فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام۔ واذکروا کما ھداکم۔ (بقرہ - ۱۹۰)	اور جب عرفات سے واپس ہونے لگو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) میں خدا کا ذکر کرو۔ اور اس طرح ذکر جس طرح اس نے تمھیں سکھایا ہے۔
و اذا قضیتم مناسککم فاذکروا اللہ کذکرکم اباءکم او اشد ذکرا۔ (البقرہ - ۱۹۹)	پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو تو منیٰ میں خدا کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔
الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم (آل عمران۔ ۱۹۰)	جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔
واذکر ربک فی نفسک تضرعا وخیفۃ ودون الجھر	اور اپنے پروردگار کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف سے اور پست آواز سے

من القول بالغدو والآصال (اعراف ۲۰۵) صبح و شام یاد کرو۔

ولذکر اللّٰہ اکبر (عنکبوت ۴۵) اور خدا ذکر بڑا اچھا کام ہے۔

منافقین کو ذکر سے البتہ کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کی اس محرومی کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے فرمایا:

ولا یذکرون اللّٰہ الا قلیلا۔ (نساء۔ ۱۴۲) اور خدا کی یاد ہی نہیں کرتے مگر بہت کم۔

احادیث و آثار کا اچھا خاصہ ذخیرہ بھی ذکر کے فضائل میں منقول ہے۔ ایک حدیث قدسی ملاحظہ ہو۔

یقول اللّٰہ عزوجل انا مع عبدی ما ذکرنی وتحرکت شفتاہ بی۔ (۱) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندہ کے ساتھ اس وقت تک رہتا ہوں جب تک وہ میرے ذکر میں مشغول رہتا ہے اور جب تک اس کے ہونٹ میری یاد سے متحرک رہتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

من احب ان یرتع فی ریاض الجنۃ فلیکثر ذکر اللّٰہ عزوجل۔ (۲) جو ریاضِ جنت کی شمیم انگیزیوں سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہے اور اس کے اثمار اور میووں سے کام و دہن کی تواضع کرنا چاہتا ہے۔ اسے چاہیے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرے۔

ایک مرتبہ آں حضرت سے پوچھا گیا کہ بہترین عمل کونسا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا۔

---

(۱) مستدرک۔

(۲) ابن ابی شیبہ و طبرانی۔

ان تموت ولسانك رطب بذكر الله عز وجل۔ (۱)

تیری موت اس عالم میں ہو۔ کہ تو اللہ کے ذکر سے رطب اللسان ہو۔

ایک اور حدیثِ قدسی دیکھیے۔ اصحابِ ذکر کے لیے کس درجہ ایمان افروز اور امید افزا ہے۔

يقول الله تبارك وتعالى اذا ذكرني عبدي في نفسه ذكرته في نفسه۔ واذا ذكرني في ملأ۔ ذكرته في ملأ خير من ملائه۔ واذا تقرب مني شبراً تقربت منه ذراعاً واذا تقرب مني ذراعاً تقربت منه باعاً واذا مشى الي۔ هرولت اليه۔ (۲)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب کوئی میرا بندہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اُس کو دل میں یاد کرتا ہوں۔ اور جب وہ برسرِ مجلس میرا تذکرہ کرتا ہے۔ تو میں بھی اس سے کہیں بہتر جماعت میں تذکرہ کرتا ہوں۔ اور اگر میرا بندہ میری طرف ایک بالشت بڑھے۔ تو میں بقدر دو بالشت کے اس کی جانب ملتفت ہوتا ہوں اور اگر وہ دو بالشت بڑھے تو میں بقدر ایک ہاتھ کے اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ پھر اگر وہ ایک ہاتھ کے انداز سے بڑھے۔ تو میں اُس کی جانب لپک کے آتا ہوں۔

یعنی نہ پوچھو۔ کہ میری توجہات و التفات کی سرعتوں کا کیا عالم ہوتا ہے! ذکر کا ایک فائدہ یہ ہے۔ کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگنے کی حاجت نہیں رہتی۔

قال الله عز وجل من شغله ذكري عن مسئلتي اعطيته افضل ما اعطي

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جو میرے ذکر میں اس درجہ مشغول رہا کہ مجھ سے کچھ طلب نہیں کر سکا۔ میں اُس کو اتنا ہی دوں گا جتنا

(۱) ابن حبان، طبرانی۔ اور بیہقی۔

(۲) متفق علیہ۔

سائلین - کسی بہترین سائل کو میں دے سکتا ہوں -

یہی نہیں بلکہ ایک عارف کے قول کے مطابق - اللہ تعالیٰ ذاکر کی جملہ ضروریات انفرادی و اجتماعی کا متکفل ہو جاتا ہے - حضرت معاذ بن جبل کا قول ہے -

لیس یتحسر اھل الجنۃ علی شیء الا علی ساعۃ مرت بھم لم یذکر اللہ سبحانہ فیھا -

اہل جنت کو بجز اس کے اور کسی چیز پر افسوس نہیں ہوگا کہ کچھ لمحے یونہی غفلت میں بسر ہو گئے - اور ان میں وہ اللہ کے ذکر سے محروم رہے -

مجالسِ ذکر

جب ذکر کے یہ فضائل ہوئے تو ان مجالس کے کیا کہنے کہ جن کو ترتیب ہی اس لیے دیا گیا ہے کہ ان میں اللہ کے ذکر سے دلوں کو صیقل کیا جائے۔

ایک حدیث میں ہے۔

ما جلس قوم مجلسًا یذکرون اللّٰہ تعالیٰ لا یریدون بذالک وجہہٗ الا ناداھم مناد من السماء قوموا مغفورًا قد بدلت لکم سیاٰتکم حسنات (۱)

جب بھی کوئی گروہ کسی ایسے اجتماع کا اہتمام کرتا ہے جس میں اللہ کا صرف اس کی خوشنودی کے پیشِ نظر ذکر کرنا مقصود ہو۔ تو ایک پکارنے والا پکار کر انھیں خوشخبری سناتا ہے۔ کہ جاؤ تمھارے گناہ بخش دیے گئے۔ اور تمھاری لغزشیں نیکیوں سے بدل دی گئیں۔

ذکر اور میراثِ رسول حضرت ابوہریرہؓ کا ایک عارفانہ اور لطیف مذاق

صحابہ کے دل میں ذکر کی کیا اہمیت تھی! اس کے بارہ میں حضرت ابوہریرہ کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔ ایک دن اتفاق سے بازار میں جو یہ جا نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خرید و فروخت کرنے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ کہنے لگے۔ لوگو! تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم یہاں کاروبار میں مشغول ہو۔ اور اسی مسجدِ نبوی میں آنحضرت کی میراث بٹ رہی ہے۔ جاؤ اور اپنا حصّہ لگاؤ۔ یہ ساری بھیڑ پلٹ کر مسجد میں آئی۔ تو یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوئی۔ کہ یہاں

---

(۱) احمد، ابو یعلیٰ و طبرانی۔

کوئی بھی دولت و ثروت کی تقسیم میں مصروف نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا۔ حضرت! یہ کیا مذاق سوجھا۔ آپ کی مسجد میں تو اس قسم کی کوئی چیز نہیں ابوہریرہ نے کہا۔ تم نے مسجد میں جاکر کیا دیکھا۔ کہنے لگے۔ یہی بس ایک حلقہ ذاکرین کا۔ ذکر اور تلاوتِ قرآن میں منہمک ہے۔ ابوہریرہ نے کہا۔ یہی میراثِ رسول ہے۔ اللہ کی یہ یاد اور ذکر یک طرفہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کچھ اس ذاتِ گرامی کو بھی اپنے یاد کرنے والوں سے دلچسپی ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

ان لله ملائكة سياحين
في الارض فضلا عن كتاب
الناس فاذا وجدوا قوما
يذكرون الله عز وجل تنادوا
هلموا الى بغيتكم فيجيئون
فيحفون بهم الى السماء
فيقول الله تبارك وتعالى
اى شئ تركتم عبادى
يصنعونه فيقولون تركناهم
يحمدونك ويسبحونك
فيقول الله تبارك وتعالى
هل راونى فيقولون لافيقول
جل جلاله۔ كيف لو راونى۔
فيقولون لو راوك لكانوا

اللہ تعالیٰ نے نامۂ اعمال لکھنے والوں کے علاوہ دنیا میں کچھ ایسے فرشتوں کا تقرر بھی فرما رکھا ہے۔ جو گھوم پھر کر ذاکرین کا پتہ چلاتے ہیں۔ پھر جب انھیں کسی ایسے مجمع کا علم ہوتا ہے۔ تو دوسروں سے کہتے ہیں۔ یہاں آؤ۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کی تم تلاش میں ہو۔ پھر یہ فرشتے اس مجمع کے گرد آسمان تک گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے ہیں۔ کہو تم نے ہمارے بندوں کو کس حال میں پایا۔ یہ کہتے ہیں ان کو ہم نے تیری حمد و ثنا اور تسبیح بیان کرتے ہوئے پایا۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے۔ مگر کیا انھوں نے مجھے کبھی دیکھا بھی ہے۔ یہ کہیں گے جی نہیں۔ اللہ تعالےٰ

اشد تسبیحًا و تحمیدًا و
تمجیدًا - فیقول له - من ای
شی یتعوذون - فیقولون من
النار - فیقول تعالیٰ وهل
راؤها فیقولون لا - فیقول
الله عزوجل - فکیف لو
راوها - فیقولون لو راوها
لکانوا اشد هربًا منها
واشد نفورًا - فیقول جل
جلاله وای شی یطلبون
فیقولون الجنة فیقول تعالیٰ
وهل راوها فیقولون لا فیقول
تعالیٰ فکیف لو راوها فیقولون
لو راوها لکانوا اشد علیها
حرصًا - فیقول جل جلاله انی
اشهدکم انی قد غفرت لهم
فیقولون کان فیهم فلان لم
یردهم انما جاء لحاجة
فیقول الله عزوجل هم
قوم لا یشقی جلیسهم -

فرمائیں گے - اور اگر یہ میری جھلک
دیکھ پائیں تو ان کے شوقِ ذکر کا کیا عالم
ہو! فرشتے کہیں گے جب تو مولا یہ
اسی کام میں لگے رہیں - اور تیری تسبیح،
تمجید اور تحمید اس سے کہیں زیادہ
زوروں سے بیان کریں - اللہ تعالے
فرمائیں گے - اور کس چیز سے پناہ
طلب کرتے ہیں - یہ کہیں گے - جہنم کی
آگ سے - اللہ تعالے فرمائیں گے -
کیا انھوں نے جہنم کی خوفناکیوں کا بھی
مشاہدہ کیا ہے؟ - یہ کہیں گے جی نہیں -
اللہ تعالیٰ کہے گا - اور اگر یہ جہنم دیکھ
پائیں - تو یہ کہیں گے کہ پھر تو اُن کا
جہنم سے فرار اور بڑھ جاتے - اور یہ
اور متنفر ہو جائیں - اللہ تعالیٰ فرمائیں گے
اور یہ چاہتے کیا ہیں - یہ فرشتے کہیں گے
تیری رضا - جنت! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے
کیا انھوں نے کبھی اس کا نظارہ کیا ہے -
یہ کہیں گے جی نہیں - اللہ تعالیٰ فرمائیں گے
اگر کہیں انھوں نے میری خوشنودی کے

---

(۱) ترمذی و صحیحین -

اس مرقع کو دیکھ لیا ہوتا۔ تو اُن کے شوق و طلب کا کیا حال ہوتا۔ یہ کہیں گے۔ جب تو اس میں اَور اضافہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ تم گواہ رہو۔ کہ میں نے ان سب کو بخش دیا۔ فرشتے کہیں گے۔ ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا۔ جو ذکر کی اس مجلس میں اپنے کسی کام کی وجہ سے آ بیٹھا تھا۔ اس کا مقصد ذکر و فکر نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ یہ وہ قوم ہے کہ جن کا جلیس بھی محروم نہیں رہتا۔"

تسبیح و تحمید وغیرہ کے فضائل

اللہ تعالیٰ کی صفات بے شمار کی وجہ سے اس کی حمد و تسبیح کی بھی بے شمار صورتیں ہیں۔ مگر احادیث سے جو اذکار ثابت ہیں اور ان میں اُن کی جن خوبیوں کا بیان ہے۔ ذیل میں انھیں درج کیا جاتا ہے۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم	آں حضرت نے ارشاد فرمایا جس نے
من سبح دبر کل صلوٰۃ ثلاثا	ہر ہر نماز کے بعد تینتیس بار سبحان اللہ کہا۔
وثلثین وحمد ثلاثا وثلثین	تینتیس بار الحمد للہ کہا اور تینتیس بار اللہ اکبر
وختم المائۃ بلا الہ الا اللہ	اور پھر یہ کہہ کر سو کی گنتی پوری کی۔ لا الہ الا
وحدہٗ لا شریک لہ۔ لہ الملک	اللہ وحدہٗ لا شریک لہ۔ لہ الملک ولہ الحمد
ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیٔ	وہو علےٰ کل شیٔ قدیر۔ اس کے تمام گناہ
قدیر۔ غفرت ذنوبہ وان	بخش دیے گئے۔ اگرچہ سمندر کے جھاگ کے
کانت مثل زبد البحر۔ (۱)	برابر ہوں۔

رفاعۃ الزرقی نے ایک حدیث میں بیان کیا ہے۔

کنا یوما نصلی وراء رسول	ایک دن ہم نے آنحضرت کے پیچھے
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فلما	نماز پڑھی۔ آپ نے جب رکوع سے سر
رفع رأسہ من الرکوع وقال سمع	اُٹھایا۔ اور سمع اللہ من حمدہ کہا۔ تو ایک آدمی
اللہ من حمدہٗ۔ قال رجل وراء	نے جو آپ کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ ان کلمات

(۱) متفق علیہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ربنا لک الحمد حمداً کثیراً طیبًا مبارکًا فیہ ۔ فلما انصرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلاتہ ۔ قال من المتکلم انفا ۔ قال انا یا رسول اللہ ۔ فقال صلی اللہ علیہ وسلم لقد رأیت بضعۃ و ثلاثین ملکًا یبتدرونھا ایھم یکتب اولًا ۔ (۱)

کو دہرایا ۔ ربنا لک الحمد حمداً کثیرا طیبا مبارکا فیہ ۔ آں حضرت نے سلام پھیرا ۔ تو پوچھا کہ کس نے یہ دعائیہ کلمات کہے ہیں ۔ اس آدمی نے کہا ۔ یا رسول اللہ میں نے کہے ہیں ۔ آپ نے فرمایا ۔ میں نے تیس سے کچھ زائد فرشتوں کو دیکھا ہے کہ ان میں اس بات پر مقابلہ ہو رہا ہے ۔ کون ان کو پہلے ضبط تحریر میں لاتے ۔

ایک اور حدیث میں ہے ۔

کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان حبیبتان الی الرحمٰن ۔ سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم (۱)

دو کلمے جو بولنے میں ہلکے پھلکے ہیں ۔ اور جن کا وزن بہت زیادہ ہے ۔ اور خدائے رحمٰن کو از حد پیارے ہیں ۔ یہ ہیں سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم ۔

ایک مرتبہ غریب مسلمانوں نے آں حضرت سے شکوہ کیا ۔ کہ جناب اہل ثروت نے پالا مار لیا ۔ اور ہر نوع کے اجر و ثواب کو سمیٹ لینے میں کامیاب ہو گئے ۔ کیونکہ جہاں تک نماز روزے کا تعلق ہے ۔ اس میں تو ہم اُن کے برابر کے شریک ہیں ۔ مگر صدقات کے معاملہ میں ہم اُن کی برابری نہیں کر پاتے ۔ آپ نے اُن کو تسلی دی اور فرمایا :

---

(۱) متفق علیہ

اولیس قد جعل اللہ لکم ما
تصدقون بہ ان لکم بکل تسبیحۃ
صدقۃ وتحمیدۃ صدقۃ وتہلیلۃ
صدقۃ۔ وتکبیرۃ صدقۃ وامر
بمعروف ونہی عن المنکر صدقۃ
ویضع احدکم اللقمۃ فی فم اہلہ
فہی لہ صدقۃ۔ وفی بضع احدکم
صدقۃ۔ قالوا یا رسول اللہ یاتی
احدنا شہوتہ ویکون لہ فیہا
اجرًا۔ قال صلی اللہ علیہ وسلم
ارأیتم لو وضعہا فی حرام اکان
علیہ وزرہا۔ قالوا نعم۔ قال
کذلک ان ھھنا فی الحلال کان
لہ فیہا اجرًا۔ (۱)

کیا اللہ نے تمہارے لیے صدقات کا
انتظام نہیں فرمایا۔ تمہاری ہر ہر تسبیح صدقہ
ہے۔ ہر ہر تحمید صدقہ ہے۔ ہر ہر تہلیل صدقہ
ہے۔ ہر ہر تکبیر صدقہ ہے۔ امر بالمعروف صدقہ
ہے۔ برائی سے روکنا صدقہ ہے۔ اور تو اور
بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالنا صدقہ ہے۔ اور زنا
شوئی کے فعل پر اجر ہے۔ اس پر صحابہ نے کہا
یا رسول اللہ کیا اس میں بھی اجر ہے؟ اگر کوئی شخص
اپنے تقاضائے شہوت کو پورا کرے فرمایا
کیوں نہیں۔ اگر وہ حرام کا مرتکب ہوتا۔ تو کیا
اسے سزا نہ ملتی۔ انھوں نے کہا۔ کیوں نہیں۔
ضرور ملتی۔ فرمایا۔ اسی طرح جب اس نے اس
تقاضہ کا صحیح استعمال کیا۔ تو اس پر یہ اجر کا مستحق
ہے۔

حضرت ابوہریرہ اور ابوسعید الخدری نے ایک حدیث بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ دعا و ذکر یک طرفہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور اپنے بندوں کے کلماتِ تحمید کی تعریف کرتے ہیں۔

اذ قال العبد لا الہ الا
اللہ واللہ اکبر قال اللہ عزو
جل صدق عبدی لا الہ الا انا

جب کوئی شخص کہتا ہے اللہ کے سوا
اور کوئی معبود نہیں۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے
تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے بندے نے سچ

(۱) مسلم

وَ اَنَا اکبر واذا قال العبد لا اله الا الله وحدہ لاشریک لہٗ، قال تعالیٰ صدق عبدی لا اله الا انا وحدی لاشریک لی و اذا قال العبد لا اله الا الله ولاحول ولا قوۃ الا بالله یقول الله سبحانه صدق عبدی لا حول ولا قوۃ الا بی ومن قالھن عند الموت لم تمسه النار ؎۱

کہا ہے۔ بلاشبہ میرا کوئی شریک نہیں۔ اور میں سب سے بڑا ہوں۔ اور جب کوئی کہتا ہے اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں وہ یگانہ اور ایک اور اس کا کوئی ساتھی نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس نے صحیح بات کہی ہے۔ بلاشبہ کوئی شریک نہیں رکھتا اور میں اپنی صفات میں تنہا اور یگانہ ہوں۔ پھر جب کوئی شخص اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ سوا اللہ کی ذات کے میں۔ اور برائی سے بچنے اور نیکی کو اختیار کرنے کی توفیق اور برائی بچنے کی توفیق اسی بخشش کا نتیجہ ہے۔ تو اللہ فرماتا ہے۔ میرا بندہ سچ کہتا ہے۔ فی الواقع نیکی کی استطاعت اور برائی سے بچنے کی صلاحیتیں میری ہی طرف سے ہیں۔ جو کوئی بھی ان حقائق کا مرتے وقت اعتراف کرے گا جہنم کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

خزائن جنت میں سے ایک بہت بڑے خزانہ کی آں حضرت نے ان الفاظ میں نشاندہی فرمائی۔

یا عبد الله بن قیس او یا ابو موسیٰ اولا ادلك علی لنزمن کنوز الجنة قال بلی۔ قال قل لاحول ولاقوۃ الا بالله ؎۲

اے عبد اللہ بن قیس، یا ابو موسیٰ۔ کیا میں تمہیں جنت کے ایک بہت بڑے خزانہ کا پتہ نہ بتاؤں۔ انھوں نے کہا۔ کیوں نہیں ضرور بتائیے۔ آنحضرت نے فرمایا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہا کرو۔

؎۱ ترمذی ؎۲ متفق علیہ

اذکارِ ماثورہ پر اتنا ثواب اس لیے ملتا ہے کہ یہ براہِ راست محبتِ الٰہی کا نتیجہ ہیں

اذکارِ ماثورہ کے ان فضائل سے اگر یہ شبہ پیدا ہو۔ کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ ان پر اجروثواب کی اتنی بڑی مقدار مترتب ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کا ادا کرنا کچھ بھی تو مشکل نہیں یعنی بظاہر صرف زبان ہی کو تو حرکت دینا ہے اور چند الفاظ ہی کو تو دُہرانا ہے۔ اس کا حقیقی اور اصلی جواب علم المکاشفہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جگہ اس کی جملہ تفصیلات بیان نہیں کی جا سکتیں۔ ہاں علم المعاملہ کی رو سے جس قدر وضاحت ممکن ہے۔ وہ ہم بیان کیے دیتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ یہ تمام اذکار اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں۔ کہ ان پر دوام اختیار کیا جائے۔ اور قلب و ذہن حضوری کی نعمت سے مالامال ہو۔ ورنہ ان کا فائدہ و اثر کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوتا۔ ایسے اذکار کو عبادات پر بھی اس اعتبار سے تقدم حاصل ہے۔ کہ انھیں کی وجہ سے تو عبادات میں عبادات کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے۔ کہ عبادات کا ثمرہ یا انتہا ہی یہ ہے کہ محبوب سے دلی تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا زبان ہر وقت اس کے ذکر میں مشغول رہتی ہے کیونکہ اگر دل حاضر و یک سو نہیں ہے۔ اور اس کے ذکر سے محبت و اُنس کے ذریعے پیدا نہیں ہوئے۔ تو یہ صرف زبان ہلا دینا ہوا۔ ذکر و عبادت کا لطف اس میں کہاں پیدا ہو سکتا ہے!

ذکر کے معاملہ میں یہ چیز ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہیے۔ کہ اس کی کیفیتوں سے انسان فوراً فیض یاب نہیں ہو پاتا۔ بلکہ مشق، مزاولت اور جدوجہد سے یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ ابتدا میں تو بہرحال تکلف برتا جاتا ہے۔ اور ان اذکار کا قلب و لسان کو بجبر عادی بنایا جاتا ہے۔ لیکن جب جبر و اضطرار کا یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔

تو آپ سے آپ اللہ تعالیٰ سے جو ان اذکار کا ہدف ہے، انس و محبت کے جذبات وابستہ ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور شوق و اشتیاق کے مرحلہ میں انسان داخل ہو جاتا ہے۔ اور پھر ایک ایسا مقام بھی آتا ہے۔ جہاں سوا محبوب کے ذکر کے دل کو اور کسی چیز سے تسکین و اطمینان ہی حاصل نہیں ہوتا۔ اس وقت بس یہی جی چاہتا ہے۔ کہ اسی کیفیت و ذوق میں سارے کا سارا وقت صرف کر دیا جائے۔ اور دنیا کے جھمیلوں سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔

اس حقیقت کو ایک عارف نے یوں بیان کیا ہے۔

کابدت القرآن عشرین سنۃ ثم تنعمت بہ عشرین سنۃ۔	میں نے قرآن کی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کے لیے عمر کے بیس برس صرف کیے۔ پھر کہیں جا کر اس لائق ہوا۔ کہ اگلے بیس برس ان لذتوں میں گذار سکوں۔

آدابِ دُعا، اس کی اہمیت فضیلت اور طریق

قرآن حکیم میں ہے ۔

واذا سالك عبادي عني فاني قريب ۔ اُجيب دعوة الداع اذا دعانِ فليستجيبوا لي (البقرہ۔١٨٦)

اور اے پیغمبر جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو کہہ دو میں تو تمہارے پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا پکارتا ہے تو میں اُس کی دعا قبول کرتا ہوں ۔ اُن کو چاہیے کہ میرے حکموں کو مانیں ۔

ادعوا ربكم تضرعا وخفية انه لا يحب المعتدين ۔ (اعراف۔٥٥)

اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو ۔ اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ۔

قل ادعوا الله او ادعوا الرحمٰن ايا ما تدعوا فله الاسماء الحسنىٰ ۔ (بنی اسرائیل۔١١٠)

تم خدا کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے جس نام سے پکارو اُس کے سب نام اچھے ہیں ۔

احادیث میں دعا کو کس نظر سے دیکھا گیا ہے ۔ اور اس کی کیا اہمیت بیان کی گئی ہے ۔ اس کو ذیل کی روایات کی روشنی میں دیکھیے ۔

ان الدعاء هو العبادة (١)

دعا ہی تو اصل میں عبادت ہے ۔

الدعاء مخ العبادة (٢)

دعا عبادت کا مغز و حاصل ہے ۔

---

(١) اصحاب السنن ۔

(٢) ترمذی ۔

لیس شئ اکرم علی اللہ عز وجل من الدعاء (۱)	اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں۔
ان العبد لا یخطأ من الدعاء احدی ثلاث۔ اما ذنبٌ یغفر له، واما خیر یعجل له۔ واما خیر یدخر (۲)	دعا سے تین چیزوں میں سے کوئی نہ کوئی تو بہرحال حاصل ہوکر رہتی ہے یعنی یا تو کسی گناہ پر خط عفو کھینچ دیا جاتا ہے۔ یا خیر و برکت کے کسی کام میں تعجیل ہو جاتی ہے

اور یا پھر خیر کو دوسرے کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھا جاتا ہے۔ جو اس کے لیے زیادہ موزون اور مناسب ہے۔

قبولیت دعا کے اوقات و احوال کی تشریح

یہ کب اور کن احوال میں زیادہ قبولیت کے امکانات رکھتی ہے۔ اس کو جاننے کے لیے اس کی ضروری شرائط کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ جو متعدد ہیں۔ پہلی شرط مثلاً یہ ہے کہ اس کے لیے مخصوص ایام اور ساعتوں کو منتخب کیا جائے یعنی سال میں ایک۔ عرفہ کا دن۔ مہینوں میں رمضان۔ ہفتوں کے اعتبار سے جمعہ۔ اور شب و روز گزرنے والی گھڑیوں میں ہنگام سحر۔

یہ سب قبولیت و اجابت کے اوقات ہیں۔

آں حضرت کا ارشاد ہے۔

ینزل اللہ تعالیٰ کل لیلۃ الی سماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الاخیر فیقول عز وجل	جب رات کا آخری ثلث باقی رہ جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے۔ اور پکار ہوتی ہے کہ کون دعا مانگتا

(۱) ترمذی۔

(۲) فردوس

من یدعونی فاستجیب لہ من یسألنی فاعطیہ من یستغفرنی فاغفرلہ ۔

ہے۔کہ میں اس کی دعا کو قبول کروں ۔ اور کون مجھ سے طلب کرتا ہے۔ کہ میں اسے دوں اور کون بخشش چاہنے والا ہے کہ میں اس کے گناہ بخش دوں ۔

اوقات کی مناسبتوں کے پہلو بہ پہلو ، احوال کی رعایت بھی موثر ثابت ہوتی ہے ۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے ۔

ان ابواب السماء تفتح عند زحف الصفوف فی سبیل اللّٰہ تعالیٰ وعند نزول الغیث وعند اقامۃ الصلوۃ المکتوبۃ فاغتنموا الدعاء فیھا ۔

جب اللہ کی راہ میں مجاہدین میں جنبش پیدا ہوتی ہے ۔ جب باران رحمت کا نزول ہوتا ہے ۔ اور جب پانچوں نمازوں کی اقامت کہی جاتی ہے ۔ اس وقت آسمان کے دروازوں کو قبولیت کے لیے کھول دیا جاتا ہے اس لیے ان اوقات میں دعا کو غنیمت جانو ۔

جناب مجاہد کا قول ہے :۔

ان الصلوٰۃ جعلت فی خیر الساعات فعلیکم بالدعاء خلف الصلوات ۔

نمازوں کی تعیین بہترین اوقات میں ہوئی ہے ۔ اس لیے دعا مانگنا ہو تو نماز کے بعد مانگو ۔

اور غور کیا جائے ۔ تو معلوم ہوگا ۔ کہ اوقات وساعات کو جو قبولیت کا شرف بخشا گیا ہے ۔ تو احوال ہی کی بنا پر ۔ مثال کے طور پر یوم عرفہ اور جمعہ کو لیجیے ۔ ان دنوں جس قدر ارباب ہمم کا اجتماع ہوتا ہے اور جس قدر اذہان وقلوب میں تعاون وہمدردی کے داعیات ابھرتے ہیں ۔ دوسرے دنوں میں کہاں میسر ہیں ؟ اسی طرح ہنگام صبحگاہی ۔ دل کے اخلاص وفراغ کے لیے جس درجہ موزوں اور

مناسب ہے۔ دوسرا کوئی وقت اس کا کہاں مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے ، ان ساعتوں میں خصوصیت سے انسان اللہ کی رحمتوں کو حاصل کرنے میں نسبتہً زیادہ کامیاب رہتا ہے۔

سجدہ بھی ایسی حالت ہے کہ اس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ حدیث میں ہے۔

اقرب ما یکون العبد من ربہ عزوجل وھو ساجد۔ فاکثروا فیہ من الدعاء (۱)

سجدے کی صورت میں انسان اللہ کے زیادہ قریب ہوجاتا ہے۔ اس لیے اس میں کثرت سے دعائیں مانگا کرو۔

ایک اور روایت میں ہے۔

انی نھیت ان اقرأ القرآن راکعاً او ساجداً فاما الرکوع فعظموا فیہ الرب تعالیٰ واما السجود فاجتھدوا فیہ بالدعاء فانہ قمن ان یستجاب لکم (۲)

مجھے رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے سے روک دیا گیا ہے۔ اس لیے رکوع میں تم پروردگار عالم کی عظمت بیان کرو۔ اور سجدہ میں سعی اور کوشش سے دعا مانگو کیونکہ اس میں قبولیت و اجابت کے اچھے خاصے مواقع ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان جب دعا مانگے تو قبلہ رو ہو کر اور دونوں ہاتھ اس طرح اُٹھا کر کہ آغوش کی سپیدی نظر آنے لگے۔ جابر بن عبداللہ نے اس کی توجیہہ میں یہ حدیث بیان کی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ربکم حی کریم یستحی من عبدہ اذا رفعوا

آں حضرت نے فرمایا کہ تمہارا پروردگار حیا و کرم سے متصف ہے۔ لہذا انہیں چاہتا کہ اس کے بندے ہاتھ اُٹھا کر اس سے کچھ طلب

---

(۱) مسلم۔

(۲) مسلم۔

ایدیہم الیھم ان یردھم صفراً (۱) کریں اور وہ انہیں خالی لوٹا دے۔

تیسری شرط یا ادب یہ ہے۔کہ آواز جہر و خفا کے بین بین ہو۔ یعنی نہ تو اس درجہ آہستہ اور مدھم ہو کہ خود دعا مانگنے والا بھی نہ سن سکے۔ اور نہ اس قدر اونچے انداز میں ہو۔کہ خشوع و خضوع کے منافی ہو۔ ابو موسیٰ اشعری کا کہنا ہے۔ ہم لوگ جب مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اور تحمید و شکر کے کلمات کو بلند آواز سے دُہرایا۔ اس پر آنحضرت نے اُن لوگوں سے کہا۔

یا ایہا الناس ان الذین	لوگو! تم جس ذات کو پکار رہے ہو۔
تدعون لیس باصم ولا غائب	وہ نہ تو بہرہ ہی ہے۔ اور نہ کہیں غائب ہی
ان الذی تدعون بینکم وبین	ہے۔ بلکہ وہ تمہارے عین درمیان میں
اعناق رکابکم (۲)	موجود ہے۔

قرآن میں ہے۔

ولا تجہر بصلاتک	اور نماز نہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ آہستہ
ولا تخافت بہا۔ (بنی اسرائیل۔۱۰۲)	بلکہ اس کے بیچ کا موقف اختیار کرو۔
ادعوا ربکم تضرعا	اور اپنے رب سے عاجزی سے اور
وخفیۃ۔ (الاعراف۔ ۵۵)	چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو۔

دعا سادہ الفاظ میں مانگا کرو سجع و تکلف کی ضرورت نہیں

بعض لوگ دعا میں سجع پیدا کرنے کے لیے تکلف و تصنع سے کام لیتے ہیں۔ یہ چونکہ تضرع و اخلاص کے منافی ہے۔ اس لیے یہ بھی ممنوع ہے۔ دعائیں حتی الامکان سادہ الفاظ میں ہونا چاہئیں۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

---

(۱) ابوداؤد و ترمذی۔

(۲) متفق علیہ۔

ایاکم والسجع فی الدعاء حسب احدکم ان یقول اللھم إنی اسئلک الجنۃ وما قرب الیھا من قول وعمل واعوذ بک من النار وما قرب منھا من قول وعمل ۔ (۱)	سجع سے پرہیز کرو۔ اور تمھارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ کہو۔ اے اللہ میں تجھ سے جنت کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اور اس قول و فعل کی توفیق چاہتا ہوں۔ جو اس کو قبولیت کے قریب تر کردے۔ اسی طرح اے اللہ میں جہنم سے پناہ چاہتا ہوں اور جو جہنم کو قریب تر کر دینے کا باعث ہو۔

سلف نے دعاؤں میں سجع کو ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ اُن کا ایک ایسے واعظ پر گذر ہوا۔ جو نہایت پرتکلف اور مسجع انداز میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ اور مجمع کو اپنے علم سے متاثر کر رہا تھا۔ انھوں نے کہا۔

أ علی اللہ تبالغ ؟	کیا اللہ کے سامنے یہ مبالغہ آرائی ؟

پھر انھوں نے اس کو بتایا کہ حبیب عجمی جو بہت ہی مستجاب الدعوات تھا۔ نہایت سادہ الفاظ میں دعا مانگا کرتا تھا۔ اور لوگوں کے حسن اعتقاد کا یہ عالم تھا۔ کہ اس کے ایک ایک لفظ پر ہر ہر کونے اور گوشے سے آمین کی صدائیں بلند ہوتیں۔ ایک صاحب کا کیا اچھا قول ہے۔

ادع بلسان الذلۃ و الافتقار لا بلسان الفصاحۃ والانطلاق ۔	ذلت و افتقار کی زبان سے اللہ کو پکار، فصاحت و روانی کے دریا نہ بہاؤ۔

ادعیہ ماثورہ میں سجع بالکل قدرتی ہے تکلف اور بناوٹ کا نتیجہ نہیں یہاں اس نکتہ کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آنحضرت

---

(۱) مستدرک

کی بعض دعاؤں میں سجع و توازن کی چاشنی پائی جاتی ہے ۔لیکن ان میں وزن و ترنم یا سجع کا انداز بالکل قدرتی ہے ۔ اور تقاضائے بلاغت ہے تکلف یا تصنع کا نتیجہ نہیں جس سے کہ دعا میں خلل پیدا ہو ۔ اور تضرع و اخلاص میں فرق پڑتا ہو ۔ جیسے آں حضرت کی یہ دعا ہے ۔

اسئلك الامن یوم الوعید	پروردگار وعید کے دن امن کا طالب ہوں
والجنۃ یوم الخلود، مع المقربین	اور خلود کے دن جنت کا ۔ اور تیرے ان
الشھود، والرکع السجود، والموفاین	مقربین کی رفاقت سے بہرہ مند ہونا چاہتا
بالعقود، انك رحیم ودود، و	ہوں، جنھوں نے تیری گواہی دی ۔ تیرے لیے
انك تفعل ما ترید۔	رکوع و سجود کو شعار ٹھہرایا ۔ اور اپنے عہد

کو پورا کیا ۔ پروردگارا تو رحیم و دوست ہے ۔ اور تو جو چاہے کرسکتا ہے ۔

تضرع اور خشوع یا رغبت و خوف کی کیفیتوں کو بیدار کرنا بھی آداب دعا میں داخل ہے ۔ قرآن حکیم میں ہے ۔

انھم کانوا یسارعون	یہ لوگ لپک لپک کر نیکیاں کرتے اور
فی الخیرات ویدعوننا رغبا و	اور ہمیں امید و خوف سے پکارتے
رھبا۔ (انبیاء ـ ۹۰)	ہیں ۔

ایک حدیث میں ہے ۔

اذا احب اللہ عبدًا	اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو چاہتا ہے
ابتلاہ حتی یسمع تضرعہ۔	تو کبھی کبھی اسے آزمائش میں ڈال دیتا ہے ۔ اور

پھر اس کے تضرع و الحاح سے لطف اندوز ہوتا ہے ۔

ایک نہایت ضروری شرط یہ ہے کہ انسان جب دعا مانگے ۔ تو اس کی قبولیت کا پورا پورا یقین رکھے ۔ اور تذبذب و شک کا شائبہ تک دل میں نہ آنے دے

آں حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یقل احدکم اذا دعا اللھم اغفرلی ان شئت اللھم ارحمنی ان شئت لیعزم المسئلۃ فانہ لا مکرہ لہ۔ (۱)

تم میں کا کوئی بھی اس طرح دعا نہ مانگے کہ اے پروردگار اگر تیری مرضی ہو۔ تو مجھے بخش دے، اگر تیرا ارادہ ہو تو مجھ پر رحم فرما۔ بلکہ طلب و سوال کے معاملہ میں یقین کی استواریاں ہونی چاہییں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابۃ ان اللہ عز وجل لا یستجیب دعاء من قلب غافل۔

اللہ سے دعا مانگو تو اس حالت میں کہ تمہیں اس کی اجابت کے بارے میں یقین ہو۔ کیونکہ اللہ ایسی دعا کو ہرگز شرف قبول نہیں بخشتا کہ جو نیم دلی اور غفلت کا نتیجہ ہو۔

سفیان بن عیینہ کا امید افزا مشورہ

سفیان بن عیینہ نے اس سلسلہ میں نہایت امید افزا بات کہی ہے۔

لا یمنعن احدکم من الدعاء ما یعلم من نفسہ فان اللہ عز وجل اجاب دعا شر الخلق ابلیس اذ قال رب انظرنی الی یوم یبعثون۔ قال انک من المنظرین۔

تم میں سے کسی کو بھی دعا مانگنے سے اپنی کمزوریوں کی بنا پر رک نہیں جانا چاہیے کیونکہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اپنے بدترین خلائق شیطان کی دعا کو بھی قبول فرمایا ہے یعنی جب اس نے کہا کہ پروردگار! قیامت تک کے لیے مہلت چاہتا ہوں۔ تو اللہ نے کہا۔ جا تجھے مہلت دی گئی۔

---

(۱) متفق علیہ۔

دعا کی ایک شرط الحاح و تکرار بھی ہے۔ عبداللہ بن مسعود کا کہنا ہے۔

کان علیہ السّلام اذا دعا دعا ثلاثا و اذا سئل سئل ثلاثا۔	آں حضرت جب دعا مانگتے تو تین تین مرتبہ اسے دُہراتے۔ اور اللہ سے کچھ طلب کرتے تو تین تین مرتبہ اس طلب کا اعادہ کرتے۔

کبھی کبھی مصالح الٰہیہ کے ماتحت اجابتِ دعا میں تاخیر بھی ہو جاتی ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ بلکہ اس پر بھی پُر امید رہنا چاہیے۔

دعا کا آغاز کن کلمات سے ہو؟

دعا کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس کا افتتاح کن کلمات سے ہونا چاہیئے۔

سلمہ بن اکوع کہتے ہیں۔

ماسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستفتح الدعاء الا استفتحہ بقول سبحان ربی الاعلی الوھاب۔ (۱)	میں نے آں حضرت صلعم کو دعا مانگتے دیکھا ہے آپ نے جب بھی دعا مانگی پہلے سبحان ربی الاعلی الوہاب کہا۔

اس کا ترجمہ یہ ہے:- میں اُس پروردگار کی تسبیح بیان کرتا ہوں جو بالا و برتر ہے۔ اور بخشنے اور عطا کرنے والا ہے۔

ابو سلیمان الدارانی کی رائے دوسری ہے۔ ان کا قول ہے۔ کہ دعا کو کلمات درود سے شروع ہونا چاہیے۔ اور درود ہی پر ختم ہونا چاہیے۔ اس کی حکمت اُنھوں نے یہ بیان فرمائی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اگر دعا کے اول و آخر کو قبول فرمائے گا۔ تو اس کے درمیانی حصّہ کو شرفِ اجابت سے محروم نہیں رکھے گا۔ یہی رائے حضرت ابو درداء اور ابو طالب مکی کی ہے۔

---

(۱) مستدرک۔

قبولیت کی آخری اور بنیادی شرط
توبہ وانابت الی اللہ اور لوگوں

قبولیتِ دعا کی بنیادی اور آخری شرط

کے مجلسی وانفرادی حقوق کی رعایت ملحوظ رکھنا ہے۔ کعب الاحبار کا کہنا ہے ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں ہولناک قحط پڑا۔ لوگ نماز استسقار کے لیے نکلے۔ اور اللہ سے بارش کے لیے رو رو کر دعا مانگی۔ مگر بارش نہ ہوئی دوبارہ اکٹھے ہوئے۔ پھر تضرع والحاح سے دعا مانگی نتیجہ پھر وہی تھا۔ ابر رحمت کو جوش میں نہ آنا تھا نہ آیا۔ تیسری مرتبہ جب جمع ہوئے تو حضرت موسیٰ کو اللہ تعالےٰ نے بتایا۔ کہ میں تمہاری دعا کیوں کر سنوں۔ جب کہ اس بھیڑ میں جو تمہارے ساتھ ہے ان میں کچھ لوگ چغلی کھانے والے بھی ہیں۔ پھر جب سب لوگوں نے اِس فعلِ شنیع سے توبہ کی۔ تو موسلا دھار بارش ہوئی۔ اسی طرح کا ایک قصہ مالک بن دینار نے یوں بیان کیا ہے۔ کہ ایک دفعہ بنی اسرائیل شدید قحط سے دوچار ہوئے۔ کئی بار دعا کے لیے جمع ہوئے اور روئے دھوئے۔ مگر بارش نہ ہوئی۔ آخر ان کے پیغمبر کے ذریعہ اُن کو بتایا گیا۔ کہ تم قبولیت کی توقع کس برتے پر کر رہے ہو۔ جب کہ تمہارے جسم ناپاک ہیں۔ تمہارے ہاتھ دوسروں کے خون سے آلودہ ہیں۔ اور تمہارے پیٹ کے خلا حرام سے پُر ہیں۔ انھیں کے بارہ میں یہ حکیمانہ اور عبرت آفریں قول مروی ہے۔ کہ لوگوں نے ان سے استسقار کی درخواست کی۔ تو انھوں نے جواب میں کہا:

انکم تستطلیون المطر — تمہیں تو اس پر تعجب ہے۔ کہ بارش میں اس درجہ تاخیر کیوں ہو رہی ہے

وانا استبطئ الحجارۃ۔ — اور مجھے اپنے اعمال کے پیشِ نظر اس پر تعجب ہے۔ کہ پتھراؤ کیوں نہیں ہوتا۔ اور ہم زندہ

کیوں ہیں ۔

دعا کے وطلب کے الفاظ کیسے ہونے چاہییں؟

دعا اور طلب کا لب و لہجہ کیا ہونا چاہیے ۔ اس کا انداز حضرت عباس کے دعائیہ کلمات سے لگائیے ۔ ان سے جب حضرت عمر نے استسقاء کے سلسلہ میں توسل چاہا ۔ تو انھوں نے ان الفاظ میں دعا مانگی ۔

اللهم انه لم ينزل بلاء
من السماء الا بذنب ولم
يكشف الا بتوبة وقد توجه
بي القوم اليك لمكاني من
نبيك صلى الله عليه وسلم
وهذه ايدينا اليك بالذنوب
ونواصينا بالتوبة ، وانت الراعي
لا تهمل الضالة ولا تدع
الكسير بدار مضيعة فقد
ضرع الصغير ورق الكبير و
ارتفعت الاصوات بالشكوى
وكنت تعلم السر واخفى اللهم
ناغثهم بغياثك قبل ان يقنطوا
فيهلكوا فانه لا ييأس من
روح الله الا الكافرون ۔

اے پروردگار جب بھی کوئی آزمائش
آسمان سے نازل ہوتی ہے ۔ تو گناہ
کے سبب ۔ اور جب بھی اس آزمائش
سے چھٹکارا ملتا ہے ۔ تو توبہ کی وجہ سے
اس جماعت نے میرے توسط سے
تیری طرف رجوع کیا ہے ۔ اور اس
پر میرا تیرے رسول سے ایک رشتہ
اور تعلق ہے ۔ یہ ہمارے ہاتھ جو گناہوں
سے آلودہ ہیں ۔ دعا میں اٹھ رہے
ہیں ۔ اور ہماری پیشانیاں از راہ توبہ
تیرے حضور جھکی ہیں ۔ تو اس گلے کا
نگران ہے ۔ اور تیری عادت بھولے
بھٹکے جانور کو چھوڑ دینے ۔ اور چوٹ
کھائے ہوئے زخم کو ہلاک کر دینے
کی نہیں ۔ چھوٹے بڑے سب تیرے
آگے تضرع سے کھڑے ہیں ۔ اور شکوہ کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں ۔ اور تو تو دلوں کے

مخفی بھیدوں تک سے آگاہ ہے ۔ پروردگار! انھیں اپنی رحمت سے ، اس سے قبل سرابور کر، کہ یہ مایوس ہو کر ہلاکت کا شکار ہو جائیں ۔ کیونکہ اللہ کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوتے ہیں ۔

تہذیب و آداب

کھانے پینے کے مسائل

غذا کا تعلق دین سے صحت و توانائی کے بغیر اطاعت کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک مذہب کے نصب العین اور مقاصد عالیہ کا تعلق ہے۔ اصل چیز تو یہ ہے۔ کہ انسان دیدار الٰہی کی نعمت سے بہرہ مند ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کے لقاء کا اپنے کو سزاوار ثابت کر سکے۔ لیکن کھانے پینے کے مسائل اور جزئیات کا تعلق چونکہ اس نصب العین کے ساتھ بالواسطہ ہے۔ اس لیے ان کی تفصیلات بھی بیان کرنا ضروری ہیں۔ یہ تعلق کیونکر بالواسطہ اس نصب العین کے حصول کو قریب تر اور سہل کر دیتا ہے۔ اس کو یوں سمجھیے۔ کہ علم و عمل کے بغیر لقاء اور اتصال کی یہ نعمت حاصل ہونے والی نہیں۔ اور علم و عمل کی استواریاں موقوف ہیں اس پر کہ جسم توانا اور تندرست ہو۔ اور یہ توانائی چاہتی ہے کھانے پینے کی ایک مخصوص مقدار اور کیفیت کو۔ لہٰذا عمل و علم کا ایک جز یہ کھانا پینا بھی ہوا۔ اسی حقیقت کی طرف ایک بزرگ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

الاکل من الدین۔ کھانا پینا بھی دین میں داخل ہے۔

اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس پر قرآن نے روشنی ڈالی ہے۔

کلوا من الطیبٰت و مومنو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور

اعملوا صالحا۔ (مومنون - ۵۱) نیک عمل کرو۔

غرض یہ ہے کہ ہمارا کھانا پینا، حیوانات کی طرح آزادانہ نہیں۔ کہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں۔ کھائیں پیئیں۔ بلکہ اس پر کچھ پابندیاں اور قیود عائد ہوتی ہیں اور اس کے کچھ آداب و سنن اور طریق مقرر ہیں۔ اس لیے کہ حیوانات جو کھاتے پیتے ہیں۔ تو صرف اس لیے کہ ان کی فطرتِ حیوانی کا تقاضہ ہے۔ اور ہمارا کھانا پینا علاوہ اس کے اس مقصد کے لیے بھی ہے۔ کہ ہم اطاعتِ الٰہی کے لائق ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کھانے پینے میں ہم شریعت کے قواعد اور اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ تو اس پر ہمیں اللہ کی طرف سے اجر و صلہ بھی ملتا ہے۔ اگرچہ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم نے اپنے جسمانی تقاضوں کو پورا کیا ہے اور کوئی مذہبی اور دینی خدمت انجام نہیں دی۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔

ان الرجل لیوجر حتی فی اللقمۃ التی یرفعھا الی فیہ والی فی امرأتہ۔ (۱)

انسان کو اس لقمہ پر بھی اجر ملتا ہے جو وہ اُٹھا کے اپنے منہ میں ڈالتا ہے۔ یا اپنی بیوی کے مُنہ میں ڈالتا ہے۔

کھانے سے پہلے بھی آداب اور شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ سات ہیں:۔

کھانا حلال و طیب ہونا چاہیئے ظاہری پاکیزگی بھی ضروری ہے

اول:۔ کھانا حلال اور طیب ہو۔ اور ایسے ذرائع سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ جو شرعاً ممنوع ہیں۔ یا جن میں کوئی کراہت پائی جاتی ہو۔ اکل حلال کی اہمیت کس درجہ زیادہ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قتل نفس سے روکا ہے۔ وہاں اس کا آغاز اس

---

(۱) بخاری۔

رح کیا ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل (نساء ۲۹) — مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔

اس کے بعد فرمایا۔

ولا تقتلوا انفسکم (نساء ۔ ۲۹) — اور اپنے درمیان قتل و فساد کی آگ نہ جلاؤ۔

اس کا یہ معنی ہوا کہ حرام خوری قتل نفس سے بھی زیادہ مجرمانہ فعل ہے۔

ثانی:۔ ہاتھ دھونے چاہئیں۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں کہ ان سے کیا کیا کام لیا گیا ہو اور کس کس نوع کی آلائشوں سے یہ آلودہ ہوا لہذا پاکیزگی اور نظافت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ کھانے سے پہلے طہارت کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیا جائے۔

آں حضرت کا ارشاد گرامی ہے۔

الوضوء قبل الطعام ینفی الفقر وبعدہ ینفی اللمم (۱) — کھانے پینے سے پہلے ہاتھ دھو لینا۔ فقر و افلاس کو دور کرتا ہے۔ اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینے سے جنون کا عارضہ لاحق نہیں ہوتا۔

ثالث:۔ دسترخوان بجائے میز اور چوکی کے زمین پر بچھایا جائے۔

کھانے کے سلسلہ میں تواضع کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ چوکی یا میز پر کھانا چننا بدعت نہیں۔

حضرت انس بن مالک کا کہنا ہے۔

ما اکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی خوان ولا فی — آں حضرت نے نہ تو کبھی چوکی پر رکھ کر کھانا تناول فرمایا ہے۔ اور نہ تھال میں

سکرجۃ۔ (۱) سمجا کر۔

اس انداز کو آں حضرت نے اس لیے پسند فرمایا کہ اس میں تواضع کی جھلک پائی جاتی ہے۔ کھانے کے سلسلہ میں آں حضرت کے بعد کن چیزوں میں تغیر پیدا ہوا۔ اس کو ایک صاحب نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

اربع احدثت بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المرائد والمناقل والاشنان والشبع	آں حضرت کے بعد چار بدعات ظہور پذیر ہوئیں۔ کھانے کی چوکیاں چھلنی۔ اشنان اور بھرپیٹ کھانا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے تو ان چاروں کا بدعات ہونا صحیح ہے۔ لیکن کیا یہ شرعاً بھی بدعات ہیں؟ یہ مسئلہ قدرے توضیح کا متقاضی ہے۔ جہاں تک چوکی پر کھانا رکھ کر کھانے کا تعلق ہے۔ سوچنے پر بھی اس میں کوئی دینی قباحت ہمیں معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا مقصد تو صرف اسی قدر ہے۔ کہ کھانا سطح زمین سے ذرا اونچا ہو جائے۔ تاکہ کھانے میں آسانی رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آں حضرت کے زمانہ میں میز یا چوکیوں کا رواج نہ تھا۔ مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ یہ بدعت یا بُرائی ہے۔ اس لیے کہ بدعت کا اطلاق ہر کام پر نہیں ہوتا۔ چاہے وہ نیا ہی ہو۔ بلکہ ایسے نئے کاموں کو بدعت سے تعبیر کریں گے جن میں کسی سنت ثابتہ کی مخالفت پائی جائے۔ جس سے کسی شرعی امر کا رفع لازم آئے جب کہ اس کا باقی رکھنا ضروری ہو۔

ہر نئی اور محدث شئی بدعت نہیں کیونکہ کبھی کبھی محدثات امور ضروری اور واجب ہو جاتے ہیں۔	ہمارے نزدیک تو محدثات امور میں فی نفسہ کوئی برائی نہیں یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو حالات

---

(۱) بخاری۔

کی تبدیلیوں سے یہ محدثات ضروری اور واجب ہو جاتے ہیں۔ چوکی یا میز پر کھانا کھانے میں البتہ اس چیز کا خیال رہنا چاہیے۔ کہ اس سے مقصود تیسّر اور آسانی ہے۔ تکبر اور غرور یا شان و شکوہ کا اظہار نہیں۔

اشنان یا صابون ایسی چیزوں کے استعمال میں جس سے ہاتھ بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ اور ہر نوع کی آلائش دور ہو جاتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ کوئی قباحت نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح کا استحسان ہے۔ کیونکہ جس قدر اُن کے استعمال سے صفائی ستھرائی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ خالی پانی ڈال دینے یا بہا دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور آں حضرت کے زمانے میں ان چیزوں کا رواج نہیں تھا۔ بلکہ اس کے دوسرے کئی اسباب تھے۔ مثلاً یہ کہ لوگ اس کے عادی نہ تھے۔ یا اُن کو یہ چیزیں میسر نہ تھیں۔ اور یا اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کے سامنے اس سے بھی زیادہ اہم اور توجہ طلب امور تھے۔ کہ جن کی انجام دہی میں یہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہیں رکھ پائے۔

چھلنی کو بھی اسی پر خیال کیجیے۔ اس کے استعمال میں بھی قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے یہ بھی از قبیل مباحات ہے۔ بشرطیکہ اس سے تنعم مفرط کے داعیات نہ اُبھرتے ہوں۔ اور غرض صرف چوکھر کو آٹے سے الگ کرنا ہے۔ ہاں بھر پیٹ کھانا ضرور مفاسد کا حامل ہے۔ اس سے طرح طرح کی بیماریاں جسم میں پیدا ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ شہوات و جذبات میں تحریک و تہیج پیدا کرتا ہے۔

بیٹھنے کا انداز

رابع:۔ کھانے سے پہلے بیٹھنے کا آسان اور عمدہ سا انداز اختیار کرے اور پھر اس پر قائم رہے۔ آنحضرت کا معمول یہ تھا۔ کہ آپ کبھی تو اُکڑوں بیٹھ کر کھانا نوش فرماتے۔ اور کبھی ایک زانو ہو کر۔ اور بہرحال ایسی وضع اور انداز ہرگز اختیار نہ کرے۔ کہ جس میں کبر و غرور کے آثار پائے

چاہئیں۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

انما انا عبدٌ اکل کما یاکل العبد واجلس کما یجلس العبد۔

میں تو اللہ کا ایک غلام ہوں۔ اس لیے اسی طرح کھاتا ہوں جس طرح ایک غلام کھاتا ہے اور اسی طرح بیٹھتا ہوں جس طرح ایک غلام بیٹھتا ہے

ٹیک لگا کر کھانا پینا منع ہے۔ اور معدہ کے لیے مضر بھی ہے۔ ہاں اگر تنکل کی قسم کی کوئی چیز ہو۔ تو لیٹے لیٹے بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

کھانے کا مقصد اطاعتِ الٰہی ہونا چاہیے

ابراہیم بن شعبان کا معمول

خاص:۔ کھانے کا مقصد یہ قرار دے۔ کہ اس طرح جسم میں جو قوت پیدا ہوگی۔ اس کو اطاعتِ الٰہی میں صرف کروں گا۔ تلذذ و تنعم کو نصب العین نہ قرار دے۔ اہل حق کا یہی وتیرہ رہا ہے۔ ابراہیم بن شعبان نے اسی بنا پر کہا ہے۔

منذ ثمانین سنة ما اکلت شيئا لشهوتي۔

اسی برس سے میرا یہ معمول ہے۔ کہ حوائجِ جسم کو پورا کرنے کے لیے کھانا نہیں کھایا۔

لیکن یہ غرض اس وقت پوری ہوتی ہے۔ جب انسان اس کے ساتھ ساتھ تقلیلِ غذا کا بھی عادی ہو۔ کیونکہ بھر پیٹ کھانا کھانے سے عبادت میں وہ ذوق ونشاط پیدا نہیں ہو پاتا۔ جو ہونا چاہیے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا۔

ما ملأ آدمی وعاء شرا من بطنه حسب ابن آدم لقيمات يقمن صلبه فان لم يفعل فثلث طعام وثلث شراب وثلث للنفس۔ (ترمذی)

ابن آدم بطن کے فراخوں کو جو پُر کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی شر نہیں۔ اسے تو چند لقموں پر ہی قناعت کرنا چاہیے جو اس کی پشت کو سیدھا رکھنے میں مدد دیں۔ اور اگر اتنا نہ کر سکے تو پھر ایک تہائی حصہ کھانے کے لیے، ایک

تہائی پانی کے لیے اور ایک تہائی سانس لینے کے لیے رہنے دے۔

اور یہ اُس وقت ہو پائے گا، جب شدید بھوک سے پہلے انسان کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ اور پھر ابھی سیر نہ ہوا ہو۔ اور دستر خوان بڑھا دے۔ تقلیل غذا سے قناعت پیدا ہوگی۔ اور طبیعت عبادات کے لیے تیار اور ہلکی پھلکی رہے گی۔ علاوہ ازیں اس کا بہت بڑا طبی فائدہ یہ ہے۔ کہ ان شاء اللہ اس کے بعد طبیب و معالج کی منت کشی کی بہت کم ضرورت رہے گی۔

تکلفات سے پرہیز کرنا چاہیے

سادس :۔ ماحضر پر اکتفا کرے اور تکلفات و تنعمات کا منتظر نہ ہو۔ حتیٰ کہ سرکہ اور چٹنی تک کی پرواہ نہ کرے۔ کیونکہ کھانے کی جو مقدار اور نوعیت بھی جسم میں فی الجملہ قوت پیدا کرتی ہے۔ اور انسان کو عبادت و اطاعت کے قابل بنا دیتی ہے۔ وہی بہت ہے۔ بلکہ ایسی غذا بجائے خود ایک خیر ہے جس کی تحقیر جائز نہیں۔ یہی سبب ہے اگر کھانا موجود ہو۔ اور نماز کا وقت بھی ہوگیا ہو۔ تو شریعت کا حکم یہ ہے۔ کہ پہلے کھانا کھائے۔ پھر نماز پڑھے۔ بشرطیکہ نماز کے وقت میں گنجائش اور وسعت پائی جاتی ہو۔ حدیث میں ہے۔

اذا حضر العشا و العشاء فابدءوا بالعشاء۔ — جب عشا کا وقت ہو جائے۔ اور عشا کا کھانا بھی موجود ہو۔ تو پہلے کھانا کھالو۔

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ وہ اس رخصت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ یعنی بارہا ایسا ہوا۔ کہ قرآت کی آواز اُن کے کانوں میں پہنچی اور وہ نماز کے لیے اُٹھے نہیں۔ بلکہ کھانے میں مشغول رہے۔

لیکن یہ رخصت کوئی کلیہ نہیں ہے۔ اگر کھانے کے لیے طبیعت میں رغبت نہ ہو۔ اور نہ کھانے سے کوئی ضرر لاحق نہ ہوتا ہو۔ تو اس صورت میں تقدیم صلوٰۃ اولیٰ ہے

اور اگر تاخیر میں یہ خطرہ ہو کہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ یا دل پر اس کا خیال بُری طرح مستولی رہے گا۔ اور نماز میں وہ سکون حاصل نہ ہو سکے گا۔ جو نماز کی جان ہے تو اس صورت میں تقدیم طعام ہی میں بھلائی ہے۔

سابع :۔ تنہا کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے

تنہا خوری سے اجتناب اور کوشش کرنا چاہیے کہ کچھ اور لوگ بھی شریک ہو جائیں۔ جیسے بیوی بچے۔ دوست احباب وغیرہ۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

اجتمعوا علی طعامکم یبارك لکم فیہ ۔ (۱)

کھانا کھاؤ تو اکٹھے کھاؤ۔ اللہ تعالے اس میں تمھیں برکت عطا کرے گا۔

خود حضور کی عادتِ مبارکہ یہ تھی۔ کہ عموماً تنہا نہیں کھاتے تھے۔ حدیث میں ہے۔

خیر الطعام ما کثرت علیہ الایدی ۔

بہترین طعام وہ ہے جس میں کئی کھانے والے شریک ہوں۔

---

(۱) ابو داؤد ۔

کھانا کھاتے وقت کن چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے

کھانا کھانے کے ضروری آداب سب سے پہلے بسم اللہ پڑھنا چاہیے جب کھانے سے فراغت ہو چکے تو الحمد للہ کہنا چاہیے۔ اور اگر ہر ہر لقمہ پر بسم اللہ پڑھے تو کیا کہنے۔ یہ بہترین عادت ہے۔ بسم اللہ جہر پڑھے تو اور بھی اچھا ہے۔ تاکہ سننے والے کو بھی یاد دلائے۔ دائیں ہاتھ سے کھائے۔ لقمہ چھوٹا اٹھائے۔ اور خوب چبا چبا کر کھائے۔ اور جب تک پہلا لقمہ نگل نہ لے۔ دوسرے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ کھانے کی مذمت نہ کرے۔ بلکہ جو بھی میسر ہو۔ اس کو مغتنم جانے۔ اور ادنیٰ تکدر کا اظہار کیے بغیر کھائے۔ آں حضرت کا اس سلسلہ میں معمول یہ تھا۔ کہ کبھی بھی کھانے کی تحقیر نہ فرماتے۔ بلکہ جو بھی سامنے چن دیا جاتا۔ اُسے بخوشی کھا لیتے۔ اور اگر کسی وجہ سے پسندِ خاطر نہ ہوتا۔ تو میلان کا اظہار ہی نہ فرماتے۔ اور کھانے پر آمادہ ہی نہ ہوتے۔ کھانے کے ضروری آداب میں ایک یہ بھی ہے۔ کہ کھانا کھاتے وقت انسان اسی حصہ پر اکتفا کرے جو اس کے سامنے ہو۔ ادھر اُدھر ہاتھ چلانے سے گریز کرے۔ حدیث میں ہے۔

کل مما یلیک۔ اپنے سامنے سے کھاؤ۔

اگر دستر خوان پر مختلف قسم کے میوے رکھے ہوں۔ تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کہ حسبِ پسند جو چاہے اُٹھا لے۔ اور کھائے۔

روٹی کے ساتھ ہاتھ نہیں پونچھنا چاہیے۔ اس کے احترام کے منافی ہے

سالن اگر گرم ہو۔ تو اُسے پھونک پھونک کر ٹھنڈا کرنا بھی درست نہیں۔
پانی بھی جب پیئے۔ تو گلاس یا کوزہ دائیں ہاتھ سے پکڑنا چاہیے۔ کھڑے
کھڑے یا لیٹے لیٹے نہ پینا چاہیے۔ ایک حدیث میں آتا ہے۔ آں حضرت نے
کھڑے کھڑے پانی پیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ کسی عذر کی بنا پر ہوگا۔
کھانا یا پانی اگر کسی مجلس میں تقسیم کرنا ہو۔ تو اس کو بھی داہنے ہاتھ سے
شروع ہونا چاہیے۔

ایک ساتھ کھانا کھانے کے آداب

اسلامی تہذیب کھانے پینے سے متعلق کن لطائف کی حامل ہے؟ شرائط و آداب کی نشان دہی

یہ تو آپ معلوم کر چکے ۔ کہ تنہا خوری کوئی اچھا فعل نہیں ہے ۔ اگرچہ بعض حالات میں اسے ناجائز بھی نہیں کہا جاسکتا ۔ تاہم اسلام مل ملا کر کھانے کو بہتر قرار دیتا ہے ۔ اور اس کے آداب و شرائط کی تعیین کرتا ہے ۔ وہ کیا آداب و شرائط ہیں ؟ ان کا ہم یہاں مختصراً تذکرہ کیے دیتے ہیں ۔

(۱) جب یہ معلوم ہو کہ مجلس میں کچھ لائق احترام بزرگ موجود ہیں ۔ تو خود آغاز نہ کرے ۔ بلکہ پہلے اُن بزرگوں کو موقع دے ۔ کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائیں ۔ ہاں اگر یہ صاحب خانہ ہو اور لوگ منتظر ہوں کہ یہ شروع کرے تو ہم بھی شروع کریں ، تب اس صورت میں البتہ اُن کو انتظار اور کش مکش کی زحمت سے بچانا ضروری ہے ۔

(۲) کھاتے وقت گفتگو ، بات چیت اور حکایاتِ صلحاء کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے ۔ چُپ چاپ اور خاموشی سے کھانے میں مشغول رہنا عجم کا شیوہ ہے ، عربوں کا نہیں ۔

(۳) جو لوگ کھانے میں شریک ہیں کوشش کرے ۔ کہ کوئی چیز ان سے زیادہ نہ کھائے ۔ بلکہ ایثار سے کام لے ۔ یہ بہت ہی موزوں ہے ۔ کسی کو کھانے پر مجبور بھی نہ کرے ۔ ہاں دو تین مرتبہ کہنا ضرور چاہیے ۔ اس سے زیادہ کہنے کے معنی یہ ہیں کہ

خواہ مخواہ اصرار کیا جا رہا ہے جو درست نہیں۔

(۴) بعض لوگ کھانے میں اس درجہ جھینپ محسوس کرتے ہیں۔ کہ ان کو بار بار کھانے کے لیے کہنا پڑتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ بلا تکلف کھانا چاہیے۔ اور حتے الامکان تصنع سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص اس نیت سے کھانے پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارتا ہے۔ کہ دوسروں کی حوصلہ افزائی ہو۔ اور اُن کی جھجک دور ہو۔ تو اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی مضائقہ نہیں۔ بلکہ یہ اولیٰ ہے عبداللہ بن مبارک کا یہ معمول تھا۔ کہ وہ زیادہ کھانے پر انعام مقرر کرتے۔ اور کہتے، جو زیادہ خرمے کھائے گا۔ میں اُن کو فی خرما کے حساب سے اتنے ہی درہم دوں گا۔ بے تکلفی سے کھانا کس درجہ بہتر ہے۔ اس کے بارہ میں جعفر صادق کا یہ قول ملاحظہ ہو۔

تتبین جودۃ محبۃ الرجل لاخیہ بجودۃ اکلہ فی منزلہ۔

ایک شخص کے دل میں اپنے بھائی کے لیے کتنی محبت ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ کہ یہ اس کے گھر میں کس بے تکلفی سے کھانا کھاتا ہے۔

(۵) طشت میں منہ ہاتھ دھونا جائز ہے۔ اگر کوئی تنہا ہو تو اس میں ناک سنکنے اور صاف کرنے میں بھی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر کئی احباب جمع ہوں تو پھر ناک سنکنا اچھا نہیں۔ اس سے دوسروں کی طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے۔ بعض لوگ احتراماً طشت آگے بڑھا دیتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور اگر کوئی اس طرح کرے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے۔ سلف سے اس کی مثال ملتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انس بن مالک اور حضرت ثابت بنانی کا ایک مجلس میں اجتماع ہوا۔ حضرت انس از راہ

تواضع اُن کی طرف طشت بڑھایا۔ تو انہیں قبول کرنے میں تکلف ہوا۔ اس پر اُنھوں نے کہا۔

اذا اکرمک اخوک — جب آپ کا بھائی آپ کی تکریم

فاقبل کرامته۔ — چاہے۔ تو اُسے قبول کر لینا چاہیے۔

بالخصوص اہلِ علم کا اس طرح کی مجالس میں خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ابومعاویہ کو اپنے ہاں دعوت دی یہ آنکھوں سے معذور تھے۔ اس لیے انہیں ابومعاویہ الضریر کے نام سے پکارا جاتا۔ جب ہاتھ دُھلانے کا وقت آیا۔ تو ہارون الرشید نے خود اُن کے ہاتھوں پر پانی انڈیلنا شروع کیا۔ جب یہ ہاتھ دھو چکے۔ تو کسی نے اُن سے کہا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ خدمت کس نے انجام دی۔ جب اُنہوں نے نفی میں جواب دیا۔ تو اُنھیں بتایا گیا۔ کہ آپ کے ہاتھ دھلانے والے خلیفہ ہارون الرشید تھے۔ اس پر اُنھوں نے دعا دی اور کہا۔

اکرمت العلم و — آپ نے علم کا احترام کیا ہے

اجللته فاجلک الله و — اللہ آپ کے اکرام و اجلال کو روز افزوں

اکرمک۔ — ترقی دے۔

سادس:۔ کھانے کے دوران دوستوں کی طرف نہ تو دیکھے۔ اور نہ کوئی ایسی حرکت کرے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ اسی طرح جب تک تمام احباب کھانے سے فارغ نہ ہو لیں۔ کھانے سے ہاتھ نہ اُٹھائے۔ اور بھوک نہ بھی ہو۔ جب بھی کچھ نہ کچھ کھاتا رہے۔

سابع:۔ اس چیز کا پورا خیال رکھے۔ کہ اس کے کسی عمل سے کھانے والے کراہت و تکدر محسوس نہ کریں۔ مثلاً اگر منہ سے کوئی آدھ چبا

نوالہ نکالتا ہے۔ تو اپنا رُخ پھیر لے۔ اور بائیں طرف جُھک کر اس طرح ڈال دے کہ دوسروں کی اس پر نظر نہ پڑے۔ اسی طرح نہ تو چٹنی کو سالن کی پلیٹ میں ڈالے اور شوربے میں لقمہ بھگو کر پھر چٹنی اور سرکہ وغیرہ میں تر نہ کرے۔ کہ یہ چیزیں دوسروں کے لیے گِھن اور نفرت کا باعث ہوتی ہیں۔

مہمان نوازی

دوستوں اور عزیزوں کی مہمان نوازی کے بارے میں کچھ لطائف ملاحظہ ہوں۔ حضرت جعفر بن محمد رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے۔

اذا قعدتم علی المائدۃ فاطیلوا الجلوس فانہا ساعۃ لا تحسب علیکم من اعمارکم۔

جب تم دسترخوان پر بیٹھو۔ تو نشست کو طول دو۔ کیونکہ یہ ایسی گھڑیاں ہیں۔ جو تمہاری عمر میں محسوب نہ ہوں گی۔

جناب حسن فرماتے ہیں:۔

کل نفقۃ ینفقہا الرجل علی نفسہ وابویہ فمن دونہم یحاسب علیہ البتۃ الا نفقۃ الرجل علی اخوانہ فان اللہ یستحی ان یسئلہ عن ذلك۔

انسان جتنی رقم بھی اپنی ذات پر، یا والدین اور اُن سے کم درجے کے عزیزوں پر خرچ کرتا ہے۔ اس سب کا حساب ہو گا۔ سوا اس رقم کے جو وہ اپنے بھائیوں اور دوستوں پر خرچ کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کا حساب طلب کرنے میں شرماتے ہیں۔

حضرت علی کا قول ہے۔

لان اجمع اخوانی علی صاع من طعام احب الی من ان اعتق رقبۃ۔

میرے نزدیک ایک صاع کھانے پر احباب کا جمع ہونا، ایک غلام آزاد کرنے سے بہتر ہے۔

عبداللہ بن عمر اکثر فرمایا کرتے تھے۔

من كرم المرء طيب زاده في سفره وبذله لاصحابه -

انسان کی شرافت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ اُس کے زادِ راہ کی نوعیت کیا ہے۔ اور وہ اپنے احباب کے لیے کیسے خرچ کرتا ہے

مہمان نوازی اور اپنے اقربا کو کھانا کھلانے میں کیا اجر ہے۔ جو ملنے آئیں اس کے متعلق کئی احادیث ہیں۔ ایک جگہ ہے۔

يقول الله تعالى للعبد يوم القيامة يا ابن آدم جعت فلم تطعمني فيقول كيف اطعمك وانت رب العالمين - فيقول جاع اخوك المسلم فلم تطعمه ولو اطعمته كنت اطعمتني -

اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنے بندے سے فرمائے گا۔ اے ابن آدم میں بھوک سے لاچار ہوا۔ لیکن تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ بندہ کہے گا۔ میں آپ کو کیسے کھلا سکتا تھا۔ جب کہ آپ پوری کائنات کے پروردگار ہیں۔ اللہ فرمائے گا۔ تمہارا ایک مسلمان بھائی بھوک سے لاچار ہوا۔ لیکن تو نے اُسے نہیں پوچھا۔ تو اگر اُس کو کھانا کھلا دیتا۔ تو گویا مجھے کھلاتا۔

ایک حدیث میں ہے۔

اذا جاءكم الزائر فاكرموه

جب کوئی تم سے ملنے آئے تو تکریم سے پیش آؤ۔

خيركم من اطعم الطعام

تم میں کا بہترین وہ ہے جو دوسروں کو کھانا کھلاتا ہے۔

کھانے کے اوقات میں کسی کے ہاں جا دھمکنا جائز نہیں۔ استثنا کی صورتیں

لیکن اس مہمان نوازی اور دعوت کے بھی کچھ آداب اور حدود ہیں مثلاً کسی شخص کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے عین کھانے کے اوقات میں اُن سے ملنے جائے۔ یہ مفاجات

(اچانک پہنچ جانا) اور تربص (انتظار) ہے۔ جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔
قرآن حکیم میں ہے۔

لا تدخلوا بیوت النبی — مومنو! پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو۔
الا ان یؤذن لکم الی طعام — مگر اس صورت میں کہ تم کو کھانے کی اجازت
غیر ناظرین اناہ ۔ (احزاب۔ ۵۳) — دی جائے اور اس کے پکنے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔

آں حضرت نے اِس عادت سے سختی سے روکا ہے۔ حدیث میں ہے۔

من مشٰی الی طعام لم — جو شخص کھانے کے لالچ میں چل کھڑا ہوتا
یدع الیہ مشٰی فاسقا و — ہے۔ حالانکہ اُسے دعوت نہیں دی گئی۔ تو
اکل حراما۔ — اُس نے فسق مول لیا اور حرام کھایا۔

ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اچانک کسی کے ہاں پہنچ جائے۔ اور اسے اُن کے کھانے کے اوقات معلوم نہ ہوں۔ ایسی صورت میں اگر اُسے کھانے کے لیے کہا جائے۔ تو اُسے قبول کرنا چاہیے۔ یا نہیں۔ اس مسئلہ میں غور طلب بات درا صل یہ ہے کہ آیا یہ دعوت بر بنائے محبت و اخلاص ہے۔ یا محض شرما حضوری کی وجہ سے ہے۔ اگر پہلی صورت ہے۔ تو قبول کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ اگر دوسری صورت ہے۔ تو بہتر یہی ہے کہ ٹال جائے اور نہ کھائے۔

ایک اور صورت ہے۔ کہ ایک شخص تعلقاتِ اخلاص و مؤدت کی بنا پر اپنے بعض دوستوں کے ہاں اس ارادے سے جاتا ہے۔ کہ وہاں کھانا کھائے گا۔ اس لیے کہ صاحب خانہ اُن کی اس طرح کی آمد کو مغتنم سمجھ کر اسے اپنے لیے باعث برکت و سعادت قرار دیتا ہے۔ اِس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حدیث میں آتا ہے ایک مرتبہ آں حضرتؐ حضرت ابو بکر صدیق، ابو الہیثم، ابو ایوب انصاری کے مکان پر خاص کھانے کی نیت سے تشریف لے گئے۔ اور کھانا تناول فرمایا۔

کسی دوست کی غیر حاضری میں ازراہِ بے تکلفی اس کے ہاں چلا جانا اور کھا لینا جائز ہے

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے آپ کسی عزیز یا دوست کے مکان پر اس کی غیر حاضری میں اچانک پہنچ گئے۔ اور ازراہِ بے تکلفی خود ہی کھا پی بھی لیا۔ اس کی بھی اس شرط کے ساتھ اجازت ہے۔ کہ آپ کو پہلے سے یہ یقین ہو۔ کہ صاحب خانہ کو جب آپ کی اس بے تکلفی اور اظہارِ مودت کا علم ہو گا۔ تو وہ اس پر خفا تو کیا ہو گا۔ اُلٹا خوش ہو گا۔ کہ آپ نے اس درجہ اس پر اعتماد کیا۔ اور اُس کو اپنا سمجھا۔ اس کی مثال بھی آں حضرت کے اُسوہ سے ملتی ہے۔ آں حضرت بریرہ کی غیر حاضری میں اس کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اور دیکھا کہ کھجوریں رکھی ہیں۔ آپ نے بے تکلف تناول فرمائیں۔ قرآنِ حکیم میں بھی اس اجازت کی طرف اشارہ ہے۔

او صدیقکم۔ (نور۔ ۶۱) یا اپنے دوستوں کے گھروں سے (یعنی اُن کے ہاں بھی تم کھا سکتے ہو۔)

آں حضرت کے علاوہ سلف میں بھی اس بے تکلفی کے اکثر واقعات ملتے ہیں چنانچہ محمد بن واسع اور اُن کے دوستوں کا معمول تھا۔ کہ اکثر حضرت حسن کی غیر حاضری میں اُن کے مکان پر آتے۔ اور جو کچھ پاتے کھا جاتے۔ اُن کو جب اِس بے تکلفی کا علم ہوتا تو بدرجۂ غایت محظوظ ہوتے۔ اور فرمایا کرتے۔

ھکذا کنا۔ ہمارا معاملہ بھی اپنے دوستوں سے اسی طرح کا رہا ہے۔

خود حضرت حسن کے بارہ میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہشام نے انہیں دیکھا کہ بازار میں بقال کی دکان پر کھڑے پھل کھا رہے ہیں۔ اور وہ بھی اُس کی اصطلاحی اجازت لیے بغیر اس انداز سے کہ کبھی انجیر اُٹھاتے ہیں۔ اور نگل جاتے

ہیں۔ اور کبھی خرما پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ اور منہ میں رکھ لیتے ہیں۔ اس پر ہشام نے اعتراض کیا۔ کہ حضرت یہ کہاں کا تقوٰی ہے۔ کہ دکاندار سے پوچھے بنا اس کے مال پر اس بے دریغی سے ہاتھ صاف کر رہے ہیں! آپ نے کہا۔ ذرا وہ آیت تو تلاوت کیجیے جس میں کھانے پینے کے آداب کا تذکرہ ہے۔ انھوں نے آیت پڑھی اور جب اس لفظ پر پہنچے۔

او صدیقکم۔

تو فرمایا۔ جہاں آپ نے آیت پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہے وہاں دوست کی تعریف بھی بیان کیجیے۔ انھوں نے کہا۔ دوست وہ ہوتا ہے کہ جس سے مل کر قلب و ذہن ایک طرح کی راحت و اطمینان محسوس کرے۔ تو انھوں نے کہا کہ ہر بقال میرا ایسا ہی دوست ہے۔

یہاں تک تو ان آداب کا تعلق تھا جو کسی کے ہاں جانے سے متعلق ہیں۔ اب ہم اُن آداب کا ذکر کرتے ہیں۔ جو کھانا پیش کرنے کے بارے میں ہیں۔

کھانا پیش کرنے کے آداب

اس سلسلہ کی پہلی بات یہ ہے۔ کہ تکلف سے پرہیز کیا جائے۔ اور جو موجود ہو اُس کو مہمان کے سامنے بغیر کسی جھجک کے رکھ دیا جائے۔ اور قرض کی زحمت سے حتے الامکان اپنے کو محفوظ رکھا جائے۔ حضرت فضیل نے تکلف کے مفاسد سے متعلق کتنی حقیقت پر مشتمل بات کہی ہے۔

انما تقاطع الناس بالتکلف یدعو احدھم اخاہ فیتکلف لہٗ۔ فتقطعہ عن الرجوع الیہ۔

لوگوں میں قطع علائق کی رسم تکلف ہی کی وجہ سے پڑی۔ کیونکہ ہوا یہ کہ کسی نے اپنے ایک بھائی کو کھانے پر بلایا۔ اور پھر ایسے تکلف سے کام لیا کہ اُس کو دوبارہ اُس کے ہاں جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔

تکلف کی ایک صورت یہ ہوتی ہے۔ کہ بال بچوں کو بھوکا رکھ کر مہمان نوازی کا فرض انجام دیا جائے۔ یہ بھی غلط ہے۔ حضرت علی کو کسی نے کھانے پر بلایا تو آپ نے فرمایا۔ دعوت منظور ہے۔ مگر تین شرطیں ہیں۔

لا تدخل من السوق شیئاً۔ ولا تدخر ما فی البیت ولا تجحف۔

ایک تو بازار سے کوئی چیز نہ آئے۔ اور گھر میں جو کچھ ہے۔ اس میں سے کچھ بچا کر نہ رکھو۔ نیز بال بچوں کو زحمت میں نہ ڈالو۔

آں حضرت نے بھی تکلف سے روکا ہے۔ حدیث میں ہے۔

قال سلمان امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا نتکلف للضیف ما لیس عندنا وان نقدم الیہ ما حضر۔

حضرت سلمان کہتے ہیں حضورؐ نے ہمیں حکم دے رکھا ہے۔ کہ جو موجود نہ ہو اس کے لیے تکلف نہ برتا جائے۔ اور ماحضر پیش کر دینے پر اکتفا کیا جائے۔

کیا کسی خاص کھانے کی فرمائش کرنا درست ہے؟

دوسری چیز جس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ زائر یا مہمان کھانے کی کوئی چیز خود تجویز نہ کرے۔ اور نہ کسی خاص کھانے پر زور ہی دے۔

بلکہ اگر بہ سبیل تذکرہ مہمان دو تین کھانوں کا ذکر بھی کر دے، تو صاحب خانہ ان میں جو سہل تر ہو۔ اس کو اختیار کرے۔ اور خواہ مخواہ اپنے کو مشقت میں نہ ڈالے لیکن اس میں بھی صاحب خانہ کی استطاعت اور تعلقات کی نوعیت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ اگر صاحب خانہ کی استطاعت

ہے اور فرمائش سے خوش ہوتا ہے۔ تو اپنی طرف سے کھانا تجویز کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ سلف کے واقعات میں اس نوع کی مثالیں ملتی ہیں چنانچہ شافعی جب بغداد گئے۔ اور زعفرانی کے ہاں ٹھہرے۔ تو اُن کا معمول تھا کہ صبح و شام جو کچھ کھانا ہوتا لکھ کر لونڈی کے سپرد کر دیتے۔ اور وہ ان ہدایات کے مطابق کھانا تیار کرتی۔ امام شافعی کو اس پر یہ بے تکلفی سوجھی۔ کہ اسی پر اپنی طرف سے کچھ کھانوں کا اضافہ کر دیتے۔ اور لونڈی سے کہتے۔ یہ بھی پکے گا۔ زعفرانی کو جب معلوم ہوا۔ تو اس پر بے حد خوش ہوئے۔ اور اس خوشی میں اس لونڈی کو آزاد کر دیا۔

ایک صاحب نے اس سلسلہ میں ایک نہایت جامع بات کہی ہے۔

الاکل علی ثلاثۃ انواع	کھانے کی تین قسمیں ہیں۔ فقراء کے
مع الفقراء بالایثار و	ساتھ اتفاق ہو۔ تو ایثار سے کام لے۔
مع الاخوان بالانبساط	دوستوں کے ساتھ کھانا پڑے تو بغیر
و مع ابناء الدنیا بالادب۔	تکلف کے۔ بخوشی کھائے۔ اور ابنائے

دنیا کے ساتھ سابقہ پڑے تو ادب کو ملحوظ رکھے۔

کھانا پیش کرنے سے متعلق تیسرا ادب یہ ہے کہ مہمان اور زائر کے دل میں اشتہا و رغبت کے دواعی کو اُکسانے کی کوشش کرے۔ اور اُسے بتلائے کہ کھانا کس درجہ لذیذ ہے۔ کتنا عمدہ اور صحت بخش ہے۔ اور اس کو کیوں کھانا چاہیے۔

چوتھا ادب یہ ہے کہ مہمان سے یہ نہ پوچھے۔ کہ کیوں حضرت کھانا لاؤں۔ بلکہ جو کچھ بھی موجود ہے۔ وہ حاضر کرے۔ ثوری کا قول ہے۔

اذا زارك اخوك فلا	جب کوئی تیرا بھائی تجھے ملنے کے لیے
تقل لہٗ اتاکل او اقدم	آئے۔ تو یہ نہ کہو کہ کیا کھانا کھاؤ گے؟

الیك ولکن قدم، فان اکل و الا فارفع۔

یا میں کھانا پیش کر دوں۔ بلکہ کھانا لے آؤ۔ اور پیش کر دو۔ اگر وہ کھالے تو فبہا ورنہ اُٹھا لو۔

مہمان کے ساتھ بہر حال اس کے ذوق و حاجت کے مطابق معاملہ ہونا چاہیے ایک صوفی کا کہنا ہے۔

اذا دخل علیکم الفقراء فقدموا الیھم طعاما۔ و اذا دخل الفقہاء فسئلوھم عن مسئلۃ۔ و اذا دخل القراء فدلوھم علی المحراب۔

اگر تم سے ملنے کوئی فقیر آئے۔ تو اُسے کھانا کھلاؤ۔ اگر فقیہ آئے تو اُس سے مسائل پوچھو۔ اور اگر کوئی قاری آئے تو اُس کو محراب کا پتہ دو۔ یعنی اس سے قرآن سنو۔ اور اس کے پیچھے نماز پڑھو۔

آدابِ دعوت

دعوت کے سلسلہ میں چھ مقام ہیں مقامِ اوّل یہ کہ دعوت نہایت اچھی عادت ہے اس کے فضائل کی توضیح

دعوت و ضیافت کے چھ مقام ہیں۔ جن کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دعوت، اجابتِ دعوت، قبولیت تعظیم طعام، کھانا اور اس کے بعد چل دینا۔ مقام دعوت کی اہمیت و فضیلت۔ ملاحظہ ہو۔ آنحضرت کا ارشاد ہے۔

لا خیر لمن لا یضیف۔ (۱)

وہ شخص کوئی بھلا آدمی نہیں ہے جو دعوت نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ حضور کا گذر ایک شخص پر ہوا۔ جو اچھا خاصا مالدار تھا۔ اُس کے پاس اونٹ، گائے بھیڑ بکری کیا نہیں تھا۔ لیکن اس نے اس کے باوجود حضور کو کھانے کی دعوت نہ دی۔ پھر آپ کا گذر ایک ایسی عورت پر ہوا۔ جس کے پاس چند بکریاں ہی تھیں۔ مگر اُس نے دعوت دی۔ بکری ذبح کی۔ اور مہمان نوازی کا شرف حاصل کیا۔ اس پر حضور نے فرمایا۔

انظروا الیھما انما ھذہ الاخلاق بید اللہ فمن شاء ان یمنحہ خلقا حسنا فعل۔ (۲)

ان دونوں کے مال و دولت کے فرق کو دیکھو اور ان کے دلوں کے تفاوت پر نظر ڈالو۔ اصل بات یہ ہے کہ اخلاق اللہ کی دین ہے جب وہ کسی شخص کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرتا

---

(۱) احمد کی روایت ہے۔ (۲) خرائطی۔

چاہتا ہے۔ تو وہ ایسا کر دیتا ہے۔

خود حضور مہمان کی خدمت کو کس حد تک ضروری خیال کرتے تھے۔ اس کے لیے ابو رافع کا جو آپ کا ایک وفادار غلام تھا۔ چشم دید واقعہ پڑھنے کے لائق ہے۔

اذہ نزل بہ صلی اللہ وسلم ضیف فقال لفلان الیھودی نزل بی ضیف فاسلفنی شیئا من الدقیق الی رجب فقال الیھودی واللہ ما اسلفہ الا برھن فاخبرتہ فقال واللہ انی لامین فی السماء امین الارض ولو اسلفنی لادیتہ فاذھب بدرعی ادفعہ عندہ (۱)	آں حضرت کے ہاں ایک شخص مہمان ہوا۔ آپ نے ابو رافع کے ذریعہ ایک یہودی کے ہاں کہلا بھیجا۔ کہ میرے ہاں ایک مہمان آیا ہے۔ اس کے لیے تھوڑا سا آٹا قرض دے دو۔ میں رجب تک ادا کر دوں گا۔ اس نے کہا بخدا میں تو بغیر کوئی چیز رہن رکھے قرض دینے کا نہیں آں حضرت کو اطلاع ہوئی۔ تو آپ نے فرمایا، اس نے خواہ مخواہ سوء ظن سے کام لیا۔ میری امانت و دیانت تو آسمان و زمین

میں ہر جگہ مسلم ہے۔ خیر جاؤ اور میری درع رہن رکھ دو۔

آں حضرت سے ایک مرتبہ پوچھا گیا۔ کہ ایمان کیا ہے۔ فرمایا۔

اطعام الطعام وبذل السلام۔	کھانا کھلانا اور السلام علیکم کو عام کرنا۔

حضرت انس کا قول ہے۔

کل بیت لا یدخلہ ضیف لا تدخلہ الملائکۃ۔ (۲)	جس گھر میں مہمان قدم نہ دھرے۔ اس میں فرشتے بھی داخل ہونا پسند نہیں کرتے۔

---

(۱) مستدرک اسحٰق بن راہویہ۔ (۲) متفق علیہ۔

دعوت کے سلسلہ میں نہایت ضروری بات یہ ہے۔ کہ اس کا دائرہ صرف اتقیار اور نیک لوگوں تک وسیع ہونا چاہیے۔ فساق اور ارباب دنیا کو دعوت پر بلانا، فسق و فجور کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

لا تاکلوا الا طعام تقی ولا یاکل طعامک الا تقی۔	تم خود بھی پاکباز اور اتقیار ہی کے کھانے میں شرکت کرو۔ اور تمہارے ہاں بھی اسی گروہ کو مدعو ہونا چاہیے۔

ایک جگہ فرمایا۔

شر الطعام طعام الولیمة یدعیٰ الیھا الاغنیاء دون الفقراء۔ (۱)	بدترین کھانا اس ولیمہ کا ہے جس میں صرف اغنیار ہی کو بلایا جائے۔ اور غربار کو نظرانداز کر دیا جائے۔

بعض لوگ دوسروں کو تو اکثر اپنے ہاں کھانے پر بلاتے رہتے ہیں۔ مگر اپنے اعزہ و اقارب کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ جائز نہیں۔ اس سے دلوں میں بغض و عناد پیدا ہوتا ہے۔ اور قطع رحمی لازم آتی ہے۔

دعوت کے ضمن میں کچھ اور چیزوں کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ جن میں اہم تر تو یہ ہے۔ کہ اس کا مقصد اظہار تفاخر، اور شان و شکوہ ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہونا چاہیے۔ کہ اس سے مختلف دلوں میں اخوت و محبت کے روابط پیدا ہوتے ہیں۔ انس بڑھتا ہے۔ اور انبساط و سرور کے لمحے میسر آتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور کی سنت پر عمل پیرا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے، کہ ایسے لوگوں کو دعوت میں شریک نہ کیا جائے جن سے شریک ہونے والوں میں بدمزگی یا تلخی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

---

(۱) متفق علیہ۔

مقام اجابت کی نزاکتیں
کن لوگوں کی دعوت قبول کرنا چاہیے

مقام اجابت کی تشریح پانچ امور سے ہوگی ۔ ان میں ان آداب سے تعرض کیا گیا ہے ۔ جو دعوت کو قبول کرنے کے سلسلہ میں ضروری ہیں ۔

اول :۔ دعوت میں امیر و فقیر کا امتیاز روا نہ رکھا جائے ۔ اور یہ نہ کیا جائے ۔ کہ امرار و اصحاب ثروت کے کھانوں میں شریک ہونا تو مان لیا جائے ۔ اور اس پر فخر و ناز کیا جائے ۔ اور غربار کی دعوت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جائے کیونکہ یہی وہ خوئے پندار و تکبر ہے جس سے شریعت نے سختی سے روکا ہے ۔
آں حضرت کا وتیرہ اس باب میں یہ تھا ۔ کہ

یجیب دعوۃ العبد و دعوۃ المسکین ۔	غلام اور غریب و مسکین شخص کی دعوت کو بھی قبول فرمالیتے تھے ۔

خانوادۂ رسالت کا طرز عمل بھی اسی انداز کا تھا ۔ حضرت حسن کے بارے میں مروی ہے ۔ آپ ایک مرتبہ خچر پر سوار کہیں جا رہے تھے ۔ کہ ان کی مڈبھیڑ ایسے ناداروں سے ہوئی ۔ جن کا پیشہ عین سڑک پر بھیک مانگ کر گذر بسر کرنا تھا ان کے سامنے روٹی کے کچھ ٹکڑے ادھر ادھر ریت پر بکھرے ہوئے تھے انھوں نے دیکھا ۔ کہ آں حضرت کا جگر گوشہ یہاں سے گذر رہا ہے ۔ تو انھوں نے ان کو ازراہ تبرک دعوت دی ۔ کہ جناب آپ ہمارے اس ماحضر میں اگر شریک ہو جائیں تو زہے نصیب ۔ یہ خچر سے اترے اور بلا تکلف شریک ہو گئے ۔ پھر ان لوگوں سے وعدہ لیا کہ ہم بھی تمھیں اپنے ہاں کھانے پر بلائیں گے ۔ تمھیں آنا ہوگا ۔ پھر ان کو بلایا ، اور نہایت ہی اعلیٰ اعلیٰ کھانوں سے ان کے کام و دہن کی

تواضع کی۔
حتی الامکان ایسی دعوت قبول کر لینے میں تامل نہیں کرنا چاہیے جو اخلاص
پر مبنی ہو۔
ابو تراب نخشبی کا کہنا ہے۔

عرض علی طعام فامتنعت	میرے سامنے کھانا لایا گیا۔ مگر میں نے
فابتلیت بالجوع اربعة عشر	احتراز کیا جس کی پاداش میں مجھے چودہ
یوما فعلمت انه عقوبته۔	دن تک بھوکا رکھا گیا۔

ثانی:۔ بُعدِ مسافت کے عذر پر دعوت مسترد نہیں کرنا چاہیے۔
ثالث:۔ بسا اوقات دعوت مان لینے میں نفلی روزہ حائل ہوتا ہے۔
اس کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اگر نیت یہ ہے۔ کہ میرے انکار سے ایک
مسلمان دوست کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ تو اس میں بھی اجر ہے۔ آں حضرت کا
ارشاد ہے۔

تکلف لك اخوك و	تیرے ایک بھائی نے دعوت کا تکلف
تقول انی صائم۔	کیا ہے۔ اور تو یہ کہتا ہے کہ میں روزے سے
	ہوں۔ یہ نامناسب بات ہے۔

حضرت ابن عباس کا قول ہے۔

من افضل الحسنات	بہترین نیکی یہ ہے۔ کہ کوئی شخص روزہ
اکرام الجلساء بالافطار۔	افطار کر کے اپنے ساتھیوں کی عزت افزائی کرے

اِس کا یہ مطلب ہے کہ اس نیت سے یہ افطاری بھی ایک نوع کی عبادت قرار
پاتی ہے۔
رابع:۔ قبولیتِ دعوت سے پہلے اس چیز کا اطمینان کر لینا چاہیے۔ کہ

کہیں کھانے میں حرام کا شبہ تو نہیں ہے۔ یا ایسی جگہ تو اس کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ جس پر قبضہ شرعًا درست نہیں۔ یا وہاں جو قالین یا چادریں بچھی ہیں۔ وہ ناجائز مال سے تو حاصل نہیں کی گئیں۔ یا جہاں آپ کے کھانے کا انتظام ہو رہا ہے، وہاں کوئی چیز ایسی تو نہیں جو از روئے شرع کھٹکنے والی ہو۔ مثلاً وہاں تصویریں ہوں۔ فرش دیباج و حریر کا ہو۔ برتن سونے چاندی کے ہوں۔ یا مثلاً مزامیر وغیرہ کا التزام کیا گیا ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی دیکھ لینا ضروری ہے۔ تہمت، جھوٹ اور بہتان والزام تراشی وغیرہ بُرائیوں کا سامنا تو نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ سب چیزیں ایسی ہیں۔ شریعت نے جن سے روکا ہے۔ اس لیے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہیے۔

خامس :۔ دعوت میں شریک ہونے سے پہلے اپنی نیت کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر کھانے میں شرکت سے غرض صرف یہ وجہ ہے۔ کہ اس سے پیٹ کا خلا ربھرنے کا موقع ملے گا۔ اور کام و دہن کی تواضع کے خوب خوب مواقع ہاتھ آئیں گے۔ تو یہ نیت کسی طرح بھی حدود شرع میں مستحسن نہیں کہی جائیگی۔ یعنی اس نیت سے کبھی بھی کسی دعوت میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس دعوت پر آمادہ کرنے والا محرک گھٹیا اور دنیا دی ہے۔ شرعی اور دینی نہیں دینی اور اُخروی محرک یہ ہے کہ انسان دعوت کو اس بنا پر قبول کرے۔ کہ اس طرح آں حضرت کی ٹھہرائی ہوئی سنت کی پیروی کا شرف حاصل ہوگا۔ اور دعوت مسترد کر کے اس حدیث کا مستوجب و مستحق نہیں قرار دیا جائے گا۔

من لم یجب الداعی فقد عصی اللّٰہ و رسولہ۔ — جس نے دعوت مسترد کی اس نے اللہ اور رسول کی مخالفت کی۔

اس لیے بھی اس کو دعوت سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کہ اس میں اکرام مسلم ایسی عزیز ترین نیکی سے محروم رہنے کا خدشہ ہے۔

من اکرم اخاہ المومن — جس نے اپنے مسلمان بھائی کی تکریم کی
فکانما اکرم اللہ۔ — وہ گویا خدا کی تکریم بجا لایا۔

اس بنا پر بھی دعوت مسترد نہیں کرنا چاہیے۔ کہ اس طرح ایک مسلمان کا جی خوش ہو جائے گا۔ اور یہ بجائے خود بہت بڑی نیکی ہے۔ حدیث میں ہے۔

من سر مومنا فقد — جس نے ایک مومن کا جی خوش کیا۔ اس
سر اللہ۔ — نے اللہ کو خوش کیا۔

قبولیتِ دعوت کا ایک محرک یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اُس سے اپنے ایک بھائی سے ملتا ہے۔ اور اُس کو اپنے بارے میں سوءِ ظن کا موقع نہیں دیتا ہے۔ یہ ہیں وہ عوامل دینیہ جو ایک مسلمان کو دعوت کے قبول کر لینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان میں کا ایک ایک ایسا عامل و محرک ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی وابستہ ہے۔ اور اگر یہ سب جمع ہو جائیں۔ تو اندازہ کیجیے۔ کہ یہ چھوٹا سا فعل کتنی گوناگوں برکتوں کا حامل ہو جاتا ہے۔

نیت کی دینی اہمیت

ممکن ہے آپ کہیں کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں نیت کے التزام کے کیا معنی؟ ہم کہیں گے کہ یہی التزام تو مذہب کی جان ہے۔ اسی سے تو تزکیہ باطن کی نعمت حاصل ہوتی ہے اور محاسبہ نفس کا موقع ملتا ہے۔ اسی نکتہ کی وضاحت ایک بزرگ نے یوں فرمائی ہے۔

انا احب ان یکون لی فی — میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہر ہر کام میں نیت
کل عمل نیۃ حتیٰ فی الطعام — کو ٹٹولوں۔ حتیٰ کہ کھانے اور پینے میں بھی اس

والشراب۔ کا جائزہ لیتا رہوں۔

اور یہی وہ حقیقت ہے۔ جس کی آں حضرت کی زبان فیض ترجمان نے اس طرح وضاحت فرمائی ہے۔

انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرء ما نوی۔ فمن کانت ھجرتہ الی اللہ و رسولہ فھجرتہ الی اللہ و رسولہ ومن کانت ھجرتہ الی الدنیا یصیبھا او امراۃ ینتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔

اعمال کی بنیاد نیتوں پر ہے۔ اور ہر شخص وہی کچھ پانے کا مستحق ہے کہ جس کی وہ نیت کرتا ہے۔ سو جس نے ہجرت اللہ اور رسول کے لیے کی اُس کی تو ہجرت واقعی اللہ اور رسول کے لیے ہے لیکن جس نے دنیا کو پانے کے لیے ہجرت کی یا اس بنا پر ترک وطن اختیار کیا۔ کہ کسی عورت سے شادی کرے گا۔ تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اُس کی ہجرت انھیں کاموں کے لیے محسوب ہوگی۔

نیت کے معاملہ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے۔ کہ یہ صرف مباحات وطاعات میں مؤثر ہے۔ منہیات میں نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کو شراب پلائے یا اس کو کسی معصیت پر اکسائے اور نیت یہ ہو کہ اس کو خوش کرنا ہے۔ اور اس کے ملال و تکدر کو دور کرنا ہے۔ تو بجائے ثواب کے اُلٹا عذاب کا مستوجب ہوگا

نیت کا محل وہ امور ہیں جن میں خیر و شر کا پہلو متردد ہے۔ ان میں اگر نیت خیر و صلاح کی ہے۔ تو وہ عمل خیر پر محمول ہوگا۔ اگرچہ اس کا منجملہ تعلق شر سے بھی ہو۔

یہاں تک تو ان آداب و سنن کا تعلق تھا۔ جن کا دعوت قبول کرنے سے پہلے خیال رکھنا ضروری ہے۔ کچھ آداب وہ ہیں جو مجلس دعوت یا مجلس دعوت میں پہنچ جانے کے بعد پیروی کے لائق ہیں۔ ان میں اہم اور قابلِ ذکر یہ ہیں

مجلسِ دعوت کے آداب

(۱) جب مجلس دعوت میں پہنچے تو صدر نشینی کی کوشش نہ کرے۔ اور نہ جگہ کا انتخاب ہی کرے

بلکہ جہاں اس کی نشست کا انتظام صاحب خانہ کی طرف سے کیا گیا ہو۔ وہیں بیٹھے۔ تواضع کا یہی تقاضا ہے۔

(۲) صاحب خانہ نے اگر نشستوں کی کوئی خاص ترتیب قائم کر رکھی ہو۔ اور اس میں کسی مہمان کی تکریم و اعزاز کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہو۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہ سمجھے اور بُرا نہ مانے۔

(۳) قرب وجوار میں جو لوگ بیٹھے ہوں۔ اُن سے سلام کہے۔ اور اُن کی مزاج پُرسی کرے۔

(۴) ایسی جگہ نہ بیٹھے جہاں سے مستورات نظر آتی ہوں۔

(۵) جدھر سے کھانا آ رہا ہو۔ اُس طرف حریصانہ نظروں سے نہ دیکھے۔

(۶) جب کوئی مہمان آئے۔ تو صاحب خانہ کو چاہیے کہ پہلے اُس کو ضروریات سے آگاہ کر دے۔ اُسے یہ بتا دے۔ کہ سمت قبلہ کدھر ہے۔ وضو اور پانی کا انتظام کس کمرہ میں کیا گیا ہے۔

(۷) صاحب خانہ کو چونکہ کھانا وغیرہ تقسیم کرنا ہے۔ اس لیے اپنے ہاتھ پہلے دھوئے۔ اور جب کھانا ہو چکے، تو اپنے ہاتھ سب سے آخر میں دھوئے۔

(۸) کھانے میں تعجیل اولیٰ ہے۔ لیکن اگر کسی ایسے شخص کا انتظار ہے جو غریب اور مفلس ہے۔ یا جس کی دشمنی کا اندیشہ ہے تو تاخیر او انتظار کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

(۹) دعوت اگر ولیمہ کی ہے۔ تو اس میں تعجیل مستحبات میں ہے۔ کیونکہ

الولیمۃ فی اول یوم سنۃ۔ وفی الثانی معروف وفی الثالث ریاء۔

ولیمہ پہلے دن تو سنت ہے۔ دوسرے دن معروف و جائز ہے اور تیسرے دن دکھاوا اور ریاء ہے۔

(۱۰) کھانوں کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے جو لطیف تر اور عمدہ ترین

کھاتے ہوں۔ اُن کو دسترخوان پر پہلے پیش کیا جائے۔ اور اس میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ تمام رنگ کے مطعومات ایک ساتھ چُن دیے جائیں۔ تاکہ جس شخص کو جو چیز مرغوب ہو۔ وہ اُس سے اپنا پیٹ بھر لے۔

مختلف کھانوں کی صورت میں کھانوں کی فہرست پیش کرنا چاہیئے

بعض شرفا سے یہ بھی منقول ہے۔ کہ وہ بوقلموں کھانوں کی فہرست لکھ کر مہمانوں کے حوالے کر دیتے۔ تاکہ وہ جو کھانا چاہتے ہوں، اور جو اُن کو خصوصیت سے مرغوب ہو۔ وہی پیش کیا جائے۔

(۱۱) جب تک سب مہمان فارغ نہ ہو جائیں۔ کوئی کھانا بھی دسترخوان سے اُٹھایا نہ جائے۔ کیونکہ ممکن ہے کسی شخص کو ابھی کسی خاص کھانے سے لطف اندوز ہونا ہو۔ اس سلسلہ میں ایک مزے کا قصّہ مروی ہے۔ ثوری ایک شگفتہ مزاج صوفی تھے۔ اُن کو ایک صاحب دنیا نے ایک مرتبہ اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔ اور ایک مسلّم برہ پکوا کر اُن کے سامنے رکھا۔ اُنھوں نے جب اُس کو بے دریغی سے کھانا شروع کیا۔ اور بوٹیاں نوچ نوچ کر دوسروں میں تقسیم کرنا شروع کیں۔ تو اُن کے بخل میں جوش آیا۔ اور کہنے لگے۔ بس اب اس کو اُٹھاؤ۔ بقیہ حصّہ بچوں کا ہے۔ ملازم نے برہ کی سینی اُٹھائی۔ اور سر پر رکھ کر اندرونِ خانہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور یہ حضرت پیچھے لپکے۔ صاحب خانہ نے کہا۔ کہاں بھاگے جا رہے ہیں آپ۔ تو اُنھوں نے کہا۔ کیا میں بچوں کے ساتھ شریکِ طعام نہیں ہو سکتا۔ اس پر یہ اپنے بخل پر سخت نادم ہوئے۔

چند آداب، کھانے سے فراغت پاکر جانے کے متعلق بھی ہیں۔

مثلاً یہ کہ مہمان کو دروازے تک چھوڑ کر آئے۔ کہ اکرامِ ضیف کا یہ ادنیٰ تقاضا ہے۔ مشایعت کے وقت اچھی اچھی باتیں کرے۔ تاکہ مہمان کو یہ شبہ نہ ہو

کہ یہ جب تک اس کے ہاں رہا ہے۔ اس پر بوجھ یا بار ثابت ہوا ہے۔ خوش گفتاری بجائے خود اچھی دعوت کا ایک حصہ ہے۔ سلف اسی پر عمل پیرا تھے۔ اور اس کو شرافت اور مروت کا لازمہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ یزید بن ابی زیاد کا کہنا ہے

ما دخلت علی عبد الرحمٰن	میں جب عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا مہمان
بن ابی لیلیٰ الا حدثنا حدیثا	ہوا۔ انھوں نے عمدہ عمدہ کھانے بھی کھلائے
حسنا و اطعمنا طعاما حسنا۔	اور عمدہ عمدہ باتیں بھی سنائیں۔

جانے سے پہلے صاحب خانہ سے اجازت لینا بھی ضروری ہے۔

یہ بھی ضروری ہے۔ کہ تین دن سے زیادہ کسی کے ہاں قیام نہ کرے۔ ہاں اگر صاحب خانہ اصرار کرتا ہے۔ اور یہ بنائے اخلاص رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ تو زیادہ دنوں کے لیے ٹھہر جانے میں بھی کوئی گناہ نہیں۔

متفرقات

ابراہیم النخعی کا قول ہے۔

الا کل فی السوق	بازار میں کھانا پینا دنایت کے
دناءۃ۔	مترادف ہے۔

اس قول کو انھوں نے آں حضرت کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن عبد اللہ بن عمر سے ایک روایت میں یوں بھی آتا ہے۔

کنا ناکل علی عھد رسول	ہم آں حضرت کے زمانے میں چلتے پھرتے
اللہ صلی اللہ علیہ و نحن نمشی	کھا لیتے تھے۔ اور کھڑے کھڑے پی لیتے تھے
و نشرب و نحن قیام (۱)	اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔

ایک بہت بڑے صوفی کو کسی نے دیکھا کہ حضرت بازار میں کھا پی رہے ہیں اس پر ان سے کہا گیا ہے۔ کہ یہ کیا حرکت ہے؟

---

(۱) ترمذی

انھوں نے جواب میں کہا۔

ویحك اجوع فی السوق | واہ بھوک تو مجھے بازار میں لگے۔ اور کھانا

واکل فی البیت۔ | گھر پر کھاؤں۔ اس میں کیا تک ہے۔

جواب میں کہا گیا۔ آپ مسجد میں بیٹھ کر کھا پی سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا۔ کہ تجویز بلاشبہ معقول ہے۔ مگر

استحی ان ادخل بیته | اس میں جذبہ حیا مانع ہے۔ کیا اللہ کے

للاکل فیه۔ | گھر میں صرف کھانے کے لیے میں داخل ہوں!

سوال یہ ہے۔ کہ اس طرز عمل میں اور مذکورہ بالا حدیث میں تطبیق کی کیا صورت ہے؟ ۔ بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ اشخاص اور عادات بلاد کے اختلاف سے تعلق رکھتا ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے۔ کہ بازار میں کھا لینے سے کبر وپندار کے داعیے ختم ہوتے ہیں اور تواضع وانکساری کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ اس کے لیے یہ جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی ملک میں یہ رواج ہے کہ وہاں اس کو عموماً معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اور اسے خلاف وضع خیال نہیں کیا جاتا۔ تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن اگر کسی شخص کا منصب ایسا ہے۔ کہ اُس کے لیے سر بازار کھانا پینا زیب نہیں دیتا تو اس کے لیے ناجائز ہے۔ اور بعض حالات میں اس درجہ مکروہ ہے۔ کہ شہادت پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

ایک طبیب حاذق کا مشورہ

حجاج نے ایک طبیب حاذق سے درخواست کی کہ کوئی جامع نصیحت فرمائیے۔ انھوں نے کہا۔

لا تنکح من النساء الا | شادی کرو تو جوان عورت سے۔ اور اگر

فتاة۔ ولا تاکل اللحم الا | گوشت کھاؤ تو کم عمر جانور کا۔ اور جب

نيتا ولا تاكل المطبوخ حتى ينعم نضجه ولا تشربن دواء الا من علة - ولا تاكل من الفاكهة الا نضيجها - ولا تاكلن طعاما الا اجدت مضغه - وكل ما احببت من الطعام ولا تشربن عليه فاذا شربت فلا تاكلن عليه شيئا - ولا تحبس الغائط والبول - واذا اكلت بالنهار فنم واذا اكلت بالليل فامش قبل ان تنام ولو مائة خطوة -

تک کوئی چیز اچھی طرح پک نہ جائے - اسے کھاؤ نہیں - دوا بغیر ضرورت کے نہ پیو - اور کچا پھل نہ کھاؤ - کھانا کھاؤ، تو خوب چبا چبا کر - اور جو شئے بھی مرغوب ہو ضرور کھاؤ - لیکن اس پر پانی نہ پیو - اور اگر پانی پی لو، تو پھر اس پر کچھ کھاؤ نہیں - پیشاب و پاخانہ نہ روکو - اور دن کو کھانا کھاؤ، تو تھوڑا سا سو لو - اور رات کے کھانے کے بعد کچھ ٹہل لو - چاہے سو ہی قدم ٹہلو -

عربوں کے ہاں ناشتہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی - چنانچہ ایک عرب حکیم نے اسے حلم اور بردباری کا ایک بہت بڑا سبب قرار دیا ہے - اس لیے اپنے بیٹے کو تاکید کی ہے کہ اس میں تساہل نہیں ہونا چاہیے -

يا بني لا تخرج من بيتك حتى تاخذ حلمك -

بیٹے گھر سے ناشتہ کیے بغیر کبھی نہ نکلنا کہ اس سے حلم قائم رہتا ہے -

امرا و سلاطین کے ہاں دعوتوں میں شریک ہونے کو بعض صوفیا نے اتنا قابلِ اعتراض سمجھا ہے - کہ ایسے آدمی کی شہادت قبول نہیں کی جس نے کہ کبھی اس کا ارتکاب کیا ہو -

زہد و اتقا اور کھانے پینے میں ذوق و تکلف کی رعایتیں

کیا اتقا و زہد کے ساتھ ساتھ کھانے پینے میں تکلف و ذوق کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے! اس کے لیے ابو علی روزباری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قصہ بہت دل چسپ ہے۔

انھوں نے ایک مرتبہ بڑے بڑے اتقیاء و صلحاء کی دعوت کی۔ اور اس میں یہ جدت اختیار کی۔ کہ مکان میں ایک ہزار چراغ جلائے۔ ایک صاحب نے کہا۔ کہ آپ نے اسراف سے کام لیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

ادخل فکل ما اوقدته لغیر اللہ فاطفئه ۔

آپ کو اجازت ہے ان میں جو بھی غیر اللہ کے لیے میں نے جلایا ہے اُسے گل کر دیں

مقصد یہ تھا کہ ان میں کا ایک ایک چراغ۔ اس نیت سے روشن کیا گیا ہے کہ اس کی روشنی سے اللہ کی یاد سے معمور قلب و دماغ فرحت و انبساط محسوس کریں

انھیں کا ایک لطیفہ اُور ہے۔ جو ضیافت ہی کی جدت طرازیوں سے متعلق ہے۔

انھوں نے ایک دفعہ نہایت خوبصورت مٹھائی کا ایک محل تیار کرایا۔ جس میں دیواریں، چھت، محراب اور بالاخانے کیا نہیں تھا۔ پھر صوفیاء کو بلایا۔ اور حملے کی دعوت دی۔ وہ آئے تو اُنھوں نے پہلے اس قصرِ شیریں کو دھکا دے کر گرا دیا اور پھر کھانا شروع کیا۔

نِکاح و مُعَاشَرَت

نکاح و تاہّل کی ذمہ داریاں

علما کا اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ نکاح و تاہل کی زندگی کا ٹھیک ٹھیک مقام کیا ہے۔ بعض اس کے فضائل اور خوبیوں کے اس درجہ قائل ہیں۔ کہ ان کے نزدیک یہ عبادتِ الٰہی کی غرض سے یکسو ہو جانے اور مجرد رہنے سے بھی بہتر ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کی فضیلت مسلم۔ مگر یہ خلوت و یکسوئی کی برکات سے بہتر ہرگز نہیں۔ ایک گروہ کا فیصلہ یہ ہے۔ کہ نکاح سے ترکِ نکاح اولیٰ ہے ان کی دلیل یہ ہے۔ کہ آج کے حالات آں حضرت کے زمانہ کے حالات سے قطعی مختلف ہیں۔ اُس زمانے میں جب کہ رزق اور معاش کے ذرائع میں باطل غذا کی آمیزش بالکل نہیں تھی۔ اور عورتوں کی اخلاقی حالت بھی کہیں بہتر تھی۔ نکاح سے محروم رہنا۔ اجر و ثواب کی بہت بڑی مقدار سے محروم رہنے کے مترادف تھا مگر آج جب کہ اکلِ حلال کی راہیں مسدود ہیں۔ اور جب کہ عورتوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت بھی حد درجہ پست اور خراب ہے۔ نکاح کو افضل ٹھہرانا درست نہیں۔ ان آرارِ مختلفہ میں صحیح رائے کون سی ہے؟ اور کون راہ حق و صواب کی راہ ہے۔ اس کو جاننے سے پہلے قرآن و سنت اور آثار میں جو اس کے متعلقات ہیں۔ اُن پر غور کر لینا چاہیے۔ کہ اس سنت میں فوائد و برکات کا حصّہ کتنا ہے۔ اور اس سے کیا کیا نقصان یا کیا کیا فوائد اور مفاسد وابستہ ہیں۔ اور پھر آخر میں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا۔ کہ کس شخص کے لیے ان فوائد و مفاسد سے بچ نکلنا آسان اور کس کے لیے مشکل ہے۔ کیونکہ انہی نکات کی وضاحت پر نکاح کا افضل یا غیر

افضل ہونا موقوف ہے۔

اِس کے بارہ میں آیاتِ قرآنی پر نظر ڈالیے۔

وانکحوا الایامی منکم (نور - ۳۲) — اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو۔

اس میں یہ نکتہ ملحوظ رہے۔ کہ نکاح کو بصیغہ امر ادا کیا ہے۔

فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن ۔ (البقرہ - ۲۳۲) — دوسرے شوہروں کے ساتھ جب وہ جائز طور پر راضی ہو جائیں نکاح کرنے سے مت روکو

انبیاء و رسل کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

ولقد ارسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لھم ازواجا و ذریۃ ۔ (رعد - ۳۸) — اور ہم نے تم میں سے پہلے بھی پیغمبر بھیجے تھے۔ اور ان کو بیبیاں اور اولاد بھی دی تھی۔

اللہ کے وہ بندے جو ازدواجی زندگی کے رشتوں میں منسلک ہیں۔ اُن کی دُعاؤں کا انداز کیا ہوتا ہے۔؟ اس کو یوں بیان فرمایا ہے۔

والذین یقولون ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریاتنا قرۃ اعین ۔ (فرقان - ۷۴) — اور وہ خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو ہماری بیبیوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے۔ کہ جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں مبعوث ہوئے ہیں۔ وہ سب کے سب متاہل تھے۔ حضرت یحیٰی نے بھی شادی کی تھی۔ اگرچہ وظیفہ جنسی ادا نہیں کیا تھا۔ اور حضرت مسیح کے بارہ میں احادیث میں آتا ہے۔ کہ جب وہ دوبارہ آئیں گے۔ تو اس پابندی کو قبول فرمائیں گے۔ اور یہ پابندی اُن کے لیے باعثِ برکت بھی ثابت ہوگی۔ یعنی صاحب اولاد ہوں گے۔

احادیث یہ ہیں :-

النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فقد رغب عنی - النکاح سنتی فمن احب فطرتی فلیستن بسنتی (۱)

نکاح میری سنت ہے اس لیے یاد رہے جس نے اس سے روگردانی اختیار کی۔ اس نے گویا مجھ سے روگردانی اختیار کی ۔ نکاح میری سنت ہے۔ سو جس کو میری یہ فطرت پسند ہے اس کو میری اس سنت پر عمل کرنا چاہیئے

من ترک التزویج مخافۃ العیلۃ فلیس منا۔ (۲)

جو نکاح افلاس کے اندیشے کے پیش نظر نہیں کرتا۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے ۔

حضرت عمر کا قول ہے ۔

لا یمنع من النکاح الا عجز او فجور۔

نکاح سے دو ہی آدمی باز رہ سکتے ہیں۔ ایک جس کو اس پر قدرت نہ ہو۔ اور ایک جو بدمعاش ہو۔

حبر اُمت ابن عباس کہا کرتے تھے ۔

لا یتم نسک الناسک حتی یتزوج۔

عابد اور زاہد کا زہد اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ شادی کرے

اس کا مقصد غالباً یہ ہے۔ کہ جب تک کسی شخص کی شادی نہ ہو۔ اس کا دل خیالات و شہوات کی اذیتوں سے بچ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے۔ اپنے غلاموں کے بارہ میں بھی اُن کا یہی معمول رہا۔ کہ جہاں وہ بالغ ہوئے۔ اُن کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔ چنانچہ عکرمہ و کریب کا نکاح ان کے مجبور کرنے سے طے پایا ۔

---

(۱) مسند ابو یعلیٰ۔

(۲) مسند فردوس ۔

عبداللہ بن مسعود نکاح کو صرف ایک ضرورت ہی تصور نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ ایک دینی خدمت بھی ہے۔ اس کی تائید میں اُن کا یہ قول ملاحظہ ہو۔

لو لم یبق من عمری الا عشرة ایام لاحببت ان اتزوج لکیلا القی اللہ عزبا۔	اگر میری زندگی کے دس ہی دن باقی ہوں۔ تب بھی میں شادی کرنا پسند کروں گا۔ تاکہ اللہ سے اس حال میں ملاقات نہ ہو کہ میرے کوئی بیوی نہ ہو۔

معاذ بن جبل کی دو بیویاں تھیں۔ اتفاق سے طاعون کا مرض پھیلا۔ اور ان دونوں کا انتقال ہوگیا۔ وہ خود بھی بیماری کی وجہ سے صاحب فراش ہوئے۔ اور قریب تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہیں۔ عین ان لمحوں میں اُن کی یہ آرزو تھی۔

زوجونی انی اکرہ ان القی اللہ عزبا۔	میرے نکاح کا اہتمام کرو۔ کیونکہ میں اللہ تعالیٰ سے مجرد یا رنڈوے کی حیثیت سے ملنا نہیں چاہتا۔

اس تمنا میں بھی یہی مذہبی روح کارفرما تھی۔ کہ ہر حالت میں ازدواجی زندگی سے دوچار رہنا ضروری ہے۔

سفیان بن عیینہ کہا کرتے تھے۔ کہ

کثرة النساء لیست من الدنیا لان علیا رضی اللہ کان ازھد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وکان لہ اربع نسوة وسبع عشرة سریة	عورتوں کی کثرت دنیا کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت علی کی جو صحابۂ رسول میں زہد و اتقا کے درجۂ تعلیٰ پر فائز تھے چار تو بیویاں تھیں اور سترہ لونڈیاں

ان کے علاوہ اولیاء و صلحاء کی ایک اچھی خاصی جماعت کا یہ خیال تھا۔ کہ تجرد سے

تاہل کی زندگی افضل ہے۔ چنانچہ جب کسی نے ایک مرتبہ ابراہیم ادہم کو ان کے تجرد پر مبارکباد دی۔ اور کہا کہ آپ کو تو خوب خوب تجرد و انزوا کی لذتوں سے بہرہ مندی کے مواقع حاصل ہیں۔ تو انھوں نے جواب میں کہا۔

لروعة منك بسبب العيال افضل من جميع ما انا فيه۔	اہل و عیال کی وجہ سے اضطراب و خوف کی ایک خلش جس سے تم دوچار ہو۔ ان تمام کیفیات پر بھاری ہے کہ جس سے میں گذر رہا ہوں۔

حامیان تجرد کے دلائل

یہ پہلو تو ترغیب نکاح کا تھا۔ اب ترہیب و احتراز کے دلائل ملاحظہ ہوں۔ حدیث میں ہے۔

یاتی علی الناس زمان یکون هلاك الرجل علی ید زوجته وابویه وولدیه یعیرونه بالفقر ویکلفونه ما لا یطیق فیدخل المداخل التی یذهب فیها دینه فیهلك[1]	ایک زمانہ ایسا بھی آنے والا ہے جب ایک آدمی اپنی بیوی بچوں اور ماں باپ کے ہاتھوں ہلاکت میں پڑے گا۔ یہ سب اس کو مفلسی کا طعنہ دیں گے اور ایسے ایسے کاموں کی اس کو زحمت دیں گے جس کی اس میں قطعی استطاعت نہیں۔ پھر یہ مجبور ہو کر ایسے

رستوں پر گامزن ہوگا۔ اور ایسا وتیرہ اختیار کرے گا کہ جس میں اس کے دین کی بربادی ہوگی۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

قلة العیال احد الیسارین وکثرتهم احد الفقرین۔	اہل و عیال کی قلت دو آسانیوں میں کی ایک آسانی ہے۔ اور کثرت دین و دنیا

کے فقر و احتیاج میں کی ایک احتیاج ہے۔

---

(۱) بیہقی و خطابی۔

ابو سلیمان الدارانی سے کسی نے پوچھا۔ نکاح کے معاملہ میں آپ کی کیا رائے ہے
اُنھوں نے جو جواب دیا۔ اس سے اس گروہ کے خیالات کی پوری پوری ترجمانی ہوتی
ہے۔ انھوں نے کہا۔

الصبر عنهن خير من — بیوی کے بغیر جو صبر برداشت ہے۔
الصبر عليهن۔ — وہ اس صبر و برداشت سے کہیں بہتر ہے
جو بیوی پاکر کیا جائے۔

انھیں کا ایک قول یہ ہے۔

الوحيد يجد من حلاوة — ایک مجرد کو عمل کا جو لطف اور قلب کا
العمل و فراغ القلب ما لا — جو فراغ حاصل ہے وہ متاہل کو حاصل نہیں
يجد المتاهل۔

کچھ حضرات نے ترکِ نکاح کی ایک دوسری ہی توجیہ بیان کی ہے۔ بشر سے
کسی نے کہا کہ لوگ آپ کے تجرد پر معترض ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ اس طرح
ترکِ سنت لازم آتا ہے۔ اُنھوں نے جواب میں کہا۔

قولوا لهم هو مشغول — ان لوگوں سے کہہ دو کہ اس کے سامنے
بالفرض عن السنة۔ — کچھ فرائض ہیں۔ جن کی بجا آوری میں وہ اس
درجہ مشغول ہے۔ کہ سنت کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

ترغیب و ترہیب کے ان دو پہلوؤں کی وضاحت کے بعد اب مناسب
معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے فوائد و عوائل پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

دوگونہ دلائل کا تجزیہ۔ نکاح معاشرہ کی اساس و بنیاد ہے
خالص حیاتیاتی نقطہ نظر سے اس دعویٰ کی وضاحت

فوائد پانچ ہیں۔ اولاد۔
شہوت۔ تدبیر منزل
کثرت عشیرۃ، اور حقوق

دو فرائض کی نگہداشت کے سلسلہ میں مجاہدہ نفس۔

جہاں تک اولاد کا تعلق ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ نکاح کے باب میں اسی کو اصل واساس کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کے لیے نکاح کا انتظام شرائع نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ اس سے بقاء نوع انسانی کے اصول کی تائید ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس دنیا کی رونق اور چہل پہل قائم ہے۔ اگر نسل انسانی باقی ہے۔ تو اس سے رُبع مسکون کی تمدنی و روحانی اقدار کا وجود بھی ممکن ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ نوع انسانی ہی ختم ہوجاتی ہے تو مذہب اور اس کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا، تو بغیر رشتہ ازدواج کے توسل کے انسانوں کو پیدا کر دے سکتا تھا۔ مگر اس کی حکمت و قدرت نے یہ چاہا نہیں۔ اور یہ پسند نہیں فرمایا۔ کہ اسباب حیات کے سلسلہ کو بے کار کر دیا جائے۔ اس لیے اس نے انسانی تخلیق کے لیے مرد و عورت میں ایک خاص قسم کا عضوی ڈھانچہ تیار کیا۔ اور اسی ڈھانچہ کا تقاضا ہے۔ کہ ان میں شہوت اور محبت جنسی ایسے میلانات پیدا کیے۔ اس میں یہ راز پنہاں ہے کہ یہی جذبات یہی محبت اور جنسی کشش دونوں کو مجبور کرتی ہے۔ کہ نوع انسانی بقار و تحفظ کے لیے سرگرم سعی ہو۔ اور اس غرض کی تکمیل کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کو صرف کرے۔ ورنہ کون ایسا تھا۔ کہ بغیر کسی لطف اندوزی کے اور مادی و محسوس بہرہ مندی کے اتنی بڑی کھکھیڑ مول لیتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام اسی طرح انسانوں سے لیا ہے۔ جس طرح ایک ہوشیار شکاری شکار کو پھانسنے اور پکڑنے کے لیے جال میں دانے بکھیر دیتا ہے۔ اور جانور دانوں کی لالچ میں جال پر گرتا ہے۔ اور پکڑ لیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس اہم ذمہ داری کو انسان کے کندھوں پر ڈال دینے کی نیت سے یہ تدبیر اختیار کی۔ کہ میاں بیوی میں محبت و شوق کا جال

بچھایا۔ اور شہوت و کشش جنس کے اس میں دانے بکھیر دیئے۔ تاکہ یہ آپ سے آپ گرفتار ہو جائے۔ اور بال بچوں کی زنجیر میں جکڑا جائے۔

بقائے نسل کا یہ اصول کس درجہ واضح ہے۔ اس کو جاننے کے لیے الفاظ و حروف کی سند درکار نہیں۔ خود انسانی جسم اور زندگی کا ایک ایک جز پکار پکار کر اس کی صراحت کر رہا ہے۔ یہ مرد و عورت کی تفریق کیوں ہے۔ دونوں کے عضوی ڈھانچے کیوں مختلف ہیں۔ رحم کیا ہے؟ یہ مستودع و مستقر کیا ہے؟ جس میں جنین پرورش پاتا اور تکمیل و اتمام کی منزلیں طے کرتا ہے۔ پھر دونوں پر تقاضائے شہوت و محبت کا استیلا کس غرض سے ہے۔ یہ تمام آلات و افعال اللہ تعالیٰ کے اس مقصد کی غمازی کر رہے ہیں۔ کہ جس کے لیے ان سب تفرقات کو پیدا کیا گیا ہے۔

اب جو شخص اس سے اعراض کرتا ہے۔ وہ گویا اس مقصد کی مخالفت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ مقصد ہے۔ اس کی مثال اس شخص سے ہرگز مختلف نہیں کہ جس کو اس کے مالک نے زمین دی، آلاتِ زراعت بخشے۔ اور بیج دیا تاکہ وہ کھیتی باڑی کا فرض انجام دے۔ اور زمین کی روئیدگی و آبادکاری میں اضافہ کرے۔ مگر وہ ان رعائتوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے۔ اور زمین کی آبادکاری کے سلسلہ میں کوئی کوشش نہ کرے۔ ظاہر ہے۔ یہ شخص مجرم ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ شخص بھی مجرم ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نوع انسانی کے بڑھانے کے جملہ وسائل و ذرائع بخشے ہیں۔ مگر وہ ان کو کام میں نہیں لاتا۔ ممکن ہے اس اصول پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے۔ کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ حیاتِ انسانی کو برقرار رکھنا عنداللہ ایک محبوب فعل ہے۔ اور اسے ختم کر ڈالنا۔ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ مگر پھر اس میں کیا بھید ہے۔ کہ خود اللہ تعالیٰ نے موت و فنا کے سلسلہ کو پیدا کیا ہوا ہے؟

کیا اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ موت و حیات عنداللہ دونوں برابر ہیں۔ اور ان میں کا کوئی بھی محبوب و مکروہ نہیں۔

ہم کہیں گے کہ۔ یہ ایسا کلمۂ حق ہے۔ جس سے کہ باطل کی تائید مقصود ہے۔

اللہ اور انسان کے ارادہ میں کوئی وجہ مماثلت پائی نہیں جاتی

بقائے نسل سے متعلق ایک اہم فلسفیانہ شبہہ کا جواب

اصل چیز یہ ہے کہ انسانی ارادہ اور الٰہی ارادہ میں کوئی وجہ مماثلت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور چیز ہے اور اس کا فعل اور چیز۔ ہمارے ارادہ و عمل میں تو توافق کا ہونا ضروری ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی کے لیے اس توافق کی حاجت نہیں۔ معاصی اس کے ہاں ناپسندیدہ نہیں۔ مگر مراد ہیں۔ کفر پر اُس کی ذات کبھی خوش نہیں ہوتی۔

و لا یرضٰی لعبادہ الکفر — اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا۔ (زمر — ۷)

مگر عام ارادہ و خلق میں اُس کا بھی وجود روا ہے۔ یہی معاملہ موت و حیات کا ہے۔ کہ زندگی اُس کو پسند ہے۔ اور اس کا بھی وجود ہے۔ اور موت و ہلاکت اور فنا و عدم اس کے نزدیک ہرگز پسندیدہ نہیں۔ تب بھی اُس کے ارادہ و مشیت سے اس کا تعلق قائم ہے۔ یہ مسئلہ حد درجہ نازک ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ وضاحت چاہتا ہے۔ مگر یہ مقام اس کے لیے موزوں نہیں۔ کیونکہ اس کا حقیقی تعلق علم المکاشفہ سے ہے۔ اور ہم علم المعاد سے بحث کر رہے ہیں۔ اِس لیے اِسی اختصار پر اکتفار کیجیے۔ اور اس حقیقت پر یقین رکھیے۔ کہ جو شخص اس اساس اور اصول کی حمایت کرتا ہے۔ اور نظام مناکحت کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ تو حیات و بقا کے تقاضوں کی تائید کرتا ہے۔ اور جو انکار کرتا ہے۔ وہ گویا اس وجود، اور

سلسلۂ حیات کی مخالفت کرتا ہے۔ جو از آدم تا ایں دم چلا آرہا ہے۔

نکاح کا دوسرا فائدہ، شیطان سے بچاؤ ہے۔ خواہشاتِ نفس کی بے راہ روی سے اجتناب ہے۔ اور شہوات کے زور کو توڑ تا ہے۔ اس سے حفظ بصر کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ اور عفاف و پاکیزگی کی دولت سے انسان مالا مال ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف آں حضرت نے اشارہ کیا ہے۔

من نکح فقد حصن نصف دینه فلیتق الله فی الشطر الآخر۔	جس نے ازدواجی زندگی اختیار کی۔ اس نے اپنا آدھا دین بچالیا۔ اب اُسے چاہیے کہ باقی آدھے کے بارے میں اللہ سے ڈرے

نکاح کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ۔ انسان اس کی وجہ سے تدبیرِ منزل کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے کاموں کی جانب اپنے کو فارغ و یکسو محسوس کرتا ہے۔ اور اس لائق ہو جاتا ہے۔ کہ مہماتِ امور کے لیے وقت نکال سکے۔ ورنہ اسے خود گھر کی صفائی کا انتظام کرنا پڑے۔ خود برتن مانجے۔ گھر کا کوڑا کرکٹ صاف کرے۔ اور ضروریات کا اہتمام کرے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پڑھنے لکھنے اور عمل کے لیے اس کے پاس نہ تو کافی وقت بچے گا۔ اور نہ اتنی مقدرت اور توانائی ہی رہے گی۔ کہ سب کاموں کو انجام دے سکے حضرت سلیمان الدارانی نے جو یہ فرمایا کہ صالح اور نیک بخت بیوی دنیا کے قبیل سے نہیں ہے۔ تو اس کا یہی مطلب تھا۔ کہ اس کی وجہ سے اتنا وقت اور قوت و مقدرت بچ رہتی ہے۔ کہ انسان دین کے بڑے بڑے تقاضوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ اس مفہوم کو آں حضرت نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے۔

لیتخذ احدکم قلبا شاکرا	تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ قلب ایسا

ولسانا ذاکرا وزوجۃ — پائے جو شکر گذار ہو، اور زبان ایسی
مؤمنۃ صالحۃ تعینہ علی — کہ اس کی یاد میں لذت محسوس کرے۔ اور بیوی نیک
آخرتہ۔ — اور صالح جو آخرت کے سلسلہ میں معین و مددگار ہو۔

چوتھا فائدہ یہ ہے۔ کہ نکاح سے مختلف عشائرہ و قبائل سے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ اور انسان کی قوت و حشمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

پانچواں فائدہ زیادہ اہم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب انسان تاہل اور بال بچوں کی زندگی بسر کرے گا۔ تو لامحالہ اس کو ان سے شکائتیں بھی پیدا ہوں گی۔ ان سے اذیتیں بھی پہنچیں گی۔ اور ان کے لیے جو اکل حلال کا سامان کیا جائے گا۔ اس کے حصول کے لیے دشواریاں بھی پیش آئیں گی۔ اب فرض کیجیے یہ شخص شکائتوں اور اذیتوں کے مقابلہ میں تحمل و برداشت سے کام لیتا ہے اور ان کی تادیب و اصلاح کی فکر میں برابر لگا رہتا ہے، اُن کی تربیت اخلاقی کے فریضہ کو با حسن وجہ پورا کرتا ہے۔ اور گھبراتا نہیں۔ مزید براں ان سب کا حلال سے پیٹ بھرتا ہے۔ اور حرام کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا۔ تو ان اعمال جلیلہ کی فضیلت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یہی وہ بات ہے۔ جس کی طرف آں حضرت نے اشارہ فرمایا ہے۔

یوم من وال عادل — والی عادل کا ایک دن عابد و زاہد کے
افضل من عبادۃ سبعین — ستر سال پر بھاری ہے۔ پھر فرمایا تم میں کا
سنۃ۔ ثم قال الا کلکم راع — ہر ایک ایک طرح کا والی ہے اور تم میں کے ہر
وکلکم مسئول عن رعیتہ(۱) — ایک سے اس کی رعیت کے بارہ میں پوچھا جائیگا۔

وجہ فضیلت ظاہر ہے۔ یہ متاہل و عیال دار ایسا شخص ہے جس نے اپنی اصلاح بھی کی اور غیر کی اصلاح و تزکیہ کے درپے بھی ہوا۔ پھر اس نے ہر اصلاح کی راہ میں

---

(۱) طبرانی و بیہقی۔

مشکلات کا سامنا بھی کیا۔ یعنی اُس کو اگرچہ تکلیفیں پہنچیں۔ مگر اُس نے ان سب کو خندہ پیشانی گوارا کیا۔ بخلاف ایسے شخص کے کہ جو ان جھمیلوں سے یکسر آزاد رہا جس نے دنیا داری کے خارزار میں قدم نہیں دھرا۔ اور لطفِ اذیت سے آشنا نہیں ہوا۔ یہ دونوں کسی طور سے بھی اجر و ثواب کے لحاظ سے برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی نکتہ دلنواز کو بشر نے محسوس کیا اور کہا۔

فضل علیّ احمد بثلاث احداھا انہ یطلب الحلال لنفسہ ولغیرہ۔

امام احمد بن حنبل کو مجھ پر تین وجوہ سے فضیلت حاصل ہے۔ جن میں ایک یہ ہے کہ وہ اپنے لیے ہی نہیں اپنے بال بچوں کے لیے بھی حلال کی روزی تلاش کرتا ہے۔

اور اسی حقیقت کو عبد اللہ بن المبارک کی چشمِ معرفت نے دیکھا۔ یہ ایک غزوہ میں شریک تھے۔ اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ جانتے ہو۔ جہاد سے بھی بہتر کونسا عمل ہے۔ کہنے لگے جی نہیں! فرمایا۔

رجل متعفف ذو عائلۃ قام من اللیل فنظر الی صبیانہ نیاماً متکشفین فسترھم وغطاھم بثوبہ فعمل افضل مما نحن فیہ

ایک ایسا پاکباز جو عیال دار ہو۔ رات کو بیدار ہو۔ اور دیکھے کہ اُس کے ننھے ننھے بچوں پہ سے چادر یا لحاف سرک گیا ہے۔ یہ آگے بڑھے اور اپنی چادر سے اُن کو ڈھانپ دے۔ تو اُس کا یہ عمل ہمارے اس شغل سے بہتر ہے۔

نکاح و تاہل کے روحانی فوائد سے وہ شخص بہرہ مند نہیں ہو سکتا جس کی منزل فرائض و حقوق سے آگے ہے

ان تصریحات سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ کہ ہر ہر شخص ان فوائد سے اپنا دامنِ عمل بھر سکتا ہے۔ نہیں۔ ان سے صرف دو ہی قسم کے حضرات کو نفع

پہنچ سکتا ہے۔ یا تو ایسے شخص کو جو مجاہدہ ریاضت کی ابتدائی منازل میں ہے۔ اور تزئین اخلاق کا طالب ہے۔ یہ جب بال بچوں میں الجھے گا۔ اور ان کے حقوق و فرائض کا اچھی طرح خیال رکھے گا۔ تو بلاشبہ اس سے نفسی و اخلاقی حالت میں ترقی ہو گی۔ اور یہ اپنے میں ایک طرح کے تغیر کو محسوس کرے گا۔ یا پھر ایسا شخص ان فوائد سے لطف اندوز ہو سکتا ہے جس کی روحانی و عقلی سطح زیادہ مرتفع نہیں۔ جسے نہ تو سیر باطن کے مرحلے درپیش ہیں۔ نہ فکر کی پرواز و حرکت کا سامنا ہے۔ اور نہ اس کا قلب ایسا ہے کہ اس کو غوامض و حقائق سے کوئی دلچسپی ہو۔ اس کا مشغلہ زیادہ تر جوارح اور اعمال بدنی تک محدود ہے۔ اور نماز روزہ یا حج و زکوٰۃ سے آگے اس کا گذر نہیں۔ ایسا شخص جب ان نیکیوں کے ساتھ ساتھ کسب حلال اور تربیت و اصلاح کے فرائض کو بھی شامل کرے گا۔ اور بال بچوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کی ذمہ داریوں کو بھی قبول کرے گا۔ تو اس کے محامد و فضائل کے کیا کہنے۔ مگر یہ ایسے شخص کی برابری کیا کر سکتا ہے۔ جو بالطبع نیک ہے اور خلقی و فطری طور سے پاک باز ہے۔ یا اس نے مجاہدہ و ریاضت سے اپنے نفس کو صیقل کر لیا ہے۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو سیر باطن میں مصروف ہے۔ اور اس کا قلب، تو فکر علوم و مکاشفات کی حیرت زائیوں کا شکار ہے۔ یہ شخص اگر شادی کرے گا۔ تو اپنے اس لطف کو کھو دے گا۔ اور اخلاق و تربیت کے فوائد جو پہلے اس کو حاصل ہیں۔ ان پر کوئی اضافہ نہیں کر سکے گا۔ لہذا اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ علم و ادراک کے دائروں کو وسعت دیتا رہے۔ کہ یہ مجرد عمل و سعی پر اس لحاظ سے افضیلت رکھتا ہے۔ کہ یہ علم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک گراں قدر عمل بھی ہے۔

نکاح و تاہل میں کن کن مفاسد کا خطرہ ہے

یہاں تک تو نکاح کے فوائد کی بحث تھی اب غوائل اور مفاسد کی تفصیل پر غور کیجیے

پیدا ہوتا ہے اور غالباً۔ اکل حلال کی دشواریوں کا ہے۔ ایک متاہل اور شادی شدہ شخص کو تعلق چونکہ اپنے علاوہ بیوی اور بچوں کی تربیت و نگرانی سے بھی ہے۔ اس لیے مجبور ہے کہ طلب معاش کے دائرہ کو وسیع کرے۔ اور اتنا مال کما لے جو ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ یہ زمانہ کا مزاج ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص بھی حرام سے تعرض کیے بغیر دولت و ثروت کے وسائل پر قابض ہوسکے۔ اس لیے اسے چاروناچار حرام کی ان کوششوں میں شریک ہونا پڑے گا اور بال بچوں کا پیٹ بھرنے۔ اور ان کی ضروریات پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑنا پڑے گا۔ بخلاف ایک مجرد کے کہ اس کا دائرہ طلب و جستجو چونکہ محدود ہے۔ اس کی خواہشات گنی چنی ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے ممکن ہے۔ کہ عفت و پاکبازی کے معیاروں کو قائم رکھ سکے۔

اس آفت اور خطرہ ہلاکت سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس نے باپ دادا سے خاصی جائداد وراثت میں پائی ہو۔ یا اسے کوئی فن جیسے تنکا۔ یا جنگل سے لکڑیاں کاٹ لینا وغیرہ آتا ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سلاطین و امراء سے اس کو سابقہ نہ پڑا ہو۔ دوسرا کوئی شخص آسانی سے۔ اکل حلال کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہوسکتا۔ لیکن ان صورتوں میں بھی حلال کی روزی اس وقت میسر ہوتی ہے جب حرص و آز کا دامن سمٹتا رہے اور انسان قانع ہو۔ طامع اور حریص نہ ہو۔ اس بنا پر ابن سالم رحمہ اللہ سے پوچھا گیا۔ کہ نکاح سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔

هذا لمن ادركه شبق غالب۔ فان ملك نفسه فتركه اولىٰ۔

نکاح اس کے لیے روا ہے۔ جو شدید جنسی خواہش رکھتا ہو۔ لیکن اگر کوئی صبر و برداشت پر قادر ہے۔ تو نکاح سے باز رہنا ہی اولیٰ ہے۔

نکاح میں دوسرا خطرہ تربیت و اصلاح کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہونا ہے یعنی ایک شخص اگر تنہا اور مجرد ہے۔ تو صرف اپنے ہی احوال اور محاسبہ نفس سے دوچار ہے۔ اور صرف اسی حد تک عند اللہ مکلف ہے۔ کہ اپنی اصلاح کرے۔ اور اپنی بصیرت اور روح کو پاکیزہ رکھے۔ جو نسبتاً آسان ہے۔ لیکن اگر بال بچوں کی نعمت پالتا ہے۔ تو اس کو اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کی اصلاح و تربیت کے فرائض کو بھی پورا کرنا ہوگا۔ اور یہ بھی دیکھنا ہوگا۔ کہ کہیں جن لوگوں کی رہنمائی اور دیکھ بھال اس کے ذمے ہے۔ وہ تو بہک نہیں رہے ہیں۔ اور ان کے پائے عمل میں تو لغزش نہیں پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے۔

كفى بالمرء اثما ان يضيع من يعول۔ — ایک شخص کے گناہگار ہونے کے لیے یہی کیا کم ہے۔ کہ جن کی کفالت اس کے ذمے تھی۔ اس نے انہیں کھو دیا۔

قرآن حکیم نے تربیت و اصلاح کی ذمہ داریوں کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے

قوا انفسكم و اهليكم نارا۔ (تحریم - ۶) — اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

علاوہ ازیں نکاح میں خطرہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اپنی اصلاح تو کجا بچے بال کو سلاطین و امراء کے در دولت پر حاضری دینا پڑتی ہے۔ اور ان کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ سفیان بن عیینہ سے متعلق مشہور ہے کہ ایک مرتبہ باوجود جلالت قدر اور تقویٰ کے ان کو بھی سلطان کے دروازہ جود و سخا پہ دستک دینا پڑی۔ کسی نے پوچھ لیا۔ حضرت آپ یہاں کہاں! فرمایا۔

وهل رأيت ذا عيال افلح — میں کس شمار میں ہوں کبھی کسی متاہل اور عیالدار کو دیکھا ہے۔ کہ ان منزلوں سے سرخروئی اور کامیابی کے ساتھ گزر جائے۔

نکاح اور تاہل سے یہ جو ضرر پیدا ہوتا ہے۔ کہ انسان کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ ناقابلِ انکار ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں۔ کہ کوئی شخص آزمائش کی اس بھٹی میں پڑنے کی وجہ سے اپنے کو لغزش و معصیت کے ارتکاب سے محفوظ ہی نہیں رکھ سکتا۔ ایک ایسا شخص جو عقلمند ہے۔ اور بال بچوں سے حکیمانہ برتاؤ کرنا چاہتا ہے۔ یقیناً ان آزمائشوں سے کامیابی و کامرانی کے ساتھ گذر سکتا ہے۔ اگر اسے عورتوں کی عادات کا اچھی طرح علم ہے۔ اگر وہ ان کے مطالبات اور زباں درازیوں پر صبر کر سکتا ہے۔ اگر اس کے لیے اُن کی ہر ہر خواہش کے سامنے جھکنا ضروری نہیں۔ اور وہ اس لائق ہے کہ ان کے حقوق کو پوری طرح ادا کر سکے ان کی کمزوریوں کا مداوا کر سکے۔ اور ان کی اخلاقی حالت کو سنوار سکے۔ تو بلاشبہ نکاح اور تاہل اس کے لیے بابرکت ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات عوام کے بارے میں تو نہیں کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان پر کم عقلی، بے وقوفی اور غصہ وغضب کا بہرحال تسلط ہوتا ہے۔ اور یہ نہایت آسانی سے انصاف و عدل سے محبت رکھنے کے باوجود بے انصافی اور ظلم و جور کا شکار ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس امکان کے مان لینے کے بعد بھی کہ کچھ لوگ نکاح و تاہل کے مفاسد و غوائل سے اپنے کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ مجموعی اور عمومی طور پر اس کی مضرتوں سے اپنے کو بچائے رکھنا آسان نہیں۔

نکاح کے غوائل و آفات میں تیسرا اور سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انساں کا ذکر و محبت اور تعلق و اتصال کا جو رشتہ ہے۔ کمزور ہو جاتا ہے۔ اور روحانی ارتقار کے سلسلہ میں اچھی خاصی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جس نسبت سے یہ تدبیرِ معاش کی الجھنوں کی طرف متوجہ ہو گا۔ بال بچوں کی سہولت و آسائش کا خیال رکھے گا، اور اُن کے لیے عمدہ اور

اعلیٰ معیارِ زندگی قائم رکھنے کے درپے ہوگا۔ اسی نسبت سے مال سے محبت بڑھے گی۔ اور جمع کرنے اور دولت سمیٹنے کا جنون روز افزوں ترقی کرے گا۔ جس کا فطری اور لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دنیا کی محبت و جذب، خدا کی محبت و جذب پر غالب آجائے گی۔ اور یہ کوشش اور مساعی اس کے پائے ارتقار کی زنجیریں بن جائیں گی۔ اور یہ تیز رفتاری اور یک سوئی کے ساتھ اللہ کی طرف نہیں بڑھ پائے گا۔

ہم نہیں کہتے۔ کہ اس طرح کی کوششوں سے یہ ضرور کسی محظور کا مرتکب ہوکر رہے گا۔ لیکن اتنا تو بہرحال تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ کہ اس کی حرص و آرزو کی گاؤ زوریاں صرف مباح اور جائز پر جاکر رُک نہیں جائیں گی۔ بلکہ تنعم و اغراق اور مبالغہ و غلو کی آخری حدود تک پہنچ کر رہیں گی۔

اور اگر یہ شخص قدرِ حرام سے بچ بھی جائے۔ اور دولت و ثروت جمع کرنے کی حرص اس پر سوار نہ بھی ہو۔ جب بھی بیوی سے محبت تو بڑھ جائے گی۔ اس کو خوش رکھنے، اور خود خوش رہنے کے مواقع تو پیدا ہو رہیں گے۔ اور موانست یا بوس و کنار اور لطف اندوزی کی رنگا رنگ صورتیں، تو موجب صد کشش ہوں گی۔ یعنی ایسی ایسی دلچسپیاں تو بہرحال اُبھریں گی۔ جو قلب و ذہن کے تمام گوشوں پر چھا جائیں۔ اور دل کے کسی خانے کو بھی اس لائق نہ رہنے دیں۔ کہ آخرت کے بارہ میں غور و فکر ہو سکے۔ اور اللہ کی محبت کے لیے ذکر و اشتغال کے اعلیٰ وظائف کو جاری رکھا جائے۔ ان حالات میں اس کی دن رات یہی خواہش رہے گی۔ کہ کوئی موقع ملے۔ اور تسکینِ نفس کا سامان مہیا کیا جائے۔ نفس و خواہشات کی انھیں مجبوریوں کی بنا پر ابراہیم ادہم رحمہ اللہ نے یہ کہہ کر طنز کیا ہے۔ کہ ——————

من تعود افخاذ النساء لم یجئ منہ شئ ۔ جو شخص عورتوں کی رانوں پر ریجھا اور کچھ اسی لطف میں پڑکر رہ گیا اس سے روح و قلب کی ترقی کی کیا امید کی جا سکتی ہے ؟

نکاح و تاہل کے بارہ میں قول فیصل

یہ ہے نکاح کے فوائد و غوائل کی پوری تفصیل ۔ اس سے معلوم ہوگا کہ یہ بہت مشکل ہے کہ کسی ایک شخص کے متعلق ہم علی الاطلاق اس کو مفید یا مہلک قرار دے سکیں ۔ اس لیے کہ ہر شخص کی حالت مختلف ۔ اور ہر شخص کی استعداد اور صلاحیتیں جدا جدا ہیں ۔ ہاں یہ البتہ ممکن ہے ۔ کہ ان فوائد اور مضرتوں کو بطور اصول اور فیصلہ کن عنصر کے تسلیم کر لیا جائے ۔ اور پھر یہ دیکھا جائے ۔ کہ جو شخص تاہل و شادی کی ذمہ داریوں کو قبول کرنا چاہتا ہے ۔ وہ کس حد تک ان فوائد سے بہرہ مند ہو سکتا ہے اور کس حد تک اس کی مضرتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے ۔ اگر فوائد کا پلڑا بھاری ہے اور مضرات و غوائل کے اندیشے کم ہوں ۔ تو تاہل کی زندگی کو اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ بلکہ بعض حالات میں افضل و زیبا ہے ۔ لیکن اگر مضرتوں کا غلبہ ہو ۔ اور فوائد کو سمیٹنے کی امید کم ہو ۔ تب پرہیز اولیٰ ہے ۔ مگر یہ چیز ہر شخص کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے ۔ دوسروں کے طے کرنے کی نہیں مثلاً اگر ایک شخص جوان ہے ۔ اور تسکین جذبات کا خواہاں ہے ۔ اور چاہتا ہے ۔ کہ خواہشات نفس کا غلط استعمال کسی صورت سے نہ ہونے پائے مزید برآں حرام و حلال کی طرف سے بھی مطمئن ہے ۔ اور برتاؤ اور معاملہ میں بھی اخلاق حسنہ کے معیاروں کا خیال رکھتا ہے ۔ تو اس کے لیے نکاح کے افضل و بابرکت ہونے میں کیا شبہ ہے ۔ لیکن اگر خطرات زیادہ ہیں ۔ اور ایک شخص دیانتداری سے یہ سمجھتا ہے کہ اس جھمیلے میں پڑ کر یہ دینی ترقی نہیں کر سکے گا تو اس حالت میں عزلت اور تجرد

ہو اور لے ہے۔

نکاح کے یوں تو کئی فوائد اور کئی مہالک ہیں۔ مگر بہت بڑا فائدہ تسکین جذبات اور حصول اولاد ہے۔ اور بہت بڑا مہلکہ کسب حرام کیلئے امکانات تقرب واتصال کے امکانات کی دوری ہے۔ اس لیے انہیں زادراہ توں کو موازنہ کے وقت سامنے رکھنا چاہیے۔ اور اس نکتہ کا شدت سے خیال رکھنا چاہیے کہ فائدہ سے مراد وہی فائدہ ہے جو واقعی و حقیقی ہو۔ موہوم اور فرضی نہ ہو۔ کیونکہ ایک شخص حصول اولاد کے لیے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جو موہوم ہے، تو دونوں طرح کے امکانات میں یہ بھی ممکن ہے کہ اولاد اس کی قسمت میں ہو۔ اور یہ بھی کہ اس نعمت سے محروم رہے۔

اس بنا پر اس چیز کی طرف سے اچھی طرح اطمینان حاصل کر لینا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اولاد کی توقع پر حقیقی خسارہ مول لے رہا ہو۔

اس مرحلہ پر قدرتاً یہ سوال غور وفکر کی سطح پر ابھرے گا۔ کہ اگر کوئی شخص نکاح کی ان تمام آفات سے محفوظ ہو۔ اور ان عوائل اور مہالک میں سے کوئی بھی اس کے ذہن و قلب کو مشوش کرنے والا نہ ہو۔ تب کیا اس کے لیے نکاح و تاہل کی ذمہ داریوں کو قبول کرنا اولیٰ اور بہتر ہوگا۔ یا یہ کہ یہ اپنے لیے ذکر و فکر اور تجرد و یکسوئی کو پسند کرے۔ اور ان جھمیلوں میں مطلق نہ پڑے۔ ہم یہ کہیں گے۔ کہ ہو سکے تو نکاح و تجرد دونوں کو جمع کرے۔ اور دونوں کے فوائد و برکات سے متمتع ہو۔ کیونکہ درحقیقت ان میں کوئی تضاد بایں بن نہیں نکاح و تاہل میں سب سے بڑا مفسدہ کسب ہی کا تو ہے۔ یقیناً اس سے روح کی پاکیزگی متاثر ہوتی ہے۔ اور سالک اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے۔ مگر کیا ضروری ہے۔ کہ ہر شخص جو شادی شدہ ہو۔ حلال کی لذت ہی سے محروم ہی ہو۔

دوسری بُرائی یا سب سے بڑا جھگڑا یہ ہے۔ کہ حصولِ معاش کا مسئلہ ایک متاہل اور عیال دار پر تمام اوقات ہی بُری طرح چھایا رہتا ہے۔ اور کوئی وقت اور لمحہ بھی اس کو نہیں چھوڑتا۔ جس میں اخلاص و یکسوئی کے ساتھ یہ اللہ تعالےٰ کا ذکر کر سکے۔ اور خلوت و انزوا کے لطائف سے دامن بھر سکے۔

اس امکان یا خدشے کی اہمیت سے انکار نہیں۔ مگر نیت و ہمت شرط ہے۔ کیا پوری رات عبادت و فکر کے لیے کافی نہیں۔ اور اگر شوق و طلب کے داعیے موجود ہوں تو کیا دن کے مختلف لمحوں اور فرصتوں سے بھی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔

ایک اہم سوال حضرت عیسیٰ نے کیوں تجرد اختیار کیا! اور آنحضرت نے کیوں نو نو بیویوں کو حرم میں رکھا؟ ان دو مختلف مقامات کی تشریح

اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی ضروری سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر ان دونوں کیفیتوں کا جمع کرنا ہی افضل ہے۔ تو حضرت عیسیٰ اس فضیلت سے کیوں محروم رہے۔ حالانکہ وہ اللہ کے پیغمبر اور فرستادہ تھے اور اگر تخلی و تجرد اولیٰ ہے۔ نکاح نہیں۔ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نو نو بیویوں کو بیک وقت اپنے حرم میں رکھا۔؟

دو لفظوں میں اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ دو مختلف مقام ہیں۔ آں حضرت کی ہمتِ عالی اور قدرت و استطاعت کی بلندی کا یہ عالم تھا۔ کہ یہ مشاغل اور رکاوٹیں اُن کے داعیاتِ ذکر و فکر اور تقاضائے شوق و طلب میں کوئی وہن و ضعف نہیں پیدا کر سکے اور اس سے نہیں روک سکے۔ کہ آپ تاہل و ازدواج کے پہلو بہ پہلو عبادت و تجرد کے لطائف سے بھی مالامال ہوں۔ چنانچہ یہ حقیقت

ہے کہ نو نو بیویوں کے باوجود آں حضرت جب رات کو اُٹھتے اور عبادت کے لیے کھڑے ہوتے تو پاؤں متورم ہو ہو جاتے۔ مگر شوق اور لطف و ذوق کی کیفیتوں میں کمی نہ آتی۔

رہی یہ بات کہ حضرت عیسٰی نے نکاح و تاہل سے کیوں گریز کیا۔ تو یہ اس لیے کہ مقام حزم و احتیاط کا یہی تقاضا تھا۔ یعنی ان کے حالات ایسے تھے کہ ان کا شادی نہ کرنا ہی اولیٰ اور بہتر تھا۔

اس باب میں یہ اصول یاد رکھنا ہے۔ کہ جب ہم انھیں اللہ کا پیغمبر اور رسول مانتے ہیں۔ اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ نکاح و تجرد کا مسئلہ سراسر حالات کے اختلاف کے ساتھ وابستہ ہے۔ اشخاص کے ساتھ نہیں۔ اور ان دونوں میں سے کسی سے متعلق بھی علی الاطلاق کچھ کہنا مشکل ہے۔ تو اس صورت میں ہمیں ان کے نکاح سے باز رہنے کی بہرحال ایسی ہی تاویل کرنا چاہیے۔ جو برمحل ہو۔ جس سے کہ ان کی بزرگی و فضیلت سے متعلق کوئی بدگمانی نہ پائی جائے۔ اس لیے کہ بحیثیت مسلمان کے ہمارا یہی فرض ہے کہ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے احوال و اعمال کے لیے اعلیٰ اور بہتر محمل تلاش کریں۔ اور یہ نہ سمجھیں کہ معاذ اللہ۔ اُنھوں نے کوئی کام بھی ادنیٰ محرکات سے متاثر ہو کر کیا ہے۔ یا کوئی قدم بھی اللہ کی رضا کے خلاف اُٹھایا ہے۔

عورتوں سے حُسنِ سلوک اور اُن سے متعلق ضروری مسائل

شادی کے بعد خاوند کے لیے کن کن آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اور حسنِ معاشرت کے سلسلہ میں کن کن ہدایات پر عمل پیرا ہونا لازم ہے۔ یہ بحث ازدواجی زندگی کو اسلامی نقطۂ نظر سے بسر کرنے اور سنوارنے کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ تفصیل کے لیے ہم اس کو مندرجہ ذیل بارہ عنوانوں کے تحت ذکر کریں گے۔

(۱) ولیمہ۔ (۲) حُسنِ خلق۔ (۳) ملاعبت و ملاطفت۔ (۴) اعتدال۔ (۵) غیرت میں توازن۔ (۶) نفقہ۔ (۷) تعلیم۔ (۸) عدل۔ (۹) مساعیٔ احسن۔ (۱۰) وظیفۂ جنسی کے آداب۔ (۱۱) اولاد۔ اور (۱۲) طلاق۔

ولیمہ کا استحباب معروف ہے۔ حضرت انس کا کہنا ہے۔

رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم على عبد الرحمٰن بن عوف رضي الله عنه اثر صفرة فقال ما هذا۔ فقال تزوجت امراة على وزن نواة من ذهب فقال بارك الله لك

آں حضرت نے عبدالرحمٰن بن عوف کے کپڑوں پر زرد رنگ کے اثرات دیکھے پوچھا یہ کیا قصہ ہے؟ انھوں نے کہا حضور! میں نے ایک عورت سے ایک گٹھلی کے برابر سونے کے ڈلے پر نکاح کر لیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ مبارک کرے۔ مگر ولیمہ کی دعوت

اولم ولو بشاۃ ۔ (۱) ضرور کرو۔ چاہے ایک بکری ہی ذبح کرنی پڑے

اس دعوت کے کئی فوائد ہیں۔ ایک بڑا فائدہ اعلان بھی ہے۔ جو نکاح کو دوسرے تمام تعلقات سے ممیز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے علاوہ شریعت نے کچھ اور چیزوں کو بھی مستحب گردانا ہے۔ جن سے اعلان کی غرض و غایت پوری ہو سکتی ہے۔ مثلاً دف بجانا۔ گانا۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

فصل ما بین الحلال والحرام الدف والصوت۔ حلال و حرام میں فرق یہی ہے کہ حرام کا ارتکاب چھپکے چھپکے ہوتا ہے۔ اور نکاح میں جو جائز اور حلال تعلق ہے۔ دف بجتی ہے۔ اور گانا ہوتا ہے۔

نکاح اور خوشی کی تقریبات پر گانا ایک عام معمول تھا۔ ربیع بن معوذ کہتے ہیں۔ کہ میری تقریب نکاح پر آں حضرت تشریف لائے۔ لڑکیاں دف پر کچھ گا رہی تھیں۔ ان میں کی ایک نے کہا۔

وفینا نبی یعلم ما فی غد۔ ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات بھی جانتا ہے۔

آپ نے سنا تو فرمایا۔

اسکتی عن ھذہ وقولی الذی تقولین قبلھا۔ ایسا نہ کہو۔ جو پہلے الاپ رہی تھیں وہی الاپے جاؤ۔

احسن معاشرت آں حضرت کی آخری وصیت اس سلسلہ کا دوسرا عنوان حسن خلق ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کی لغزشوں پر درگذر کیا جائے۔ اور ہر طرح کی تکلیف کو ممکن حد تک برداشت کیا

جائے۔ کیونکہ ان میں عقل و دانش کی فراوانیاں نہیں۔ قرآن میں ہے۔

وعاشروهن بالمعروف — اور اُن سے اچھی طرح رہو سہو۔

(النساء - ۱۹)

دوسری جگہ ان کے حقوق کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی۔

واخذن منكم ميثاقا غليظا (النساء - ۲۱) — اور تم سے وہ عہد واثق بھی لے چکی ہیں۔

قرآن میں ایک جگہ پڑوسی کے بارہ میں آیا ہے۔

والصاحب بالجنب (النساء - ۳۶) — اور پہلو کے رفیق۔ (یعنی ان سے بھی احسان اور مروت کا برتاؤ ہونا چاہیے)۔

بعض لوگوں نے اس سے مراد منکوحہ عورت لیا ہے۔
سب سے بڑھ کر یہ کہ آخری کلمات جو آنحضرت کی زبان مبارک سے نکلے یہ تھے۔

الصلوٰة الصلوٰة وما ملكت ايمانكم لا تكلفوهم ما لا يطيقون - الله الله في النساء فانهن عوان في ايديكم۔

اور غلاموں کا خیال رکھو۔ نماز کا التزام کرو۔ ایسا نہ ہو، کہ تم ان کو ان کے مقدور سے زیادہ زحمت دو۔ اور عورتوں کے بارے میں خصوصیت سے اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ وہ بے چاریاں، سراسر تمہارے قبضہ میں ہیں۔ اور تمہارے رحم وکرم کی اسیر ہیں۔

حسن خلق کے کئی پہلو ہیں۔ جن میں ایک یہ بھی ہے۔ کہ اپنی طرف سے کوئی حرکت ایسی نہ کی جائے۔ کہ جس سے اُن کو کسی طرح کی اذیت کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن جو پہلو زیادہ قابل قدر ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگرچہ عورتیں غضبناک ہوں اور سخت غصہ میں ہوں۔ تب بھی حلم وصبر اور برداشت وعفو ہی کا ثبوت دیا جائے۔ آنحضرت

کی سنت کا تقاضا یہی ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواجِ مطہرات خفا ہوتی تھیں۔ اور دن دن بھر قطع کلام رہتا تھا۔ تاہم آپ بُرا نہیں مانتے تھے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت فاروق کے دبدبہ و جلال کے باوجود اُن کی بیوی نے ان سے اختلاف ظاہر کیا۔ اور جواب دیا۔ تو اُنھوں نے برہم ہو کر کہا۔

اتراجعینی یا لکعاء۔ فقالت	اے بدبخت کیا تو مجھے جواب دیتی ہے۔
ان ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ	بیوی نے کہا۔ آپ کیا ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ
وسلم یراجعنہ وھو خیر منک	علیہ وسلم آپ سے کہیں بہتر تھے۔ اور اُن کی

بیویاں اُن کو جواب دیتی تھیں۔ اور اُن کے سامنے بولتی تھیں۔

باہمی مناقشہ کی پاکیزہ ترین شکل۔ ازواجِ مطہرات کا اندازِ اظہار

آں حضرت سے ازواجِ مطہرات کا اختلاف و مناقشہ کیا شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اُس کو خود آنحضرت کے اس ارشاد سے معلوم کیجیے۔

وکان یقول لہا۔ انی لاعرف	آں حضرت جناب عائشہ سے کہا کرتے
غضبک من رضاک، قالت و	کہ میں جانتا ہوں۔ تو کب خفا ہوتی ہے اور
کیف تعرفہ۔ قال اذا رضیت	کب خوش ہوتی ہے۔ عائشہ نے پوچھ لیا۔
قلت لا و الٰہ محمد و اذا	یہ آپ کو کیسے معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا جب تو
غضبت قلت لا و الٰہ ابراھیم	خوش ہوتی ہے، تو ربِ محمد کی قسم کھاتی ہے
قالت صدقت انما اھجر	اور برہم ہوتی ہے تو۔ تو ربِ ابراہیم کی
اسمک۔ (۱)	قسم کھاتی ہے۔ عائشہ نے کہا۔ آپ درست

فرماتے ہیں۔ لیکن میں صرف آپ کا نام ہی ترک کرتی ہوں۔ آپ کی محبت سے دست بردار نہیں ہوتی۔

حضرت انس نے آں حضرت کو جو عورتوں اور بچوں سے محبت تھی اُس کو ان الفاظ

---

(۱) متفق علیہ۔

میں بیان فرمایا ہے۔

کان رسول اللہ ارحم الناس بالنساء والصبیان - (۱)

آنحضرت عورتوں اور بچوں کے حق میں سب سے بڑھ کر شفیق و مہربان تھے۔

عورتوں کے لیے لطف و تفریح کے جائز مواقع بہم پہنچانا چاہییں - اس سلسلہ میں حدود اعتدال کی تعیین

ازدواجی رشتوں کو استوار تر کرنے - اور حسن معاشرت کے معیاروں کو قائم رکھنے کا ایک طریق یہ ہے - کہ عورتوں کی پرواکیے بغیر ہنسی مذاق جاری رہے - اور ملاعبت و ملاطفت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے - چنانچہ آنحضرت ہمیشہ اس کا خیال رکھتے اور اپنے مرتبہ و مقام کی بلندیوں کی پروا کیے بغیر ایسی ایسی تفریحات میں بیویوں کے ساتھ حصہ لیتے - جو اُن کی عقلی سطح کے عین مطابق ہوتیں - چنانچہ احادیث میں یا آتا ہے - کہ آں حضرت عائشہ کے ساتھ دوڑ لگاتے جس میں ایسا بھی ہوتا - کہ حضرت عائشہ آپ سے آگے نکل جاتیں - ایک مرتبہ آپ نے حضرت عائشہ کو حبشیوں کا تماشہ بھی دکھایا - یہ اس لیے کہ اہل و عیال کو خوش رکھنا بھی آپ کے نزدیک ایک بہت بڑی دینی خدمت انجام دینا ہے - اس حقیقت کا اظہار آپ نے ایک حدیث کے ذریعہ یوں فرمایا ہے۔

اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا والطفھم باھلہ -

کامل الایمان آدمی وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں - اور جو اپنے بال بچوں کے لیے بدرجۂ غایت شفیق ہو -

ایک دوسری حدیث میں ہے -

خیرکم خیرکم لنسائہ

تم کا بہتر وہ ہے جو عورتوں کے حق میں

---

(۱) متفق علیہ -

و انا خیرکم لنسائی - (۱) بہتر ہو۔ اور میں تم سب میں عورتوں کے حق میں رہوں۔

ہنسی مذاق اور لطف و ملاعبت کی افادیت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ کہ اس سے ازدواجی تعلقات کی استواری میں بڑی مدد ملتی ہے لیکن اس کے بھی کچھ حدود ہیں۔ اور ان حدود میں اعتدال و توازن کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً خاوند کو اللہ تعالیٰ نے سیادت عطا کی ہے۔ اور ایک قسم کا وقار بخشا ہے۔ جو تدبیر منزل کی مصلحتوں کو نبھانے اور آپس کے جھگڑوں کو مٹانے کے لیے بہت اہم ہے۔ اب اگر اس کا طرز عمل ایسا ہے جس سے عورت گستاخ ہو جاتی ہے۔ اور اس سے خاوند کا وقار اُٹھ جاتا ہے۔ اور وہ ہیبت باقی نہیں رہتی۔ جس کا باقی رہنا خود اُس کے حق میں مفید ہے۔ تو یہ طرز عمل اعتدال اور توازن کے خلاف ہو گا۔

اسی طرح خاوند کو اس چیز کا بھی خیال رکھنا ہو گا۔ کہ بیوی منکرات اور خلاف شرع باتوں پر جسور نہ ہو جائے۔ اور اس کے تساہل و محبت سے اس کو حدود اللہ توڑنے کا موقع نہ ملے۔ یہ درست ہے۔ ان سے حُسن سلوک روا رکھنا چاہیے۔ اور عمدہ برتاؤ کا ثبوت دینا چاہیے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں۔ کہ اُن کو خواہشات کی پیروی میں انسان اس حد تک بڑھ جائے۔ کہ نہ اُن کو شریعت کی پرواہی رہے اور نہ آداب و مروت کا خیال۔ ان سے گھر کے مسائل کے بارے میں بات چیت اور مشورہ کرنا چاہیے۔ مگر عمل اسی بات پر ہونا چاہیے۔ جو عند اللہ صحیح اور عند الشرع درست ہو۔ یہی مطلب ہے حضرت عمر کے اس قول کا۔

خالفوا النساء فان فی رائے اور مشورہ میں عورتوں کی مخالفت کرو

---

(۱) ترمذی و نسائی -

خلافهن برکة۔ کیونکہ برکت ان کی مخالفت ہی میں ہے۔ موافقت میں نہیں۔

ان ہی کا قول ہے۔

تعس عبد الزوجة۔ جورو کے غلام کا بھلا نہ ہو۔

ایسے شخص کو جو اپنے اختیارات سے کام نہیں لیتا۔ اپنے منصب کی اہمیتوں کو نہیں سمجھتا۔ اور ناجائز امور میں بیوی کا مطیع بن کر رہتا ہے۔ اگر غلام نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ مرد کو اللہ تعالیٰ نے سربراہی سے سرفراز کیا ہے متبوع بنایا ہے اور قوام ٹھہرایا ہے۔ یہی نہیں سید یا خاوند بھی کہا ہے۔

والفیا سیدها لدی الباب۔ (یوسف - ۲۵) دونوں کی دروازہ کے قریب اس کے خاوند سے مڈبھیڑ ہوئی۔

لہذا اگر کوئی شخص ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ اور متبوع کے بجائے تابع کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے اس نعمت کی قدر نہیں کی۔ اور کفران نعمت کا ثبوت دیا ہے۔

عورت کی مثال دراصل نفس انسانی کی سی ہے۔ کہ آپ نے ذرا ڈھیل دی تو اس کی سرکشی اور تمرد بڑھا۔ اور بڑھتا چلا گیا۔ اور اگر احتیاط برتی اور اس کو قابو میں رکھا۔ تو گویا ان کی زمام کار آپ کے قبضے میں ہے۔ جس طرح چاہیے کام لیجیے۔

امام شافعی نے عورتوں کی نفسیات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ثلاثة ان اکرمتهم اهانوك وان اهنتهم اکرموك المرءة والخادم والنبطی۔ تین ایسے افراد ہیں۔ آپ نے ان کی تکریم کی۔ تو یہ آپ کی توہین کے درپے ہوں گے اور اگر ان کی توہین کی۔ تو وہ تمام ان کی نظر میں آپ کی عزت بڑھ جائے گی۔ عورت۔ خادم۔ اور حبشی۔

اس سے غلط فہمی نہ اُبھرنا چاہیے - اور بدگمانی نہ پیدا ہونا چاہیے - امام کا مقصد یہ ہے - کہ اگر ان سے تکریم کا برتاؤ کیا جائے - مگر ڈانٹ ڈپٹ اور مناسب زجر و توبیخ نہ کی جائے تو ان نتائج کا پیدا ہونا ناگزیر ہے -

یہ واضح رہے کہ عورتیں بھی یونہی گستاخی پر آمادہ نہیں ہو جاتیں - بلکہ پہلے وہ اس بات کا اندازہ لگا لیتی ہیں - کہ خاوند کا مزاج کیسا ہے - اور اس میں تحمل و برداشت کی قوتیں کس حد تک ہیں! چنانچہ عرب عورتیں اپنی لڑکیوں کو جو نصیحت کیا کرتی تھیں - اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو -

اختبري زوجك قبل الاقدام والجراة عليه - انزعي زج رمحه فان سكت فقطعي اللحم على ترسه - فان سكت فكسري العظام على ترسه - فان سكت فاجعلي الاكاف على ظهره و امتطيه فانما هو حمارك -

بیٹی!! اپنے خاوند کو خوب دیکھ بھال لے - پھر اس کے خلاف مرضی کوئی قدم اُٹھا - اور اس کا طریق یہ ہے کہ اس کے نیزے کا پھل اُتار لے - اور اپنے کام میں لا - اس پر اگر چُپ رہے - تو اس کی ڈھال! اور سپر پر گوشت کاٹ اور قیمہ تیار کر - اس پر بھی نہ بولے تو اس کی ڈھال پر ہڈیاں توڑ اور گودا نکال - اور اس پر بھی خاموش رہے - تو اس پر جھول ڈال - اور سواری گانٹھ - کیونکہ وہ تمہارا گدھا ہے خاوند نہیں

عدل و توازن ہی معاشرت کی اساس ہے

الغرض عدل و توازن ہی زندگی و معاشرت کا بہترین پیمانہ ہے - اسی پر زمین آسمان کی استواریاں قائم ہیں - یہ اگر موجود ہے - تو معاشرت میں ایک طرح کا انضباط اور ہمواری رہے گی - اور اگر یہ عدل ہی پایا نہیں جاتا ہے - تو طرح طرح کی قباحتوں کا پیدا ہونا لازمی ہے - لہذا چاہیے - کہ ہر ایک مسلمان بیوی کے معاملہ میں ان حدود کا پورا پورا خیال رکھے، نہ اس درجہ تواتی و محبت کا ثبوت دے - کہ ان کی پیروی

اور اطاعت پر مجبور ہو جائے۔ اور نہ مخالفت ہی کا ایسا انداز اختیار کرے۔ کہ بدمزگی پر منتج ہو۔ بلکہ ان کے بین بین جو حسن اور صحیح ہے اسی کو اختیار کرے۔ کیونکہ معتدل اور درمیانہ روش اختیار کرنے ہی سے عورتوں کے شر سے انسان کا محفوظ رہنا ممکن ہے۔ ورنہ کون نہیں جانتا۔ کہ ان کے مکر و کید کا کیا عالم ہے۔ ان کا شر کس درجہ واضح ہے۔ اور سوء خلق اور رکاکت کا ان پر کتنا استیلاء ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ ان کے ان مفاسد سے بچنے کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لطف و احتیاط کا ملا جلا معاملہ ان سے روا رکھا جائے۔ یہ اکثریت کا حال ہے۔ یعنی عورتوں سے سوء ظن بربنائے اغلبیت ہے ورنہ ان میں نیک اور صالح عورتیں بھی ہیں۔ جن کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

المرءة الصالحة فی النساء کمثل الغراب الاعصم بین مائة غراب۔	عام عورتوں میں ان صالحہ کا وجود ایسا ہی نادر الوجود ہے۔ جیسے سو کووں میں ایک سفید ٹانگوں والا مل جائے۔

حضرت لقمان نے عورتوں کے بارہ میں اپنے بیٹے سے کہا۔

یا بنی اتق المرءة السوء فانها تشیبك قبل المشیب واتق شرار النساء فانهن لا یدعون الی خیر وکن من خیارهن علی حذر۔	اے بیٹا! بری عورت سے احتراز کر وہ تمہیں قبل از وقت بوڑھا کر دے گی۔ شریر عورتوں سے بھی اجتناب کر۔ کیونکہ خیر کی طرف کیا بلائیں گی، الٹا شر ہی کی طرف دعوت دیں گی اور ان میں جو بہتر اور صالح ہوں اُن کے بارہ میں بھی چوکس رہ۔

خود آنحضرت نے ازواج مطہرات کو، جو دنیا کی بہترین عورتیں ہیں۔ ان الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔

انکن صواحبات یوسف — تم وہ ہو جنھوں نے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی۔

آں حضرت کا مقصد اس حدیث سے یہ تھا کہ جس طرح زلیخا کی کچھ سہیلیوں نے حضرت یوسف کو حق و اعتدال کی راہ سے منحرف ہو جانے کی دعوت دی۔ اسی طرح خلافتِ ابوبکر کے معاملہ میں تمھاری روش ہے۔ کہ میں تو ان کو خلافت کے لیے آگے بڑھا رہا ہوں اور تمھارا مشورہ یہ ہے کہ یہ ہرگز مناسب نہیں۔

آں حضرت کا یہ ارشاد بھی ہے۔

لا یفلح قوم تملکھم امراۃ — وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جس کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ میں ہو۔

حضرت عمر کی عورتوں کے متعلق کیا رائے تھی۔ اس کا اظہار ہو چکا۔ کہ ان کی بیوی نے ایک مرتبہ جب ان کو جواب دیا، تو انھوں نے ڈانٹا اور کہا۔

ما انت لعبۃ فی جانب البیت ان کانت لنا الیک حاجۃ والا جست کما انت — تمھاری حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ گھر کے ایک گوشہ میں گڑیا کی طرح پڑی ہو۔ ضرورت ہو گی تو دل بہلا لیا جائے گا۔ ورنہ وہیں چپ سادھے بیٹھی رہو۔

ان تصریحات سے معلوم ہوا۔ کہ عورتوں میں فطرۃً ضعف و کمزوری ہے۔ اور شر و مزر ہے۔ لہذا ایک حاذق طبیب کی طرح ان دونوں بیماریوں کا معالجہ ہونا چاہیے اور ان کے ساتھ بہرحال اب ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ جس میں ان دونوں کی رعایت رکھی گئی ہو۔ لہذا تھوڑی سی حکمت عملی اور خشونت تو اس بنا پر ضروری ہے تاکہ ان کے شر کا پہلو دبا رہے۔ تاکہ ان کے ضعف و کمزوری کا مداوا ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ میں کوئی کلیہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔ ہونا صرف یہ چاہیے۔ کہ ہر ہر خاوند

اپنی بیوی کی اخلاقی حالت کا اچھی طرح جائزہ لے۔ اور پھر ایسا طرزِ عمل اختیار کرے جو مناسب حال ہو۔

غیرت ایک اچھا اور پاکیزہ جذبہ ہے۔ مگر اس معاملہ میں توازن اور احتیاط نہایت ضروری ہے

غیرت ایک نہایت پاکیزہ جذبہ ہے۔ مگر یہ بھی اگر توازن کے ساتھ ہو تو کارآمد و مفید ہے

ورنہ نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بحیثیت خاوند کے ایک مرد کو اپنی بیوی کی حرکات و سکنات کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ اور ابتدا میں اگر معمولی کمزوریوں پر اس کی نظر پڑے تو بطریق حکمت اس کی اصلاح بھی کرنا چاہیے۔ اس نگرانی سے ان شاء اللہ مفاسد نہیں اُبھریں گے۔ اور ہر طرح برائی کا سدِ باب ہو جائے گا۔ مگر حد سے بڑھا ہوا سوءِ ظن خواہ مخواہ کی ٹٹول اور تجسس سے نہایت خوفناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا جذبۂ غیرت کے استعمال میں ایسی چیزوں سے ہمیشہ دامن بچانا لازم ہے۔ حدیث میں ہے۔

نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تتبع عورات النساء۔[1]

آن حضرت نے اس سے روکا ہے کہ کوئی شخص عورتوں کی کمزوریوں کے درپے تجسس رہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

المرءۃ کالضلع ان قومتہا کسرتہ۔ تستمتع بہ علی عوج۔[2]

عورت میں پسلی کی سی ٹیڑھ ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو توڑ ڈالو گے

اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس ٹیڑھ کے باوجود اس سے فائدہ اُٹھاتے رہو۔

غیرت کے بے جا استعمال سے کیا برائی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی طرف حضرت علی نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

---

(۱) طبرانی۔

(۲) متفق علیہ۔

لا تكثر الغيرة على اهلك فترمى بالسوء من اجلك ۔

اپنی بیوی کے بارے میں ضرورت سے زیادہ غیرت کا اظہار نہ کرو۔ کیونکہ اس میں یہ خطرہ ہے کہ کہیں وہ تمہاری وجہ سے برائی کا ارتکاب کر بیٹھے۔

ان تصریحات کا تعلق جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ غیرت بے جا سے ہے۔ لیکن اگر اس کا استعمال برمحل ہو۔ تو کیا کہنے۔ یہ صفت تو ایسی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے لیے اس اتصاف کو گوارا فرمایا ہے۔ چنانچہ آنحضرت کا ارشاد ہے۔

ان الله يغار والمومن يغار وغيرة الله تعالى ان ياتى الرجل ما حرم عليه ۔ (۱)

اللہ بھی غیرت والا ہے اور مومن بھی غیرت والا ہے۔ اللہ کی غیرت کا اظہار ان مواقع پر ہوتا ہے جب کوئی شخص اس حرام کا مرتکب ہو۔

اسی طرح حضرت سعد کے بارہ میں فرمایا۔

اتعجبون من غيرة سعد انا والله اغير منه ۔ والله اغير منى ۔ (۲)

کیا تمہیں سعد کی غیرت پر تعجب ہو رہا ہے میں بخدا اس سے زیادہ غیور ہوں اور اللہ مجھ سے بھی بڑھ کر غیرت والا ہے۔

غیرت کی تعریف اور حدود

حضرت فاطمہ کا مرتبہ عفاف

لیکن یہ غیرت ہے کیا۔ اور اس کے حدود کہاں کہاں تک ممتد ہیں۔ اس کے بارہ میں بعض احادیث و آثار ملاحظہ ہوں۔ آں حضرت نے ایک مرتبہ جناب فاطمۃ الزہرا سے پوچھا۔

ای شیء خیر للمرءة ۔

عورت کا بہترین طرز عمل کیا ہے۔

آپ نے جواب میں فرمایا۔

---

(۱) متفق علیہ

(۲) متفق علیہ

ان لا ترٰی رجلا ولا یراھا۔ (۱) — یہ کہ نہ تو عورت کسی غیر مرد کو دیکھے اور نہ کوئی غیر اس کو دیکھ پائے۔

آں حضرت اس جواب پر اتنا خوش ہوئے کہ فاطمہ کو سینے سے لپٹا لیا۔

صحابہ کا طرزِ عمل اس بارہ میں یہی تھا کہ غیرت کے جملہ لوازم کا خیال رکھتے چنانچہ یہ اپنے گھر کی دیواروں میں کوئی رخنہ یا شگاف ایسا نہ رہنے دیتے جن سے باہر کے لوگوں پر نظر پڑ سکے۔ اور اگر اتفاقیہ کہیں کوئی دررہ جاتی تو اس کو بند کر دیتے۔

عیدین میں آں حضرت نے عورتوں کو شریک ہونے کی البتہ اجازت دی ہے اسی طرح اگر کوئی خاص ضرورت پیش آجائے۔ تو ان کا گھر سے نکلنا ممنوع نہیں۔ بشرطیکہ خاوند سے اجازت حاصل کر لی گئی ہو۔ مگر اصول اس سلسلہ میں یہی ہے۔ کہ عورت گھر ہی کو اپنا مرکز سمجھے۔ اور بلا کسی امر مہم کے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ محض سیر و تفریح کے لیے سڑکوں اور بازاروں میں گھومتے پھرنا کسی طور سے بھی شرافت کے مطابق نہیں۔ بلکہ بسا اوقات موجب فتنہ و فساد ہے۔ لہذا اس سے احتراز اولیٰ ہے۔

اس سلسلہ میں عبداللہ بن عمر اور اُن کے بعض بچوں کا طرزِ عمل بھی سبق آموز ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی۔

لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ۔ — اللہ کی بندیوں کو خانۂ خدا میں آنے جانے سے نہ روکو۔

اس پر اُن کے بعض صاحبزادوں نے کہا۔

بلی واللہ نمنعھن۔ — بخدا ہم تو قطعی روکیں گے۔

اُن کو اس پر غصہ جو آیا۔ تو اُن کو پیٹ ڈالا اور کہا۔

---

(۱) بزار و دارقطنی۔

تسمعنی اقول قال رسول اللہ لا تمنعوا وتقول بلی (۱)

تم سُن رہے ہو کہ میں حدیث رسول بیان کر رہا ہوں۔ کہ آں حضرت نے عورتوں کو مسجد میں حاضری کی اجازت دی ہے۔ اور تم مخالفت کر رہے ہو۔

عبداللہ بن عمر تو اس جسارت اور طرزِ عمل پر ناخوش تھے۔ کہ حدیث رسول پیش کی جائے اور بغیر کسی معقول عذر کے اُس کو رد کر دیا جائے۔ اور بچوں کا عذر یہ تھا۔ کہ زمانہ بدل گیا اور اخلاق و عادات میں وہ پہلی سی پاکیزگی نہیں رہی۔ لہذا اس اجازت کا اطلاق بھی علی الاطلاق نہ ہونا چاہیئے۔

قرآن کے نقطۂ نظر سے نان و نفقہ کا معیار۔ بال بچوں پر خرچ کرنا جہاد سے بھی بہتر ہے

نفقہ اور خرچ کے متعلق قرآن کا یہ اصول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

کلوا واشربوا و لا تسرفوا۔ (اعراف - ۳۱)

کھاؤ اور پیو۔ مگر بے جا نہ اُڑاؤ۔

ولا تجعل یدك مغلولۃ الی عنقك ولا تبسطها کل البسط۔ (بنی اسرائیل - ۲۹)

اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا یعنی تنگ کر لو۔ اور نہ بالکل کھول ہی دو۔

بال بچوں پر خرچ کرنے کا کیا درجہ ہے؟ اس سوال کا جواب اس حدیث میں ڈھونڈیئے۔

دینار انفقتہ فی سبیل اللہ۔ و دینار انفقتہ فی رقبۃ و دینار تصدقت بہ علی مسکین

ایک دینار تو وہ ہے۔ جو تو نے جہاد کے سلسلہ میں خرچ کیا۔ ایک دینار تو وہ جس سے غلام کو آزادی دلانے میں مدد دی۔ ایک دینار

---

(۱) متفق علیہ

ودینار انفقتہ علیٰ اھلک۔ اعظمہا اجرًا الذی انفقتہ علیٰ اھلک۔ (۱)

کو کسی غریب پر خرچ کیا۔ اور ایک دینار بیوی پر صرف کیا۔ یہ ان سب سے اجر میں بڑھ کر ہے۔

حضرت علی کا قاعدہ تھا کہ اپنی چاروں بیویوں کے لیے ہفتہ میں دو بار گوشت ضرور خریدتے۔ نفقہ اور خرچ میں اعتدال اور توازن کی ایک صورت وہ ہے جو حضرت حسن کے قول میں ملتی ہے۔ ان کا کہنا ہے۔

کانوا فی الرجال مخاصیب وفی الاثاث والثیاب مجادیب۔

صحابہ کی کیفیت یہ تھی کہ انسانوں کے معاملہ میں تو زرخیز زمین کی طرح فیاض تھے یعنی خوب خوب لگتے تھے۔ مگر گھر کے سازوسامان اور لباس وغیرہ کے معاملہ میں ایسی زمین کے مانند تھے۔ جس کی پیداوار حد درجہ کم ہو۔

یعنی اعتدال کے پہلو کو یوں قائم رکھتے کہ بال بچوں پر تو کھلے دل سے خرچ کرتے اور آرائش اور لباس وغیرہ کے معاملہ میں جزرسی کا ثبوت دیتے۔

خرچ میں اعتدال سے یہ نہ سمجھنا چاہیے۔ کہ سرے سے تکلفات کا اہتمام ہی نہ کیا جائے۔ کیونکہ کبھی کبھی کا تکلف خانگی زندگی کے لوازم میں سے ہے۔ ابن سیرین کا قول ہے۔

یستحب للرجل ان یعمل لاھلہ کل جمعۃ فالوذجہ وکان الحلاوۃ۔ وان لم تکن من المھمات۔ ولکن ترکھا بالکلیۃ تقتیر فی العادۃ۔

اپنے بال بچوں کے لیے ہر جمعہ کے روز فالودہ کا اہتمام کرنا۔ از قبیل استحباب ہے۔ اور اس طرح کی میٹھی چیزیں مہیا کرنا اگرچہ غذا کی ضروری فہرست میں داخل نہیں تاہم کلیۃً اس کا ترک بھی قطعی بخل کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔

---

(۱) متفق علیہ

تدبیرِ منزل کا اہم اصول مساوات ہے کھانے پینے کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ جو تدبیرِ منزل سے خصوصیت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ یہ ہے۔ کہ اپنی ذات کو

باہمی اختلاف کی شکل میں حکم کا انتخاب

مرجح نہ سمجھے۔ اور ایسا نہ کرے۔ کہ خود تو پُرتکلف کھانوں سے کام و دہن کی تواضع کرے۔ اور بال بچوں کو کفاف پر ٹرخائے۔ اور اگر کسی وجہ سے اچھے اور مرغن کھانوں کا استعمال کرنا ہی پڑے تو اس کا علم بال بچوں کو نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ طرح طرح کی بدگمانیاں اُبھریں گی۔ اور تعلقات باہمی میں تکدر پیدا ہوگا۔

کھانے کے آداب میں ایک ادنیٰ مگر نتائج کے اعتبار سے نہایت ہی خوش آئند ایک ادب یہ بھی ہے۔ کہ جب کھانا تناول کرے تو ایک ہی دستر خوان بچھائے اور بال بچوں کی معیت میں کھائے۔ اور تنہا خوری سے حتی الامکان پرہیز کرے لیکن زیادہ اہم بات اس باب میں اکل حلال ہے۔ کوشش کرے کہ پیٹ کی احتیاجیں اس کے جذبۂ ایمان پر غالب نہ آنے پائیں۔

مرد کو کم از کم کن مسائل کا جاننا ضروری ہے تعلیم سے یہ غرض ہے کہ مرد کو ان احکام و مسائل کو جاننا چاہیے۔ کہ جن کا تعلق غسل و طہارت، اور حیض و استحاضہ سے ہے تاکہ یہ مسائل وہ بیوی کو بتا سکے۔ ان مسائل کا خصوصیت سے عورتوں کے لیے جاننا اس بنا پر ضروری ہے۔ کہ ان کے بغیر عبادات کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے۔ اور چونکہ ان مسائل کی نزاکت اس بات کی متقضی ہے۔ کہ دوسروں سے نہ پوچھے جائیں۔ اس لیے یہ ذمہ داری خاوند کی ہے۔ کہ پہلے وہ دینی علم حاصل کرے۔ اور پھر بیوی کو سمجھائے۔ لیکن اگر وہ خود اس قابل نہ ہو تب علماء سے پوچھ کر ان مسائل کی پوری پوری تفصیل سے بیوی کو آگاہ کرے۔ اور اگر خاوند یہ بھی نہ کر پائے تو بیوی براہِ راست علماء دین سے ان مسائل

کے بارہ میں معلومات حاصل کر سکتی ہے ۔ اس صورت میں خاوند کو ہرگز حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس سے اُس کو روک سکے ۔ یا اجازت نہ دے ۔

تعدد ازدواج کی صورت میں عدل کا پیمانہ اور اصلاح احوال کی تدبیریں

عدل سے یہ مقصود ہے ۔ کہ جس حد تک ممکن ہے ۔ اور جن جن امور میں انسانی اختیار کو دخل ہے ۔ ان میں کسی قسم کی ناانصافی نہ ہونے پائے ۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کی ضرورت عموماً تعدد ازدواج کی صورت میں پیش آتی ہے ۔ آں حضرت کا طرزِ عمل اس معاملہ میں یہ تھا ۔ کہ علما رو انفاق میں کامل مساوات برتتے ۔ شب باشی میں بھی کسی کی حق تلفی نہ فرماتے لیکن جذبات محبت کے تفاوت پر جو بالکل قدرتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں معذرت خواہ ہوتے ۔

اللھم ھذا عمدی فیما املك ولا طاقة لی فیما لا املك[1]

پروردگار ! جن چیزوں میں میرا بس چلتا ہے میں نے تقاضائے عدل کو ملحوظ رکھا ہے ۔ مگر جو باتیں میرے اختیار میں نہیں ۔ ان میں مساوات کیونکر قائم رکھ سکتا ہوں ۔

میاں بیوی جب مل جُل کر رہیں گے ۔ تو باہمی اختلافات اور رنجشیں بھی پیدا ہوں گی ۔ اور ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں بھی اُبھریں گی ۔ ان کا علاج اسلام نے مساعی اصلاح سے کیا ہے ۔ مساعی اصلاح کیا ہیں ۔ عام حالات میں ان کو ہر کوئی جانتا ہے ۔ اس میں وعظ و نصیحت بھی داخل ہے ۔ تادیب بھی مفید ہے کچھ دن کے لیے جنسی تعلقات کا انقطاع بھی مفید رہتا ہے ۔ اور اگر ان حربوں سے مزاج درست نہ ہو ۔ تو ہلکی سی مار پیٹ میں بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن جب اختلافات بڑھ جائیں اور کوئی انفرادی صورت اصلاح احوال کی کارگر ہوتی نظر نہ آئے ۔ تو ایسے مواقع پر قرآن

---

(۱) اصحاب سنن ۔

نے دونوں کے عزیزوں میں سے دو حَکَم "پنچ بیٹھ" کا حکم دیا ہے۔ ان کے سامنے سب حالات بغیر کم و کاست کے پیش کیے جائیں۔ اور موقع دیا جائے۔ کہ یہ اپنی صوابدید سے کسی فیصلہ پر پہنچیں۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ یہ حکم اگر میتوں کو صاف رکھیں۔ اور جانب داری سے کام نہ لیں۔ تو ضرور کوئی نہ کوئی شکل باہمی سلوک کی نکل آئے گی۔

اِنْ يُرِيدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا۔ (نساء۔ ٣٥)

اگر صلح کرا دینی چاہیں گے۔ تو خدا ان میں موافقت پیدا کر دے گا۔

دونوں حکم اگر نیک نیتی سے کام لیں تو موافقت مابین کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی

حضرت عمر کا استدلال

قرآن کا یہ فیصلہ کس قدر یقین افروز ہے۔ اس کو حضرت عمر کے نہایت ہی حکیمانہ طرز استدلال کی روشنی میں دیکھیے۔ ایک مرتبہ جب حکمین نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور میاں بیوی میں مصالحت کرانے میں ناکام رہے تو انھوں نے کوڑے سے اُن کی خبر لی۔ اور کہا کہ قرآن تو کہتا ہے کہ اصلاح ممکن ہے۔ اور تم اس کو ناممکن خیال کرتے ہو۔ جاؤ اور پھر نیک نیتی سے کوشش کرو نتیجہ یہ ہوا کہ دوبارہ ان لوگوں نے میاں بیوی کے درمیان افہام تفہیم سے کام لیا۔ اور کامیاب رہے۔ (سبحان اللہ حضرت عمر کی نظر بھی امور دین میں کتنی عمیق تھی۔ اور قرآن کے ان نکات و رموز پر بھی اُن کو کس درجہ انشراح حاصل تھا۔ جو عام طور پر بڑے بڑوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔)

اسلام نے وظیفہ جنسی ادا کرنے پر بھی کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ کیونکہ اس کے نقطۂ نگاہ سے یہ فعل محض جسم و حیوانیت کا تقاضا نہیں۔ بلکہ اس کا تعلق اولاد اور تربیتِ اولاد ایسے پاکیزہ اصول سے ہے۔ اس بنا پر احادیث میں اس سلسلہ میں کچھ ہدایات آئی ہیں۔ مثلاً آں حضرت نے اس سے روکا ہے۔ کہ کوئی شخص بالکل

عریانی کی حالت میں اس فعل کو انجام دے۔ اس سے بھی منع کیا ہے۔ کہ بغیر دواعی محبت و دواعی کے اُکسائے۔ اور مناسب فضا پیدا کیے۔ مباشرت شروع کر دے علاوہ ازیں اس بات کی تلقین کی ہے۔ کہ اس فعل سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیا جائے ایک حدیث میں ہے۔

لو ان احدکم اذا اتی	اگر تم میں سے کوئی وظیفہ زناشوئی ادا کرتے
اھلہ قال اللھم جنبنی	وقت یہ پڑھ لے کہ اے پروردگار شیطان کو مجھ سے
الشیطان وجنب الشیطان	دور رکھ۔ اور میری اولاد کو بھی اس کی دستبرد سے
ما رزقتنا فان کان بینھما	بچا۔ تو جو اولاد پیدا ہوگی وہ شیطان کے شر سے
ولد لم یضرہ الشیطان۔	محفوظ رہے گی۔

عزل کے جواز پر دلائل اور اس کے محرکات کا باریک تجزیہ حسن و جمال کا تحفظ اور عورت کا جذبۂ تعزز اور پندار نظافت بھی اس میں شامل ہے

عزل جائز ہے یا نہیں! اس سوال پر فقہا نے چار طریق سے غور کیا ہے۔ بعض نے مطلقاً جائز ٹھہرایا ہے۔ بعض کے نزدیک علی الاطلاق حرام ہے۔ کچھ لوگ اس شرط پر اس کی صحت کے قائل ہیں۔ کہ بیوی سے اس کی اجازت حاصل کر لی جائے۔ اور بعض حرہ اور مملوکہ میں فرق قائم کرتے ہیں ان کے نزدیک مملوکہ سے تو عزل ہو سکتا ہے۔ حرہ سے نہیں۔ مگر ہماری رائے یہ ہے۔ کہ یہ علی الاطلاق جائز ہے۔ اور نہی کی روایات کو ہم ترک اولیٰ پر محمول کرتے ہیں۔ کہ اس کا ایک مورد و محل یہی ہے۔ کیونکہ عزل کے حرام اور منہی عنہ ہونے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو کوئی نص ایسی ہو جس میں اس فعل سے روکا گیا ہو۔ اور یا پھر قیاس صحیح اس کا مبنیٰ قرار پائے۔ ظاہر ہے۔ اس باب میں دونوں چیزیں نہیں۔ نہ تو کوئی نص ہی پائی جاتی ہے اور نہ قیاس صحیح ہی اس کی حرمت و مخالفت

پر دلالت کناں ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ قرین صواب ہے۔ کہ قیاس تو اُلٹا اس کے جواز کا مقتضی ہے۔ کیونکہ جب نفس نکاح ضروری نہیں۔ نکاح کے بعد مباشرت ضروری نہیں۔ اور مباشرت کے باوجود انزال کو روکا جاسکتا ہے۔ تو عزل میں کیا مضائقہ ہے؟ اور اس میں عدم جواز کا کونسا پہلو نکلتا ہے؟ اس قیاس کا ایک اور صورت سے جائزہ لیجیے۔

سوال یہ ہے کہ بچہ کیونکر تخلیق و تکوین کی منزلیں طے کرتا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ اس کی پیدائش و تخلیق چار مرحلوں کی مرہونِ منت ہے۔ یعنی پہلے تو میاں بیوی میں مناکحت و اتصال کا رشتہ قائم ہونا چاہیے۔ پھر ایسے مواقع ملنے چاہییں۔ کہ جن میں یہ وظیفۂ جنسی ادا کر سکیں۔ پھر وظیفۂ جنسی اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک کہ فراغت کلی نہیں ہو پاتی۔ اور تنہا یہ فراغت بھی کافی نہیں۔ بلکہ یہ اس وقت ختم ہوتی ہے جب نطفہ قرار مکیں میں پہنچکر زندگی کی پہلی دہلیز پر قدم رکھ دیتا ہے۔ اب اگر نکاح اختیاری امر ہے۔ جنسی تعلق بھی زوجین کی مرضی پر منحصر ہے۔ فراغت کے لمحوں کو بھی تا بہ انزال ممتد کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی انزال کو کلیتاً روکا بھی جا سکتا ہے۔ تو عزل کیوں اختیاری چیز نہیں۔ اس سے آخر کس شرعی مصلحت کا خون ہوتا ہے؟

کوئی شخص کہہ سکتا ہے۔ اچھا عزل ان معنوں میں درست سہی کہ اس سے وظیفۂ تخلیق میں کوئی قابلِ ذکر خلل پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ایک وقت خاص تک اولاد کی آمد کو روک دیا جاتا ہے۔ لیکن اس اعتراض کا کیا جواب ہے۔ کہ اس سلسلہ میں نیت تو بہر حال اچھی نہیں ہوتی۔ اس میں تو شرک خفی کے شوائب پائے جانے کا قطعی خطرہ ہے۔ ہم کہیں گے نہیں۔ ساری نیتیں ایسی نہیں ہوتیں۔ آئیے نیتوں کا تجزیہ کریں۔ اور دیکھیں کہ ان میں کہاں کہاں شرعی نقطۂ نظر سے خلل پایا

جاتا ہے۔ اور کون کون صورتیں ایسی ہیں۔ جن میں کسی قباحت کی نشان دہی نہیں ہوتی۔
نیتیں پانچ مقاصد پر مشتمل ہو سکتی ہیں۔

(۱) لونڈیوں سے عزل کرنے میں یہ مصلحت ہو سکتی ہے۔ کہ یہ اُم ولد نہ ہونے پائیں اور اس سے استفادہ و ملک کے حقوق بدستور قائم رہیں۔ ظاہر ہے ایسی کوشش قطعی ممنوع نہیں۔

(۲) اس کا عام فائدہ یہ ہے۔ کہ عورتوں کی خوبصورتی اور جمال ایک عرصہ تک باقی رکھا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں اس سے جسم کی موزونیتیں اور فربہی قائم رہتی ہے یہ سبب بھی ایسا نہیں کہ نہی کے ضمن میں آ سکے۔

(۳) کثرت اولاد سے اکثر گربڑ پیدا ہوتی ہے۔ اور معاشی توازن میں فرق آتا ہے۔ نیز انسان مجبور ہوتا ہے۔ کہ آمدنی کے ان ذرائع کے درپے ہو۔ جو ناجائز ہیں ظاہر ہے عزل سے اس برائی کا سدباب ہوتا ہے۔ لہذا نیت کا یہ پہلو بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بلکہ غور کیجیے گا۔ تو اس سے دینی تقاضوں کو پورا کرنے میں مدد ملے گی۔ کیونکہ اس شخص کی دنیوی اور مالی پریشانیاں جس نسبت سے کم ہوں گی اسی نسبت سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ جمعیت خاطر سے رجوع ہو سکے گا۔

کمال توکل البتہ اس کا مقتضی نہیں

ہاں البتہ یہ صحیح ہے۔ کہ کمال توکل اس کے خلاف کا مقتضی ہے۔ کیونکہ رزق کی ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے قبول کر رکھی ہیں۔ بندوں پر اس کی ذمہ داری نہیں۔

وما من دآبۃ فی الارض — اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں۔ مگر
الا علی اللہ رزقھا۔ (ہود - ٦) — اس کا رزق خدا کے ذمہ ہے۔

مگر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ یہ مرتبہ کمال کا تقاضا ہے اور ترک کمال بہر حال جائز نہیں۔ کیونکہ اگر کوئی شخص، عواقب و نتائج کے پیش نظر، مال و دولت کو جمع کرتا

اور تحفوظ رکھتا ہے۔ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ فعل شنیع کا مرتکب ہو رہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے گا۔ کہ اس کا یہ فعل احتیاط پر مبنی ہے۔ ٹھیک اسی طرح معاشی خرابیوں کے اندیشے سے متاثر ہو کر اگر کوئی شخص عزل کرتا ہے۔ تو اس کو ناجائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کو احتیاط کے درجے میں رکھیں گے۔

(۴) ایک آدمی اس خوف سے عزل کا مرتکب ہوتا ہے۔ کہ مبادا لڑکیاں پیدا نہ ہوں۔ اور لڑکیوں کی پیدائش پر حسب رسم جاہلیت ناک بھوں چڑھاتا اور عار محسوس کرتا ہے۔ تو یہ پہلو واقعی قابلِ اعتراض ہے۔ اور اس طرح قابلِ اعتراض ہے جس طرح کہ کوئی عورت مثلاً شادی سے اس بنا پر احتراز کرے کہ اس طریق سے مرد کو تفوق حاصل ہو جائے گا۔

(۵) کبھی کبھی عزل کا محرک عورت کا پندار نظافت وتعزز ہوتا ہے یعنی عورتیں یہ چاہتی ہیں کہ حیض ونفاس اور رضاعت وتربیت کے جھمیلوں میں پڑنے سے جس حد تک احتراز کر سکتی ہیں کریں۔ اور جس حد تک ان ذمہ داریوں سے بچ سکتی ہیں اپنے کو بچائے رکھیں۔ تصنع ونیت کا یہ پہلو ایسا ہے۔ کہ اس کو بھی شرعاً جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔

کیا عزل قتل کے مترادف ہے

عزل پر معنوی حیثیت سے ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ حدیث رسول میں بصراحت اس کی مذمت آتی ہے۔

ذالک الواد الخفی وقرأ وإذا الموءدة سئلت - (تکویر۔ ۹)[1]

یہ وادِ خفی یعنی بچوں کو مار ڈالنے کے مترادف ہے۔ اور اس پر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اور جب موؤدہ سے پوچھا جائے گا۔ الآیہ

---

(۱) صحیح مسلم۔

ہم کہیں گے کہ یہ کراہت پر محمول ہے۔ تحریم پر نہیں۔ کیونکہ عزل کے جواز پر بھی کئی صحیح احادیث شاہد ہیں۔

ابن عباس کا ایک قول بھی اس سلسلہ میں پیش ہو سکتا ہے۔ جس میں اُنھوں نے کہا ہے۔

العزل هو الواد الاصغر — عزل چھوٹے پیمانے پر وأد ہی ہے۔

ہمارا موقف اس کے مقابلہ میں یہ ہے۔ کہ ابن عباس کی یہ رائے محض قیاس پر مبنی ہے۔ یعنی انھوں نے بھی اس کو موؤدہ کے مماثل قرار دیا ہے۔ اس قیاس کی حیثیت کیا ہے؟ اس کے بارہ میں حضرت علی کا جواب ملاحظہ ہو۔

اُنھوں نے استدلال کی اس نوعیت کو سُنا۔ تو فوراً تردید فرمائی۔ اور تردید کی بنیاد قرآن کی اس آیت پر رکھی۔ جس میں کہ نطفہ سے جنین کامل ہونے تک سات منزلوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين۔ ثم جعلناه نطفة فی قرار مكين الآیۃ

اور ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا اور پھر ہم ہی نے اُس کو حفاظت کی جگہ (یعنی عورت کے رحم میں) نطفہ بنا کر رکھا۔

گویا جب تک یہ قطرۂ آب اس ہفت خواں سے نہ گذرے، اس پر مولود کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور جب تک یہ مولود نہیں ہے اس کا استہلاک جائز ہے۔

اس استدلال سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ ابن عباس اور علی میں معانی کے درک و استدلال کے طریق میں کتنا فرق ہے۔ حضرت علی کی نظریں کس درجہ عمیق، گہری اور نکتہ رسی لیے ہوئے ہیں۔

لیکن متفق علیہ حدیث حضرت جابر سے مروی ہے۔

كنا نعزل على عهد رسول — ہم آں حضرت کے زمانہ میں عزل کرتے تھے

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم ینہنا۔ لیکن ہمیں اس سے روکا نہیں گیا۔

جابر ہی سے ایک حدیث اور اس مضمون کی آئی ہے۔

ان رجلا اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان لی جاریۃ ھی خادمنا وسانیتنا فی النخل وانا اطوف علیہا واکرہ ان تحمل فقال علیہ الصلوٰۃ والسلام اعزل عنہا ان شئت فان سیاتیہا ما قدر لہا۔ فلبث الرجل ما شاء اللہ ثم اتاہ۔ فقال ان الجاریۃ قد حملت فقال قد قلت سیاتیہا ما قدر لہا۔

ایک آدمی آں حضرت کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔ میری ایک لونڈی ہے جو ایک طرف تو گھر میں بطور خادمہ کام کرتی ہے۔ دوسری طرف کھجور کے پودوں کو سینچتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ حاملہ ہو اور کام کاج میں ہرج واقع ہو۔ آپ نے فرمایا۔ کہ چاہو تو عزل کر سکتے ہو مگر جو اولاد مقدر ہے وہ تو ایک نہ ایک دن پیدا ہو کر رہے گی۔ کچھ عرصہ اُس کا عزل پر عمل رہا۔ پھر آں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو اس نے شکایت کی۔ کہ حضور اس کے تو حمل ٹھہر گیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یہی تو میں نے کہا تھا کہ ایک نہ ایک دن مقدر ہے۔ وہ ظاہر ہو کر رہے گا۔

مرد کے لیے باپ کی حیثیت سے کن آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے

بچیوں سے ترجیحی سلوک روا رکھنے میں زیادہ اجر ہے

پانچ آداب ولادت سے متعلق ہیں جن کو باپ کی حیثیت سے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) اولاد ذکور پہ زیادہ نہ اترائے۔ اور اگر لڑکی پیدا ہو۔ تو اس پہ مایوسی پیدا نہ ہو نہ زیادہ حزن و تشویش کا اظہار ہی کرے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ خیر و برکت کے پہلو کو کون زیادہ سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ لڑکا جس کی اُس کو آرزو ہے یا وہ لڑکی جو پیدا ہوئی ہے

مزید برآں لڑکی کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ثواب و اجر کی مقدار کہیں بڑھ جاتی ہے۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

من كانت له ابنة فادبها فاحسن تاديبها وغذاها فاحسن غذاءها۔ واسبغ عليها من النعمة التي اسبغ الله عليها كانت له ميمنة وميسرة من النار الى الجنة۔ (۱)

اگر کسی نے اپنی بچی کی تعلیم و تربیت کا اچھی طرح انتظام کیا۔ اس کو عمدہ اور اچھی غذا بھی دی اور ان تمام نعمتوں میں اس کو شریک ٹھہرایا جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مالا مال کر رکھا ہے۔ تو یہ لڑکی جہنم کی راہ میں اس کا میمنہ و میسرہ بن جائے گی اور اس کو جنت میں پہنچا کر رہے گی۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

ما من احد يدرك ابنتين فيحسن اليهما ما صحبتاه الا ادخلتاه الجنة۔ (۲)

جس کسی کو دو بچیوں کا باپ ہونے کا موقع ملا اور اس نے جب تک وہ اس کے پاس رہیں ان سے بہترین سلوک روا رکھا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دونوں اس کے دخولِ جنت کا باعث ہوں گی۔

ایک حدیث میں تو آں حضرت نے لڑکیوں سے ترجیحی سلوک روا رکھنے کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

من خرج الى سوق من اسواق المسلمين فاشترى شيئا فخص به الاناث دون الذكور نظر الله من نظر الله اليه لم

جس شخص کا مسلمانوں کے بازاروں میں سے کسی بازار میں گذر ہوا۔ اور وہاں سے کوئی چیز خرید کر گھر لایا پھر اسے صرف بچیوں میں تقسیم کیا۔ تو اللہ تعالیٰ اس پر مخصوص نظر ڈالے گا۔ اور جس پہ اس کی نظر

---

(۱) طبرانی۔

(۲) ابن ماجہ۔

یعذب بہ۔ (۱) پڑھ جائے وہ عذاب میں مبتلا نہیں ہوتا۔

(۲) جب بچہ پیدا ہو۔ تو اس کے کان میں اذان کہنا چاہیے۔ تاکہ پہلی آواز جو کان میں پڑے وہ اللہ کی توحید پر مبنی ہو۔ اور ساتویں دن ختنہ کرنا چاہیے۔

(۳) جب بچہ اس دنیا میں قدم رکھے۔ تو اس کا اچھا سا نام بھی تجویز کرنا چاہیے یہ اس کا مخصوص حق ہے۔ اچھے نام کیسے ہونے چاہییں۔ حدیث میں آیا ہے۔ کہ جن میں عبودیت کا اظہار ہو۔ حدیث میں ہے۔

احب الاسماء الی اللہ عبد اللہ وعبد الرحمٰن۔ اللہ کو عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ایسے نام بہت پیارے ہیں۔

"محمد" اگرچہ آں حضرت کا اسم گرامی ہے۔ مگر عام مسلمانوں کا یہ نام بھی ہو سکتا ہے۔ آپ نے اس کی اجازت دی ہے۔

سموا باسمی ولا تکنوا بکنیتی۔ میرے ایسے نام ضرور رکھو۔ مگر کنیت میں اختلاف ہونا چاہیے۔

اس احتیاط میں یہ مصلحت تھی کہ اس زمانے میں عام مسلمانوں کو جب اس نام اور اس کنیت کے ساتھ پکارا جائے گا تو اس سے شبہ پیدا ہوگا کہ شائد اس کے مخاطب آں حضرت ہیں۔

ظاہر اس صورتِ حال سے آں حضرت کو پریشانی لاحق ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس سے روکا۔ اب چونکہ یہ اندیشہ باقی نہیں رہا۔ اس لیے نام اور کنیت جمع کر دینے میں کوئی ہرج نہیں۔

اگر کسی شخص کا نام اس کے والدین نے اچھا نہیں رکھا ہے کہ اس میں خود ستائی پائی جاتی ہے۔ تو اس کو بدل دینا چاہیے۔ چنانچہ آں حضرت کی بیوی زینب کا پہلا نام

(۱) خدائیگی۔

برۃ تھا۔ آپ نے اس کو تبدیل کر کے زینب تجویز فرمایا۔ کیونکہ اس سے خود کو پاکیزہ سمجھنے کے جذبہ کی نمائش ہوتی ہے۔

ایسے ناموں سے بھی روکا ہے جن میں کسی وقت تشائم کا پہلو اُبھر آئے۔ یا بدشگونی کا احتمال ہو۔ جیسے برکت وغیرہ کہ جب کوئی پوچھے گا

برکت یہاں ہے؟

تو جواب میں کہا جائے گا

جی نہیں!

یعنی یہاں برکت نہیں ہے۔ حالانکہ برکت ہر جگہ رہنی چاہیئے۔

(۴) بچہ کی ولادت پر عقیقہ بھی کرنا چاہیئے۔ اگر لڑکا پیدا ہو تو دو بکرے ذبح کرے اور لڑکی ہو تو ایک کافی ہے۔ یہ بھی سنت ہے کہ بچے کے سر کے بالوں کے برابر سونا یا چاندی صدقہ کے طور پر دے دیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

امر فاطمۃ رضی اللہ عنہا یوم سابع حسین ان تحلق شعرہ وتتصدق بوزنہ شعرہ فضۃ۔

حسین کی ولادت کے ساتویں دن آں حضرت نے فاطمہ سے کہا۔ کہ اس کا سر منڈوائے اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی اللہ کی راہ میں بطور خیرات کے دے۔

(۵) کھجور یا کسی میٹھی چیز کی گھٹی دینا بھی مسنون ہے۔ عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے۔ تو حضرت اسماء بنت ابوبکر اُن کو اسی غرض سے آں حضرت کے پاس لائیں اور آپ کی گود میں ڈال دیا۔ آں حضرت نے خرما منگوایا۔ اور چبایا پھر اپنا لعاب دہن اس کے مُنہ میں ڈال دیا۔

طلاق بدرجۂ مجبوری دینا چاہیے۔ اس سے متعلقہ ضروری مسائل کی تشریح۔

نکاح اور ازدواجی زندگی کے آداب وضروریات میں سے آخری چیز طلاق ہے جس کی اجازت شریعت نے بدرجۂ مجبوری عطا کی ہے۔ اور ایک ایسا جائز قرار دیا ہے۔ جسے صرف اس وقت اختیار کیا جاسکتا ہے جب صلح کی تمام تدبیریں ناکام ہوجائیں۔ اور اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہے کہ دونوں میاں بیوی علیحدگی اختیار کرلیں۔

اس جائز کی کیا حیثیت ہے۔ اس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ آں حضرت نے اسے "ابغض المباحات" کہا ہے۔

یعنی ایسا امرِ مباح جو اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت ناگوار اور انتہائی ناپسندیدہ ہے طلاق ایسی فضا میں دینا چاہیے جس میں اس کو ایذا بالباطل سے تعبیر نہ کیا جائے۔

قرآنِ حکیم میں ہے۔

فان اطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا۔ (نساء - ۳۴)

اور اگر فرمانبرداری اختیار کرلیں۔ تو ایذادہی کا کوئی بہانہ مت ڈھونڈو۔

اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ طلاق کے لیے خواہ مخواہ اسباب و وجوہ تلاش نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ کوشش کرنا چاہیے۔ کہ حالات حتے الامکان سازگار رہیں۔ اور میاں بیوی میں محبت وحسن سلوک کا ماحول ہمیشہ قائم رہے۔ پھر اگر علیحدگی ناگزیر ہوجائے اور علیحدہ ہوجانے ہی میں دونوں کا بھلا اور راحت ہے۔ تب طلاق کی نوبت آنا چاہیے۔ ورنہ بغیر کسی عذر شرعی و طبعی کے طلاق دینا ایذاء بالباطل کے تحت شمار ہوگا۔

اگر زیادتی مرد کی ہو۔ اور وہ چاہتا ہو۔ کہ بیوی سے قطع تعلق کرلے۔ تو اس صورت میں عورت اپنے مالی حقوق سے دستبردار ہوکر گلو خلاصی حاصل کرسکتی ہے

اسے عُرفِ شرع میں خلع کہا جاتا ہے۔ مگر مالی حقوق سے دست برداری کے یہ معنی نہیں کہ جتنی چاہے مانگ لے۔ اس میں اصول یہ ہے۔ کہ مطالبے کو اس کی استطاعت و توفیق کے حدود سے آگے نہ بڑھائے۔ اور صرف اسی قدر رقم کی واپسی کا دعوےٰ کرے جو مہر کی شکل میں اُسے دے دی ہے۔ ورنہ یہ صرف زیادتی اور ظلم ہی کے مترادف نہ ہوگا۔ بلکہ کہا جائے گا کہ یہ شخص جنسی تعلق کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ پھر جس طرح مرد کے لیے ضروری ہے کہ سوا حالات کی انتہائی ناسازگاری کے طلاق نہ دے۔ اسی طرح عورت کو بھی چاہیے۔ کہ خواہ مخواہ طلاق کا مطالبہ کر کے اپنی دنیا و عقبیٰ خراب نہ کرے۔

حدیث میں ہے۔

ایما امرأۃ سألت زوجها	جو عورت بھی اپنے خاوند سے بغیر کسی تکلیف
طلاقها من غیرما بأس لم ترح	کے اور حقیقی شکایت کے طلاق کا مطالبہ کرے گی
رائحة الجنة ۔ (۱)	وہ جنت کی بو بھی نہیں سونگھ پائے گی۔

ایک حدیث میں ایسی تنک مزاج عورتوں کو جو بلاوجہ طلاق و خلع کی خواہشمند رہتی ہیں، ان الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔

المختلعات هن المنافقات ۔	خلع چاہنے والیاں درحقیقت منافق ہیں۔

طلاق کب اور کیونکر دینا چاہیے

طلاق کیونکر دی جائے۔ کتاب و سنت میں اس کے لیے چار باتیں ضروری ٹھہرائی گئی ہیں۔

(۱) ایسے وقفہ پاکیزگی میں طلاق دے۔ جس میں نہ تو عورت حائضہ ہوا ور نہ وظیفہ جنسی ہی ادا کیا گیا ہو۔ ورنہ وہ طلاق جس میں ان دونوں چیزوں کا خیال نہیں رکھا جائے گا۔ بدعی کہلائے گی۔ عبداللہ بن عمر نے ایک مرتبہ اپنی بیوی کو حیض کی حالت

---

(۱) ابوداؤد۔

میں طلاق دی ۔ اس پر آں حضرت نے کہا۔

مرہ فلیراجعہا۔ حتی تطہر ثم تحیض ثم تطہر ثم ان شاء طلقہا وان شاء امسکہا فتلک العدۃ امر اللہ ان یطلقہا النساء (۱)

اس سے کہیئے کہ رجوع کرے، یہاں تک کہ عورت نہا دھو کر پاک ہو جائے۔ پھر جب حیض آئے اور عورت نہا دھو کر پاک ہو جائے تو طلاق دے سکتا ہے یا اس سے باز رہ سکتا ہے۔ یہی وہ عدت صحیحہ ہے اللہ نے جس کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

"طہر" یا پاکیزگی کے دو وقفوں کا انتظار اس مصلحت پر مبنی ہے۔ تاکہ یہ بات واضح ہو جائے۔ کہ ایک شخص علیحدگی کا فی الواقع فیصلہ کر چکا ہے۔ اور یہ فیصلہ کسی عارضی خفگی کا نتیجہ نہیں۔

پہلے ایک ہی طلاق پر اکتفا کرنا چاہیے

طلاق کی دو نفسیاتی خرابیاں

(۲) پہلے ایک طلاق دینے پر اکتفا کرے تاکہ اگر اس فیصلہ سے دست بردار ہونا پڑے اور حسب سابق تعلقات زناشوئی برقرار رکھنا ہی قرین مصلحت ہو تو رجوع کر سکے۔ ورنہ اس میں یہ قباحت ہے۔ کہ بغیر عمل تحلیل کے مطلقہ بیوی اس کے قبضے میں نہیں آسکتی۔ اور حلالہ میں دو خرابیاں ایسی بین ہیں کہ جن کا کوئی علاج ہی نہیں۔ لہٰذا اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔ ایک تو جس مرد کا عارضی طور پر اس عورت سے تعلق ہو گا۔ اس کے دل میں محبت و موانست کے جذبات کا ابھر آنا ممکن ہے۔ جو شاید دائمی صورت اختیار کر لیں۔ دوسرے خود اس عورت کے بارہ میں خاوند کو ہمیشہ خیال رہے گا۔ کہ اس کی محبت خالص نہیں رہی۔ چنانچہ یہ بدگمانی چٹکیاں لیتی رہے گی۔ کہ ممکن ہے اس کے جذبات کا رخ اب بھی اسی طرف ہو۔ ایک طلاق میں یہ برائی نہیں۔

---

(۱) نسائی۔

(۳) طلاق کے بعد عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر اس اذیت کی تلافی کرے۔ جو اس کو طلاق سے پہنچی ہے۔ قرآن میں ہے۔

و متعوھن۔ (البقرہ - ۲۳۶) اور اُن کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو۔

حضرت حسن کثرت طلاق کی وجہ سے بدنام ہیں۔ مگر اُن کا حسن سلوک ملاحظہ ہو۔ یہ جب طلاق دیتے تو دس دس ہزار درہم کی گراں قدر رقیں مطلقہ بیوی کو ادا کرتے تاکہ اُس کے دل میں غبار نہ رہے۔ اور وہ اس قطع تعلق پر بھی اُن کی نجابت و شرافت کے بارہ میں حرف گیری نہ کر سکے۔

(۴) کسی صورت میں بھی اپنی بیوی کا راز افشا نہ کرے۔ اور کوئی لفظ اپنی زبان سے ایسا نہ نکالے جس سے اُس کی حرمت و عزت نفس پر حرف آتا ہو۔ نہ اُس وقت جب وہ اس کے حبالۂ عقد میں ہو۔ اور نہ اس وقت جب وہ اس کی بیوی نہ رہے۔ حدیث میں آنحضرت نے اسے بدترین خیانت سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے۔ کہ ان کی اپنی بیوی سے کچھ شکایتیں پیدا ہوئیں۔ اور چاہا کہ طلاق دے دیں۔ کسی دوست کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے ازراہ بے تکلفی پوچھ لیا۔ آپ کیوں طلاق دے رہے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ جب تک میری بیوی ہے میں راز افشا کرنے والا نہیں۔ کیونکہ اُس کی عزت اور ناموس کی حفاظت میرا فرض ہے۔ پھر جب اُنھوں نے طلاق دے ہی دی۔ تو اُنھوں پھر بر بنائے دوستی سوال کیا۔ آپ نے کیوں اس غریب کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگے کہ اب چونکہ میرے لیے وہ بمنزلہ ایک غیر اور اجنبی عورت کے ہے۔ اس بنا پر اُس کو ذلیل کرنے کا مجھے کیا حق حاصل ہے؟

غرض یہ ہے کہ طلاق کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک شخص اب کسی معقول وجہ سے ازدواجی رشتوں کو قائم رکھنا نہیں چاہتا۔ اس لیے اس کو اختیار ہے۔ کہ اس معاہدے کو توڑ دے۔ اور اس عورت کو بخوشی اجازت دے دے۔ کہ

وہ بھی جہاں چاہے رہے اور جس سے چاہے عقد کرے۔ یہ بات بہرحال معاملہ کی ہے۔ اس لیے اس کو نہایت خوش اسلوبی سے معاملہ ہی کی سطح پر رہنا چاہیے بدمزگی۔ بدگمانی۔ اور ایسی فضا پیدا نہ ہونا چاہیے۔ کہ جس سے ان دونوں میں کسی ایک کی شہرت خراب ہوتی ہو۔ اور مزید تلخیاں ابھرتی ہوں۔

شوہر کے حقوق

شوہر کی اطاعت ضروری ہے بیوی کے لیے ضروری ہے کہ شوہر کے ہر مطالبہ کو پورا کرے۔ اور اس کی تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ جب تک کہ اس مطالبہ میں معصیت کا کوئی پہلو نہ ہو۔ کیونکہ یہ تعلق ایک گونہ رقیت اور غلامی سے مشابہ ہے۔ اور لونڈی کو کہاں اختیار ہے کہ حکم عدولی کی مرتکب ہو۔

شوہر کی اطاعت سے متعلق متعدد روایات مذکور ہیں۔ ایک حدیث میں ہے۔

ایما امرأۃ ماتت وزوجھا عنھا راض دخلت الجنۃ۔ (۱)	جو عورت اس حال میں مری کہ اُس کا شوہر اس سے خوش تھا۔ اُس کا جنت میں جانا یقینی ہو گیا۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

اذا صلت المرأۃ خمسھا وصامت شھرھا، وحفظت فرجھا۔ واطاعت زوجھا دخلت جنۃ ربھا۔ (۲)	جس عورت نے پانچ نمازیں پڑھیں۔ پورے مہینے کے روزے رکھے۔ اور عفیف و پاکباز رہی نیز شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری میں بھی سرگرم رہی وہ گویا اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو گئی۔

اس اطاعت و فرمانبرداری کے حدود کیا ہیں؟ ایک روایت ملاحظہ ہو۔

---

(۱) ترمذی

(۲) ابن حبان۔

وکان رجل قد خرج الی سفر وعهد الی امراته ان لا تنزل من العلو الی اسفل وکان ابوها فی الاسفل - فمرض فارسلت المراة الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی النزول الی ابیها - فقال صلی الله علیه وسلم اطیعی زوجك - فمات فاستاذنته فقال اطیعی زوجك - فدفن ابوها - فارسل رسول الله صلی الله علیه وسلم یخبرها ان الله قد غفر لابیها بطاعتها (۱)

ایک آدمی سفر پر روانہ ہوا۔ اور بیوی سے کہہ گیا کہ مکان کی اوپر کی منزل میں ہی رہائش رکھنا۔ نیچے نہ اترنا۔ اتفاق سے اُس کا والد بیمار پڑا۔ اُس نے آں حضرت سے اجازت طلب کی۔ کہ کیا میں نیچے آکر عیادت کر سکتی ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اپنے خاوند کی فرمانبردار رہو۔ اتفاق سے اُس کا والد اسی بیماری میں مر گیا۔ اُس نے پھر پوچھا۔ آپ نے پھر یہی جواب دیا۔ کہ خاوند کی اطاعت ضروری ہے۔ جب اُس کو دفن کر دیا گیا۔ تو آں حضرت نے اُس کو پیغام بھجوایا۔ کہ صرف اس کی مخلصانہ اطاعت کی بدولت اس کے باپ کی بخشش ہو گئی۔

جنت میں عورتوں کی تعداد کم ہو گی۔ کیوں؟ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

اطلعت فی الجنة فاذا اقل اهلها النساء فقلت این النساء - قال شغلهن الاحمران الذهب والزعفران - (۲)

میں نے جنت میں جھانک کر دیکھا تو اس میں مستورات کو بہت کم پایا۔ میں نے پوچھا مستورات کہاں ہیں۔ جواب ملا۔ کہ ان کو دو سرخ چیزوں کی محبت نے الجھا رکھا ہے۔ یعنی سونے کے زیورات اور خوشبو نے۔

مقصد یہ ہے کہ ان چیزوں کا مطالبہ اس صورت میں ہو کہ خاوند اس کو پورا

(۱) طبرانی۔

(۲) احمد، مسلم۔

نہ کرسکے۔ اور یہ اصرار عقوق و نادانی پر منتج ہو۔

ان کے جہنم میں جانے کے دو سبب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں ایک کا تعلق اسی نافرمانی سے ہے۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

خاوند کی ناشکری اور لعن طعن کی عادت جہنم میں لیجانے والی ہے

اطلعت فی النار فاذا اکثر اھلھا النساء۔ فقلن لم یا رسول اللہ۔ قال یکثرن اللعن ویکفرن العشیر۔

(میں نے جہنم میں دیکھا کہ عورتوں کی ایک بھیڑ جمع ہے۔ عورتوں نے پوچھا یا رسول اللہ۔ یہ کس بنا پر؟ فرمایا۔ اس لیے۔ کہ یہ بات بات پر دوسروں کو ملعون ٹھہراتی ہیں اور اپنے رفیقِ حیات کی ناشکر رہتی ہیں۔)

شوہر کی اطاعت و احترام کو آں حضرت نے اس درجہ اہم قرار دیا ہے۔ کہ اس کے بارہ میں حدیث میں ہے

لو امرت احداً ان یسجد لاحد لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا من عظم حقہ علیھا۔ (۱)

اگر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت دے سکتا۔ تو بیوی سے کہتا کہ شوہر کے حقوق کے پیشِ نظر اس کو سجدہ کرے۔

ازدواجی زندگی کے لیے دو باتیں بہت اہم ہیں کردار کی پاکیزگی اور مطالبات کو صرف حلال و مباح کی حدود تک منحصر رکھنا مسلمان عورتوں کا اس بارہ میں طرزِ فکر

بیوی کے لیے دو باتیں بہت اہم ہیں۔ ایک تو صیانت و ستر یعنی پردہ و حیا کی حد درجہ پابندی کرے۔ دوسرے اپنے مطالبات کی وسعتوں کا جائزہ لے اور اُن کو صرف حلال و مباح کی حدود تک ہی منحصر رہنے دے۔ آگے نہ بڑھائے۔ ہمارے اسلاف میں ایسی نیک دل مستورات کا پتہ

---

(۱) ابن حبان و ترمذی۔

چلتا ہے۔ جو اس پر سختی سے کاربند تھیں۔ اُن کا شوہر یا والد جب کسب معاش کی غرض سے سفر پر روانہ ہوتا تو یہ اُس سے ان الفاظ میں درخواست کرتیں۔

ایاك وکسب الحرام فانا
نصبر علی الجوع والضر و لا
نصبر علی النار۔

آپ کسب حرام سے کسی طرح بھی دامن کو آلودہ نہ ہونے دیں۔ کیونکہ ہمارے لیے یہ تو ممکن ہے کہ ہم بھوک اور تکلیف پر صبر کر لیں۔ مگر آگ کی سہار نا ممکن ہے۔

ماؤں کو اسلامی اخلاق کا اس درجہ خیال تھا۔ کہ شادی پر خصوصیت سے اپنی بچیوں کو سمع واطاعت کی تلقین کرتیں۔ چنانچہ اسماء بنت خارجہ فزاری نے اپنی بیٹی کو سسرال بھیجتے وقت جو نصیحت کی۔ وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

انك خرجت من العش الذی
درجت فصرت الی فراش لم
تعرفیه وقرین لم تالفیه
فکونی له ارضا یکن لك سماء
وکونی له مهادا یکن لك عمادا
وکونی له امة یکن لك عبدا
لا تلحفی به فیقلاك ـ و لا
تباعدی فتنساك ـ ان دنا منك
فاقربی منه وان نای فابعدی
عنه ـ واحفظ انفه، وسمعه
وعینه، فلا یشمن منك الاطیبا
ولا یسمع الاحسنا و لا ینظر

تو ایک جانے بوجھے آشیانے سے نکلی ہے۔ اور ایسے مکان کو اپنا رہی ہے جسے تو نہیں پہچانتی، اور ایسے رفیقِ حیات سے تیرا سامنا ہے جس سے تو مانوس نہیں۔ سو تجھے چاہیے۔ کہ زمین کی طرح اُس کے پاؤں تلے بچھ جاؤ۔ وہ تمھارے حق میں آسمان بننے کی کوشش کرے گا۔ فرش کی طرح اپنے کو ثابت کرو وہ تمھارے لیے ستون ثابت ہوگا۔ تم لونڈی بن کر رہو، وہ غلام بے دام بن کر رہے گا۔ کسی مطالبہ پر بھی اصرار نہ کرو، ورنہ بے زار ہو جائے گا۔ اس سے دور دور نہ رہو ورنہ وہ بھلا دے گا۔ وہ اگر قریب آئے۔ تو تم بھی قریب آنے کی کوشش کرو۔ اور اگر وہ دور

الاجمیلا۔ رہے۔ تو تم بھی اپنے کو دور رکھو۔ ہر حال میں اس کی عزت، شہرت اور شخصیت کا خیال رکھو۔ سوا مہک کے تم سے اُدھر کوئی چیز سونگھنے نہ پائے۔ اور بجز اچھی بات کے اُور کچھ نہ سننے پائے۔ اسی طرح اُس کی نظریں جب بھی اُٹھیں جمال اور خوبصورتی پر پڑیں۔

عورتوں کو اخلاق و عادات کے کس سانچے میں ڈھلنا چاہیے۔ اس کی چند لفظوں میں تلخیص یہ ہے۔

عورتوں کو کن اخلاق و عادات کا حامل ہونا چاہیے۔ ایک بدوی عورت کا قصّہ

اپنے گھر کو اپنی تگ و دو کا مرکز قرار دیں۔ اور بغیر کسی ضرورت کے گھر سے باہر نہ نکلیں۔ پڑوسیوں سے گفتگو اور بے تکلفی کا سلسلہ نہ بڑھائیں تاکہ وہ انھیں حالات میں اس کے ہاں آنے کی جرأت کریں۔ جب کہ آنا ضروری ہو۔ اور کوئی اہم کام ہو۔ شوہر کی غیر حاضری میں بھی عزت و ناموس کے تقاضوں کا خیال رکھیں اور ہر ہر بات میں اس کی خوشنودی مدِ نظر رکھیں۔ گھر سے نکلیں تو اجازت لے کر۔ اپنے کو چھپائے ہوئے۔ ردی اور گھٹیا لباس پہن کر۔ جس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ معروف بازاروں اور بارونق گذرگاہوں کو چھوڑ کر ایسے راستوں پر چلیں۔ جہاں بھیڑ کم ہو۔ کوئی جان پہچان نہ ہو۔ اور کوئی اجنبی اُن کی آواز کو نہ سُن سکے۔ اپنے شوہر کے دوستوں سے کوئی چیز طلب نہ کریں۔ بلکہ اگر یہ معلوم ہو۔ کہ فلاں شخص اس کے شوہر کا دوست ہے۔ تو اُس پر کچھ ظاہر نہ کریں۔ اپنی اصلاح، گھر کی دیکھ بھال اور نماز روزہ میں مصروف رہیں۔ کوئی شخص اگر دروازہ کھٹکھٹائے اور اُس کے شوہر کے بارے میں پوچھے تو اس سے زیادہ کلام نہ کریں۔ شوہر جو کچھ بھی دیں اس پر قانع رہیں۔ اور اُس کے شوق کو اپنے شوق پر ہمیشہ ترجیح دیں۔ بلکہ اس کے رشتہ داروں کے معاملہ میں بھی ایثار سے کام لیں۔ اولاد کے حق میں حد درجہ

شفیق اور مہربان ہوں۔ گالی گلوچ اور ڈانٹ ڈپٹ سے بچوں کو حتی الامکان بچائے رکھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شوہر کا احترام کریں۔ اور جواب نہ دیں شکل وصورت اور حسن و جمال خدا کی دین ہے۔ اس پر کسی عورت کو فخر و ناز نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر خاوند میں یہ خوبیاں نہیں ہیں۔ تب بھی اس سے محبت و سلوک ہی روا رکھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ جمالِ ظاہری سے محرومی کے باوجود اللہ نے ان کو محاسنِ باطنہ سے آراستہ کر رکھا ہو۔ اصمعی نے اپنی صحرا نوردی کے باوجود کئی قصے لکھے ہیں۔ ان کا کہنا ہے میں ایک مرتبہ حسبِ عادت بادیہ میں گھوم پھر رہا تھا۔ کہ میری نظر ایک نہایت ہی خوب صورت عورت پر پڑی۔ جس کا خاوند حد درجہ بدصورت تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا پوچھا یہ کیا بات ہے؟ کیا ایسی پیکرِ حسن و ناز کو ایسے انسان کی بیوی ہونا چاہیے جس کی شکل وصورت کے قبح کا یہ عالم ہے؟ عورت نے پلٹ کر جواب دیا۔ اصمعی تم کیا جانو! یہ اپنے خالق کے ساتھ کس درجہ عمدہ تعلقات رکھتا ہے اور وہ اس کو کتنا پیارا ہے۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی نیکی کے صلہ میں اس کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اور مجھ میں جو حسنِ باطنی اور جذبۂ خیر کی کمی تھی۔ اس کی یہ سزا دی ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ رہنے پر مجبور رہوں۔ جو ایسا بدصورت ہے۔ یوں بھی مجھے اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اصمعی نے یہ حکیمانہ جواب سُنا تو پھڑک گیا۔ اور چپ ہونا پڑا۔ (اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ۔ اسلام کی خدا پرستانہ تعلیم نے دلوں پر کیا اثر ڈالا تھا۔ اور کس طرح حسن و جمال کے زاویوں کو یک سر بدل کر رکھ دیا تھا۔)

عورتوں میں عموماً یہ کمزوری ہوتی ہے کہ شوہر کے سامنے تو دبی اور سہمی ہوئی رہتی ہیں۔ لیکن اس کی غیر حاضری میں خوب چہکتی اور مسرور نظر آتی ہیں۔ یہ طرزِ عمل صحیح نہیں اس کے برعکس ان کے لیے زیبا یہ ہے کہ شوہر کے بغیر تو منقبض رہیں اور ایک طرح کی

کر احسن محسوس کریں اور اُن کے سامنے شگفتہ و خوش دکھائی دیں ۔ بلکہ موقع ہو تو طرب و انبساط کی جملہ کیفیتوں کو پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس لیے کہ یہی تو ازدواجی زندگی کا ماحصل ہے ۔ اور اپنی کسی ادا سے شوہر کو ناراض نہ کریں۔

یہاں تک تو ان حقوق کی تفصیل مذکور تھی ۔ جو میاں بیوی کی زندگی سے متعلق ہے اس کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں ۔ جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ مثلاً بیوہ کو چاہیے کہ خاوند کی وفات پر چار ماہ اور دس دن صبر کرے ۔ اور نہایت استقلال سے عدت کے یہ دن گذارے ۔ اور اس اثناء میں شوہر ہی کے گھر میں اقامت اختیار کرے ۔ اور بلا ضرورت گھر سے قدم باہر نہ دھرے ۔

مَحَبّت واخوّت

اُلفت و مَحبّت

مکارم اخلاق کے فضائل

محبت و یگانگت حُسنِ خلق کا نتیجہ ہے۔ اور ایک دوسرے سے بغض و نفرت سوءِ خلق کی پیداوار۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ حُسنِ خلق تو محبت کو جنم دیتا ہے۔ اُلفت کو بڑھاتا ہے۔ اور توافق و اتحاد کی گوناگوں صورتیں پیدا کرتا ہے اور سوءِ خلق منتج ہوتا ہے۔ باہمی بغض و عناد پر، حسد پر اور بے توجہی اور بے التفاتی پر۔ دینی نقطۂ نظر سے یہ جذبہ کس درجہ منفعت کا حامل ہے اور کتنی خوبیوں کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس پر یوں غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت کی جس بنا پر مدح و ستائش فرمائی ہے۔ وہ یہی حسنِ خلق ہے۔

قرآن میں ہے۔

وانك لعلىٰ خلق عظيم (القلم) — اور تم خلقِ عظیم سے بہرہ مند ہو۔

حدیث میں آیا ہے۔

اکثر ما يدخل الناس الجنة تقوى الله وحسن الخلق[1] — زیادہ تر جنت میں لے جانے کا باعث دو چیزیں ہوں گی۔ اللہ کا ڈر اور حُسنِ خلق۔

یہ اللہ تعالیٰ کی بہترین بخشش ہے حضرت اسامہ کہتے ہیں۔ ہم نے آں حضرت سے پوچھا۔ انسان کے حق میں اللہ کا بہترین عطیہ کونسا ہے۔ فرمایا۔

خلق حسن۔ (۲) — اچھا خلق۔

قیامت کے دن جب اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ اور سب نیکیاں تولی جائیں گی۔ تو

(۱) ترمذی۔ (۲) ابن ماجہ۔

حُسنِ خلق کا پلڑا جھکا ہوا رہے گا۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

اثقل ما یوزن فی المیزان خلق حسن۔ (۱)

اعمال کی ترازو میں حُسنِ خلق کا وزن سب سے زیادہ ہوگا۔

حُسنِ خلق کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ یہی دین کی غرض و غایت ہے۔ آنحضرت نے فرمایا ہے۔

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ (۲)

مجھے بھیجا ہی اس لیے گیا ہے۔ تاکہ مکارم اخلاق کی تکمیل و اتمام کا اہتمام کروں۔

آں حضرت سے حضرت ابوہریرہ نے پوچھا۔ یا رسول اللہ یہ حسنِ خلق ہے کیا؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

تصل من قطعک وتعفو عن من ظلمک وتعطی من حرمک۔ (۳)

یہ کہ تو اُس شخص سے رشتۂ الفت و محبت استوار کرے۔ جو اس کو توڑنے کے درپے ہے اور اُس کو معاف کرے۔ جو ظالم ہے۔ اور اُس شخص کو اپنے کرم و عطا کا مورد بنائے۔ جو تمہیں محروم رکھتا ہے۔

مردِ مومن بندۂ الفت و محبت ہے
عند اللہ الفت و محبت کے مدارج کی بلندیاں

الفت و محبت کے فوائد و ثمرات یوں ہی کیا کم ہیں۔ لیکن اگر اس کی بنیاد تقویٰ پر ہو، رابطہ دینی پر ہو، اور آیات و احادیث سے تعلق خاطر پر ہو تو کیا کہنے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے سلسلہ میں حسن نیت کو زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ اور حسن احسان کو عظیم ٹھہرایا ہے۔ وہ تعلقات

---

(۱) ابوداؤد

(۲) احمد و بیہقی۔

(۳) بیہقی۔

کی یہی پاکیزگی اور استواری ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے۔

لو انفقت ما فی الارض	تم اگر دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے
جمیعا ما الفت بین قلوبھم	تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے
و لکن اللہ الف بینھم (انفال ۶۳)	مگر خدا ہی نے اُن میں الفت ڈال دی۔

یہی نہیں تفرقہ کی مذمت کی ہے۔

واعتصموا بحبل اللہ	سب مل کر خدا کی رسی کو پکڑے رہنا۔ اور
جمیعا ولا تفرقوا۔ (آل عمران ۱۰۳)	متفرق نہ ہونا۔

بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر مومن کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

المومن الف و مالوف و	مومن بندۂ محبت ہے۔ جہاں یہ دوسروں
لا خیر ممن لا یالف ولا یولف	کو چاہتا ہے۔ وہاں دوسرے بھی اسے دل و
(۱)	جان سے چاہتے ہیں۔ اور جو محبت کے اِس

جوہر سے عاری ہے۔ اُس میں خیر کا کوئی پہلو نہیں۔

ایک حدیث میں ہے۔

ان حول العرش منابر	عرش کے گرداگرد منبر ڈال دیے جائیں گے
علیھا قوم لباسھم نور وجوھھم	جن پر ایک قوم کھڑی ہوگی۔ جن کا لباس نورانی
نور۔ لیسوا بانبیاء ولا شھداء	ہوگا۔ اور جن کے چہرے بھی نورانی ہوں گے
یغبطھم النبیون والشھداء	یہ نہ تو انبیاء ہوں گے۔ اور نہ ان کا تعلق
فقالوا یا رسول اللہ صف لنا	شہداء ہی سے ہوگا۔ بلکہ یہ دونوں گروہ ان
فقال ھم متحابون فی اللہ و	کی خوش بختیوں پر رشک کریں گے۔ آنحضرت

---

(۱) حاکم

المتجالسون فی اللہ والمتزاورون سے پوچھا گیا۔ یارسول اللہ یہ کون لوگ ہیں فرمایا
فی اللہ (۱) اللہ کے لیے محبت کرنے والے۔ اللہ کے لیے
باہم مل کر بیٹھنے والے۔ اور اللہ ہی کے لیے ایک دوسرے سے میل جول رکھنے والے۔

وہ محبت جو اللہ کے لیے ہو حقیقی اخوت کے مترادف ہے

یہ اخوت و محبت جو محض لوجہ اللہ ہو۔ اخوت حقیقی سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ چنانچہ ایک صاحب کا کہنا ہے۔ ایسے دو دوست جن کی دوستی اخلاص و محبت پر مبنی ہوگی۔ قیامت کے روز برابر کے درجات پر فائز ہونگے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں کا ایک مقام و رتبہ کے اعتبار سے فروتر ہوگا۔ تو دوسرے کی سفارش پر اسی مقام پر رسائی حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ اخوت دینی جو اللہ کی خوشنودی اور رضا کی بنا پر نیار ہوتی ہے۔ اخوت ولادت ہی کے حکم میں ہے۔ پھر جس طرح اولاد کے حق میں صالح والدین کی سفارش قبول ہوگی اور ان کے مدارج کو والدین کے مدارج کے برابر کر دیا جائے گا۔ اسی طرح ان میں کسی ایک کی سفارش دوسرے کے لیے ازدیاد درجات کا باعث ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الحقنا بھم ذریاتھم ہم ان کی اولاد کو ان کے درجے تک پہنچائیں
وما التناھم من عملھم من گے۔ اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم
شیء (طور - ۲۱) کریں گے۔

ایسی دوستی اور بھائی چارہ عنداللہ کن عزت افزائیوں کا مستحق ہے۔ ان کے بارہ میں چند احادیث ملاحظہ ہوں۔ ایک حدیث میں ہے۔

ان اللہ تعالیٰ یقول حقت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میری محبت ان
محبتی للذین یتزاورون من لوگوں کے حق میں ثابت ہوگی۔ جو مرف میری

---

(۱) نسائی۔

اجلی وحقت محبتی للذین
یتحابون من اجلی - وحقت محبتی
للذین یتباذلون من اجلی - و
حقت محبتی للذین یتناصرون
من اجلی - (۱)

میری خوشنودی کی خاطر باہم محبت سے رہتے
ہیں - اور میری رضا کے حصول کے لیے باہم تحائف
کا تبادلہ کرتے ہیں - اور اُن لوگوں کے حق میں
بھی میری محبت ثابت شدہ حقیقت ہے - جو
میرے لیے ایک دوسرے کی مدد کے درپے
رہتے ہیں -

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا -

سبعۃ یظلهم اللہ فی ظلہ
یوم لا ظل لہ الا ظلہ - امام
عادل وشاب نشأ فی عبادۃ
اللہ ورجل قلبہ متعلق بالمسجد
اذا خرج منها حتی یعود
الیہ - ورجلان تحابا فی اللہ
اجتمعا علی ذالك وتفرقا علیہ
ورجلا ذکر اللہ خالیا ففاضت
عیناہ - ورجل دعتہ امرأۃ
ذات حسب وجمال - فقال انی
اخاف اللہ تعالیٰ - ورجل
تصدق بصدقۃ فاخفاها
حتی لا تعلم شمالہ ما

سات ایسے اشخاص ہیں - جنھیں اللہ
تعالیٰ اُس دن اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے گا
جس دن اُس کے سایہ کے سوا اور کہیں پناہ
نہیں ملے گی - ان میں ایک امام عادل ہے -
دوسرا وہ نوجوان ہے - جو ذوقِ عبادت میں
پلا بڑھا - اور اس فضا میں ایسا مانوس رہا -
اور مسجد سے اُس کا دل اس طرح وابستہ ہوا
کہ تھوڑی دیر کے لیے اگر جُدا بھی ہوا تو وہاں
جانے کے لیے پھر بے قرار ہوا - وہ دو دوست
بھی اس میں شامل ہیں - جن کی دوستی اللہ کی
محبت پر قائم ہے - اسی پر وہ دونوں ملتے
ہیں اور اسی پر جُدا ہوتے ہیں - نیز اس گروہ
میں وہ مردِ عاشق بھی داخل ہے - جس نے اگر

(۱) متفق علیہ -

تنفق یمینہ ۔ (۱) خلوت میں اللہ کو یاد کیا۔ تو بے اختیار آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ اور وہ پاک باز بھی جس کو حسین وجمیل اور اونچے درجے کی عورت نے عیش وعشرت کی دعوت دی۔ اور اس نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ اسی طرح وہ شخص بھی اس زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔ جس نے یوں چھپا کر اللہ کی راہ میں صدقہ دیا۔ کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی یہ نہیں معلوم ہو پایا۔ کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔

خالص محبت میں اللہ تعالیٰ بھی شرکت فرماتا ہے

ایک حدیث میں آں حضرت نے اس حقیقت کی وضاحت فرمائی ہے۔ کہ بھائی چارہ اور محبت کی اِس نوعیت میں اللہ تعالیٰ بھی شرکت فرماتا ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

ان رجلا زار اخالہ فی اللہ فارصد اللہ لہ ملکا۔ تعالی این ترید قال ارید ان ازور اخی فلانا۔ فقال لحاجۃ لك عندہ۔ قال لا۔ قال لقرابۃ بینك و بینہ۔ قال لا۔ قال فنعمۃ لہ عندك۔ قال لا۔ قال فیم؟ قال احبہ فی اللہ۔ قال فان اللہ ارسلنی الیك یخبرك بانہ یحبك لحبك ایاہ

ایک صاحب اپنے کسی مخلص دوست سے ملنے چلے۔ اللہ تعالیٰ نے تحقیق احوال کے لیے ایک فرشتہ بھیجا۔ اس نے پوچھا۔ کہاں کسار آرہے ہیں۔ انھوں نے کہا، ایک بھائی سے ملنے جا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کیا کوئی ضرورت لاحق ہے؟ انھوں نے کہا۔ جی نہیں۔ انھوں نے پوچھا۔ کیا آپ اُن کے قرابت دار ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا بالکل نہیں۔ انھوں نے پھر پوچھا۔ تو کیا کسی احسان کی تلافی مقصود ہے۔ انھوں نے کہا یہ بھی نہیں۔ آخر انھوں نے پوچھا کہ کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا۔ وجہ

---

(۱) مسلم۔

وقد اوجب لکم الجنۃ۔ (۱)

صرف اللہ کے لیے اُن کو چاہتا ہوں۔ آتنا کہنا تھا۔ کہ فرشتہ پکار اُٹھا۔ تو سُن لو کہ ایسی مخلصانہ محبت کے جواب میں اللہ بھی تم سے محبت رکھتا ہے۔ اور تمہارے لیے جنت کو ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔

پھر جس طرح محض اللہ کی خوشنودی کی بنا پر بعض لوگوں سے محبت والفت کے پینگ بڑھانا ضروری ہے۔ کہ اللہ کی رضا کے پیشِ نظر کچھ لوگوں کو ناپسند بھی کیا جائے۔ اور اُن سے کسی نوع کا تعلق نہ قائم رکھا جائے۔ یہ بغض فی اللہ ہے ایک حدیث میں ہے۔

اوثق عری الایمان الحب فی اللہ والبغض فی اللہ۔

اللہ کے لیے محبت اور اُسی کے لیے نفرت و بغض۔ ایمان کی مضبوط ترین رسی ہے۔

ہمارے اسلاف محبت والفت کے بارہ میں کس طرح کے خیالات رکھتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں اُن کا طرزِ عمل کیا تھا۔ اس کو مندرجہ ذیل آثار کی روشنی میں دیکھیے۔ حضرت علی کا قول ہے۔

علیکم بالاخوان فانھم عدۃ فی الدنیا و الاٰخرۃ۔ الا تسمع الی قولِ اھل النارِ "فما لنا من شافعین و لا صدیق حمیم"۔ (الشعراء۔ ۱۰۰)

تمہارے کچھ دوست اور بھائی ہونے چاہییں۔ تاکہ دنیا اور آخرت میں ان کے اخلاص و خیر سگالی سے کام لیا جائے۔ کیا اہلِ جہنم کے اس قول کو تم نے نہیں سُنا "سو ہمارے لیے نہ تو سفارش کرنے والے ہیں۔ اور نہ کوئی قلبی دوست"۔

عبداللہ بن عمر کا کہنا ہے۔

---

(۱) مسلم

واللہ لو صمت النهار لا افطره وقمت الليل لا انامه، وانفقت مالی خلقا خلقا فی سبیل الله - اموت یوما اموت ولیس فی قلبی حب لاهل طاعة الله، ولا بغض لاهل معصیة ما نفعنی ذالک شیئا -

بخدا اگر میں دن بھر روزے سے رہوں اور افطار نہ کروں - رات بھر قیام کروں اور خدا کی راہ میں اپنا سلا اثاثہ دے ڈالوں اور پھر اسی حالت میں مرجاؤں۔ کہ میرے دل میں نہ تو اُن لوگوں کی محبت ہو - جو اللہ کے فرمانبردار ہیں - اور نہ اُن کے بارہ میں بغض جو اللہ کے نافرمان ہیں - تو ان سب اعمال کا مجھے کچھ فائدہ پہنچنے والا نہیں۔

ابن السماک نے مرتے وقت کہا -

اللهم انک تعلم انی اذا کنت اعصیک کنت احب من یطیعک فاجعل ذالک الیک -

پروردگار! میں نے اگر کوئی گناہ کیا ہے - تو تو جانتا ہے - میں تیرے فرمانبرداروں سے بہرحال محبت رکھتا تھا - اس لیے اسی عمل کو میرے لیے اپنے قرب کا ذریعہ ٹھہرا۔

محبت فی اللہ کے معنی مجرد محبت کے نہیں بلکہ ایسی محبت کے ہیں جو عملی زندگی میں اثر انداز ہو حضرت فضیل کی تصریح

یہاں ایک بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنے کی ہے - کہ نیک اور پاکباز حضرات کی محبت والفت بلاشبہ آخرت میں کام آنے والی چیز ہے مگر ایسے وقت جب کہ اعمال اور روزمرہ کی زندگی میں بھی، توافق ہو - اور یہ دوستی اور اخلاص سیرت و کردار کے مختلف خانوں پر بھی اثر انداز ہو - ورنہ مجرد دوستی اور اخلاص جو عمل پر منتج نہ ہو کسی مصرف کا نہیں حضرت حسن نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے -

یا ابن آدم لا یغرنک قول من یقول المرء مع من احب۔ فانک لن تلحق الابرار الا باعمالهم فان الیهود والنصاریٰ یحبون انبیاءهم ولیسوا معهم۔

اے ابن آدم! تمہیں اس قول سے ٹھوکر نہیں کھانا چاہیے۔ کہ انسان عقبیٰ میں۔ انہیں کے ساتھ ہوگا۔ جن سے کہ اس کی محبت ہوگی۔ بغیر اعمال کے ابرار کی رفاقت حاصل ہونے والی نہیں۔ یہود ونصاریٰ کو دیکھو۔ اُن کو اپنے انبیاء سے کتنی محبت ہے۔ مگر اس کے باوجود اُن کو معیت نصیب نہیں ہوگی۔

فضیل نے اس مضمون کو اور زیادہ اُجاگر کر دیا ہے۔

اُه۔ تریدان تسکن الفردوس۔ وتجاور الرحمٰن فی دارہ مع النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین بای عمل عملته؛ بای شهوة ترکتها۔ بای غیظ کظمته بای رحم قاطع وصلته وبای زلة اخیک غفرتها۔ بای قریب باعدته فی اللہ۔ بای بعید قاربته فی اللہ۔

آہ! تو چاہتا ہے کہ فردوس میں تیرا ٹھکانا ہو۔ اور اللہ کے گھر میں، نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صلحاء کی لطف و رفاقت سے بہرہ مند ہو۔ مگر کس بوتے پر؟ کیا تونے کوئی ایسا کام کیا ہے۔ کسی رغبت سے کنارہ کشی کی ہے۔ کسی غصہ کو دبایا ہے۔ کسی ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا ہے۔ کسی بھائی کی لغزش پر پردہ ڈالا ہے۔ یا کسی قریبی کو اللہ کی خاطر دور ہٹایا ہے اور کسی بعید کو اللہ کے لیے قرب بخشا ہے! اگر یہ نہیں کیا۔ تو ان مراتب کو پا لینے کی امید نہ رکھ۔

اَلْحُبُّ لِلّٰہ کا مفہوم

محبت والفت کے جن مناقب اور خوبیوں کا تذکرہ پچھلے باب میں ہوا ہے۔ اِن سے مراد ہر محبت اور ہر تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد حب فی اللہ ہے۔ اور حب فی اللہ کا اطلاق کن حالات میں ہوتا ہے۔ اس میں چونکہ ایک گونہ غموض اور اجمال پایا جاتا ہے۔ اِس لیے ہم اس باب میں اس غموض کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔ کہ حب فی اللہ اور دنیاوی محبت میں کیا ما بہ الامتیاز ہے؟

محبت کی قسمیں اور فلسفہ۔ محبت دلوں میں کیونکر ابھرتی ہے

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ بات سمجھنے کی ہے۔ کہ محبت کی موٹی موٹی دو قسمیں ہیں۔ ایک محبت وہ ہے۔ جو محض بخت و اتفاق کی سازگاریوں کے نتیجے میں اُبھرتی ہے۔ مثلاً پڑوسی ہونے کی وجہ سے ایک طرح کا تعلق پیدا ہو گیا۔ ہم مکتب ہونے کے باعث بے تکلفی بڑھی۔ بازار میں کہیں آتے جاتے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یا دورانِ سفر میں کسی شخص کی صحبت سے استفادہ کے مواقع پیدا ہوئے۔ ظاہر ہے حُب فی اللہ کا اطلاق محبت کی اس قسم پر نہیں ہو سکتا۔

دوسری قسم وہ ہے۔ کہ ارادہ وقصد کی کارفرمائیاں اس کی موجب ہوں۔ یعنی آپ کسی کو چاہیں۔ اور جان بوجھ کر چاہیں۔ اور پھر اس تعلق خاطر پر تعلقات کی حسین وجمیل عمارت استوار کریں۔ یہ قسم بلاشبہ حب فی اللہ کے ضمن میں آسکتی ہے۔ کیونکہ یہی دراصل محبت کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے۔ مگر اس میں یہ پیچیدگی ہے کہ یہ پھر چار خانوں میں منقسم ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو چاہنے والے کا محبوب سے جو لگاؤ ہوگا

وہ ذاتی نوعیت کا ہوگا۔ اور اس سے کوئی غرض وغائت وابستہ نہیں ہوگی۔ یا یہ تعلق خاطر کسی مقصد پر مبنی ہوگا۔ یہ مقصد پھر دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس کا تعلق دنیا اور اس کی شادمانیوں ہی تک محدود رہے گا۔ اور یا اس کی حدود آخرت اور اللہ تعالیٰ تک وسیع ہوں گی۔ محبت کی ان چار قسموں کی کیا تفصیل ہے! اور ان سے متعلقہ مسائل کی کیا نوعیت ہے۔ ترتیب وار ان کے بارہ میں ہمارا بیان ملاحظہ ہو۔

قسم اول :۔ یہ محبت کی وہ قسم ہے جس میں ایک شخص ذاتی طور پر کسی سے اُلفت و یگانگت پیدا کرتا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ذاتی حیثیت سے محبوبیت و دلنوازی کی تمامتر صلاحیتوں کا حامل ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینے سے راحت و لذت کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ اور اس سے ملنے جلنے میں قلب کو ایک گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے اخلاق و عادات بھی پسندیدہ ہوں۔ مگر تعلق خاطر کی اصلی بنیاد اخلاق کا یہ حسن و جمال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خود اس کی ذات ہے یعنی اُس کی ذات یا شخصیت چونکہ محبوب اور پیاری ہے۔ اس لیے اُس کے اخلاق و عادات میں بھی آپ سے آپ حسن و جمال کی رنگینیاں آجاتی ہیں۔

تعلق خاطر کی اس نوعیت کو تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ قطعی ممکن ہے کیونکہ یہ اس اصول پر مبنی ہے کہ ہر ہر جمیل لذیذ ہے۔ اور ہر ہر لذیذ محبت والفت کے لائق ہے۔

پھر یہ جمیل عموماً چونکہ کوئی شخص ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ محبت تو حسن ظاہری سے متعلق ہوگی۔ یا جمال باطنی اور معنوی سے۔ حسن ظاہری میں شکل وصورت کی مناسبتیں، خد و خال اور قامت کی رعایتیں داخل ہیں۔ اور جمال معنوی کے دائرے میں عقل و خرد کا کمال، حسن اخلاق اور سیرت کی پاکیزگی و بلندی ایسی چیزیں شامل ہیں۔ دونوں طرح کا تعلق طبعی اور معقول ہے۔

محبت کے سلسلہ میں ایک بڑی پیچیدگی اور آں حضرت کی توجیہ

محبت کا معاملہ ایسا دقیق و غامض ہے۔ کہ کبھی کبھی اس کی توجیہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہم ایسے دو شخصوں میں قلبی و دلی روابط کی استواریاں پاتے ہیں۔ جن میں باہم جذب و کشش کے اسباب مفقود ہیں یعنی ان میں کا کوئی نہ تو حسین و جمیل ہی ہے۔ اور نہ اخلاق و عادات کا نکھار ہی کسی میں پایا جاتا ہے۔ تاہم کوئی نہ کوئی باطنی مناسبت فرض کرنا پڑے گی۔ جو دونوں میں محبت و الفت کی شمعوں کو روشن کیے ہوئے ہے۔ اور دونوں کے دلوں کو اس طرح جوڑے ہوئے ہے۔ انسانی علم اس درجہ ناقص ہے کہ اس کی رسائی ان مقتضیات تک نہیں ہو پاتی۔ لہذا یہ نہیں جان سکتا۔ کہ حسن ظاہری کے نہ ہونے کے باوجود دل ایک دوسرے کی طرف کیوں کھنچتے ہیں۔ اور جمال باطنی سے محرومیوں کے باوصف جذب و کشش کے دواعی میں کیوں تحریک پیدا ہوتی ہے؟ آں حضرت نے اس کیفیت کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ ۱

الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف۔

عالم امر میں روحوں کی مختلف نوعیں ہیں جو وہاں ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے وہ یہاں بھی متعارف ہیں۔ اور جن کی وہاں سازگاری نہ ہوئی۔ وہ یہاں بھی باہم مختلف ہیں۔

محبت و الفت کی محرک کچھ باطنی مناسبتیں ہیں جن کی معقول اور جچی تلی توجیہ ناممکن ہے

تجربہ و مشاہدہ کی رو سے اتنا تو بہرحال طے ہے۔ کہ بعض باطنی اسباب و وجوہ کی بنا پر دوستی و محبت کے تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی کیا عقلی توجیہ ہو سکتی ہے؟

اور ان کے لیے عقل و فکر کا کونسا سانچہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا از حد دشوار ہے۔ بعض لوگوں نے اس سانچہ کو علم النجوم کی روشنی میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور طالع کو اس طرح مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس سے یہ عقدہ وا ہو سکے۔ مگر اس سے اور اور طرح کی مشکلات ابھر آتی ہیں اور حل طلب مسئلہ پھر وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ جہاں پہلے تھا۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس باب میں کامل خاموشی اختیار کی جائے۔ اور مان لیا جائے۔ کہ توجیہ و تعلیل کا سلسلہ اگرچہ ہماری رہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم کچھ مخفی رشتے، کچھ طبیعت و ذوق کی پنہاں مناسبتیں۔ اور تشابہ و یکسانی کی پوشیدہ صورتیں ایسی ضرور پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے دلوں میں آپ سے آپ سازگاری و محبت کے تقاضے چٹکیاں لینے لگتے ہیں۔ ذوق و فکر کی اسی یکسانی کی طرف اس حدیث میں آں حضرت نے اشارہ کیا ہے۔

لوان مومنا دخل الی مجلس فیہ مائۃ منافق و مومن واحد لجاء حتی یجلس الیہ و لوان منافقا دخل الی مجلس فیہ مائۃ مومن و منافق واحد لجاء حتی یجلس الیہ۔ (۱)	اگر کسی مومن کو ایسی مجلس میں شرکت کا موقع ملے۔ جس میں سو منافق ہوں اور ایک مومن ہو۔ تو وہ اسی ایک مومن کے پہلو میں آکر بیٹھے گا۔ اسی طرح اگر کوئی منافق ایسی مجلس میں شریک ہو جس میں سو مومن ہوں۔ اور ایک منافق ہو تو وہ رفاقت کے لیے اسی ایک منافق کو چنے گا۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جذب و میلان کا سبب تشابہ و یکسانی ہے۔ جو بالکل قدرتی اور طبعی ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں۔ کہ اس میں شعور اور ادراک کو بھی

(۱) بیہقی۔

داخل ہو۔ مالک بن دینار کہا کرتے تھے۔ جہاں دس آدمیوں میں سے دو میں محبت و اُلفت کے جذبات پائے جائیں۔ سمجھ لو۔ کہ ان میں کوئی نہ کوئی وصف مشترک ضرور ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک لطیفہ بھی بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ یہ کیا دیکھتے ہیں۔ کہ کوا اور فاختہ باہم شیر و شکر۔ ایک دوسرے کے ساتھ چگنے اور پھدکنے میں مصروف ہیں۔ ان کو اس غیر متوقع اتفاق پر تعجب ہوا۔ چنانچہ یہ سوچنے لگے کہ ان دونوں میں کیا شئے مشترک ہو سکتی ہے۔ اتنے میں یہ دونوں اُڑے۔ تو معلوم ہوا کہ دونوں کی ایک ایک ٹانگ مجروح ہے۔

کیا حسن و جمال سے لطف اندوزی کا محرک ہمیشہ جنسی جذبہ ہی ہوتا ہے؟ جمالیات کی روشنی میں اس کا جواب

مسئلہ کے اس پہلو سے متعلق یہ ساری وضاحت اس غرض سے ہے، تاکہ یہ بتایا جائے۔ کہ انسان کبھی کبھی کسی شخص محض اس کے حسن و جمال یا کسی اور مخفی مناسبت کی وجہ سے چاہتا ہے اور اس سے کوئی دنیوی یا اُخروی مقصد وابستہ نہیں کرتا۔ یہ چاہنا ضروری نہیں۔ کہ جنسی جذبہ کی وجہ سے ہو۔ اور اوانی خوشنمائی ہی اس کے باعث اور سبب ہوں۔ اگر ہم آبِ رواں کو دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں عمدہ پھولوں سے دل بہلاتے ہیں۔ گونا گوں پھلوں کو دیکھ کر نظر و بصر کے لیے سامانِ راحت پیدا کرتے ہیں۔ اور سیب کی سُرخی سے طرب و انبساط کی کیفیتیں دل میں پاتے ہیں۔ اور اس میں کوئی معصیت اور گناہ نہیں سمجھتے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اچھی شکلوں کو دیکھ کر دیدہ و دل متاثر نہ ہو۔ مجرد تاثر کی یہ کیفیت فی نفسہٖ نہ بُری ہے نہ اچھی ہے۔ یہ محض تقاضائے فطرت ہے۔ جو بالکل جائز اور روا ہے۔ ہاں اسے اگر بُرے جذبات سے آلودہ کریں گے۔ تو بلا شبہ یہ گناہ و معصیت کی صورت اختیار کرلے گی۔ محبت کی یہ قسم الحب فی اللہ کے دائرے میں بہرحال داخل نہیں۔

اگر وسائل سے محبت اس بنا پر ہے کہ اس سے کوئی دینی اور اونچا مقصد حاصل ہوتا ہے تو محبت کی یہ نوعیت الحُبُّ فی اللّٰہ میں داخل ہے ورنہ نہیں

قسم ثانی :- یہ محبت کی اسی صورت پر مشتمل ہے جس میں کوئی شخص کسی چیز یا شخص کو اس کی ذاتی حیثیت سے نہیں چاہتا بلکہ اس بنا پر چاہتا ہے۔ کہ یہ چیز یا شخص کسی دوسرے محبوب مقصد یا پیاری شخصیت کا وسیلہ ہے۔ اس وسیلہ سے بھی محبوب سا لگاؤ اور تعلق خاطر پیدا ہو جاتا ہے جیسے سونا چاندی اور روپیہ پیسہ وغیرہ ایسی اشیاء ہیں کہ فی نفسہ ان میں اگر محبوبیت کی کوئی ادا اور پیار کی کوئی جھلک نہیں۔ مگر تاہم محض اس وجہ سے کہ بہت سے عزیز مقاصد اور پیاری چیزوں کے حصول کا یہ کامیاب ذریعہ ہیں - یہ بھی اس لائق ہیں۔ کہ ان سے محبت کے ایسے پاکیزہ جذبات کو وابستہ کیا جائے - پھر جس طرح ان وسائل کو بعض حلقوں میں محبوب قرار دیا جاتا ہے - اسی طرح بعض اشخاص کو بھی اس وجہ سے محبوب اور پیارا سمجھا جاتا ہے۔ کہ ان کی وساطت سے کچھ اور محبوب مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ بادشاہ اور استاذ سے جو تعلق خاطر پیدا ہوتا ہے - وہ اسی نوعیت کا ہے۔ کیونکہ بادشاہ کے ذریعہ اگر عزت و جاہ کے متعدد دروازے کھلتے ہیں تو علم سے رزق و توخیر کی مختلف راہیں کشادہ ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا محبت کی یہ قسم الحب فی اللہ میں داخل ہے ؟ جواب یہ ہے کہ علم سے مقصود دنیوی اعزاز ہے۔ مال و دولت کی فراوانیاں ہیں یا شہرت و مقبولیت ہے - تب اس سے لگاؤ اور شغف کو کسی صورت میں بھی للّٰہیت کے دائرے میں نہیں محسوب کیا جا سکتا - لیکن اگر، علم سے مقصود دنیا اور اس کے گھٹیا مقاصد نہیں ہیں تو اس صورت میں اس کو البتہ الحب فی اللہ کی صف میں رکھنا ممکن ہوگا۔ ذریعہ و وسیلہ کی اس نوعیت کی پھر دو قسمیں ہیں - ایک مباح اور جائز ہے۔ دوسری

قبیح اور سراسر ناجائز۔ اگر ذرائع سے ایسے مقاصد کے حصول کا کام لیا جاتا ہے۔ جو فی نفسہٖ ناجائز اور حرام ہیں۔ جیسے کوئی شخص یتیموں کی دولت سمیٹنے کی کوشش کرے یا منصب قضا پر اس لیے فائز ہونا چاہے۔ کہ اس طرح رشوت کی بہت بڑی مقدار اپنے دامن میں ڈال سکے گا۔ تو یہ قطعی حرام ہے۔ لیکن اگر ذرائع و وسائل کو مباحات کے اصول کی تعمیر تک محدود رکھتا ہے۔ اور ان سے شغف و محبت کے جذبات کو اسی مناسبت سے وابستہ کرتا ہے۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ بالکل جائز اور درست ہے۔

قسم ثالث :۔ اس محبت کا تعلق اگرچہ کسی چیز یا شخص سے ذاتی طور پر نہیں ہے مگر بسبب "غیر" اسے بھی ہے۔ دنیاوی نوعیت کا بہر حال نہیں ہے۔ بلکہ سراسر امور آخرت سے متعلق ہے۔ یہ شکل ایسی ہے۔ کہ بعین طور پر الحب فی اللہ کے دائرے میں سمجھنا چاہیے۔

الحب فی اللہؐ کی بظاہر دنیاوی صورتیں

اگر کوئی شخص اپنے استاد یا شیخ سے بدیں وجہ ارادت و عقیدت رکھتا ہے کہ ان کے ذریعہ تحصیل علم و عمل کے مواقع اسے میسر آتے ہیں۔ یا استاد و شیخ ایسے شاگرد و مرید سے اس لیے محبت رکھتے ہیں۔ کہ یہ آگے چل کر خود ان کے حق میں ازدیاد درجات کا موجب ہوگا۔ تو تعلق خاطر اور دلی موانست بھی بلا شبہ الحب فی اللہ کے سنہری سلسلہ کی ایک کڑی شمار ہوگی۔ یہی نہیں۔ غیر سے محبت کا یہ باب بہت وسیع ہے۔ اس کی اور متعدد صورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے باورچی سے اس بنا پر محبت رکھتا ہے۔ کہ وہ ان لوگوں کو عمدہ عمدہ کھانے تیار کر کے کھلاتا ہے۔ جنھیں یہ محض بر بنائے تقرب الی اللہ دسترخوان پر بلاتا ہے۔ تو یہ بھی وہ محبت ہے جس کی عنداللہ بڑی ہی قدر و منزلت ہے۔ اسی طرح

اگر کسی کرم فرما سے کوئی اس بنار پر محبت رکھتا ہے۔ کہ اس نے اپنے کرم گسترانہ طرزِ عمل سے اس کو بہت سے دنیاوی مشاغل سے بے نیاز کر دیا ہے۔ تو یہ بھی وہ شخص ہے جس کی محبت الحب فی اللہ میں شمار کی جائے گی۔ یہی نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی اس نیک بخت بیوی کو چاہتا ہے۔ جو اس کو شیطانی وساوس سے محفوظ رکھنے میں مدد دیتی ہے، یا اس کے لیے صالح اور متقی اولاد پیدا کرتی ہے۔ تو یہ محبت بھی اگرچہ بظاہر خالص دنیاوی شئے ہے۔ اجر و ثواب کا استحقاق رکھتی ہے۔ کیونکہ مقصود دنیا نہیں۔ آخرت ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ہم یہ کہیں گے۔ جس شخص کے نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی آچکی ہے۔ کہ وہ الحب فی اللہ کے سوا اور کسی تعلق سے متاثر ہی نہیں ہوتا۔ وہ جس جس شخص یا شئے سے بھی محبت رکھے گا۔ ہم یہی کہیں گے کہ اس نے "حب فی اللہ" کے اصول کو ترک نہیں کیا۔ اور یہ اپنے جذبات میں مخلص ہونے کی وجہ سے "حب فی اللہ" کی صف میں شامل ہے۔

محبتِ دنیا فی نفسہٖ محبتِ عقبیٰ کے منافی نہیں

یہاں اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ محبتِ دنیا فی نفسہٖ محبتِ عقبیٰ کے منافی نہیں۔ بشرطیکہ دونوں کا امتزاج کسی شخص میں پایا جائے۔ اس لیے اگر کسی کو محسوس ہو کہ فلاں آدمی کے ساتھ راہ و رسمِ عقیدت استوار کرنے سے دنیا و دین دونوں سنورتے ہیں۔ اور کونین کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، تو اس کے ساتھ محبت رکھنے اور تعلقات رکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیار کو جس جامع دعا کی تلقین کی ہے۔ اس میں دین و دنیا کی بہرہ مندیوں کو مقصد و مطلوب قرار دیا گیا ہے۔

ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ۔ (البقرہ - ۲۰۱)

اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت سے سرفراز کر۔

آں حضرت کی دعاؤں کا انداز بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ ان میں دنیا کے بجا مرتبہ و مقام کو تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ کی ایک دعا ان الفاظ میں مذکور ہے۔

اللّٰھم انی اسئلك رحمة	پروردگار! میں تجھ سے ایسی رحمت
انال بها شرف كرامتك فى	کا طلبگار ہوں جس سے دنیا و آخرت
الدنیا والاٰخرة - (۱)	میں تیری رحمت کے شرف کو پا سکوں۔

ایک اور دعا کے سلسلہ میں فرمایا۔

اللھم عافنی من بلاء	پروردگار! مجھے دنیا و آخرت کی آزمائشوں
الدنیا والاٰخرة - (۲)	سے محفوظ رکھ۔

دنیا کی لذتیں، عقبیٰ کی بہرہ مندیوں کے کیوں منافی نہیں۔ اور کیوں ان کو ایک ہی
دنیا وآخرت میں کیوں منافات نہیں؟ اس لیے کہ زمانہ دل میں جمع کر دینا ممکن ہے!
غیر منقسم ہے اس میں عاجل و آجل کا فرق حقیقی اور بنیادی نہیں بڑی معقول وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ ان میں ذاتی
منافات اور تناقض ہی کہاں ہے؟ فرق صرف اتنا ہی تو ہے۔ کہ ایک ان میں عاجل ہے اور دوسری آجل۔ لہٰذا جو کل پیش آنے والا ہے۔ وہ آج ممنوع کیوں ہو۔ اور کل جن حظوظ ولذائذ سے فکر و روح کی سعادتوں کا ہم اہتمام کرنے والے ہیں۔ آج ان کو حرام کس بنا پر ٹھہرائیے گا۔ دنیا و عقبیٰ میں آخر زمانی فرق ہی تو حائل ہے۔ کل کے حالات ایک دن آج کی شکل اختیار کرنے والے ہیں۔ پھر اس "آج" کی لذتیں اور اس آج کی بہرہ مندیاں کیوں مطلوب و مقصود نہ ہوں۔ بات یہ ہے کہ ناجائز صرف دنیا کا وہ حصہ ہے۔ جس سے حصول آخرت میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یا جو معنوی تقاضوں کو پس پشت ڈالتا ہے۔ اور عاجل کے اکتفار پر آمادہ کرتا اور

---

(۱) ترمذی۔ (۲) احمد۔

اور اُکساتا ہے۔ وہ نہیں جس سے آخرۃ کی راہیں کھُلتی اور آسان ہوتی ہیں۔ گویا دُنیا کی یہی وہ نوعیت ہے جس کی انبیاء اور صلحاء نے مذمت کی ہے۔ اور جس سے بچنے اور محترز رہنے کو صلاح و تقویٰ کی شرط ٹھہرایا ہے۔

کیا منہیات میں مزاج و طبیعت کی کوئی بُرائی پائی نہیں جاتی جن سے پھر جن چیزوں سے مجتنب رہنا ہے

اور جن حظوظ ولذائذ کو آخرت کے لیے ترک کرنا ہے، ان کے بارے میں یہ اصول ہمیشہ ملحوظ و مرعی رہنا چاہیے کہ ان سے نفرت عقل وادراک کے تقاضے سے ہے طبیعت و مزاج کے تقاضے سے نہیں۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ فرض کرو ایک بادشاہ نے دعوت کے سلسلہ میں کچھ لوگوں کو اپنے ہاں بلا رکھا ہے۔ اور دسترخوان پر رنگا رنگ کے کھانے چُن دیے گئے ہیں مگر حکم یہ ہے کہ فلاں فلاں چیز کو کوئی ہاتھ نہ لگانے پائے۔ ورنہ اس کی پاداش میں جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اب جو عقلمند ہے، ظاہر ہے باوجود طبیعت کے اقتضاء کے اور انتہائی رغبت رکھے، ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اور بے وقوف ان پر بُری طرح گرے گا۔ اور مارا جائے گا۔ ٹھیک اسی طرح اس دنیائے دنی میں خواہشات ولذائذ کا ایک دسترخوان بچھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون شخص مزاج و طبیعت کی مجبوریوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دنیا اور خواہشات و لذات پر اندھا دھند گرتا ہے۔ اور کون وہ ہے، جو عقل و دانش کی آواز پر کان دھرتا اور ان ترہیبات نفس سے باز رہتا ہے۔ الحب فی اللہ، اور دنیوی محبت میں ایک موٹا اور اصولی فرق یہ ہے کہ اللہ کے لیے ایسی چیزوں کی محبت ہوگی۔ کہ اگر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت نہ پایا جائے تو ان چیزوں سے محبت و وابستگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے عقیدہ سے دل و دماغ

روشن ہے۔ تو ان چیزوں سے البتہ سبب اور ذریعہ کی حیثیت سے تعلق خاطر رہے گا۔

قسم رابع:۔ محبت کی یہ نوعیت بہت اونچی ہے۔ اور اونچی ہونے کے ساتھ ساتھ غامض اور دقیق بھی ہے۔ **محبت کی سب سے اونچی قسم! محبوب اور اُس کے جملہ متعلقات سے تعلق خاطر** اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ کسی چیز سے محبت اگرچہ للّٰہ اور فی اللّٰہ ہے۔ تاہم بالکل ذاتی طور پر ہے، ذریعہ و وسیلہ ہونے کی حیثیت سے نہیں یعنی علم و عمل کی کوئی غرض اس سے وابستہ نہیں۔

سوال یہ ہے کیا محبت کی یہ قسم ممکن ہے؟ اس کھٹک کا جواب اس پیش پا اُفتادہ حقیقت میں تلاش کرو۔ کہ جب کسی شخص سے محبت ہو جاتی ہے۔ تو اس محبت والفت کے دائرے صرف اس محبوب کی ذات ہی تک محدود نہیں رہتے۔ بلکہ یہ اس ہر چیز تک وسیع و ممتد ہوتے ہیں جن کا اس محبوب سے ادنیٰ تعلق بھی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی اس محبوب کی تعریف کرتا ہے۔ تو وہ بھی محبوبیت کا سزاوار ٹھہرتا ہے، اس خادم، اس کے دوست اور ساتھ رہنے سہنے والوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں اس محبت کی شمیم انگیزیوں سے اس کے جملہ متعلقات متاثر ہوتے ہیں۔ اس رمز کو شاید لقیہ بن ولید نے یوں بیان کیا ہے۔

ان المومن اذا احب المومن احب کلبہ'۔

مومن کو جب کسی مومن سے محبت ہو جاتی ہے۔ تو اُس کے کتے کو بھی وہ نظر سے غیر نہیں دیکھتا۔ بلکہ اُس کو بھی چاہنے لگتا ہے۔

اور یہی وہ لطیفۂ محبت ہے۔ جس کی تشریح مجنوں بن عامر کے ان اشعار میں ہے

امر علی الدیار دیار لیلیٰ
اقبل ذا الجدار و ذا الجدارا

میرا جب بھی دیار لیلیٰ پر گذر ہوتا ہے۔ تو یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ کہ کبھی ایک دیوار

کو بوسہ دیتا ہوں اور کبھی دوسری کو۔

وما حب الدیار شغفن قلبی	(مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے۔کہ) ان دیار نے
ولکن حب من سکن الدیارا	میرے قلب وجگر پر قبضہ کر رکھا ہے، نہیں

میرے دل پر، تو اُس محبوب کی حکمرانی ہے جس نے کبھی ان دیار میں سکونت اختیار کی ہے۔

پھر جب عشاق کے واردات اور مشاہدہ سے معلوم ہوگیا۔کہ محبت کے تقاضے سمٹاؤ اختیار نہیں کرتے۔اور متعین حدود تک نہیں رہتے۔ بلکہ متعلقات محبوب تک پھیل جاتے ہیں۔ تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔کہ یہی کیفیت اللہ کی محبت میں بھی پیدا ہوسکتی ہے۔یہاں بھی کچھ لوگ اصلی محبت پر اکتفا نہیں کرتے۔ اور افراط سے کام لیتے ہیں۔یہی نہیں۔بسا اوقات یہ افراط غلو کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صرف اللہ کو چاہنے والا، ماسوا کو بھی چاہنے لگتا ہے۔ اس کی تہ میں بھی یہی دلیل کارفرما ہوتی ہے کہ یہ مخلوق جس نے ہمارے قلب وجگر کو رجھایا۔اور محبت واُنس پر آمادہ کیا ہے۔آخر اس کی قدرت وصناعی ہی کا تو ایک پرتو ہے۔

اس انداز کی محبت کے ثبوت میں اس حدیث کو پیش کیا جاتا ہے۔

کان صلی اللہ علیہ وسلم	آں حضرت کی خدمت میں جب کوئی
اذا حمل الیہ باکورۃ	تازہ پھل پیش کیا جاتا۔تو آپ اُس کو
من الفواکہ مسح بہا	آنکھوں پر لگاتے۔اور ازراہ تکریم فرماتے
عینہ واکرمہا وقال	یہ ابھی ابھی ہمارے پروردگار کے ہاں
انہ قریب العہد بربنا۔(۱)	سے آیا ہے۔

---

(۱) طبرانی دابو داؤد

جب محبوب اور اُس کے جملہ متعلقات سے محبت استوار ہو جاتی ہے۔ تو عقوبت و ثواب کی تفریق مٹ جاتی ہے۔

پھر جب یہ مقام کسی شخص کو حاصل ہو جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ سے محبت و انس کسی غرض کے تحت نہیں ہے۔ نہ کسی خوف کے سبب سے ہے، بلکہ خالصۃً اس کا مدار و محور اس کی ذاتِ گرامی ہے۔ تو اس صورت میں عقوبت و ثواب کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اور ابتلاء و نعمت کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ اس وقت احساسات کا عالم کچھ اس انداز کا ہوتا ہے۔ کہ محبوب کسی کی طرف سے جس کیفیت کا بھی سامنا کرنا پڑے متنعم ہے۔ اسی مقام کے بارہ میں کچھ لوگوں کو کہنا پڑا۔

لا نفرق بين البلاء و	ہمارے ہاں مصیبت و نعمت میں کوئی تفریق
والنعمة فان الكل من الله	نہیں قائم کی جاتی۔ کیونکہ ان کا مصدر و سرچشمہ
و لا نفرح الا بما فيه رضاه	ایک ہی ذات تو ہے۔ ہمارے لیے صرف اس

کی رضا کی طلب ہی ایسی چیز ہے۔ جس سے کہ دل کا کنول کھل سکتا ہے۔

بہر حال محبت کسی درجے کی ہو۔ جب اللہ کے لیے مخصوص ہو گی۔ اور اس میں غرض و غایت دنیوی کا کوئی شائبہ نہیں ہو گا۔ تو رنگ لائے بغیر نہیں رہے گی۔ اور ایسا شخص جو اس سے بہرہ مند ہو گا۔ نا ممکن ہے کہ عبادت علمی و عملی میں ثابت قدم نہ ہو۔ یا حُسنِ خلق اس میں نہ اُبھرے۔ یا یہ جذبہ اس میں نہ پیدا ہو۔ کہ آدابِ شرع کو زندگی کے ہر ہر گوشہ میں سمو کر دکھانا ہے۔ اس میں نیکی اور تقوٰی کا ذوق اتنا گہرا ہو گا۔ اور محبتِ الٰہی کا رنگ اس قدر شوخ ہو گا۔ کہ کہیں بھی خیر و شر میں امتیاز نہ روا رکھے بنا نہیں رہے گا حتٰی کہ جب اسے عابد و زاہد، اور فاسق و فاجر میں سے ایک کو دوستی کے لیے چُننا پڑے گا۔ تو اس کی نظرِ انتخاب عابد و زاہد ہی پر پڑے گی فاسق و فاجر پر نہیں۔ نیکی اور خیر کی طرف اس کا یہ میلان کیوں ہے اور شغف کی کیا

توجیہ کی جا سکتی ہے۔ جو اس کو نیک اور پاک باز حضرات کی طرف جھکائے ہوئے ہے۔ صرف یہ کہ یہ نتیجہ ہے کہ اس مخصوص نقطۂ نظر کا کہ اس کی محبت رضائے الٰہی کی طلب پر مبنی ہے۔ اس کو یقین حاصل ہے۔ کہ جس شخص سے اس کے مراسم ہیں۔ اس کے دل میں اللہ کی محبت کے سوا، اور کوئی جذبہ موجزن نہیں۔ اور یہ کہ خود اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت رکھتا ہے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو محبت کے ایسے بے لاگ تصور کے امکانات سے اختلاف ہو۔ کہ اس میں نفع عاجل یا ذاتی غرض کی جھلک تک نہ پائی جائے اور وہ سراسر اللہ کی خوشنودی پر مبنی ہو۔ لیکن کیا ان لوگوں نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا ہے۔ کہ ہماری محبت کا دائرہ صرف زندہ حضرات تک ہی سمٹا ہوا نہیں۔ بلکہ اس کی وسعتیں گزشتہ برگزیدہ شخصیتوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف سے بھی کم محبت نہیں۔ تابعین کے لیے بھی ہمارے دل میں جگہ ہے۔ صحابہ بھی ہماری آنکھ کی ٹھنڈک ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے خصوصی لگاؤ ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا تعلق خاطر کی یہ نوعیت محض اللہ کے لیے نہیں ہے؟ اور کیا اس نوع کی محبت و ارادت سے ہمارا دعویٰ اچھی طرح ثابت نہیں ہو جاتا۔

بغض فی اللہ کی حقیقت

بغض فی اللہ، الحب للہ کا منطقی نتیجہ ہے جب تم محبت کے مفہوم سے آگاہ ہو چکے۔ تو بغض فی اللہ کی حقیقت کو پا لینے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب ایک شخص سے قلبی و دلی روابط استوار کیے جا سکتے ہیں۔ کہ وہ اللہ کا مطیع اور فرماں بردار ہے۔ یا اللہ کا محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اور اس سے اس نوع کا تعلق در اصل تعلق باللہ کے مترادف ہے۔ تو ایسے شخص سے بغض یا عدم موانست کا ہونا بالکل قدرتی اور ضروری ہے۔ جو معاصی پر اصرار کرتا ہے۔ اور عند اللہ مبغوض ہے۔ گویا کسی کو چاہنے۔ اور کسی اصول کو اپنانے کا مطلب یہی ہے کہ کسی کو آپ نہیں بھی چاہتے ہیں۔ اور کچھ اصول ایسے بھی ہیں۔ جو بہر حال نفرت و تحقیر کے متقاضی ہیں۔

نفرت و محبت کے یہ متناقض اور باہم مختلف جذبات یوں تو ہر ہر شخص میں پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کا اظہار اس وقت ہوتا ہے۔ جب ان میں کوئی جذبہ غلبہ پا لیتا ہے۔ اور زیادہ قوت و زور اختیار کر لیتا ہے۔ اسی وقت محبت و نفرت کے داعیات ابھرتے ہیں۔ اور دوستی یا دشمنی کے تعلقات اچھی طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ وقت ہوتا ہے۔ جب ایک شخص، دوستوں اور دشمنوں میں حقیقی فرق قائم کرتا اور اس فرق کی بنیاد پر اپنے سلوک و طرزِ عمل کا نقشہ مرتب کرتا ہے۔ اور طے کرتا ہے کہ کن کن لوگوں سے اس کے دوستانہ مراسم رہنے چاہییں۔ اور کون کون لوگ اس کی محبت و دوستی کے سزاوار

نہیں۔ تعلقات و روابط کا یہی وہ موڑ ہے۔ جس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے۔

ھل والیت فی ولیا و — کیا تو نے میری خاطر میرے کسی دوست

وھل عادیت فی عدوًا۔ — سے دوستی اور الفت کا رشتہ قائم کیا۔

اور میرے لیے میرے کسی دشمن سے دشمنی مول لی۔

بلاشبہ اگر ایک شخص نیک اور اللہ کا محبوب ہے۔ تو اس سے محبت و تعلق خاطر ہونا ہی چاہیے۔ اور فسق فجور میں مستغرق ہے۔ تو نفرت و بغض کے سوا اور کسی جذبہ کا مستحق نہیں۔

بغض و محبت کے دوگونہ جذبات کے سلسلہ میں ایک پیچیدگی اور اس کا حل

مشکل اس وقت پیش آئے گی۔ جب طاعت و معصیت کی ملی جلی زندگی پائی جاتی ہے۔ جب ایک شخص زندگی کے بعض پہلو نہایت گھٹیا ہیں۔ ایسی صورت میں۔ ایک طالب حق اس الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کہ ایک ہی دل میں محبت و بغض کے متضاد عناصر کو کیونکر جمع کیا جائے۔ اور ایک ہی شخصیت سے متعلق دو مختلف نوع کے طرزِ عمل کیونکر اختیار کیے جائیں۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ کیا ہم دنیا پر مبنی تعلقات میں بھی دشواری محسوس نہیں کرتے۔ کیا ہم ایک ہی شخص کو بعض وجوہ کی بنا پر پسند اور بعض وجوہ کی بنا پر ناپسند نہیں ٹھہراتے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ بسا اوقات حسین بیوی کو اس کے حسن و جمال کی بنا پر گوارا کر لیا جاتا ہے۔ لیکن کردار و سیرت کی کمزوریوں کی بنا پر محبت و الفت کا وہ درجہ نہیں دیا جاتا۔ جس کی کہ وہ پاکبازی کی صورت میں مستحق ہو سکتی تھی۔ اسی طرح کیا یہ واقع نہیں۔ کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو اس کی

ذہانت و خدمت کی وجہ سے چاہتا ہے۔ مگر یہی چاہت اور محبت اس کے فسق و فجور کی وجہ سے کم بھی ہو جاتی ہے۔ طرز عمل کے اس اختلاف اور سلوک کے اس تفاوت کی زیادہ واضح مثال اُس شخص پر صادق آئے گی جس کے تین بیٹے ہوں فرض کرو اُن میں ایک جودتِ طبع اور ذہانت کے ساتھ نیکی کی نعمت سے بھی مالا مال ہے۔ دوسرا ذہن و فکر کی محرومیوں کے ساتھ ساتھ خدمت و ادب کی دولت سے بھی محروم ہے۔ اور تیسرا اگرچہ کند ذہن ہے۔ مگر نیک ہے۔ اور یا پھر ذہین ہے اور عاق ہے۔ ان تینوں صورتوں میں باپ کے تعلقات اور محبت کی نوعیت حد درجہ مختلف ہوگی۔ یعنی ایک سطح اولاد کی ایسی ہوتی ہے۔ جس کے سبب وہ سب کو چاہنے پر مجبور ہوگا۔ اور دوسری سطح اخلاق و ادب کی ایسی ہوگی جس کی بنا پر اس کو سلوک و طرزِ عمل میں تفاوت رکھنا پڑے گا۔ اور دنیاوی تعلقات کا یہ نقشہ اگر صحیح ہے۔ تو ایسے شخص کی راہ میں کوئی دشواری حائل ہونے والی نہیں جو نیکی اور بُرائی یا خیر و شر کی بنیاد پر لوگوں سے تعلقات محبت و نفرت استوار کرنے کا خواہشمند ہے۔ اسی نہج اور انداز سے وہ بھی لوگوں سے اپنے برتاؤ کو متعین کر سکتا ہے

تعلقات کے اس اختلاف پر ممکن ہے کوئی شخص یہ اعتراض کر دے۔ کہ جب ایک صاحب مسلمان ہیں۔ تو کیونکر زیبا ہے۔ کہ اس کے بارہ میں نفرت و بغض کے جذبات دل میں رکھے جائیں۔ غرض یہ ہے کہ کیا بغض و اسلام کو ایک ہی قلب اور سینے میں جمع کیا جاسکتا ہے۔ ہم کہیں گے کہ دو کیفیتوں میں سرے سے کوئی تناقض ہی نہیں۔ بلکہ یہ تو عین تقاضائے اسلام ہے۔ ہم جب اسلامی حقوق کا خیال کریں گے تو محبت و تودد کے جذبات اُبھریں گے۔ اور جب یہ دیکھیں گے کہ کسی شخص میں حقوقِ اسلامی کی رعایت کا جذبہ پایا نہیں جاتا۔ تو اس سے قطع محبت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ پھر جس جس نسبت سے کسی شخص کی محبت احکامِ اسلامی سے ہوگی۔

اسی نسبت سے ہمارے دل میں اس کی محبت بڑھے گی۔ اور جس نسبت سے وہ حدود اللہ سے تجاوز اختیار کرے گا۔ اسی نسبت سے یہ تعلق مبدل بہ نفرت ہوتا چلا جائیگا

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ہے۔ کہ بغض فی اللہ کے اظہار کا طریق کیا ہے۔ اس کے دو طریق ہیں۔ ایک قولی اور ایک فعلی۔ قولی کی پھر دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس سے بات چیت ترک کر دی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بول چال میں سختی روا رکھی جائے۔ اور استخفاف و توہین سے بھی گریز نہ کیا جائے

اسی طرح فعلی کی بھی دو ہی شکلیں ہیں۔ پہلے درجہ میں اس کے لیے بھاگ دوڑ۔ اور سعی و کوشش نہ کرنا ہی کافی ہوگا۔ لیکن اگر جب اس پر تنبیہہ نہ ہو اور معصیت پر اصرار بدستور جاری رہے۔ تو پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر ایسی تدبیریں بھی اختیار کی جائیں گی جن سے اُس کو ضرر پہنچے۔ یا یہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

بغض فی اللہ کے حدود۔ امام احمدؒ بن حنبل کا اس باب میں طرزِ عمل

بغض فی اللہ کے حدود کیا ہیں؟ اور یہ حربہ کہاں کہاں اور کس انداز سے استعمال کرنا چاہیے۔ اس کی ٹھیک ٹھیک وضاحت سلف کے طرزِ عمل سے ہوتی ہے۔ امام احمد بن حنبل کی روش یہ تھی کہ اکابر سے چھوٹی سی لغزش کو بھی برداشت نہ کرتے۔ چنانچہ اُنھوں نے یحییٰ بن معین سے محض اس بنار پر قطع تعلق کر لیا۔ کہ اُنھوں نے بادشاہ سے تعاون کو اپنے لیے جائز رکھا تھا۔ اسی طرح حرث محاسبی سے اس وجہ سے خفا ہو گئے کہ انھوں نے معتزلہ کے رد میں جو کتاب لکھی تھی۔ اس میں اُن کے ادلہ کو بھی بوضاحت بیان کیا۔ امام کا اس پر یہ اعتراض تھا کہ اس پیرایۂ بیان سے عوام کو ٹھوکر لگے گی۔ یعنی ممکن ہے وہ ان کے رد سے قطعی متاثر نہ ہوں، اور معتزلہ کے دلائل اُن کی نظروں میں زیادہ جچیں۔ ابوثور سے بھی اسی سبب سے بول چال بند کر دی کہ انھوں

نے اس حدیث

ان الله خلق آدم علیٰ صورته ۔ — اللہ تعالےٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

کی تاویل کی تھی ۔

جب یہ معلوم ہوگیا۔ کہ ان لوگوں سے تعلقات استوار نہیں کرنا چاہیے ۔ جو معصیت اور نافرمانی پر اصرار کرتے ہیں ۔ بلکہ بعض حالات میں ان سے بغض و تحقیر تک کا معاملہ روا رکھنا چاہیے ۔ تو اس مرحلہ پر قدرتاً سوال یہ پیدا ہوتا ہے ۔ کہ کیا ایسا کرنا شرعاً واجب ہے ۔ اور اس کے ترک پر بہرحال انسان گنہگار ہو جاتا ہے نہیں ایسا کرنا واجب نہیں ۔ اور ایسے امور کو تکلیف و ایجاب کی اصطلاحوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس کا تعلق حالات و کیفیات سے ہے ۔ اور وہ اس درجہ مختلف اور متعدد ہیں ۔ کہ کسی ایک ضابطے میں ان کو محصور نہیں رکھا جاسکتا۔ چنانچہ آں حضرت کے زمانہ میں جو لوگ شراب پیتے تھے ۔ اور بعض برائیوں کا ارتکاب کرتے تھے! ان سے ایک ہی انداز کا معاملہ نہیں کیا جاتا تھا ۔ بلکہ ہر ایک سے اس کی حالت و کیفیت کے مطابق جدا جدا سلوک روا جاتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کسی سے تو سختی کا برتاؤ کیا جاتا ۔ اور کسی سے صرف اعتراض ہی پر اکتفا کیا جاتا اس باب میں اصل شئے جو ضروری اور اس لائق ہے ۔ کہ اس کو واجب سمجھا جائے اللہ کی معرفت اور محبت ہے ۔ باقی جو کچھ ہے ۔ وہ اسی کی شاخیں اور فروع ہیں ۔

محبّت و دوستی کی شرطیں

الحب فی اللہ کا معیار جب الحب فی اللہ کی حقیقت واضح ہو چکی اور اس کے فضائل و مناقب کے بارہ میں کوئی کھٹک نہ رہی

محبت کی پانچ بنیادیں تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ محبت و دوستی کا معیار کیا ہے! وہ کیا اخلاقی و دینی خوبیاں ہیں۔ جن کو اس کی بنیاد قرار دیا جائے۔ اور وہ کیا عقلی و نفسی امتیازات ہیں۔ جنھیں ایک حبیب اور دوست میں ڈھونڈھنا چاہیے۔ اس معیار کی وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ ہر ہر شخص اس لائق کہاں ہوتا ہے۔ کہ اس سے ان روابط کو وابستہ کیا جائے۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل۔

ہر شخص اپنے دوست کے خیالات دینی سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے اسے اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے۔ کہ کس سے دوستی قائم کر رہا ہے۔

محبت و دوستی کے ذریعہ کئی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ جو دنیاوی بھی ہو سکتی ہیں۔ اور دینی بھی۔ دنیا اور اس کی ضروریات مختلف النوع ہیں۔ ایک ضرورت مثلاً تحصیل علم کی ہو سکتی ہے۔ حسنات عمل سے استفادہ بھی اس میں شامل ہے۔ اسی طرح حصولِ جاہ کی کوششیں بھی اس ضمن میں آ سکتی ہیں۔ بشرطیکہ مقصود قلب و فکر کو یک سوئی عطا کرنا ہو۔ اور مال و دولت کی فراوانیوں سے بہرہ مندی بھی۔ اسی ڈھنگ کی ہے۔ بشرطیکہ اس سے فراغ حاصل ہو سکے۔ اور انسان پوری جمعیتِ خاطر سے عبادت کے لیے وقت نکال سکے۔ مہماتِ امور میں استعانت یا

دعا و تبرک کی طلب بھی اس دائرے میں داخل ہے خصوصیت سے شفاعت دوستاں تو ایسی چیز ہے۔ کہ تنہا اسی پر محبت کی پوری عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اس حقیقت کو ایک بزرگ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

استکثروا من الاقران — زیادہ سے زیادہ بھائی چارہ قائم کرو کیونکہ

فان لکل مومن شفاعۃ فلعلک — ہر مومن کو سفارش کا حق دیا جائے گا۔ اور تمہارے

تدخل فی شفاعۃ اخیک۔ — حق میں ممکن ہے ان بھائیوں میں سے کسی کی سفارش کارگر ہو جائے۔

دوستی اور محبت کے انھیں فوائد کے پیش نظر کہ اس سے علم بڑھتا ہے۔ عمل سنورتا ہے اور سکونِ قلب کی دولت کو پا لینے میں مدد ملتی ہے سلف میں بہت سے حضرات نے صحبت اور اُلفت پر زور دیا ہے۔ اور میل جول اور تعلقات کی اہمیتوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اور عزلت و گوشہ نشینی کو ناپسند فرمایا ہے۔ لیکن ان فوائد میں ہر ہر فائدہ چونکہ ایسا ہے۔ کہ اس کی کچھ کچھ شرائط ہیں جن کو ملحوظ و مرعی رکھنا بہرحال ضروری ہے۔ اس بنا پر ہم چاہتے ہیں کہ اس مرحلہ پر ذرا تفصیل سے کام لیں۔ مثلاً یوں سمجھ لیجیے۔ کہ دوستی و محبت کی پانچ بنیادیں ہیں۔ سب سے پہلے تو انھیں عقلمند اور زیرک ہونا چاہیے حسنِ خلق سے آراستہ ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بھی واجب ہے کہ فسق و فجور سے ان کا دامن پاک ہو۔ ایسے دوست کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ مبتدع نہ ہو۔ اور دنیا کی حرص و آز میں گرفتار نہ ہو۔ کیونکہ لالچ اور حرص ایسی شئے ہے کہ جس سے محبت و دوستی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور اخلاص و تودد کے داعیے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اب ان کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

عقل وزیرکی دوستی کا راس المال ہے

جہاں تک عقل و زیرکی کا تعلق ہے۔ اس کو دوستی کا راس المال کہنا چاہیے۔ کیونکہ احمق

سے تعلقات کا نبھانا سخت دشوار ہے۔ یہی نہیں۔ احمق کی دوستی بالآخر تشویش و اضطراب کا باعث ہوتی ہے۔ اور سخت وحشت پیدا کرتی ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں۔

فلا تصحب اخا الجهل — تمھیں جاہل کا دوست نہیں بننا چاہیے۔

وایاک وایاہُ۔ — اس کی دوستی سے بچو اور احتراز کرو۔

فکم من جاهل اردی — کیونکہ کتنے ہی جاہلوں نے اچھے خاصے

حکیماً حین آخاہ — بردباروں کو دوستی کی آڑ میں ملیا میٹ کیا ہے۔

یقاس المرء بالمرء — آدمی آدمی کا پیمانہ ہے۔ جب کہ

اذا ما المرء ما شاہ — دوستی کے چند قدم چلے۔

وللشیء من الشیء — اور ہر ہر شے دوسری شے کے لیے پیمانہ

مقاییس واشباہُ — بھی ہے اور مماثلت کا باعث بھی۔

وللقلب علی القلب — اور جب دو دل باہم ملتے ہیں۔ تو ان میں

دلیل حین تلقاہُ — غیر شعوری طور پر میلان پہلے سے موجود ہوتا ہے

ایک صاحب کا کہنا ہے۔

مقاطعة الاحمق — احمق سے راہ و رسم نہ رکھنا۔ اللہ کی طرف

قربان الی اللہ — تقرب کا ایک قدم ہے۔

حضرت ثوری کہا کرتے تھے۔

النظر الی وجه الاحمق — بے وقوف کے چہرہ کو محبت کی نظر سے

خطیئة مکتوبة۔ — دیکھنا بھی معصیت ہے۔

زیرک و عقلمند سے ہماری مراد ایسے شخص سے ہے۔ جو یا تو تمام امور کو براہ راست سمجھتا ہے۔ اور یا اس میں اتنی صلاحیت ہو۔ کہ اگر اسے کوئی بات سمجھائی

جائے تو انشراح قلب کے ساتھ اسے قبول کر سکے۔

حُسنِ خلق دوستی کی بنیاد و اساس ہے

حسن خلق کو دوستی کی بنیاد قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اصلاحِ احوال کے معاملہ میں صرف زیرکی و عقل مندی سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ نفس و کردار کی نفاست و پاکیزگی بھی درکار ہے۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے۔ کہ ایک شخص بلا کا ذہین ہو۔ اور تمام امور کو اچھی طرح جانتا بوجھتا ہو۔ مگر اس پر بھی غضب و شہوت کے ہاتھوں مجبور ہو۔ یا بخل و جبن نے اُس کی طبع رسا کو روک رکھا ہو اور نتیجۃً وہ ہرگز اس لائق نہ رہا ہو۔ کہ جرأت سے حق کو قبول کر سکے یا خیر و نیکی کی طرف قدم بڑھا سکے۔ ان حالات میں ایسے شخص سے یارانہ گانٹھنے میں کوئی اخلاقی و دینی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں۔ لہذا اس کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔

فاسق مصر بھی بھروسہ کے لائق نہیں۔ اور بنا بریں، دوستی و محبت کے حق دار بھی نہیں۔ کیونکہ جس نے فسق و فجور پر اصرار کیا۔ اُس نے گویا زبانِ حال سے کہہ دیا کہ اس کا دل خوف و خشیتِ الٰہی کی نعمت سے محروم ہے۔ ورنہ گناہوں کے اصرار کے کیا معنی! اور ایسا شخص جس کے اعمال و افعال کا مرکز۔ اس کی خواہشات قرار پائیں۔ اس کا کیا اعتبار، وہ تو خواہشات کے ساتھ ساتھ دوستی و محبت کے رُخوں کو بھی بدلتا رہے گا۔ اور ہمیشہ ہر ہر اقدام کا فیصلہ اس بنا پر کرے گا۔ کہ اس سے اس کی ذات کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے۔ کہ فسق و فجور دوستی کی پائدار بنیاد نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی تشریح مندرجہ ذیل آیات سے ہوتی ہے۔

فاعرض عمن تولّٰی عن ذکرنا ولم یرد الا الحیٰوۃ

تو جو ہماری یاد سے روگردانی کرے۔ اور صرف دنیا ہی کی زندگی کا خواہاں ہو۔ اُس سے مُنہ

الا قبا۔ (النجم-۲۹) — پھیرے۔

واتبع سبیل من اناب الی۔ (لقمان-۱۵) — اور جو شخص میری طرف رجوع لائے اس کے راستے پر چلنا۔

مبتدع یا ایسا شخص جو دین کے بارے میں تجددات کا قائل ہے قطعی چھوڑ دینے کے لائق ہے۔ چہ جائے کہ اسے دوستی سے نوازا جائے۔ حضرت عمر کا ایک قول جناب سعید بن المسیب نے نقل کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تعلق خاطر کے لیے تدین کس درجہ ضروری ہے۔

علیک باخوان الصدق تعش فی اکنافهم فانهم زینة فی الرخاء وعدة فی البلاء وضع امر اخیک علی احسنه حتی یجیئك ما یغلبك منه۔ واعتزل عدوك واحذر صدیقك الا الامین من القوم ولا الامین الا من خشی الله۔ فلا تصحب الفاجر فتتعلم من فجوره۔ ولا تطلعه علی سرك۔ واستشر فی امرك الذین یخشون الله تعالی۔

صرف سچے دوستوں سے واسطہ رکھو اور انھیں کے پہلو میں زندگی بسر کرو۔ کیونکہ وہ اچھے حالات میں دوستی کی زیب و زینت ہیں۔ اور مصائب میں سازگاری اور مدد کا ذریعہ ہیں۔ ان کی ہر ہر بات کے لیے اچھا محمل تلاش کرو۔ تا آنکہ تمھارے سوءِ ظن کا پہلو غالب ہو۔ دشمن سے بچو۔ اور ایسے دوست سے بھی احتراز کرو جو امین نہ ہو۔ اور امین وہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ فاسق و فاجر کی صحبت میں نہ رہو۔ مبادا اس کا فجور تمھیں متاثر کرے۔ اور نہ ایسے شخص کو اپنا کوئی بھید ہی بتاؤ۔ اور مشورہ کرنا ہو تو اس کے لئے صرف ایسے لوگوں کو منتخب کرو جن کے سینے اللہ کی محبت سے معمور ہیں۔

دوستی اور محبت کے بارہ میں اہل تقویٰ کے حکیمانہ اقوال علقمۃ العطاردی کا نظریہ

دوستی اور صحبت کے بارے میں اہل تقوٰی و دین کے کچھ حکیمانہ اقوال اور ارشادات ہیں۔ جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ انھیں پڑھیے اور ان کی روشنی میں اپنے لیے صحیح راہ عمل متعین کیجیے۔

علقمۃ العطاردی کی وصیت کیا خوب ہے۔

یا بنی اذا عرضت لك الى صحبة الرجال حاجة فاصحب من اذا خدمته صانك، وان صحبته زانك وان تعدت بك مؤونة مالك اصحب من اذا مددت يدك بخير مدها۔ وان رأى منك حسنة عدها۔ وان رأى سيئة سدها اصحب من اذا سألته اعطاك وان سكت ابتداك۔ وان نزلت بك نازلة واساك۔ اصحب من اذا قلت صدق قولك وان حاولتما امرا امرك وان تنازعتما آثرك۔

بیٹا اگر کسی کی صحبت میں رہنے کی ضرورت محسوس ہو۔ تو ایسے آدمی کی صحبت اختیار کرو۔ جو تمھاری خدمات کی قدر کرے۔ اور تمھیں ہر طرح کے خطرے سے بچائے جس کی صحبت تمھارے لیے سرمایۂ نازش ہو۔ جو ضرورت پڑنے پر تمھاری مالی مدد کر سکے۔ ایسے آدمی کی رفاقت کی آرزو رکھو۔ جب تم اس کے ساتھ بھلائی روا رکھو۔ تو وہ بھی دست تعاون بڑھائے اور اگر تمھاری جانب سے کسی نیکی کی اطلاع پائے تو اسے احسان سمجھے۔ اور برائی دیکھے تو اس کی روک تھام کے لیے کوشاں ہو۔ ایسے شخص کو صحبت کے لیے چنو، جب تم اس سے کچھ مانگو۔ تو وہ دے دے۔ اور اگر تم چپ رہو، تو وہ پوچھے۔ اور اگر کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے تو تمھاری مدد کے لیے تیار رہے۔ ایسے دوست کو منتخب کرو کہ جو بھی تم کہو اس کی تصدیق کرے، اور تم جس شے کے درپے ہو۔ وہ اس کی تعمیل کا حکم دے۔ اور اگر تم میں کبھی اختلاف رونما ہو تو تمھاری رائے

کو مرجح سمجھے۔

اس میں لطیفہ کا پہلو یہ ہے۔ کہ ماموں نے جب یہ وصیت سُنی تو بے ساختہ کہا۔ کہ ایسے دوست ملتے کہاں ہیں؟ اِس پر اُن کو ایک صاحب نے جواب دیا۔ کہ یہی تو وصیت کرنے والے کا اصلی مقصد ہے۔ کہ ایسا کوئی دوست اگر نہیں میسر ہوتا ہے تو اس سے ترک دوستی اور مجرد رہنا ہی اولیٰ ہے۔ اسی مضمون کو ایک اور بزرگ نے صاف صاف بیان کر دیا ہے۔

لا تصحب من الناس	صرف اُسی شخص کی صحبت و رفاقت میں
الا من یستر سرک و	رہنا پسند کرو۔ جو تمہارے راز کو چھپائے اور
یکتم عیبک فیکون معک	تمہارے عیوب پر پردہ ڈالے۔ جو ہر غور بات
فی النوائب۔ و یوثرک	میں تمہیں ترجیح دے۔ اور جو تمہاری خوبیوں
بالرغائب و ینشر حسنک	کی تشہیر کرے۔ اور برائیوں کو چنداں اہمیت نہ دے
و یطوی سیئتک۔ فان لم	لہذا اگر ایسا کوئی دوست نہیں ملتا ہے۔ تو اپنی
تجدہ فلا تصحب الا نفسک	ہی رفاقت کیا بری ہے۔ اسی سے بہرہ مند ہو۔

حضرت علی کا ارشاد ہے۔

حضرت علی کا تصورِ محبت

ان اخاک الحق من کان معک
و من یضر نفسہ لنفعک

(تمہارا سچا دوست وہ ہے۔ جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔ اور تمہارے نفع کے لیے خود اپنا نقصان برداشت کرے۔)

و من اذا ریب الزمان صدعک
تشتت فیہ شملہ لیجمعک

(جو اس وقت تمہارے سکون کی خاطر پریشانی مول لے جب انقلاب زمانہ تمہیں گزند پہنچائے)

کے درپے ہو۔)

ایک صاحب کا کہنا ہے۔

لا تصحب الا احد رجلین۔
رجل تتعلم منه شیئاً فی امر
دینك۔ فینفعك۔ او رجل
تعلمه شیئاً فی امر دینه
فیقبل منك۔ والثالث
فاهرب منه۔

صرف دو قسم کے انسانوں کی صحبت اختیار
کرو۔ یا تو ایسے شخص کی جس سے تمہیں کوئی دینی
بات حاصل کرنا ہو۔ اور وہ تمہارے لیے
مفید ہو۔ اور یا ایسے شخص کی جسے تمہیں دینی
تعلیم دینا ہو۔ اور اُس میں قبول کرنے کی
صلاحیت پائی جائے۔ ان کے علاوہ ہر شخص
کی رفاقت سے بھاگنے کی کوشش کرو۔

پانچ آدمی صحبت کے لائق نہیں حضرت جعفر صادق کی رائے

جناب جعفر الصادق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:۔

لا تصحب خمسة الکذاب
فانك منه علی غرور وهو
مثل السراب یقرب منك
البعید ویبعد منك
القریب والاحمق فانك
لست منه علی شیٔ یرید ان
ینفعك فیضرك۔ والبخیل
فانه یقطع بك احوج ما
تکون الیه۔ والجبان فانہ

پانچ آدمیوں کی صحبت سے قطعی مجتنب رہو
ایک تو جھوٹے کی صحبت سے۔ کیونکہ اس کی طرف
سے تم ہمیشہ دھوکے میں رہوگے۔ وہ اور اس کے
وعدے ہمیشہ سراب ہیں۔ مزید بیاں وہ ان
لوگوں کو تمہارے قریب کر دے گا جنھیں دور
رہنا چاہیے۔ اور اُن لوگوں کو دور کر دے گا جنھیں
قریب تر رہنا چاہیے + دوسرے احمق کی صحبت
سے کہ اس سے تمہارا کوئی ناطہ نہیں۔ یہ تمھیں
نفع پہنچانا چاہے گا۔ مگر اس طرح کہ تمھیں

یسلمک و یفر عند الشدة۔ والفاسق، فانه یبیعک باکلة او اقل منها۔

نقصان پہنچے۔ تیسرے بخیل کی صحبت سے، کہ یہ ان چیزوں کو روک دے گا، جن کی تمہیں شدید ترین ضرورت ہو سکتی ہے، چوتھے بزدل کی رفاقت سے کہ یہ تمہیں دشمن کے سپرد کر دے گا۔ اور مقابلہ پر بھاگ کھڑا ہو گا۔ پانچویں فاسق کی دوستی سے کہ یہ تمہیں ایک لقمہ یا اس سے بھی کم کے عوض بیچ ڈالنے میں دریغ نہیں کرے گا۔"

فاسق مگر شائستہ اُس قاری قرآن سے زیادہ اچھا ہے جو بد اخلاق ہو حضرت جنید کا قول

حضرت جنید نے دوستی کے معیار پر ایک دوسرے ہی پہلو سے غور کیا ہے۔ ان کا قول ہے۔

لان یصحبنی فاسق حسن الخلق احب الی من ان یصحبنی قاری سئی الخلق۔

ایک فاسق، مگر شائستہ اخلاق انسان کی دوستی، میرے نزدیک اُس قاری کی دوستی سے کہیں بہتر ہے۔ جو بداخلاق ہو۔

بشر نے اخوت کو تین قسموں میں بانٹا ہے۔

الاخوان ثلاثة ! اخ لآخرتک واخ لدنیاک و اخ تتأنس به۔

بھائی تین طرح کے ہیں۔ ایک جو آخرت کے سلسلہ میں معین ہو۔ دوسرا جس سے مشکلات دنیا میں مدد ملے۔ اور تیسرا جس سے مل کر راحت حاصل ہو۔

مامون کی تقسیم بھی تجربہ پر مبنی ہے۔

الاخوان الثلاثة احدهم مثله مثل الغذاء لا یستغنی عنه، والآخر مثله مثل الدواء یحتاج الیه فی وقت

بھائیوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک ایسا ضروری ہے جیسے روزمرہ کی غذا۔ اس سے بے نیازی ممکن نہیں۔ دوسرا دوا کی مانند ہے جس کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ اور تیسرا

دون وقت۔ والثالث مثلہ مثل الداء لا یحتاج الیہ۔

بجائے خود بیماری ہے۔ اس کی کبھی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

افادہ وضرر کے نقطۂ نگاہ سے انسانوں کی تقسیم

افادہ وضرر کے اعتبار سے انسانوں کی کیا تقسیم ہے۔ اس کو اس قول کی روشنی میں دیکھیے۔ کیا استیعاب ہے۔

جملۃ الناس کمثل الشجر والنبات فمنھا مالہ ظل ولیس لہ ثمر وھو الذی ینتفع بہ فی الدنیا دون الآخرۃ فان نفع الدنیا لظل سریع الزوال ومنھا ما لہ ثمر ولیس لہ ظل وھو مثل الذی یصلح للآخرۃ دون الدنیا ومنھا لہ ثمر وظل جمیعا ومنھا ما لیس لہ۔ واحد منھما کام مغیلان تمرق الثیاب ولا طعم فیھا و لا شراب۔

جملہ انسان درخت اور پودوں کی طرح ہیں۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں۔ کہ ان کا سایہ تو ہے، مگر پھل نہیں۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جس سے امورِ دنیا میں تو استفادہ ممکن ہے۔ لیکن آخرت میں اس سے کچھ نفع پہنچنے کی امید نہیں۔ کیونکہ نفعِ دنیا، ایک طرح کا سایہ ہی ہے جو جلد زوال پذیر ہونے والا ہے۔ بعض ایسے ہیں۔ کہ ثمر سے بہرہ مند ہیں مگر سایہ ندارد۔ اس سے مراد وہ شخص ہے، جو آخرت کے سلسلہ میں مفید ہے۔ مگر دنیا میں کچھ مفید نہیں۔ کچھ ایسے ہیں۔ کہ پھل اور سایہ دونوں رکھتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں کہ ان دونوں سے محروم ہیں۔ یہ کانٹے دار جھاڑی کی مانند ہیں۔ جن میں کوئی کھانے کی چیز ہے نہ پینے کی۔ مزید برآں اس سے نثر خار کے کپڑے بھی پھٹتے ہیں۔

اسی حقیقت کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

الناس شتّٰی اذا ما انت ذقتهم

لا یستوون کما لا یستوی الشجر

(جب تمہیں سابقہ پڑے۔ تو انسانوں کی مختلف قسمیں پاؤ گے۔ جس طرح درخت ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ اسی طرح ان میں بھی یکسانی نہیں۔)

هذا له ثمر حلو مذاقته

و ذاك لیس له طعم و لا ثمر

(چنانچہ ان میں ایک تو میٹھا اور شیریں ہے۔ اور ایک ایسا ہے، کہ اس کا مزہ ہے نہیں پھل سے بالکل محروم۔)

حضرت ابوذر غفاری اور رفاقت

حضرت ابوذر غفاری نے وحدت وانزوا اور صحبت و رفاقت دونوں کی ضرورت تسلیم کی ہے، مگر مشروط طور پر۔ اُن کا کہنا ہے۔

الوحدة خیر من جلیس السوء۔ والجلیس الصالح خیر من الوحدة۔

بُرے ساتھی سے تو تنہائی اور گوشہ نشینی ہی بہتر ہے۔ ہاں اگر جلیس صالح ہو۔ تو البتہ صحبت و رفاقت کو فضیلت حاصل ہے۔

بُری صحبت پر کیا نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ اس کے بارہ میں امام احمد بن حنبل کا قول ملاحظہ ہو۔

وما اوقعنی فی بلیة الا صحبة من لا احتشمته

میں ابتلا اور آزمائش میں گرفتار نہیں ہوا۔ اِلّا اُس وقت جب مجھے ایسے شخص سے رفاقت اختیار کرنا پڑی ہے۔ جس کے بارہ میں میں اپنے دل میں

کوئی احترام نہیں پاتا۔

حضرت لقمان کا قول اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ ارشاد **مسک الختام** ہے۔

یا بنی جالس العلماء
وزاحمهم بركبتيك
فان القلوب لتحيا بالحكمة
كما تحيى الارض الميتة
بوابل المطر۔

بیٹا! علماء کی صحبت میں رہو۔ اور اس طرح اُن کے قریب ہو کر بیٹھو کہ تمہارے زانو اُن کے زانوؤں سے مزاحم ہوں۔ بیٹا شوق رکھو۔ دل اسی طرح حکمت سے زندہ ہوتے ہیں۔ جس طرح زمین بارش کے چھینٹوں سے۔

اخوت و رفاقت کے تقاضے

اخوت و رفاقت ایک طرح کا عقد و رابطہ ہے جس کے مالی نفسیاتی اور اخلاقی تقاضے ہیں

بھائی چارہ اور الحب فی اللہ اسی طرح کا شرعی و دینی رابطہ ہے۔ جس طرح مثلاً نکاح ہے۔ جس طرح عقدِ نکاح سے حقوق و واجبات کا ایک نقشہ متعین ہوتا ہے اسی طرح محبت و رفاقت کچھ حقوق چاہتی ہے۔ جو مالی بھی ہیں اور نفسیاتی بھی زبان سے بھی ان کا تعلق ہے۔ اور اعمال و جوارح سے بھی۔ ان کو کل آٹھ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مالی حقوق۔ آں حضرت نے ایک حدیث میں فرمایا ہے۔

مثل الاخوين مثل اليدين۔ تغسل احداهما الاخرى۔

دو بھائی دو ہاتھوں کی مانند ہیں کہ ایک دوسرے کو دھوتا اور غسل دیتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ جس طرح دونوں ہاتھ باہم معاون ہیں۔ اور ہر ہر کام میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ اسی طرح اخوت و بھائی چارہ، ہر نوع کی امداد کا طالب اور ہر نوع کی مشارکت و حصہ داری کا متقاضی ہے۔ دونوں کو چاہیے کہ حال و مستقبل اور تنگی و کشائش میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں اور ترجیح و برتری کے خیال کو دل کے ہر گوشے سے نکال باہر کریں۔ بالخصوص جہاں تک مالی اعانت و دستگیری کا تعلق ہے۔ قطعی دریغ نہ کریں۔ اور فیاضی

دیر چشمی سے پیش آئیں۔

مالی اعانت کی تین قسمیں ہیں۔ یا تو دولت کو کم از کم وہ حیثیت دے۔ جو اس کے خادم کو حاصل ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے۔ کہ اس کی ضروریات کا حتی الامکان خیال رکھے۔ اور اپنے زائد مال میں سے وقتاً فوقتاً، اس کی حاجت روائی کرتا رہے۔ اور اس کی نوبت تو بالکل نہ آنے دے۔ کہ اس کے ہوتے ہوئے یہ دوسروں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو۔

اس سے بلند تر سطح یہ ہے۔ کہ دوست کو اسی اہمیت کا مستحق سمجھے۔ جس اہمیت کا وہ خود مالک ہے۔ اس صورت میں ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ مال و دولت اور مکان و آسائش کی تمام شکلوں میں اس کی مشارکت گوارا کرے۔ یہی نہیں بلکہ خود اس کی دعوت دے۔ اسی مقام کی طرف حضرت حسن نے اشارہ کیا ہے۔

کان احدھم یشق ازارہٗ بینہٗ و بین اخیہ۔	ان میں ہر ایک اپنے ازار میں سے آدھا ازار پھاڑ کر اپنے بھائی کو دے دیتا تھا۔

تیسری سطح سب سے اعلیٰ ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے۔ کہ دوست کو اپنے سے بھی بہتر سمجھے۔ اور اس کی ضروریات کو نہ صرف اپنی ضروریات قرار دے، بلکہ ان سے بھی مقدم جانے۔ اس مقام کا حصول آسان نہیں۔ اس پر امت کے وہ صلحائ فائز ہیں جنھیں رتبۂ صدیقیت میسر ہے۔ اس مقام کا اولین ثمرہ ایثار بالنفس ہے اس ایثار کی کیا حدود ہیں۔ اور کیا چیزیں اس کی زد میں آتی ہیں۔ اس کا اندازہ اس قصے سے کیجیے۔ کہ صوفیاء کے ایک گروہ کو کسی شکایت کی بنا پر ایک خلیفہ کے دربار میں حاضر ہونا پڑا۔ اس نے حکم دیا۔ کہ ان سب کی گردن اڑا دی جائے اس گروہ میں اتفاق سے ابوالحسین نوری بھی تھے۔ انھوں نے حکم سنا تو لپک کر

جلاد کی جانب بڑھے اور اپنی گردن قتل کے لیے پیش کردی۔ تاکہ دوستوں سے پہلے موت کی آغوش میں جانے کا موقع ملے۔ ان کا کہنا تھا۔ جب زندگی کے بارہ میں ہمیشہ ایثار سے کام لیا ہے۔ تو موت کے معاملہ میں کیوں پیچھے رہوں۔

اخوت اور الحب فی اللہ کی یہی تین سطحیں ہیں۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی پر بھی متمکن نہیں ہے۔ تو یہ سمجھ لے۔ کہ یہ رشتہ محض زبانی جمع خرچ ہے اور اس کی جڑیں ۔ اس کی گہرائیوں میں پیوستہ نہیں عقل و دین کے نقطہ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایسی ہی کھوکھلی اور بے جان محبت سے متعلق میمون بن مہران کا کہنا ہے۔

من رضی من الاخوان	جو شخص دوستی کی اس شکل پر مطمئن ہے
بترك الافضال فليصاحب	کہ اس کے لیے کچھ خرچ کرنا نہ پڑے اُسے
اهل القبور۔	مُردوں سے یارانہ گانٹھنا چاہیے۔

اصل محبت کیا ہوتی ہے اور اہل صفا کے گروہوں میں حقوق اخوت کا کس درجہ خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کا ایک نمونہ فتح الموصلی کی اس بے تکلفی میں تلاش کیجیے کہ انھیں جب ایک مرتبہ کچھ رقم کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ تو ایک دوست کے ہاں گئے۔ اتفاق سے وہ گھر پر نہیں تھا۔ انھوں نے لونڈی سے صندوق کی کنجی منگوائی۔ اور خود کھول کر حسب ضرورت درہم و دینار نکال لیے۔ یہ دوست گھر پر آئے۔ تو لونڈی نے از راہ تعجب یہ سارا ماجرا ان سے بیان کیا۔ انھوں نے فرط مسرت سے کہا۔

ان صدقت فانت حرة	اگر تو سچ کہتی ہے۔ تو آج سے فی
لوجه الله۔	سبیل اللہ آزاد ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے پاس ایک صاحب آئے۔ اور خواہش ظاہر کی۔ کہ

میں آپ سے مواخات چاہتا ہوں۔ اُنھوں نے فرمایا۔ جانتے بھی ہو مواخات کے حقوق کتنا ایثار چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا آپ ہی فرما دیجیے۔ اس پر اُنھوں نے کہا۔

ان لا تکون احق بدینارک ودرھمک منی۔ — مواخات کا یہ معنی ہے کہ تیرے درہم و دینار میں میرا حصہ کسی طرح تم سے کم نہ ہو۔

علی بن حسین نے ایک مرتبہ ایک صاحب سے پوچھا۔ تم جس شخص کی دوستی اور محبت کا دم بھرتے ہو۔ کیا اُسے یہ حق حاصل ہے۔ کہ تمھاری جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنا کچھ چاہے نکال لے۔ اُس نے کہا، ہماری محبت ہنوز اس درجہ پختہ نہیں ہوئی۔ آپ نے فرمایا۔ اس کا یہ مطلب ہے۔

لستم باخوان۔ — کہ تمھارے درمیان سرے سے بھائی چارہ قائم ہی نہیں ہوا۔

عبداللہ بن عمر نے ایثار کا ایک دل چسپ قصہ بیان کیا ہے۔ آں حضرت کے صحابی کے ہاں کسی نے بکری کا گلہ بھیجا۔ اس نے کہا۔ فلاں دوست کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس دوست نے ایک تیسرے دوست کی خبر دی۔ اور تیسرے نے چوتھے کی سفارش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ چھ سات آدمیوں میں گھوم پھر کر گلہ پھر انھیں کے ہاں واپس آگیا۔

ابوسلیمان الدارانی کا قول ہے۔

لو ان الدنیا کلھا لی فجعلتھا فی فم اخ لی، لاستقللتھا لہ۔ — اگر مجھے ساری دنیا کی نعمتیں حاصل ہو جائیں۔ اور میں ان سب کو ایک بھائی کے مُنہ میں ڈال دوں تب بھی میرے جذبۂ محبت کی تسکین نہ ہو، اور میں اسے کم ہی سمجھوں۔

انہیں کا قول اس سلسلہ میں بہت مزے کا ہے۔

انی لا لقم لقمۃ اخا من اخوانی فاجد طعمھا فی حلقی۔

میں اگرچہ بظاہر اپنے کسی بھائی کے مُنہ میں لقمہ ڈالتا ہوں۔ تاہم اس کی لذت اپنے حلق میں محسوس کرتا ہوں۔

اگر سوال یہ درپیش ہو۔ کہ مساکین کو کھانا کھلانا بہتر ہے۔ یا کسی دوست کی دست گیری کو ترجیح دی جائے گی۔ تو اس کا جواب حضرت علی کے ایک قول میں تلاش کیجیے۔

اخ فی اللہ احب الی من ان اتصدق بمائۃ درھم علی المساکین۔

میرا ایک بھائی جس سے رضائے اللہ کی بنا پر تعلق خاطر ہے۔ کہیں زیادہ عزیز ہے۔ اور اس کا مفاد کہیں زیادہ محبوب ہے اس کی نسبت کہ میں سو درہم مساکین پر خرچ کروں۔

یعنی یہ سو درہم بھی ایسے دوستوں اور بھائیوں ہی پر خرچ ہونا چاہیے۔ اسی مضمون کی تائید ان کے ایک اور قول سے بھی ہوتی ہے۔

لان اصنع صاعا من طعام واجمع علیہ اخوان فی اللہ احب الی من ان اعتق رقبۃ۔

میرے نزدیک صاع بھر طعام کی مخلص دوستوں کو دعوت دینا۔ ایک غلام آزاد کرنے سے زیادہ عزیز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جہاں تک مالی حقوق کا تعلق ہے۔ دوستی اور اخوت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ اس سلسلہ میں راہ و رسم ایثار کو تازہ کیا جائے۔ اور من و تو کے فرق کو مٹا دیا جائے۔

(۲) اعانت بالنفس۔ اس کا تعلق مالی حقوق کے ایک متعین گوشے سے ہے

اور وہ یہ ہے۔ کہ دوست اور اُس کی مدد کے یہ معنی نہیں۔ کہ جب تک وہ خود نہ لے۔ اور اظہار کی رسوائیوں سے دوچار نہ ہو۔ اس کی ضروریات کو محسوس ہی نہ کیا جائے۔ صحیح اور سچی اخوت یہ ہے۔ کہ سوال سے پہلے دست تعاون بڑھایا جائے۔ اور آپ سے آپ حاجت روائی کی جدوجہد جاری رکھی جائے اور اگر کوئی دوست یہ فرض یاد دلائے، تو اس کی اعانت کو جملہ ضرریات پر مقدم ٹھہرایا جائے۔

ابن شبرمہ نے ایک مرتبہ، ایک دوست کی غائبانہ گراں قدر مدد کی۔ اسے معلوم ہوا، تو تحفہ لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے کہا۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ میرے نزدیک دل میں تقاضائے محبت تھا۔ الحمد للہ کہ اس سے سبک دوش ہوا۔ فرمایا:-

اذا سئلت اخاك حاجة	جب تم کسی دوست سے حاجت
فلم یجهد نفسها فی قضائها	روائی کی درخواست کرو۔ اور وہ اس کے
فتوضأ للصلوٰة وكبّر	لیے زحمت برداشت نہ کرے۔ تو وضو
علیه اربعة تكبیرات	کرو۔ اور مُردہ سمجھ کر اُس کی نماز جنازہ
و عدّه فی الموتیٰ -	پڑھ ڈالو۔

جعفر بن محمد نے اعانت و خیر سگالی کا اچھوتا معیار قائم کیا۔ ان کا کہنا ہے۔

انی لاسارع الی قضاء	میں اپنے اعداء کی ضروریات کو اس
حوائج اعدائی مخافة ان	خیال سے پورا کرنے میں عجلت اور پھرتی
ارد هم فیستغنوا عنی -	کا ثبوت دیتا ہوں۔ کہ مبادا وہ مجھ سے
	بے نیاز نہ ہو جائیں۔

دوستوں کے بارہ میں ہمارے اسلاف کا طرزِ عمل

ہمارے اسلاف میں ایسے ایسے حضرات بھی تھے۔ جو دوستوں کی وفات کے بعد چالیس چالیس برس تک برابر اُن کے گھروں میں جاتے۔ اور اُن کے بال بچوں کا خیال رکھتے۔ اور اُن کی ادنیٰ ضروریات دریافت فرمانے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے چنانچہ کسی سے گھی کے بارہ میں پوچھتے۔ کسی سے نمک سے متعلق سوال کرتے اور یقین دلاتے کہ تمہاری حاجت روائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جائے گا۔ یہ ہے وہ اخوت، وہ محبت، وہ خیرسگالی و ہمدردی جس کی ایک دوست بھائی سے توقع رکھنی چاہیے۔ اور اگر یہ دوستی، اس طرح کے نتائج و ثمرات کی حامل نہیں ہے اور اس لائق نہیں ہے کہ پہلو میں دل ہمدرد کو مدد و اعانت پر آمادہ کر سکے۔ تو بالکل بے کار اور عبث ہے۔ بلکہ ایسا شخص کسی درجے میں بھی التفات و توجہ کا مستحق نہیں ایسے ہی لوگوں کے باب میں میمون بن مہران کا قول ہے۔

من لم تنتفع بصداقته لم تضرك بعداوته

جس کی دوستی سے تمہیں نفع نہیں۔ اس کی عداوت بھی تمہارے لیے مضر نہیں۔

گویا ایسے لوگ برسرِ عداوت بھی ہوں تو کیا پرواہ ہے۔ لیکن دوستی اور محبت کا یہ درجہ کسے نصیب ہے۔ اور ہر کوئی اس کا کہاں سزاوار ہے؟ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

الا وان لله اوانی فی الارض وهی القلوب فاحب الاوانی الی الله تعالیٰ اصفاها و اصلبها و ارقها۔ اصفاها من الذنوب، و اصلبها فی

خبردار! یہ نعمت عام نہیں۔ دنیا میں اللہ نے کچھ ظروف پیدا کر رکھے ہیں۔ اور یہ ظروف کیا ہیں؟ دل۔ سو اللہ تعالیٰ کو ان ظروف میں سے پاکیزہ تر، مضبوط تر اور نازک تر زیادہ پیارے ہیں۔ پاکیزہ تر تو گناہوں سے

فی الدین و ارفاقہا علی	مضبوط تر دین کے معاملہ میں۔ اور نرم تر
الاخوان۔	اپنے بھائیوں سے تعلق۔

ان تصریحات سے مقصود یہ بتانا ہے۔ کہ ہمیشہ اپنے بھائی اور دوست کی ضروریات کو اپنی ضروریات قرار دو۔ بلکہ اپنی ضروریات سے زیادہ اہم سمجھو اور اس کا اس طرح خیال رکھو۔ جس طرح اپنا خیال رکھتے ہو۔ اور کوشش کرو۔ کہ اس کی جملہ حاجات آپ سے آپ اس طریق سے پوری ہوتی رہیں۔ کہ اس کو دستِ سوال دراز کرنے کی زحمت نہ برداشت کرنا پڑے۔ یہی نہیں۔ ایک دوست کے حق میں اپنی اولاد و اقارب سے بھی زیادہ ایثار و کرم کا ثبوت دینا چاہیے۔ کیوں؟ اس کی وجہ حضرت حسن بیان کرتے ہیں۔

اخواننا احب الینا	ہمارے احباب ہمیں اپنے اہل و
من اہلنا و اولادنا، لان	اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ کیونکہ اہل و
اہلنا یذکروننا بالدنیا،	اولاد تو صرف دنیا ہی کو یاد دلاتے ہیں لیکن
و اخواننا یذکروننا	احباب آخرت کی یاد تازہ کرنے کا موجب
بالاٰخرۃ۔	ہوتے ہیں۔

دوست و احباب کے موٹے موٹے حقوق کیا ہیں؟ سعید بن العاص نے اس کی یوں وضاحت کی ہے۔

لمجلسی علی ثلاث،	ہم نشین کے مجھ پر تین حقوق ہیں قریب
اذا دنا رحبت، اذا حدث	آئے تو خیر مقدم کہوں۔ بات کرے۔ تو
اقبلت علیہ۔ و اذا جلس	پوری توجہ سے سنوں۔ اور بیٹھنا چاہے تو
اوسعت لہ،	اسے جگہ دوں۔

قرآن حکیم نے آں حضرت کے رفقا و احباب سے متعلق فرمایا ہے۔

رحماء بینھم۔ (فتح - ۲۱) اور آپس میں رحم دل ہیں۔

اس میں شفقت و تکریم کی جملہ صورتیں آجاتی ہیں۔ مالی، جانی، اور نفسی ہر قسم کی۔

(۳) اعانت باللسان ۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سکوت یا گفتگو سے ایک دوست یا بھائی کے جذبات یا خیالات کا خیال رکھا جائے۔ جہاں تک گفتگو کا تعلق ہے۔ اس کے تقاضے تو واضح ہیں ۔ سکوت کی متعدد شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اس کے عیوب سے تعرض نہ کرے ۔ نہ اس کے سامنے اور نہ اُس کی غیر حاضری میں ۔ بات چیت میں اس کی تردید نہ کرے ۔ اور نہ شکوک و شبہات کا خواہ مخواہ اظہار کرے ۔ تجسس سے گریز کرے ۔ نیز اس کے احوال کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کرے ۔ اور اگر سرِ راہ کہیں اتفاقیہ بھی ملاقات ہو جائے ۔ تو یہ نہ پوچھے۔ کہ کہاں سے آرہے ہو۔ یا کہاں کا قصد ہے ؟ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان امور کو وہ چھپانا چاہتا ہو ۔ اور سوال کی صورت میں اُسے لا محالہ جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اور یا پھر افشارِ راز کرنا پڑے گا۔ یہ دونوں نتائج تکلیف دہ ہیں۔ اس لیے ایک دوست کو مجبور نہیں کرنا چاہیے ۔ کہ ان سے دوچار ہو۔

اسی طرح دوست کے رازوں کو دوسروں کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے ۔ اور اس کے احباب اور بال بچہ کے بارہ میں قدح و تنقید سے بچنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں آں حضرت کے اسوہ میں ایک اصولی چیز ملتی ہے۔

کان صلی اللہ علیہ وسلم	آں حضرت کا دستور تھا کہ کبھی کسی
لا یواجہ احدًا بشیءٍ	کے سامنے ایسی بات بیان نہ کرتے جس

یکرھہ ۔ سے اُن کو اذیت پہنچتی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہیے ۔ کہ ہر اس اقدام سے باز رہے جس سے کسی کا دل دکھتا ہو۔ یا جس سے کسی شخص کے کرب و ملال میں اضافہ ہوتا ہے ہاں اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ اس وقت اس کا کہنا سُننا شرعاً ضروری ہے جس سے اس وقت تو کسی بُرائی سے مخاطب کو روک دینا ہے ۔ یا کسی معروف نیکی پر آمادہ کرنا ہے ۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ بلکہ ایسی حالت میں اگر نصیحت مخاطب کو کچھ بُری بھی معلوم ہوئی ہو تو پرواہ نہ کرے ۔ کسی شخص میں عیوب و نقائص ڈھونڈنا اور پھر اُن کی تبلیغ و اشاعت کرنا صراحتاً غیبت کا مرتکب ہونا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اس معصیت سے بچنے کا طریق کیا ہے! اس سے مجتنب رہنے کی دو تدبیریں ہیں ۔

اول :۔ اپنے احوال نفس کا جائزہ لے ۔ اور اس طرح کہ اس میں کوئی کمزوری پائی جاتی ہے کہ نہیں ۔ اگر پائی جاتی ہے ۔ تو جس طرح اس کمزوری کے مقابلہ میں اپنے کو بے بس سمجھتا ہے ۔ اور معذور جانتا ہے ۔ اسی طرح اپنے اُس بھائی کے بارہ میں کوئی معقول معذرت تلاش کرے جس کی کسی بُرائی یا عیب پر اس کو اطلاع ہوئی ہے ۔ اور یہ خیال کرے ۔ کہ ایسا مہذب اور شائستہ انسان کہاں ملے گا جس میں سرے سے کوئی عیب ہی نہ ہو ۔ جو سراپا نیکی اور سراپا جمال ہو ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب خود یہ اپنی بعض کمزوریوں سے دست کش نہیں ہو سکتا ۔ تو دوسروں کا بھی یہی حال ہے ۔ ان سے بھی بعض معصیتیں اور کمزوریاں نہیں چھوٹتیں ۔

ثانی :۔ دوستی سے متعلق یوں سوچے ۔ کہ یہ معیار نبھنے والا نہیں اور ایسے دوست نہیں ملتے ۔ کہ جن سے اپنے مراسم ہوں ۔ اور وہ ہر ہر عیب

اور لغزش سے پاک ہوں۔ اگر یہ بھی معیار قرار دیا جائے۔ اور ادنیٰ لغزش و معصیت کو دوستی و تعلق کی راہ میں حائل سمجھا جائے۔ تو آپس کے یہ رشتے اور تعلقات استوار ہو چکے۔ اس کے لیے تو بس اتنا ہی کافی ہے۔ کہ جن لوگوں سے تمھیں الفت و محبت ہو۔ اُن کی سیرت میں خیر کا پہلو، شر کے پہلو پر غالب ہو۔ اور نیکیاں زیادہ سے زیادہ ہوں۔ اور معصیتیں خال خال ہوں پھر دوست کی یہ پہچان ہے۔ کہ حسنات کے اس پہلو کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور کمزوریوں کی تاویل کرتا ہے۔ اسی حقیقت کو عبد اللہ بن المبارک نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

مومن و منافق میں نفسیاتی فرق

المؤمن یطلب المعاذیر والمنافق یطلب العثرات

مومن تو عذر تلاش کرنے کے درپے رہتا ہے۔ اور منافق لغزش تلاش کرتا ہے۔

حضرت فضیل کا قول ہے۔

الفتوة العفو عن زلات الاخوان۔

جوانمردی یہ ہے کہ اپنے بھائی بندوں کی لغزشوں کو معاف کر دیا جائے۔

لغزشوں کی پردہ پوشی، اس لیے بھی ضرور ہے، کہ ہر ہر شخص میں کردار کے دونوں پہلو ہو سکتے ہیں۔ لغزش اور معصیت کے بھی۔ اور خیر اور بلندی کے بھی۔ اب اگر کمزوریوں کو درخورِ اعتنا سمجھا جائے۔ اور خیر و بلندی کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تعلقات یا تو سرے سے قائم ہو نہیں پائیں گے۔ یا ان کی بنیاد نفاق پر ہوگی۔ اور یہ دونوں باتیں صحیح نہیں۔ امام شافعی نے اس سلسلہ میں مبنی بر حقیقت تجزیہ سے کام لیا ہے۔

ما احدٌ من المسلمين يطيع الله و لا يعصيه ولا احد يعصى الله ولا يطيعه فمن كانت طاعته اغلب من معاصيه فهو عدلٌ و انما جعل مثل هذا عدلاً في حق الله فبان تراه عدلا في حق نفسك و مقتضى اخوتك اولىٰ -

مسلمانوں میں کوئی ایسا شخص نہیں جس نے اللہ کی پوری پوری اطاعت کی ہو۔ اور کبھی معصیت کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ اور نہ کوئی ایسا شخص ہے۔ کہ جس نے ہمیشہ معصیت کی ہو۔ اور اطاعت کا نام نہ لیا ہو۔ سو جس کی اطاعت معصیت کے مقابلہ میں زیادہ ہو، اس نے گویا تقاضائے عدل اختیار کیا۔ اور جہاں عند اللہ یہ عدل ہے، وہاں تمہارے نزدیک، اور تمہارے بھائی چارہ کے نقطۂ نظر سے اس کو بطریقِ اولےٰ عدل ہونا چاہیے۔

پھر جس طرح دوست و مومن کے حق میں زبانِ طعن دراز کرنا۔ ناجائز ہے اسی طرح دل کو اساءتِ ظن سے بچانا چاہیے۔ کیونکہ اساءتِ ظن دل کی غیبت ہے۔ اور احادیث میں اس سے بھی روکا گیا ہے۔ اساءتِ ظن کیا ہے؟ دو لفظوں میں اس کی تعریف پر غور کیجیے۔ اساءتِ ظن یہ ہے۔ کہ جب کسی دوست کی لغزش کا پتہ چلے، تو بغیر اس کے کہ پہلے، اس کے لیے کوئی اچھا محمل تلاش کیا جائے، یا کسی اچھی توجیہہ سے، اس کی تاویل کی جائے۔ ایک بری رائے قائم کر لی جائے۔ اگر واقعہ اس نوعیت کا ہے کہ یقین و مشاہدہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔ تب بھی۔ اس کے لیے سہو و نسیان کی آڑ تو بہرحال لی جا سکتی ہے۔ ہاں بری رائے قائم کرنے میں انسان اگر مجبور ہی ہو جائے تو یہ دوسری بات ہے۔ اس میں عند اللہ مؤاخذہ کا

اندیشہ نہیں۔

سوءِ ظن سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ ارشادِ نبوی اساءت ظن سے متعلق آنحضرت کا ارشاد ہے۔

ایاکم و الظن فان الظن اکذب الحدیث۔ سوءِ ظن سے مجتنب رہو۔ کیونکہ سوءِ ظن بہت بڑا جھوٹ ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

ان اللہ قد حرم علی المومن من المومن دمہ و مالہ و عرضہ و ان یظن بہ ظن السوء۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مومن کے بارہ میں مومن پر اس کے خون، مال و دولت اور عزت و آبرو پر حملہ کو حرام ٹھہرایا ہے، اور اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے کہ اس کے متعلق بدگمانی کی جائے۔

مُعاملات

کسب معاش کی فضیلت

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور کارسازیوں نے دین و دنیا کے قانون کی کچھ اس طرح تقسیم فرمائی ہے۔ کہ آخرۃ کو تو ثواب واجب کی جگہ مقرر کیا ہے۔ اور دنیا کو تگ و دو اور سعی و اضطراب کی جولانگاہ بنایا ہے۔ اور پھر تگ و دو اور جد وجہد صرف معاد ہی کے لیے مخصوص نہیں رکھی۔ بلکہ اس کو حصولِ دنیا کے لیے بھی ضروری ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ آخرت اور معاد کی برکات سے دامن بھرنے کا بہت بڑا ذریعہ یہ دنیا ہی ہے۔ یہ آخرت کی کھیتی ہے۔ اور آخرت کے لیے بہترین وسیلہ ہے۔

دنیا کی دلچسپیوں کے اعتبار سے اشخاص کی تین قسمیں

کوئی شخص دنیا میں کس درجہ منہمک ہوتا ہے۔ اور اس کی دلچسپیاں اس کے فراغوں کو کس حد تک بھرتی اور معمور رکھتی ہیں؟ اس اعتبار سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔

ایک وہ شخص ہے۔ جو معاش کی الجھنوں میں اس طرح کھو گیا۔ کہ فکرِ آخرت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہ ہالکین کی فہرست میں آتا ہے۔

دوسرا وہ ہے جس نے خوفِ معاد کو نصب العین کی حیثیت سے اختیار کیا۔ اور دنیا کی طرف ملتفت نہ ہوا۔ وہ فائزین کے زمرہ میں داخل ہے۔

تیسرا شخص درحقیقت اعتدال و توازن لیے ہوئے ہے۔ یہ وہ ہے

جن کی دنیا کے ساتھ دلچسپیاں اسی حد تک ہوں جس حد تک ان کا تعلق نفسِ معاد اور آخرت سے ہے۔ یہ گویا اگرچہ دنیا کے حصول میں شب و روز منہمک ہے تاہم اس کا یہ انہماک حدودِ آخرت سے متجاوز نہیں ہو پاتا۔ اس درجہ پر فائز ہونے کے لیے ضروری ہے۔ کہ شریعت کی پیروی اور تتبع کو ہر ہر قدم پر ترجیح دی جائے۔ کاروباری تجارت کے ہر ہر موڑ پر ان آداب کا خیال رکھا جائے۔ جن کی اسلام نے جا بجا وضاحت کی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

وجعلنا النہار معاشا (النبأ) — اور دن کو معاش کا وقت قرار دیا۔

یہاں یہ نکتہ نظر و فکر کے سامنے رہنا چاہیے۔ کہ معاش کا ذکر معرضِ امتنان ہوا ہے۔

وجعلنا لکم فیہا معایش قلیلا ما تشکرون۔ (الاعراف۔ ۱۰) — اور اس میں تمہارے لیے سامانِ معیشت پیدا کیے۔

اس آیت میں جہاں حصولِ دنیا کو نعمت کی حیثیت سے بیان فرمایا ہے۔ وہاں شکر و ممنونیت کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ۔ — نماز جمعہ کے بعد اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو۔

(جمعہ۔ ۱۰)

احادیث میں بھی حصولِ معاش کی کوششوں کو کچھ کم سراہا نہیں گیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

من الذنوب ذنوب لا یکفرہا الا الہم فی طلب المعیشۃ۔ — کچھ گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ طلب معاش کی فکر ہی سے ہو سکتا ہے۔

سچے تاجر کے رتبہ کی بلندیاں
اسے انبیار کی معیت حاصل ہو گی

ایک حدیث میں ہے :۔

التاجر الصدوق یبعث یوم القیامۃ مع الصدیقین والشھداء ۔ (۱)

ایماندار اور سچا تاجر قیامت کے دن صدیقین اور شہدار کا رفیق ہوگا۔

محنت و مزدوری سے کمانے والے کے چہرہ پر کس درجہ انوار کا ہجوم ہوگا اس کو اس حدیث میں ملاحظہ فرمائیے ۔

من طلب الدنیا حلالاً وتعففا عن المسئلۃ و سعیا علی عیالہ و تعطفا علی جارہ نضر اللہ وجھہ کالقمر لیلۃ البدر ۔ (۲)

جس نے دنیا کو جائز ذرائع سے حاصل کیا۔ کہ سوال کی ذلتوں سے محفوظ رہے۔ اپنے بال بچوں کی ضروریات کو پورا کرے اور پڑوسی کے ساتھ ہمدردی و شفقت کا اظہار کرے۔ ایسا شخص اللہ سے اس حالت میں ملے گا۔ کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا۔

ایک مرتبہ آں حضرت صحابہ کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے کہ ایک جوان رعنا صبح صبح مزدوری اور محنت کی غرض سے گھر سے نکلا۔ صحابہ نے دیکھا۔ اور کہا۔ اس کی قوتیں اور نشاط کار اللہ کے لیے ہوتا۔ آپ نے فرمایا۔

لا تقولوا ھذا ۔ فانہ ان کان یسعیٰ علی نفسہ

یوں نہ کہو۔ اگر یہ شخص اس لیے مزدوری کرنا چاہتا ہے۔ کہ اپنے کو سوال

---

(۱) ترمذی و حاکم۔

(۲) بیہقی۔

ليكفها عن المسئلة ويغنيها عن الناس فهو في سبيل الله وان كان يسعى على ابوين ضعيفين او ذرية ضعاف ليغنيهم ويكفهم فهو في الله وان كان يسعى تفاخرا وتكاثرا فهو في سبيل الشيطان - (۱)

سے بے نیاز کر دے ۔ تو اس کی یہ کوشش اللہ کی راہ میں محسوب ہوگی ۔ اگر اپنے بوڑھے اور کمزور ماں باپ کی خدمت کرنا چاہتا ہے ۔ جب بھی اس کی یہ محنت اللہ کی راہ میں شمار ہوگی ۔ اسی طرح اگر یہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے تاکہ ان کو سوال کی زحمتوں سے بچائے ۔ اور لوگوں سے بے نیاز کر دے تو بھی اس کی یہ دوڑ دھوپ فی سبیل اللہ کے ضمن میں درج ہوگی ۔ لیکن اگر یہ تفاخر کے پیچھے دوڑتا ہے ۔ یا کثرت کی ہوس میں مبتلا ہے ۔ تو اس کی یہ کوشش شیطان کے لیے ہے ۔

پیشہ و ہنر کی عنداللہ کیا قدر و منزلت ہے؟

کسی نہ کسی ہنر یا پیشہ کے بارے میں فرمایا ۔

ان الله يحب العبد يتخذ المهنة ليستغني بها عن الناس و يبغض العبد يتعلم العلم يتخذه مهنة (۲)

اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت رکھتے ہیں ۔ جو اس کے لیے کوئی ہنر سیکھتا یا پیشہ اختیار کرتا ہے ۔ تاکہ لوگوں سے مستغنی ہو جائے ۔ اور وہ اس بندے کو پسند نہیں فرماتے جس نے علم اس غرض سے حاصل کیا ۔ کہ اس سے پیشہ یا ہنر کا کام لے ۔

---

(۱)

(۲) مسند الفردوس ۔

جو شخص محنت کرتا ہے۔ اُس کے بارے میں تو خصوصیت سے فرمایا۔

ان اللہ تعالیٰ یحب المؤمن المحترف۔ (۱)	اللہ تعالیٰ کو مومن محترف پسند ہے۔

حضرت مسیح نے ایک شخص کو دیکھا، تو پوچھ لیا۔ کیا عبادت و زہد تمھارا مشغلہ ہے۔ اس نے کہا جی ہاں۔ فرمایا۔ مگر تمھاری ضروریات کون پوری کرتا ہے۔ اُس نے کہا جناب میرا ایک بھائی ہے۔ وہ میری جملہ ضروریات کا ذمہ دار ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تو وہ تم سے زیادہ عابد ہے۔

ایک حدیث میں ہے۔

لان یاخذ احدکم حبلہ فیحطب علی ظھرہ خیر من ان یاتی رجلا اعطاہ اللہ من فضلہ فیسئلہ اعطاہ او منعہ۔ (متفق علیہ)	تم میں کا کوئی اگر رسی اور تیشہ لے اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر پشت پر لادے یہ اس سے کہیں بہتر ہے۔ کہ مالدار کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔ پھر اگر وہ چاہے تو دے۔ اور چاہے تو ہاتھ روک لے۔

مانگنے سے فقر و احتیاج کی ذلتیں کیونکر انسان کو گھیر لیتی ہیں۔ اِس کے متعلق ارشاد فرمایا۔

من فتح علی نفسہ بابا من السوال۔ فتح اللہ علیہ سبعین بابا من الفقر۔ (۲)	جو شخص اپنے لیے سوال و طلب کے ایک دروازہ پر دستک دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس پر فقر و افلاس کے ستر دروازوں کو کھول دیتا ہے۔

---

(۱) طبرانی۔

(۲) ترمذی۔

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے۔

لا یقعد احدکم عن طلب الرزق و یقول اللھم ارزقنی فقد علمتم ان السماء لا تمطر ذھبا و لا فضۃ۔

تمھیں طلب رزق سے یہ کہہ کر باز نہیں رہنا چاہیے۔ کہ اے خدا مجھے رزق سے بہرہ مند کر۔ کیونکہ آسمان سے۔ نہ تو سونا برستا ہے اور نہ چاندی۔

یعنی جو کچھ حاصل ہوگا وہ محنت ہی سے ہوگا۔

بے کاری جرم ہے

بے کار رہنا کیسا ہے۔ اور صحابہ اس کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے اس قول سے لگائیے۔

انی لاکرہ ان اری الرجل فارغا لا فی امر دنیاہ و لا فی امر اخرتہ۔

مجھے یہ سخت ناپسند ہے کہ کوئی شخص بے کار رہے۔ نہ دین کے معاملہ میں یہ اچھا ہے اور نہ امور آخرت کے بارہ میں۔

ابراہیم ادہم سے کسی نے دریافت کیا کہ تم ایسے شخص کو زیادہ پسند کرتے ہو۔ جو کاروبار میں صداقت شعاری سے کام لے۔ یا ایسے شخص کو جو اپنے کو عبادت و زہد کے لیے وقف کر دے۔ انھوں نے فرمایا۔

التاجر الصدوق احب الی۔

میرے نزدیک سچا تاجر، عابد و زاہد پر فوقیت رکھتا ہے۔

اس فوقیت کی جو وجہ بیان فرمائی۔ وہ بہت دلچسپ ہے۔

لانہ فی جھاد یأتیہ الشیطان عن طریق المکیال والمیزان و من قبل الاخذ

تاجر کو اس بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ وہ شیطان سے بر سر پیکار رہتا ہے شیطان اس کو ناپ تول اور لین دین میں گمراہ کرنے

والعظام فیھا ھلاکا۔ کی کوشش کرتا ہے مگر یہ اس کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا۔

کاروبار میں مصروفیت کی موت بہترین موت ہے، حضرت عمر کی آرزو

اسی نکتۂ دل پذیر کو حضرت عمر نے اپنے مخصوص انداز میں یوں اُجاگر فرمایا ہے۔

ما من موضع یاتینی الموت فیہ احب الیّ من موطن السوق لاھلی ابیع واشتری۔

کوئی مقام مجھے بہتر نظر نہیں آتا۔ کہ جہاں میں مرنا بہتر خیال کروں۔ بجز ایسے مقام کے کہ جہاں میں اپنے بال بچوں کے لیے خرید و فروخت کر سکوں اور بیع و شرا میں مشغول رہ سکوں۔

ایک مرتبہ کشتی میں ایک اہل اللہ سوار تھے۔ اتنے میں اُس کو طوفان نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لوگوں نے کہا۔ حضرت! آپ اس طوفان کی شدتوں کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

ما ھذہ الشدۃ انما الشدۃ الحاجۃ الی الناس۔

میں ان شدتوں کا قائل نہیں۔ سب سے بڑی شدت احتیاج ہے۔

غرض یہ ہے کہ صحابہ اور سلف کا معمول یہی تھا۔ کہ حصولِ معاش کے لیے تگ و دو کریں۔ اور کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ چنانچہ بعض ان میں تاجر تھے۔ جو دور دور کا سفر طے کرتے تھے۔ اور بحر و بر کو اپنی جولاں گاہ ٹھہراتے تھے۔ بعض کے باغات اور اراضی تھیں۔ جن کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے انھیں آنا جانا پڑتا تھا۔ اس لیے اگر سوال یہ پیدا ہو۔ کہ اسلام کی روح کس بات کی متقاضی ہے اور کس طرح کی زندگی چاہتی ہے۔ تو یہ حضرات ہیں جن کے طرزِ عمل سے اس چیز پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ ابو قلابہ نے ایک صاحب سے کہا۔

لان اراك تطلب معاشتك احب الى ان اراك فى زاوية المسلمين ۔

میرے نزدیک تمہارا طلب معاش میں بھاگ دوڑ کرنا مسجد کے کسی کونے میں بیٹھ رہنے سے کہیں محبوب تر ہے۔

اوزاعی کا کہنا ہے۔ میں ابراہیم ادہم سے ملا۔ یہ لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لادے چلے آ رہے تھے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔ آپ اتنی زحمت کیوں برداشت کرتے ہیں۔ آپ کے کئی احباب ایسے ہیں۔ جو آپ کو بے نیاز کر دے سکتے ہیں۔ اُن کا یہ جواب تھا۔

دعنى يا ابا عمرو فانه من وقف موقف مذلة فى طلب الحلال وجبت له الجنة ۔

اے ابو عمر! میرے اس حال پر نہ کہا۔ میں نے سنا ہے۔ جو کوئی حلال کے سلسلہ میں کوئی ذلت برداشت کرے گا۔ اس کو قطعی جنت ملے گی۔

کچھ ایسی تصریحات جن سے حصولِ معاش کے مقابلہ میں آخری اقدار کو مرجح سمجھا گیا ہے ان کا صحیح معنی اور محل کی تعیین

اس طرح کی تصریحات کے برعکس کچھ دوسری قسم کی تصریحات بھی ہیں۔ مثلاً آں حضرت کی حدیث ہے۔

ما اوحى الىّ ان اجمع المال و اكن من التاجرين و لكن اوحى ان سبح بحمد ربك وكن من الساجدين واعبد ربك حتى ياتيك اليقين ۔ (تفسیر ابن مردویہ)

میری طرف یہ وحی نہیں ہوئی کہ میں مال و دولت جمع کروں اور تاجر بنوں۔ بلکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے رب کی حمد و ستائش کر۔ اس کے سامنے سربسجود رہ۔ اور اپنے معبود کی عبادت گزارا رہ۔ جب تک کہ موت آکر ان مشاغل ختم نہیں کر دیتی۔

اسی طرح سلمان فارسی سے آپ نے فرمایا۔

من استطاع منكم ان	اگر تم کا کوئی شخص مدان حج میں یا میدان
يموت حاجا او غازيا او	جہاد میں یا مسجد کی آبادی کے سلسلہ میں زندگی
عامر المسجد فليفعل ولا	کھپا سکتا ہے۔ تو اُسے یہ ضرور کرنا چاہیے
تموتن تاجرا خائنا۔	لیکن یہ نہیں چاہیے کہ کوئی اس حیثیت میں
	مرے کہ وہ بد دیانت تاجر ہو۔

اس نوع کی تصریحات سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آں حضرت نے مطلقاً کاروبار تجارت کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس طرح کی تمام وضاحتیں تفصیل احوال چاہتی ہیں۔ اگر ایک شخص تجارت سے مال و دولت اس بنا پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کہ ان کو دوسروں پر پھیلائے۔ اور مستحقین پر خرچ کرے۔ تب اس کے جواز میں کیا شبہ ہے۔ لیکن اگر نیت جمع و اکتناز ہے۔ اور وسائل کے اختیار کرنے میں بھی حلال و حرام کی تمیز روا رکھی نہیں جاتی۔ تو اس کے ظلم و فسق ہونے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ واقعی ناجائز ہے۔ اسی طرح عام حالات میں کسب معاش کے لیے محنت و مزدوری کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص عبادت و زہد میں اپنا وقت صرف کرنا چاہتا ہے۔ یا کوئی ایسا ہے۔ کہ سیر باطن میں اس درجہ منہمک اور مشغول ہے۔ کہ عالم خارجی کی لذتیں اس کے لیے تشویش خاطر کا موجب نہیں ہوتیں۔ یا کوئی عالم دین ہے۔ لوگوں میں تفسیر و حدیث کے فنون کی اشاعت میں معروف ہے۔ جو تربیت کے نقطۂ نگاہ سے بہت ضروری ہے۔ اور اس کی ضروریات کسی وقف وغیرہ سے پوری ہو رہی ہیں، تو ان حضرات کے لیے محنت مزدوری کرنا نہ صرف ضروری نہیں بلکہ افضل ہے۔ ان کو چاہیے کہ ایسے کاموں میں لگے رہیں۔ کیونکہ

ایسے بھی مشاغل ترقی درجات کا سبب ہونگے۔ یہی وجہ ہے۔ حضرت ابوبکر نے جب ابتداء خلافت کی باگ دوڑ ہاتھ میں لی۔ تو اس کے ساتھ گذر اوقات کے لیے اپنا کاروبار جو اچھا وسیع تھا۔ اس کو جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ لہذا صحابہ نے بجا طور پر مطالبہ کیا کہ بیت المال سے بقدر ضرورت کے ان کے لیے اہتمام کیا جائے تاکہ پوری پوری یکسوئی اور دل جمعی سے امور خلافت کو یہ انجام دے سکیں۔ اور معاش کی الجھنیں ملت و دین کی خدمت سے روکنے نہ پائیں۔ انھوں نے اس پیشکش کو قبول فرمالیا۔ مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ مرتے وقت کہہ گئے۔ جو کچھ میری ضروریات سے بچ گیا ہے۔ اس کو بیت المال میں دوبارہ داخل کردیا جائے۔

پھر یہ حضرات جن کے لیے کسب و معاش کی کھکھیڑ میں نہ پڑنا بہتر ہے۔ ان کی دو حالتیں ہیں۔ جو قابلِ غور ہیں۔ یا تو صدقات و اوقاف کی آمدنی سے انہیں ضرورت بھر مل جاتا ہے۔ اور طلب مزید کی کوئی خواہش یہ اپنے دل میں نہیں پاتے۔ تو ان کے لیے بہر حال یہی افضل ہے۔ کہ ان امور خیر کی تکمیل و اتمام میں لگے رہیں۔ اور ان مشاغل سے دست بردار نہ ہوں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ لوگ معاشرہ کی بہترین خدمات انجام دیتے ہیں۔ اور اُن سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں وہ ان کے ذمہ بمنزلہ قرض کے ہے۔ یا صورتِ حال یہ ہے۔ کہ صدقات و اوقاف کی آمدنی کافی نہیں۔ اور انھیں کبھی کبھی اغنیاء کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں انھیں ان امورِ خیر کو جاری رکھنا چاہیے یا جاری نہیں رکھنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو شریعت نے سوال کو سختی کے ساتھ رد کیا ہے۔ اور اس ذہنیت کی بڑی حد تک مذمت کی ہے۔ کہ کوئی شخص بلاوجہ دوسروں سے مانگے۔ اور دوسروں پر بوجھ اور بار ثابت ہو۔ دوسری طرف اس ضرورت کی اہمیت بھی کم درجے کی نہیں۔ کہ کچھ حضرات اپنی خدمات

کو رفاہِ عام کے لیے وقف کیے ہیں اور اپنے علم و عمل سے دوسروں کو بہرہ ور کرتے ہیں۔ لہذا یہ طے کرنا چاہیے۔ کہ کونسا طرزِ عمل اس پیچیدگی کو دور کر سکتا ہے؟ اس سوال کا کوئی بھی جواب ظاہر ہے کہ قطعی اور شافی نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے کہ ہر شخص کی نفسی حالت جُدا جُدا ہے۔ اگر کوئی دیکھتا ہے کہ جو کام وہ انجام دے رہا ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر سوال کی ذلتوں کو وہ آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔ اور اس سے اس کے نفس میں انقباض کا کوئی جذبہ نہیں ابھرتا۔ تو اسے یہ کام اور ذریعہ بغیر کسی کھٹک کے جاری رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس صورتِ حال کا تحمل اپنے میں نہیں پاتا۔ تو اُسے دست کشی اختیار کر لینا چاہیے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ہر شخص اپنا مفتی آپ ہے۔ یہ ہم اس بنا پر کہتے ہیں۔ کہ کوئی فتوے بھی تمام حالات پر یکساں منطبق ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ حالات و صور کی گونا گونی اور انسانی کیفیات کے دقائق کا یہ عالم ہے کہ ان پر ہر ایک ایک مستقل فیصلہ چاہتا ہے۔

کاروبار یا تجارت میں عدل و احسان کی اہمیت

معاملات کی وہ صورتیں جو بظاہر جائز معلوم ہوتی ہیں مگر در اصل ناجائز ہیں جیسے مثلاً احتکار

معاملات کا جو نقشہ اسلام نے تجویز فرمایا ہے۔ اس میں ظلم و جور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاملہ کی نوعیت بے ضرر دکھائی دیتی ہے۔ اور نظر بظاہر مفتی دین بھی اس کے جواز پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔ مگر معاملہ کی یہ صورت چونکہ در اصل ظلم و جور پر مبنی ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس کو جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس طرح کے معاملہ کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ اس کی تفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔

نوع اول :- کبھی کبھی بائع یہ چاہتا ہے۔ کہ غلہ یا اناج کچھ عرصہ کے لیے روک رکھے۔ تاکہ اسے اس وقت بازار میں بیچنے کی غرض سے لائے۔ جب زیادہ دام ملنے کی امید ہو۔ اصطلاح شرع میں اسے احتکار (ذخیرہ اندوزی) کہتے ہیں۔ اسلام نے روکا ہے اور اس کی شدید مذمت فرمائی ہے۔ حدیث میں ہے۔

من احتکر الطعام اربعین یوما ثم تصدق به لم تکن صدقته کفارة لاحتکاره۔ (۱)

جس نے غلہ یا اناج کا چالیس دن تک ذخیرہ کیا۔ اور پھر اس کو بطور خیرات کے لوگوں میں بانٹ دیا۔ تو یہ خیرات اس کے احتکار کا کفارہ نہیں ہو سکتی۔

---

(۱) احمد و حاکم

عبداللہ بن عمرؓ کی آں حضرت سے روایت ہے۔

من احتکر الطعام اربعین یوماً فقد برئ من اللہ وبرئ اللہ منہ۔ (۱)

جب کسی نے غلہ یا اناج چالیس دن تک روک رکھا۔ وہ سمجھ لے کہ اس نے اللہ سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ اور اللہ نے اس سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔

حضرت علیؓ اس بات کے قائل تھے۔ کہ احتکار سے قلب میں قساوت ابھر آتی ہے۔ اور انسان اپنے اصلی جوہر خیر سگالی سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک ذخیرہ اندوز کی کھیتی کو نذر آتش کر دیا۔

بعض لوگوں نے کہا کہ قرآن میں جو آیا ہے۔

ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم (حج - ۲۵)

اور جو اس میں از راہ شرارت کج روی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اسے دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

تو اس میں جو ظلم کا تذکرہ ہے۔ اس میں یہ احتکار بھی شامل ہے۔

ہمارے اسلاف احتکار کو کس حد تک برا سمجھتے تھے۔ اس کی لطیف جھلک اس قصے میں دیکھیے۔

وعن بعض السلف انہ کان بواسط فجھز سفینۃ حنطۃ الی البصرۃ وکتب وکیلہ بع ھذا الطعام

واسط کے ایک بزرگ سے روایت ہے۔ انھوں نے ایک کشتی گیہوں بار کر کے بصرہ بھیجی۔ اور اپنے وکیل کو ہدایت کی۔ کہ جس دن یہ بصرہ کے ساحل پر لنگر انداز ہو

---

(۱) احمد، حاکم۔

تدخل البصرة لا تؤخره
الى غد - فوافق سعة فى
السعر، فقال له التجار
لو اخرته جمعة ربحت
فيه اضعافه - فاخره
جمعة - فربح فيه امثاله
وكتب الى صاحبه بذالك
فكتب صاحب الطعام يا
هذا انا كنا قنعنا بربح
يسير مع سلامة ديننا
وانك قد خالفت وما نحب
ان نربح اضعافه بذهاب
شئ من الدين فقد جنيت
علينا جناية - فاذا اتاك
كتابى هذا فخذ المال كله
فتصدق به على فقراء
البصرة وليتنى انجو
من اثم الاحتكار كفافا
لا على ولا لى -

فوراً اس کو بیچ ڈالو - اور دیکھو اس
میں ایک دن کی تاخیر بھی نہ ہونے پائے
لیکن جب کشتی بصرہ پہنچی - تو اس نے
دیکھا - کہ بھاؤ میں گنجائش ہے - مقامی
تاجروں نے مشورہ دیا کہ اگلے جمعہ تک
نہ بیچو - تو منافع کئی گنا بڑھ جائے گا
چنانچہ اس نے اس مشورہ پر عمل کیا -
اور نتیجہ یہ ہوا - کہ گیہوں نہایت نفع مند
ثابت ہوا - اس نے یہ کیفیت مالک کو
لکھ بھیجی - انھوں نے جواب میں لکھا -
اے فلاں! اگر ہمارا دین سلامت
رہ جاتا، تو ہمارے لیے تھوڑا نفع بھی
بہت تھا - تم نے اس اصول کی مخالفت
کی - ہم نہیں چاہتے کہ نفع تو کئی گنا
ملے - مگر دین سلامت نہ رہے - تم
نے فی الواقعہ ہم پر زیادتی کی ہے - اس
لیے جب تمھیں ہمارا خط ملے تو اس سارے
مال کو فقرائے بصرہ میں تقسیم کر دینا -
کاش ہم اس تدبیر سے احتکار کی
معصیت سے بچ جائیں - اور برابر سرابر چھوٹ جائیں - یعنی ہم پر نہ تو کوئی ذمہ داری
عائد ہو - اور نہ ہم ثواب ہی کے امیدوار ہوں -

احتکار کا تعلق صرف غذائیات سے ہے

احتکار یا ذخیرہ اندوزی کے سلسلہ میں تین باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔
ایک یہ کہ اجناس کے اعتبار سے اس میں عموم یا کلیت نہیں۔ دوسرے یہ کہ وقت کا مسئلہ غور طلب ہے۔ یعنی اس سے صرف وہ چیزیں مراد ہیں۔ جو عموماً انسانی غذا کے کام آتی ہیں۔ اور جن سے پیٹ کے خلا پُر کیے جاتے ہیں۔ جائیں۔ جڑی بوٹیاں اور مقویات اس میں شامل نہیں۔ البتہ کھانے کی وہ چیزیں جو بعض حالات میں غذا کا کام دیتی ہیں جیسے گوشت اور پھل وغیرہ تو ان کو بھی بعض کی رائے میں اسی میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بعض فقہاء نے اس بنا پر گھی، شہد، پنیر اور روغن زیتون کے احتکار کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔
وقت اور زمان کے مسئلہ کے یہ معنی ہیں کہ ان کے معاملہ میں بھی عموم و کلیت کا خیال نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس احتمال کی بھی گنجائش رہنے دی جائے۔ کہ شائد شارع کا مقصد ایامِ قحط میں ذخیرہ اندوزی سے روکنا ہے۔ یا ان حالات میں اس حریصانہ عمل سے باز رکھنا ہے۔ جب اشیاء کی سخت قلت ہو۔ اور اندیشہ ہو کہ مبادا ذخیرہ کرنے سے معاشرہ کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن اگر یہ صورتِ حال نہ ہو۔ بلکہ تمام کھانے پینے کی چیزیں فراوانی سے مل جاتی ہوں۔ اور کسی شخص کے احتکار سے ضرر و اضرار کا خطرہ نہ ہو۔ تو ظاہر ہے۔ کہ یہ فعل نہی کے دائرہ میں نہیں آئے گا۔

احتکار کے بارہ میں اصل اصول ضرر و اضرار ہے کیا غذائیات کی تجارت مستحسن نہیں؟ ایک دلچسپ دلیل

غرض یہ ہے کہ اس باب میں اصل اصول ضرر و اضرار ہے۔ اگر کسی اقدام سے معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ اور لوگوں کو اس کی وجہ سے پریشانی

لاحق ہوتی ہے۔ تو یہ ناجائز ہے۔ یہی نہیں۔ وہ تمام اقدامات بھی ناجائز ہیں۔ جن سے ضرر و اضرار کو بالواسطہ کسی درجہ میں بھی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ جو شے مرنی لنفسہ ناجائز ہے۔ اس کے مبادی اور وہ کڑیاں بھی ناجائز متصور ہوں گی۔ جو آخر آخر میں اس پر منتج ہوتی ہیں۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر ہم تو یہ کہیں گے۔ کہ اجناس خوردنی کی بجائے خود تجارت ہی مستحسن نہیں۔ اس پر ہماری دلیل یہ ہے کہ اجناس خوردنی کا تعلق اولِ حیات سے ہے۔ اور تجارت ان چیزوں میں ہونا چاہیے۔ جو زوائد و حیات کے حکم میں ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف ایک تابعی نے اشارہ کیا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

لا تسلم ولدك في بيعتين ولا في صنعتين بيع الطعام و بيع الاكفان فانه يتمنى الغلاء و موت الناس۔ و الصنعتان ان يكون جزاراً۔ فانها صنعة تقسي القلب او صواغاً فانه يزخرف الدنيا بالذهب و الفضة۔

اپنے لڑکے کو نہ دو قسم کے کاروبار میں ڈال اور نہ دو قسم کی صنعتوں کا خوگر بنا۔ وہ دو کاروبار یہ ہیں۔ ایک اجناس خوردنی کی تجارت اور ایک کفن فروشی۔ کیونکہ ان میں پہلے کاروبار کا تقاضا یہ ہے کہ انسان گرانی کی تمنا کرے۔ اور دوسرا مشغلہ یہ چاہتا ہے۔ کہ یہ لوگوں کی موت کا منتظر رہے۔ جن دو صنعتوں سے روکنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہیں۔ ایک قصاب ہونا۔ دوسرا سنار بننا۔ اس لیے کہ پہلا شخص تو قساوتِ قلبی کا شکار ہو جائے گا۔ اور دوسرا دنیا کو سونے چاندی کے تکلفات سے دل فریب بنانے میں مدد دے گا۔

تزئیف یا کھوٹا سکہ چلانا اجتماعی معصیت کے مترادف ہے

نوع ثانی :۔ کچھ لوگ کھوٹے سکے کی ترویج میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے انھیں معلوم ہونا چاہیے۔ کہ ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ کیونکہ یہ حرکت صرف ایک آدمی کی غلطی تک محدود نہیں رہتی۔ اور یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ یہ سلسلہ بڑھتا ہے۔ اور ایک شخص کی لغزش اُن تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ جو اس میں ملوث ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ان تمام لوگوں کے گناہ میں کہ جنھوں نے کھوٹے سکہ کو چلایا اس شخص کا بھی حصہ ہے۔ جس نے اس کا آغاز کیا۔ آں حضرت کا ارشاد ہے۔

من سن سنۃ سیئۃ	جس شخص نے کسی بُرائی کی طرح ڈالی
فعمل بہا من بعدہ کان	اور اس پر عمل پیرا ہوا۔ پھر اس کے بعد
علیہ وزرہ ومثل	آنے والوں نے بھی اس پر عمل کیا۔ تو اس
من عمل بہا لا ینقص من	گناہ کا حصہ اس کو بھی پہنچتا رہے گا اگرچہ
اوزارھم شیئا۔	بعد میں اس بُرائی کو اپنانے والوں کے
	گناہ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

بعض فقہاء کا کہنا ہے۔ کہ ایک کھوٹا درہم چلانا، سو درہم چُرانے سے کہیں بُرا ہے۔ کیونکہ چوری تو ایک ایسی معصیت ہے جو سرزد ہوئی اور ختم ہوئی مگر کھوٹے سکے کا منحوس چکر کبھی بھی ختم ہونے والا نہیں۔ لہٰذا جب تک اس کی گردش لوگوں میں رہے گی۔ یہ شخص جس نے پہلے پہل اس کا ارتکاب کیا۔ معصیت و گناہ کی مضرتوں سے اپنا دامن بھرتا رہے گا۔ اور اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی میں اضافہ کرتا رہے گا۔ قرآن حکیم میں ہے۔

ونکتب ما قدموا	اور جو کچھ وہ آگے بھیج چکے۔ اور جو

وَ اٰثَارَھُمْ ۔ ان کے نشان جو پیچھے رہ گئے، اُن کو قلمبند کرتے ہیں۔ (یٰسٓ ۔ ۱۲)

معصیت کی اس شکل سے بچنے کی چند تدابیر ہیں۔ جنھیں قطعی اختیار کرنا چاہیے۔

(۱) جب کسی شخص کو معلوم ہو۔ کہ اس کی نقدی میں کچھ کھوٹے سکے بھی شامل ہو گئے ہیں۔ تو انھیں الگ کرے، اور ایسے گہرے کنوئیں میں پھینک دیے جہاں سے پھر کوئی نکال کر استعمال نہ کر سکے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کو ناقابلِ استعمال بنا دے۔

(۲) اسے بحیثیت تاجر کے ان تمام علائم و جزئیات کا اچھی طرح علم ہونا چاہیے۔ جو کھوٹے سکے سے متعلق ہیں۔ اس لیے نہیں کہ خود اس ضرر سے محفوظ رہے۔ بلکہ اس لیے کہ اسلامی معاشرہ کو اس خسارہ سے بچا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف دوسرے علوم کے پہلو بہ پہلو "علاماتِ نقد" کا جاننا بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ دنیا طلبی کے ادنے داعیہ سے مجبور و متاثر ہو کر نہیں۔ اس وجہ سے کہ اسلامی معاشرہ کی خدمت بجا لا سکیں۔ اور اپنی عقبےٰ استوار سکیں۔

(۳) اول تو کھوٹے سکے قبول ہی نہ کرے۔ کیونکہ قبول کرنے کے معنی ہی یہ ہیں۔ کہ یہ ان میں رواج دینا چاہتا ہے۔ لیکن اگر قبول کرنا ہی پڑے تو اس جذبہ کے تحت کہ چند سکوں کی خرابی سے اصل معاملہ میں کوئی پیچیدگی نہ پیدا ہونے پائے۔ اور نفس پہلے ہی مسخ نہ ہو جائے۔ یعنی اس میں بہرحال ایک مسلمان کی سہولت مدنظر رہنا چاہیے۔

حدیث میں ہے۔

رحم اللہ امرءً ۔ اللہ تعالےٰ اُس شخص پر اپنی رحمتیں

سهل البیع سهل الشراء نازل کرتا ہے، جو بیع، شراء، قضاء، اور
سهل القضاء سهل الاقتضاء طلب کے معاملہ میں سہولت سے کام لیتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے۔ کہ اسلامی نقطہ نظر سے تزئیف یا کھوٹے سکے کو رواج دینا معمولی لغزش نہیں۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے۔ اس سے فساد وانہ بگاڑ کی آگ کو ہوا دینا مقصود ہے۔ یہ عند اللہ انتہائی بڑا گناہ ہے۔ جتنا اس شخص کا کہ جو شراب کشید کرنے والوں کے ہاتھ انگور بیچتا ہے۔ اور یہ جانتا ہے کہ یہ اس سے شراب بنائیں گے۔

کاروبار بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس میں شرعی نزاکتوں کا خیال رکھتا ہے۔ تو اس کا درجہ ایک رسمی عابد سے کہیں بہتر ہے۔ ہمارے بزرگ اس چیز کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ کہ معاملات میں کہیں گڑ بڑ نہ ہونے پائے۔

ایک مجاہد کا کہنا ہے۔ ایک مرتبہ سلسلہ جہاد میں جب کہ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ اور ایک کافر کا کام تمام کرنا چاہتا تھا۔ اس نیت سے جو حلہ بولا تو گھوڑے نے ساتھ نہ دیا۔ اور وہ کافر صاف بچ کر نکل گیا۔ اتفاق سے دوبارہ اس کا سامنا ہوا۔ میں نے ارادہ کی تکمیل کرنا چاہی۔ مگر اس مرتبہ بھی گھوڑا عین حملہ کے وقت بدکا۔ اور پیچھے ہٹ گیا۔ کافر میری زد سے بچ کر نکل گیا۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بے حد افسوس ہوا۔ اس لیے کہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہو پایا تھا تیسری مرتبہ پھر تلاش کر کے حریف کو نرغہ میں لیا۔ اب چاہتا تھا کہ ایک وار میں اس کی گردن اڑا دوں۔ کہ گھوڑے نے پھر دھوکہ دیا۔ ناچار ملول وافسردہ واپس لوٹا۔ اپنے خیمے میں اسی فکر میں پریشان بیٹھا تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ گھوڑا مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے۔

صاحب! ایک طرف تو آپ کافر کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ اور اس کو ختم کر دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ دوسری طرف دیانتداری کا یہ عالم ہے کہ کل آپ نے جو گھاس خریدی۔ اور اس کے عوض پیسے دیے۔ اس میں ایک کھوٹا سکہ بھی شامل تھا۔ ان حالات میں مجھ سے اس کی توقع نہ رکھیے کہ آپ کا ساتھ دوں گا۔

یہ قصہ ہی نہیں۔ اس میں قابلِ لحاظ یہ نکتہ ہے۔ کہ اس طرح کی لغزشوں کا اثر کس درجہ وسیع اور دور رس ہوتا ہے۔

فریقِ معاملہ کے حقوق

عدل وانصاف کا منطقی پیمانہ یا کسوٹی۔ بیع کی چار شرطیں

کاروبار یا تجارت میں اصل اصول یا اسلامی روح تو یہ ہے کہ فریقِ معاملہ کو کسی نوع کا نقصان نہ پہنچنے پائے۔ اور عدل وانصاف کو شعار ٹھہرایا جائے۔ لیکن کیا چیز منصفانہ ہے۔ اور کیا منصفانہ نہیں ہے؟ اس کو طے کرنے کا کیا پیمانہ ہے۔ یہ ہے بنیادی سوال جس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم معاملہ کی اس نوعیت کو اپنے لیے بھی پسند کرتے ہو جس کو تم دوسروں کے لیے روا رکھ رہے ہو تو تمھارا معاملہ منصفانہ اور مبنی بر عدل ہے ورنہ نہیں۔

ایک بزرگ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے۔ فرض کرو تم ایک چیز ایک درہم میں بیچ رہے ہو۔ لیکن اگر اسی چیز کو تمھیں اپنی ضرورت کے لیے خریدنا پڑے۔ تو تم پانچ دانق سے زیادہ دینے پر آمادہ نہ ہو سکو۔ یہ صریحاً ظلم اور ناانصافی ہے۔ اور یہ خیر سگالی کے اس اصول کے منافی ہے۔ جس کی اسلام نے تلقین کی ہے۔ اور جس کی ہر مسلمان مسلمان سے بجا طور پر توقع رکھتا ہے۔

یہ تو ہوا اصول۔ تفصیلات چار متعین خانوں میں منقسم ہیں۔

اپنے مال کی بے جا تعریف نہیں کرنا چاہیے

(۱) اپنے مال کی بے جا تعریف نہ کرے صحیح صحیح وزن بتائیے

اور مقدار و کمیت کے بارے میں کسی غلط بیانی سے کام نہ لے۔ نیز وہی بھاؤ بتائے جو بازار میں متعارف ہو۔ تاکہ خریدار کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔ اسی طرح اگر مال میں کچھ عیوب ہوں۔ تو اُن کو بھی صاف صاف بیان کر دے۔

یہ چیزیں ہم اس بنا پر کہہ رہے ہیں۔ کہ اگر ایک شخص نے اپنے مال کی ناحق تعریف کی۔ تو اُس نے گویا جھوٹ بولا۔ اور خریدار پر ظلم کیا۔ علاوہ ازیں یہ حرکت تقاضائے مروت کے بھی خلاف ہے۔ بیچنے والے کو ہمیشہ اس حقیقت کو نظر و بصر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ کہ اس کے مُنہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ محاسبہ کی غرض سے لکھا اور تولا جاتا ہے۔

ما يلفظ من قول الا — کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی
لديه رقيب عتيد۔ (ق۔ ۱۰) — مگر ہم اس کو لکھ لیتے ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بائع اپنے مال کی عمدگی اور خوبیوں کا یقین دلانے کے لیے قسم کا حربہ استعمال نہ کرے۔ کیونکہ اگر قسم جھوٹی ثابت ہوئی تو یہ یمین غموس کا ارتکاب ہوگا۔ اور یہ ارتکاب وہ کبیرہ گناہ ہے۔ کہ جس کی ہلاکت آفرینی اکثر شہروں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لینے والی ہے۔ اور اگر یہ قسم سچی ثابت ہوتی ہے۔ تب بھی بے محل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نام اس سے کہیں زیادہ احترام کا مستحق ہے۔ کہ اس کو دنیائے دنی کا ذریعہ بنایا جائے۔

حدیث میں ہے۔

ثلاثة لا ينظر الله اليهم يوم القيامة۔ عتل مستكبر و منان بعطيته و منفق سلعته

تین ایسے اشخاص ہیں۔ جن پر اللہ تعالیٰ نظرِ کرم نہیں ڈالے گا۔ سرکش و متکبر احسان جتانے والا۔ اور ایسا شخص کہ جو قسمیں کھا کھا کر مال بیچتا ہے۔

بیہقی۔ (۱)

صحیح تعریف بھی اولیٰ نہیں حضرت یونس بن عبید کی احتیاط — یہی نہیں کہ جھوٹی قسم نہ کھانا چاہیے۔

اور بے جا تعریف نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ صحیح تعریف بھی کچھ رزق میں اضافہ کا موجب نہیں ہوتی۔ حضرت یونس بن عبید کا واقعہ مطالعہ کے لائق ہے۔ یہ حضرت ریشم کے تاجر تھے۔ ایک مرتبہ ایک گاہک کے لیے غلام سے تھان لانے کو کہا اُس نے تھان لاکر گاہک کے سامنے پھیلا دیا اور کہا۔

اللھم ارزقنا الجنۃ۔ پروردگار ہمیں جنت سے بہرہ ور کر۔

یونس بن عبید سمجھے۔ کہ یہ بھی ایک انداز توصیف ہے۔ لہذا غلام سے کہا اسے تہہ کر کے رکھ دو۔ ہم نہیں بیچیں گے۔

اللہ اللہ کیا احتیاط اور تقویٰ ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں۔ جو دنیا کے کاروبار میں آخرت کی منفعتوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ بلکہ ہمیشہ کاروبار پر اس نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں۔ کہ آخرت کی منفعتیں زیادہ بیش قیمت ہیں۔

مگر یہ نقطۂ نظر پیدا ہونا آسان نہیں۔ یہ اُس وقت لوحِ قلب پر مرتسم ہوتا ہے۔ جب انسان اچھی طرح جان لے کہ دھوکہ اور تلبیسات سے جمع کیے ہوئے اندوختے میں برکت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور یہ کہ عین ممکن ہے اس نوعیت کا مال کسی ایک ہی حادثہ کی نذر ہو جائے۔ اور اس طرح ایسے شخص کو اللہ کی طرف سے اس کے کیے دھرے کی سزا مل جائے۔ اور وہ اس لائق ہی نہ رہے۔ کہ حرام کے اندوختہ سے بہرہ مند ہو سکے۔

---

(۱) بیہقی۔

مبیع کے تمام عیوب بیان کردینا چاہییں دھوکہ کی مختلف صورتوں کا واقعاتی تجزیہ اور سلف کی احتیاطیں

(۱) مبیع کے تمام عیوب بلاکم و کاست بیان کر دے۔ اور خریدار سے واضح طور پر کہہ دے۔ کہ اس کے مال میں فلاں فلاں نقص پایا جاتا ہے کیونکہ مسلمان کے لیے ہر حال میں ضروری ہے کہ خیر سگالی اور نصیحت کے جذبات عالیہ سے عاری نہ ہونے پائے۔ لیکن اگر اس نے اپنے بھائی کو ان عیوب کی اطلاع نہیں دی۔ اور ناقص مال اس کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ تو اس کے یہ معنیٰ ہیں۔ کہ اس نے دھوکہ دیا۔ اور خیر خواہی و خیر سگالی کے تقاضوں کی مخالفت کی۔

دھوکہ کی کئی صورتیں ہیں۔ کسی چیز کا ایک ہی رُخ دکھانا، یا نسبتہً کم روشنی میں گاہک کے سامنے مال پیش کرنا۔ یا اگر ایک فرد کی دو تہیں ہیں تو ان میں صرف عمدہ تہ دکھانے پر اکتفا کرنا، اور ناقص تہ دکھانا۔ یہ سب شکلیں فریب کے دائرہ میں داخل ہیں۔ حدیث میں ہے۔

انه مر عليه الصلوٰة والسلام برجل يبيع طعامًا فاعجبه فادخل يده فيه فرأى بللاً فقال ما هذا؟ قال اصابته السماء۔ فقال هلا جعلته فوق الطعام حتى يراه الناس من غشنا فليس منا۔ (۱)

آں حضرت کا غلہ کے ایک ڈھیر پر گذر ہوا۔ جو بظاہر عمدہ دکھائی دیتا تھا۔ مگر آپ نے اس میں ہاتھ ڈال کر جو دیکھا تو اس میں نمی محسوس کی۔ اس پر آپ چونکے کہ اس میں نمی کیسی ہے؟ اس نے کہا حضور! بارش کے کچھ چھینٹے پڑ گئے تھے۔ فرمایا تو اس کو تو اوپر رکھنا چاہیے تھا۔ تاکہ سب دیکھ سکیں نہ یہ کہ چھپا کر رکھا جائے۔ یاد رکھو جو ہمیں

---

(۱) مسلم۔

دھوکہ دیتا ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

آں حضرت کا معمول تھا کہ جب تاجروں سے بیعت لیتے۔ تو صاف صاف کہہ دیتے کہ خریداروں کے معاملہ میں خیراندیشی سے کام لینا ہوگا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کاروبار میں خصوصیت سے اس کا خیال رکھتے۔ حضرت جریر بن عبداللہ کے متعلق مشہور ہے۔ جب کوئی چیز بیچتے تو تمام عیوب کی نشاندہی فرما دیتے۔ اور گاہک سے کہہ دیتے ہیں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب خریدنا یا نہ خریدنا تمھارے اختیار میں ہے۔ لوگوں نے کاروبار کے اس انداز پر ٹوکا۔ اور کہا۔ کہ اگر آپ اسی طرح گاہکوں کو بدظن کرتے رہے تو تجارت ہوچکی۔ اُن کا ایک ہی جچا تلا جواب ہوتا۔ بھائی!

انا بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی النصح لکل مسلم۔

ہم آں حضرت کے دست حق پرست پر اس بات کا عہد کرچکے ہیں۔ کہ ہر ہر مسلمان کی خیر خواہی ملحوظ رہے گی۔

لہذا ہم سے کم از کم اس کے سوا کی امید نہ رکھو۔

واثلہ بن اسقع کا اونٹ اُن کے سامنے ایک صاحب نے تین سو درہم میں بیچ ڈالا۔ خریدار اونٹ لے کر تھوڑی دور ہی گیا ہوگا۔ کہ انھوں نے جالیا۔ پوچھا تم نے اونٹ گوشت کی غرض سے خریدا ہے یا سواری کے لیے۔ اس نے کہا۔ سواری کے لیے۔ کہا۔ اس کے پاؤں میں خلل ہے۔ اس وضاحت کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اصل قیمت میں سے بقدر ایک سو درہم کم کرنا پڑا۔ ظاہر ہے یہ خسارہ کا سودا تھا۔ مگر ان کو یہ خسارہ اس بنا پر منظور تھا۔ کہ آں حضرت نے اس کی تلقین کی تھی۔ چنانچہ جب اُن کے وکیل نے اس حرکت پر اعتراض کیا۔ تو آپ نے یہ حدیث پڑھ دی۔

لا يحل لاحد يبيع بيعاً الا ان يبين آفته ولا يحل لمن يعلم ذالك الا تبيينه

کسی شخص کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ بغیر نقص بتائے اور عیب جتلائے مال بیچ ڈالے۔ اسی طرح کسی کے لیے روا نہیں کہ وہ عیوب پر پردہ ڈالے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ کہ ہمارے اسلاف، خیر سگالی اور خیر اندیشی کو کس درجہ ضروری قرار دیتے تھے۔ اور یہ کہ ان کے ہاں اس کا مفہوم کیا تھا؟ ان کی رائے میں یہ جذبہ اس اصول پر مبنی تھا۔ کہ جو بات اپنے لیے پسند نہیں ہے۔ وہ دوسروں کے لیے بھی زیبا نہیں۔

اسلاف کے نقطۂ نظر سے کاروبار میں یہ احتیاط صرف ازدیادِ درجات کی غرض سے نہ تھی۔ بلکہ یہ حضرات اس کو اسلام کی ایک ضروری شرط قرار دیتے تھے اس سلسلہ میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے۔ کہ ان کے نزدیک خیر خواہی و خیر اندیشی کا یہ جذبہ، صرف مستحسن و مستحب ہی نہ تھا اور اس کی صرف یہی حیثیت نہ تھی۔ کہ اس سے فضائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ یا درجات و مقامات میں ترقی ہوتی ہے۔ بلکہ معاملہ کی سب سے ضروری اور لازمی شرط یہی تھی۔ اور ان کے اسلام لانے اور آں حضرت کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے سے جو فرائض ان پر عائد ہوتے تھے۔ ان میں ایک فرض یہ بھی تھا۔ کہ لوگوں سے ان کا معاملہ بہر حال خیر خواہی و خیر سگالی کے اصول پر مبنی ہو گا۔ اور کسی صورت میں بھی کسی کو دھوکہ نہیں دیں گے۔

اس اصول پر عمل کرنا کتنا دشوار ہے۔ اور اس کو روزمرہ کی کاروباری زندگی میں برت کر دکھانا کس درجہ مشکلات لیے ہوئے ہے۔ اس کا اندازہ

اِس سے کیجیے۔ کہ بعض کوتاہ ہمت صوفیوں نے اعتزال و خلوت کی راہ محض اس بنا پر اختیار کی اور زندگی کے تقاضوں سے صرف اس لیے مُنہ موڑ لیا کہ معاملات کی ذمہ داریاں اُن کے دامن عمل کو کہیں داغدار نہ کر دیں۔ اور اُن کی دیانت اور پاکیزگی نیت کو معرض خطر میں نہ ڈال دیں۔ حالانکہ دیانتداری اور خیر سگالی کا تقاضا تو اسی امتحان و آزمائش کا طالب ہے۔ یعنی دیکھنا تو یہ ہے۔ کہ آیا کوئی شخص معاشرہ میں رہ کر اس کی دشواریوں اور پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ آیا یہ اختلاط، یہ میل جول، یہ کاروبار حیات اور یہ احتیاجیں اس کے پائے عمل میں لغزش پیدا کرتی ہیں۔ یا ثبات و عزیمت کا پیکر ثابت ہوتا ہے ماننا پڑے گا کہ اس مقام کا حصول آسان نہیں۔ یہ مقام حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی رعایت چاہتا ہے۔ جو صدیقیت کا وہ درجہ ہے جو بہت ہی کم لوگوں کو میسر ہے۔ اس مقام کو پانے اور اس درجہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دو چیزیں نہایت ضروری ہیں۔

کاروبار میں مقام صدیقیت کے حصول کی دو شرطیں۔ برکت سے مراد ریاضیاتی برکت نہیں

اوّل:۔ یہ کہ انسان اس حقیقت پر یقین رکھے کہ تلبیس عیوب، فریب اور دھوکہ سے نفس رزق میں کوئی اضافہ نہیں ہو پاتا۔ بلکہ ایسا رزق جو ان ذرائع سے حاصل ہو۔ برکت سے قطعی محروم رہتا ہے۔ اور بسا اوقات کسی ایک ہی حادثہ میں فنا و ہلاکت کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔:

ید اللہ علی الشریکین	دو شریک جب تک خیانت کے مرتکب
ما لم یتخاونا فاذا تخاونا	نہیں ہوتے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا دست شفقت
دفع یدہ عنھما۔	رہتا ہے اور جہاں انھوں نے خیانت کی۔ اللہ کی

تائید واعانت نے ہاتھ اٹھالیا۔
مگر برکت کی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے وہ ریاضی کام نہیں دیتی۔ اور وہ پیمانے مدد نہیں کرتے، جو عام کاروبار میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کا پیمانہ اس چیز پر ایمان لانا ہے۔ کہ ایک درہم جو جائز طریق سے حاصل ہوا ہے۔ اُن ہزارہا دراہم پر بھاری ہے۔ جو ناجائز طریق سے حاصل ہوتے ہیں۔

ثانی:۔ اس عقیدہ کو بھی حرزِ جاں بنانا لازمی ہے۔ کہ عقبیٰ و آخرت کی نفع مندیاں دنیا کی بہرہ مندیوں سے کہیں بہتر ہیں۔ کیونکہ دنیا کے فوائد ختم ہونے والے ہیں اور آخرت کی بہرہ مندیاں ختم ہونے والی نہیں۔

ممکن ہے کوئی صاحب یہ کہیں کہ جہاں تک معاملات بیع و شرار کا تعلق ہے اپنے مال کے عیوب، صاف صاف جتا دینا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس طرح خریدار کو آمادہ کیونکر کیا جائے گا۔ اور اس کے دل میں، اس مال کے بارہ میں رغبت وطلب کے جذبات کو کیونکر اکسایا جائے گا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ صورت حال یہ نہیں۔ بیع و شرا میں پہلی شرط مال کا عمدہ ہونا ہے۔ اگر خود اُسے خریدنا پڑے تو بغیر کسی تکدرِ خاطر اور اظہارِ تاسف کے خرید لے۔ عیوب جتا دینے سے صرف نفع کی مقدار کچھ کم ہوتی ہے۔ دام نسبتاً کم ملتے ہیں۔ یہ نہیں کہ سرے سے مال بکتا ہی نہیں۔ اگر انسان اپنے کو قلیل مگر جائز و طیب آمدنی کا خوگر بنالے۔ اور اس پر خوش ہو کہ اس کی خواہشات کا سلسلہ حرام و ناجائز کی حدود تک دراز نہیں ہوا، تو معاملات کی صفائی گراں نہیں پڑتی۔ یہی نہیں قلیل اور کم نفع برکت و سعادت کا ایسا ذریعہ بن جاتا ہے جس پر اس کو فخر ہوتا ہے۔ دراصل تلبیسِ عیوب سے لوگ اس لیے کام لیتے ہیں۔ کہ ان میں قناعت نہیں۔ قلیل آمدنی

پر گذر کرنے کی صلاحیت نہیں۔ مزید برآں جب یہ دیکھتے ہیں۔ اکثر کاروبار کرنے والے ان باریکیوں کا خیال نہیں رکھتے۔ تو ان میں بھی ایک طرح کی بے خوفی اور دلیری آجاتی ہے۔ جہاں تک ہمارے اسلاف کا تعلق ہے۔ ان کا وتیرہ ہرگز یہ نہ تھا۔ کہ بغیر عیوب جتائے کوئی چیز بیچیں۔ اور نفع کثیر کی لالچ میں اپنی عقبیٰ بگاڑ لیں۔ چنانچہ ابن سیرین ایک مرتبہ اپنی ایک بکری بیچنے پر مجبور ہوئے۔ تو اُن کو خریدار سے کہنا پڑا۔ کہ اس میں چارہ بکھیر دینے کی عادت ہے۔ اسی طرح حسن بن صالح نے اپنی ایک لونڈی الگ کرنا چاہی۔ تو اُنھوں نے بھی خریدار کو بتا دیا۔ کہ ایک مرتبہ اس کے نتھنوں سے خون نکلا تھا۔

غرض یہ ہے کہ کاروبار میں اس نوعیت کی صفائی ضروری ہے۔ اس لیے دین سے لگاؤ رکھنے والے حضرات کو چاہیے کہ اس کا اچھی طرح خیال رکھیں ورنہ یا تو کاروبار سے دست کش ہو جائیں۔ اور یا پھر اپنے نفس وضمیر کو عذاب آخرت کے شدائد پر مطمئن کریں۔ تیسری کوئی صورت نہیں۔

تول اور وزن میں ہمیشہ تقاضائے دیانت کو ملحوظ رکھنا چاہیے

(۳) خیرسگالی و خیرخواہی کا تقاضا یہ بھی ہے۔ کہ تول اور وزن میں ذرہ برابر کمی روا نہ رکھی جائے۔ قرآن میں ہے۔

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون و اذا کالوھم او وزنوھم یخسرون۔

(المطففین ـ ۳)

ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔ جو لوگوں سے ناپ تول کریں تو پورا پورا لیں۔ اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔

مگر ناپ تول میں پورا پورا انصاف ممکن نہیں۔ اس لیے اس ذمہ داری سے

عہدہ برآ ہونے کی ایک ہی صورت ہے - وہ یہ ہے کہ جب دوسروں سے کوئی چیز خریدے - تو مقدار اور وزن میں قدرے کمی گوارا کرلے - لیکن جب بیچے تو قدرے زیادہ دے - تاکہ ظلم وجور کے ارتکاب سے دامن بچائے رہے - یہ ہم اس بنا پر کہہ رہے ہیں - کہ اگر اس نے اپنا حق پورا پورا لینا چاہا - اور اس سلسلہ میں ذرا بھی بہانہ آرائی سے کام لیا - تو اندیشہ ہے - کہ اس سے ظلم سرزد نہ ہونے پائے یہی وہ احتیاط ہے جو حاصل دین ہے - آں حضرت نے ایک مرتبہ کوئی چیز خریدی - اور جب قیمت دینے کی نوبت آئی - تو وزن کرنے والے سے فرمایا -

زن و ارجح — تول کر دو - مگر پلڑا قدرے جھکا ہوا رہے

یہی طرز عمل بزرگان دین نے اختیار کیا - مگر کس احتیاط کے ساتھ - اس کا اندازہ حضرت فضیل کے فرزند ارجمند کی اس عادت سے کیجیے - یہ جب کسی کو اشرفیاں دیتے تو اچھی طرح مانجھ لیتے - تاکہ میل کچیل سے اصلی وزن بڑھ نہ جائے -

تطفیف کا لفظ عام ہے اس میں تمام انسانی اعمال آجاتے ہیں -

تطفیف کا اصول صرف ناپ تول ہی سے مخصوص نہیں
اس میں اخلاق اور معاملات کی تمام صورتیں داخل ہیں

کیونکہ ہر ہر عمل کا ایک شرعی عمل و دینی اندازہ ہے - اور ہر ہر کام کی ایک مقررہ حد ہے - جس سے سر مو تجاوز جائز نہیں - البتہ اگر کسی نے قول وفعل اور نیات و خطرات کے معاملہ میں کہیں عدل وانصاف سے منہ موڑا - اور اللہ تعالیٰ کے حقوق اطاعت میں کوتاہی کی - تو اُسے اس ویل اور خرابی کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ جس کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے -

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے - کہ تطفیف کا تعلق صرف ناپ تول کی کمی

بیشی ہی سے نہیں۔ بلکہ تمام قسم کے اندازوں اور پیمانوں سے ہے۔ حتیٰ کہ اس میں وہ قصاب بھی داخل ہے۔ جو گوشت کے ساتھ ہڈیاں بھی تول دیتا ہے۔ بشرطیکہ عرف و معاشرہ میں ہڈیوں کو گوشت میں شمار نہ کیا جاتا ہو۔ اور گوشت سے مراد گوشت ہی ہو۔ ہڈیاں نہ ہوں۔ اسی طرح وہ بزاز بھی شامل ہے۔ جو دوسروں سے گز کے حساب سے کپڑا لے۔ تو ڈھیلا چھوڑ دے۔ تاکہ زیادہ آئے۔ اور دے تو کس کر دے۔ تاکہ کم دینا پڑے۔

مقررہ بھاؤ سے زیادہ دام وصول نہیں کرنے چاہییں

(۴) مسلمان کا دوسرے مسلمانوں سے جو برادرانہ تعلق ہے۔ اور باہمی ہمدردی اور خیر خواہی کا جو دینی رشتہ ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ کہ جب کوئی چیز بیچے تو بازار کے بھاؤ سے زیادہ وصول نہ کرے۔ پہلے سے گاہک کو بتا دے۔ کہ اس مال کی رائج الوقت قیمت یہ ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آں حضرت نے "تلقی رکبان" سے منع فرمایا ہے۔ اور نجش سے روکا ہے۔

"تلقی رکبان" یہ ہے کہ کوئی شخص، سوداگروں سے شہر میں پہنچنے سے پہلے ہی مل لے۔ اور اُن کی ناواقفیت سے فائدہ اُٹھا کر سودا پکا کرے۔ حالانکہ قاعدہ کی رو سے اُن کا حق ہے۔ کہ پہلے شہر میں پہنچکر بازار میں رائج قیمتوں کا جائزہ لیں۔ اور اپنے مال کو اُن قیمتوں کی روشنی میں جانچیں۔ پھر جب اپنے مال کی صحیح صحیح قیمت سے آگاہ ہو جائیں۔ تب اُس کو دوسروں کے ہاتھ بیچیں۔ بائع کا یہ حق اس درجہ مسلمہ ہے۔ کہ اگر کوئی تلقی رکبان، کا ارتکاب کرے۔ اور بازار میں پہنچنے سے پہلے سودا کر لے۔ تو گو یہ بیع شرعاً منعقد

ہو جائے گی۔ تاہم بائع کو فسخ کا اختیار ہوگا جس کا یہ مطلب ہے۔ کہ اگر وہ دیکھے گا۔ کہ اُسے غلط معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ تو وہ اس سودے کو کالعدم قرار دے سکتا ہے۔

"نجش" کے معنی عام فریب کاری اور دھوکہ کے ہیں۔ اس میں وہ تمام صورتیں آجاتی ہیں۔ جن میں گاہک کی سادہ لوحی اور لاعلمی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ خصوصیت سے اس کا اطلاق اس صورت پر ہوتا ہے۔ کہ بائع کوئی مصنوعی گاہک پیدا کرے۔ جو زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے پر رضامند ہو۔ مقصد خود خریدنا نہ ہو۔ بلکہ خریداری کے لیے دوسروں کو آمادہ کرنا ہو۔ اور وہ بھی مُنہ مانگے داموں پر۔ اس صورت میں چونکہ خریدار گھاٹے میں رہتا ہے۔ اس لیے اگر ثابت ہو جائے۔ کہ یار لوگوں نے اُس کو دھوکہ دیا ہے۔ تو اُس کو بھی خیارِ استرداد حاصل ہے۔

معاملہ کی اس صورت کو بھی آں حضرت نے ممنوع ٹھہرایا ہے۔ کہ کوئی شہری، دیہات سے آنے والے تاجروں کے مال کو خصوصًا اناج کو یہ کہہ کر روک لے۔ کہ تمھیں زیادہ دام دلواؤں گا۔ غرض یہ ہو کہ جب تک قیمتیں چڑھنا شروع نہ ہوں۔ اور موجودہ سطح سے اوپر نہ اُٹھیں۔ اُس وقت تک اُس کو بیچا نہ جائے۔

معاملہ کی اس صورت میں بھی چونکہ عوام تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور ان چیزوں کے ہوتے ساتے زحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس کو شریعتِ اسلامی نے جائز نہیں رکھا۔

ایک تابعی کا قصہ ملاحظہ ہو، کیا تقویٰ اور احتیاط ہے۔ یہ حضرت سکّہ کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے غلام نے جو ان کا وکیل تھا۔

لکھا ۔ کہ اب کی فصل اچھی نہیں ہوئی ۔ اس لیے شکّر کا ذخیرہ کر لینا مناسب ہے ۔ چنانچہ اس نصیحت کے پیشِ نظر شکّر کی بہت بڑی مقدار خرید لی ۔ اور جب بیچی تو معلوم ہوا ۔ کہ معمول سے کوئی تیس ہزار دینار زیادہ ہاتھ لگے ہیں ۔ اب ایک طرف اتنی معقول رقم تھی ۔ جس سے دست بردار ہو جانا ہرگز آسان نہ تھا ۔ اور دوسری طرف یہ خلشِ قلب وضمیر کو پریشان کر رہی تھی ۔ کہ میں نے خیرسگالی اور خیر خواہی کا ثبوت نہیں دیا ۔ مقصد یہ تھا کہ شکّر خریدتے وقت مجھے بتا دینا چاہیے تھا ۔ کہ اس میں نفع کے یہ یہ امکانات ہیں ۔ رات بھر سوچتے رہے ۔ اور آزمائش وامتحان کی کڑی منزلوں سے گذرتے رہے ۔ آخر تقویٰ و احتیاط کی جیت ہوئی ۔ اور حرص و آز کے جذبات نے ہار مانی ۔ حضرت تیس ہزار کی رقم لے کر اس تاجر کے پاس پہنچے ۔ اور کہا ۔ جناب یہ لیجیے اپنی رقم ۔ وہ متعجب ہوئے ۔ کہ یہ رقم میری کیونکر ہے ۔ جب کہ بہ طیبِ خاطر دام وصول کر چکا ۔ انھوں نے ان کو سمجھایا ۔ کہ جس وقت میں نے شکّر خریدی تھی ۔ اس وقت بھاؤ زیادہ تھا ۔ مگر میں نے تمھیں بتایا نہیں ۔ تا کہ ارزاں داموں پر خریدسکوں اور گراں قیمت پر بیچوں ۔

معاملہ کی یہ نوعیت چونکہ جائز نہیں ۔ اس لیے یہ نفع جوں کا توں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ۔ اسے براہِ کرم قبول فرمائیے ۔

ان تصریحات کو دیکھیے ۔ کیا ان سے ثابت نہیں ہوتا ۔ کہ ایک مسلمان کو عدل و انصاف کے تقاضوں سے کسی صورت میں بھی منحرف نہیں ہونا چاہیے ۔ اور خالص معاملات میں بھی خیر خواہی و خیرسگالی کے اعلیٰ

معیاروں کو قائم رکھنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھنا چاہیے۔

فہم قرآن

فضائل قرآن

قرآن سب سے بڑی دولت ہے

کتاب اللہ کے فضائل اور خوبیاں کیا کیا ہیں؟ اس کا اندازہ آں حضرت کی اس حدیث سے لگائیے

من قرأ القرآن ثم رای ان احدًا اوتی افضل مما اوتی فقد استصغر ما عظمه الله تعالیٰ۔ (۱)

جسے قرآن پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور اس نے خیال کیا۔ کہ اس سے کہیں بہتر وہ دولت ہے۔ جو کسی دوسرے شخص کو دی گئی ہے۔ تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے اللہ کی اس کتاب کی توہین کی جس کے رتبے کو اللہ نے بڑھایا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

ما من شفیع افضل منزلۃ عند الله تعالیٰ من القرآن لا نبی ولا ملك ولا غیرہ (۲)

اللہ تعالیٰ کے ہاں قرآن سے بڑھ کر اور کوئی شفیع نہیں۔ نہ پیغمبر اور نہ فرشتے وغیرہ۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

افضل عبادۃ امتی القرآن۔ (۳)

میری امت کی بہترین عبادت قرآن کی تلاوت اور فہم ہے۔

---

(۱) طبرانی۔

(۲) طبرانی۔

(۳) ابونعیم نے ذکر کیا ہے۔

معاشرہ میں قرآن پر عبور حاصل کرنے والوں کا کیا درجہ ہے؟ اس کے بارہ میں فرمایا۔

خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ (۱) — تم میں بہتر وہ لوگ ہیں۔ جن کا مشغلہ قرآن کی تعلیم حاصل کرنا اور اس کی تعلیم دینا ہے۔

ایک مقام پر اس پر روشنی ڈالی۔ کہ عنداللہ ان حضرات کا مقام کیا ہے؟

اہل القرآن اہل اللہ وخاصتہ۔ — قرآن سے شغف رکھنے والے اہل اللہ اور اس کے خاص بندے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے۔

ان القلوب تصدأ کما تصدأ الحدید فقیل یا رسول اللہ وما جلاءھا فقال تلاوۃ القرآن و ذکر الموت۔ (۲) — دل اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح کہ لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ پوچھا گیا۔ کہ یا رسول اللہ پھر ان کو صیقل کیونکر کیا جائے۔ فرمایا۔ تلاوت قرآن سے اور موت کی یاد سے۔

فضائل قرآن اور کچھ آثار قرآن سے بہرہ مندی علوم نبوت سے بہرہ مندی کے مترادف ہے — مزید تفصیل کے لیے کچھ آثار ملاحظہ ہوں۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں

اذا اردتم العلم فانثروا القرآن فان — جب تمہیں علم و حقائق تک رسائی حاصل کرنا ہو۔ تو قرآن کو کھول کر دیکھو۔

---

(۱) بخاری۔

(۲) بیہقی۔

فیہ علم الاولین والاٰخرین۔ — اس میں اولین وآخرین سب سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔

عمرو بن عاص کا کہنا ہے۔

من قرأ القراٰن ادرج النبوۃ بین جنبیہ الا انہ لا یوحٰی الیہ۔ — جس نے قرآن پڑھا اور اس پر غور وفکر کیا۔ اُس نے گویا انوار نبوت سے قلب وذہن کے گوشوں کو معمور کر لیا۔ ہاں اس پر وحی کے دروازے البتہ بند ہیں۔

امام احمد بن حنبل نے خواب میں اللہ تعالیٰ سے پوچھا۔ کہ مولا! آپ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے بہترین ذریعہ کون سا ہے۔ اور کس طریق سے آپ تک رسائی ممکن ہے۔ فرمایا۔

بکلامی یا احمد۔ — اے احمد میرے کلام کے ذریعہ۔ یہی میرے تقرب کا بہترین ذریعہ ہے۔

امام نے دریافت کرنا چاہا۔ کہ اس سے مقصود سمجھ کر پڑھنا ہے۔ یا بغیر سمجھے بوجھے پڑھنا بھی تقرب الی اللہ کا باعث ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا۔

بفھم و غیر فھم — سمجھ بوجھ کر پڑھنا۔ اور یونہی ادراہِ محبت وشوق پڑھنا دونوں اس میں داخل ہیں۔

فضیل بن عیاض کا قول ہے۔

ینبغی لحامل القراٰن ان لا یکون لہٗ الی احد حاجۃ ولا الی الخلفاء — حامل قرآن کو زیب نہیں دیتا۔ کہ وہ کسی کا دست نگر ہو۔ نہ تو اُس کو خلفاء سے سروکار ہونا چاہیے۔ اور نہ اُن لوگوں سے جو ان سے

فمن دونهم۔ فینبغی ان تکون حوائج الخلق الیه۔ — کم درجے کے ہیں۔ ہاں لوگوں کی ضرورتیں البتہ اِس سے وابستہ ہونی چاہییں۔

انہیں کا کہنا ہے۔

حامل القرآن حامل رایۃ الاسلام۔ — قرآن کا حامل پرچم اسلام کا حامل ہے۔

سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے۔

اذا قرأ الرجل القرآن قبل الملك بین عینیه۔ — انسان جب قرآن پڑھتا ہے تو فرشتہ اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے۔

خالد بن عقبہ آں حضرت کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ذرا قرآن تو سنائیے آپ نے ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان الآیۃ پڑھ کر سنائی اس نے کہا۔ ایک مرتبہ اور پڑھیے۔ آپ نے دوبارہ تلاوت فرمائی۔ تو اس پر اُس کا تاثر یہ تھا۔

واللہ ان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ وان اسفلہ لمورق وان اعلاہ لمثمر وما یقول ھذا لبشر۔ (۱) — بخدا اس میں شیرینی ہے۔ اور سج دھج ہے۔ اور یہ ایسا شجر فصاحت ہے کہ اس کے نیچے کا حصّہ تو پتوں سے ڈھکا ہے۔ اور اوپر پھول اور میووں کی کثرت ہے۔ یہ کلام ہرگز کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔

حسن کا مقولہ ہے۔

واللہ ما دون القرآن من غنی ولا بعد من فاقۃ۔ — واللہ قرآن سے ادھر غنا نہیں۔ اور اس کو پانے کے بعد فقر و احتیاج کا وجود نہیں۔

---

(۱) حافظ ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے۔

قرآن کے معاملہ میں غفلت و سہو کی مذمت

انس بن مالک نے ان لوگوں سے متعلق جو طوطے کی طرح قرآن پڑھتے ہیں اور فکر و عمل کی سمتوں کو اس کے مطابق بدلنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ فرمایا ۔

رب تال القرآن و القرآن يلعنه ۔

کتنے ہی ایسے قاری ہیں ۔ کہ قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے ۔

میسرۃ نے قرآن کی بے چارگی کے بارہ میں کہا ۔

الغريب هو القرآن في جوف الفاجر ۔

غریب و اجنبی کوئی شخص نہیں ۔ وہ قرآن ہے جو فاجر کے سینہ میں ہے ۔

ابو سلیمان الدارانی کہا کرتے تھے ۔

الزبانية اسرع الى حملة القرآن الذين يعصون الله عز و جل منهم الى عبدة الاوثان حين عصوا الله سبحانه بعد القرآن ۔

جہنم کے فرشتے اُن لوگوں کو زیادہ عجلت سے گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے ۔ جو قرآن کے حامل بھی ہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت بھی کرتے ہیں ۔ بہ نسبت اُن کے جو بُت پرست ہیں ۔ اور اُنھوں نے نزولِ قرآن کے بعد نا فرمانی کی ۔

ابن الرماح نے کہا ۔

ندمت على استظهاري القرآن لانه بلغني ان

مجھے حفظِ قرآن پر بڑی ہی ندامت ہوئی ۔ جب یہ معلوم ہوا ۔ کہ ان حاملینِ قرآن

اصحاب القرآن يسئلون عما يسئل الانبياء يوم القيمة -

کی ذمہ داری اتنی ہی ہے۔ جتنی کہ انبیاء علیہم السلام کی۔ کیونکہ ان سے بھی انبیاء کی طرح پوچھا جائے گا۔ کہ آپ نے ہمارے پیغام کے مقتضیات کو کہاں تک پورا کیا۔

عبداللہ بن مسعود نے فرمایا۔

ينبغي لحامل القرآن ان يعرف بليله اذا الناس ينامون - و بنهاره اذا الناس يفرطون - وبحزنه اذا الناس يفرحون - و ببكائه اذا الناس يضحكون - و بصمته اذا الناس يخوضون - وبخشوعه اذا الناس يختالون - وينبغي لحامل القرآن ان يكون مستكيناً ليناً - ولا ينبغي له ان يكون جافيا و لا مماريا. و لا صياحا ولا صخابا و لا حديدا -

حامل قرآن کے لیے یہی زیبا ہے۔ کہ اپنی شب بیداری کی بدولت پہچانا جائے۔ جب کہ لوگ مزے سے سو رہے ہوں۔ اپنے دن کے پاکیزہ مشاغل سے پہچانا جائے جب کہ لوگ جائز و ناجائز کی تفریق کا خیال نہ رکھ رہے ہوں۔ اس کی علامت گریہ وزاری ہونا چاہیے، جب کہ دوسرے قہقہے لگا رہے ہوں۔ خاموشی ہونی چاہیے، جب دوسرے لاطائل بحثوں میں غور و خوض کر رہے ہوں۔ خشوع ہونی چاہیے، جب دوسرے کبر و نخوت کے نشہ سے سرشار ہوں۔ نیز حامل قرآن کے لیے زیبا یہ ہے، کہ متواضع اور نرم خو ہو سخت دل، جھگڑالو اور شور مچانے والا نہ ہو۔ اس کو یہ بات بھی زیب نہیں دیتی کہ لوہے کی طرح سخت اور غیر تاثر پذیر ہو۔

آں حضرت کا ارشاد ہے۔

اكثر منافقي هذه

اس امت کے منافقین کی اکثریت قرا

الامة قراءها۔ (۱) سے متعلق ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا۔

اقرا القرآن ما نہاک قرآن پڑھنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ یہ برائیوں
فان لم ینہک فلست تقرءہ (۲) سے تمھیں روکتا ہے اور گناہوں سے باز
رکھتا ہے۔ لیکن اگر یہ برائیوں سے نہیں روکتا ہے تو یہ کوئی پڑھنا نہیں ہے۔

اس مفہوم کو ایک دوسری حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے۔

ما آمن بالقرآن من وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں رکھتا
استحل محارمہ۔ (۳) جو اس کے محارم کو حلال سمجھتا ہے۔

ایک عالم نے کیا خوب کہا ہے۔ تلاوت قرآن کے سلسلہ میں بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک انسان خود اپنے کو نادانستہ طور سے ملعون قرار دیتا ہے یعنی جب وہ کہتا ہے۔

فنجعل لعنة الله علی پھر ہم دونوں جھوٹوں پر خدا کی لعنت
الکاذبین۔ بھیجیں۔

تو اس سے بڑھ کر اور کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ یا جب اس آیت کی تلاوت کرتا ہے

الا لعنة الله علی سن رکھو ظالموں پر خدا کی لعنت
الظالمین۔ (ہود۔ ۲) ہے۔

تو اس سے زیادہ کوئی اس لعنت کا مستحق نہیں ہوتا۔

جناب حسن کہتے ہیں۔

---

(۱) احمد۔

(۲) طبرانی۔

(۳) ترمذی۔

انکم اتخذتم قراۃ القرآن مراحل وجعلتم اللیل جملا فانتم ترکبونه تقطعون به مراحله، وان من کان قبلکم راوه رسائل من ربهم فکانوا یتدبرونها باللیل وینفذونها بالنهار۔

تم نے تلاوتِ قرآن کو مراحل سمجھ رکھا ہے۔ اور رات کو بمنزلہ سواری کے قرار دے رکھا ہے۔ کہ جس کے ذریعہ ان مراحل کو طے کرتے ہو۔ مگر اگلوں کا شیوہ اس سے مختلف تھا۔ وہ قرآن کو اللہ کا پیغام سمجھتے تھے۔ اس لیے رات کو تدبر و تفکر میں بسر کرتے تھے۔ اور دن کو اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

عبداللہ بن مسعود نے امت کی بے عملی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا۔

انزل القرآن لیعملوا به۔ فاتخذوا دراسته عملا ان احدکم یقرء القرآن من فاتحته الی خاتمته ما یسقط منه حرفا وقد اسقط العمل به۔

قرآن عمل کے لیے نازل ہوا تھا۔ مگر یار لوگوں نے اس کی تعلیم و تعلم کو پیشہ کی صورت دے رکھی ہے۔ چنانچہ یوں تو فاتحہ سے لے کر والناس تک اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور ایک حرف اور اس کا شوشہ بھی چھوٹنے نہیں پاتا۔ مگر جہاں تک عمل کا تعلق ہے۔ اسے یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

کیا کلام اللہ کا درجہ ایک دوست کے خط سے بھی کم درجہ کا ہے اور کیا خود ذاتِ باری کا مقام اتنا بھی نہیں جتنا کہ ایک دوست کا ہے

توراۃ کے ایک صحیفہ میں کتاب الٰہی سے متعلق غفلت و سہو کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے۔

يا عبدي اما تستحي
مني يأتيك كتاب من
بعض اخوانك و انت
في الطريق تمشي فتعدل
من الطريق وتقعد لاجله
و تقرأه و تتدبره حرفا
حرفا حتى لا يفوتك شيء
منه ، و هذا كتابي انزلته
اليك - انظر كم فصلت
لك فيه من القول -
و كم كررت عليك فيه
لتتأمل طوله وعرضه
ثم انت معرض عنه -
افكنت اهون عليك من
بعض اخوانك يقعد اليك
بعض اخوانك فتقبل بكل
وجهك و تصغي الى حديثه
بكل قلبك فان تكلم متكلم
او شغلك مشاغل عن
حديثه اومات اليه
ان كف وها انا ذا

اے میرے بندے! کیا تو اس صورت
حال سے شرمندہ نہیں ہوتا۔ کہ اگر تمھیں
کسی دوست کا خط راستے میں ملے۔ تو
فوراً الگ بیٹھ کر اُسے پڑھنا شروع
کر دیتا ہے۔ اور اُس کے ایک ایک
حرف پر غور و فکر کی توتیں صرف کرتا
ہے۔ حتیٰ کہ کوئی بات چھوٹنے نہیں
پاتی۔ لیکن میری کتاب کے بارہ میں
یہ تمہارا حال ہے۔ کہ میں نے گو اسے
تمہارے فائدے کے لیے اُتارا۔ اور
اس کے حقائق کو کھول کھول کر بیان کیا
اور بکرات ان حقائق کی وضاحت کی۔
تاکہ تو اس کے طول و عرض پر غور کر سکے
لیکن تو ہے۔ کہ اس سے روگرداں ہے
کیا اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ میری ذات
تمہارے ایک ایسے دوست سے بھی
کم درجے کے اعتبار کی مستحق ہے۔ جو
تمہارے پاس بیٹھتا ہے۔ اور تمہاری
تمام توجہات گھیر لیتا ہے۔ تم اس کی
باتیں پوری توجہ سے سنتے۔ اور اس کے
ہر ہر قول پر کان دھرتے ہو۔ اور کوئی

مقبل الیک و محدث لک و انت معرض بقلبک عنی افجعلتنی اھون عندک من بعض اخوانک۔

بداخلت اس سلسلہ میں گوارا نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مخل ہونا بھی چاہے تو ذرا اس کو اشارہ سے روک دیتے ہو۔ لیکن میں تمہاری طرف اپنی عنان توجہ مبذول کیے ہوئے ہوں۔ اور تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر تم ہو کہ ذرا ملتفت نہیں ہوتے۔ تو کیا میرا درجہ تمہارے ایک دوست سے بھی کم ہے۔

آداب تلاوت

قرآن کیونکر پڑھنا چاہیئے؟

سب سے پہلے تو قاری کو باوضو ہونا چاہیے اور پھر یہ دیکھنا چاہیے۔ کہ اس کا انداز غیر مؤدبانہ تو نہیں۔ اگر کھڑا ہے تو ادب و سکون مترشح ہونا چاہیے۔ اور بیٹھا ہے۔ تو قبلہ رو ہونا چاہیے۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھنا، یا ٹیک لگا کر بیٹھنا یا ایسے انداز میں بیٹھنا کہ جس سے کبر و پندار کی بو آتی ہو۔ درست نہیں۔ زیادہ اچھا یہ ہے کہ اس شاگرد کی طرح ادب و سکون سے بیٹھے، جو اپنے استاد کے سامنے دامن طلب پھیلائے ہوئے ہے۔ اور مؤدب ہو کر دو زانو بیٹھا ہے۔ بہترین صورت یہ ہے کہ قرآن نماز میں، قیام کی حالت میں پڑھا جائے۔ اور وہ بھی مسجد میں۔ وضو کیے بغیر بشرط طہارت بھی تلاوت جائز ہے۔ اسی طرح ایک آدمی لیٹے لیٹے بھی قرآن پڑھ سکتا ہے۔ لیکن یہ صورت حال اولیٰ نہیں۔ قرآن حکیم میں ہے۔

الذین یذکرون اللہ	جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں
قیاما و قعودا و علی جنوبھم	خدا کو یاد کرتے اور آسمان و زمین کی پیدائش
و یتفکرون فی خلق السمٰوٰت	میں غور کرتے ہیں۔
و الارض۔ (آل عمران۔ ۱۹۱)	

اس ترتیب بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حالت قیام میں قرآن پڑھنا افضل ہے اس سے کم درجہ کا بیٹھ کر پڑھنا ہے۔ اور لیٹ کر پڑھنا بھی گو جائز ہے۔ تاہم ثواب میں ان دونوں صورتوں سے کم ہے۔

تلاوت کی مقدار اولیٰ کیا ہے؟

تلاوت کی مقدار کیا ہونا چاہیے۔ اس میں بر بنائے عادات اختلاف ہے۔ کوئی شب و روز میں ایک مرتبہ ختم قرآن کا قائل ہے۔ کوئی دو مرتبہ اور کوئی تین تین مرتبہ۔ کوئی ایک ماہ میں ختم کرتا ہے۔ اسی کو اولیٰ قرار دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں آں حضرت کی اس حدیث کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے۔

من قرأ القرآن في اقل من ثلاث لم يفقهه (۱) — جس نے تین دن سے کم میں قرآن ختم کیا۔ وہ اسے سمجھ نہیں پایا۔

کیونکہ جب اتنی تیزی اختیار کرے گا۔ تو فہم و فکر کے مواقع کب میسر ہوں گے۔ حضرت عائشہ نے ایک صاحب کو سنا۔ غیر معمولی سرعت کے کے ساتھ قرآن پڑھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

ما قرأ و ما سكت۔ — کہ یہ شخص نہ تو قاری کے حکم میں ہے۔ اور نہ ساکت کے حکم میں۔

ایک حدیث میں ہے۔

امر النبي صلى الله عليه وسلم عبد الله بن عمر رضي الله عنهما ان يختم القرآن في كل سبع (۲) — آں حضرت نے عبداللہ بن عمر کو حکم دیا۔ کہ قرآن سات دن میں ختم کیا کریں۔

صحابہ کی ایک کثیر جماعت اسی پر عمل پیرا تھی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ زید بن ثابت، ابن مسعود اور ابی بن کعب وغیرہ کا معمول تھا۔ کہ ایک جمعہ سے شروع کرکے دوسرے جمعہ تک ختم قرآن کی سعادت حاصل کرتے۔

---

(۱) ترمذی۔

(۲) اصحاب سنن۔

ترتیل و تدبر قرآن آداب تلاوت میں ترتیل کے تقاضوں کا خیال رکھنا بھی شامل ہے کیونکہ اس سے فہم و تدبر قرآن میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حضرت ام سلمی نے آں حضرت کے اندازِ تلاوت کی خصوصیت سے تعریف کی۔ آپ نے فرمایا۔ آپ جب پڑھتے ہیں تو ایک ایک حرف پہچانا جاتا ہے۔ اسی ضرورت کی اہمیت حضرت ابن عباس نے اپنے اس قول میں بیان کی ہے۔

ولان اقرأ البقرة و آل عمران ارتلهما واتدبرهما احب الیّ من ان اقرأ القرآن كله هذرمة۔

میں صرف بقرہ و آل عمران کو ترتیل و تدبر کے ساتھ پڑھنا۔ اس سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں۔ کہ پورا قرآن بغیر کچھ جانے بوجھے تیزی سے پڑھ جاؤں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شخص فہم قرآن کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے اس کے لیے ترتیل غیر ضروری ہے۔ اس کی ضرورت اس وقت بھی قائم رہے گی۔ کیونکہ قرآن کی توقیر اور احترام خاص یہ چاہتا ہے۔ کہ اسے عام کتابوں کی طرح سرسری طور پر نہ پڑھا جائے۔ رقت قلب اور بکا بھی آداب تلاوت میں ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ جب کوئی شخص سوچ سمجھ کر قرآن پڑھے گا۔ اور اس کے احکام و مواعید پر اچھی طرح مطلع ہو گا۔ اور معلوم کرے گا۔ کہ اس کتاب ہدیٰ میں کن کن ذمہ داریوں کو نبھانے کی تاکید آئی ہے۔ اور پھر اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈالے گا۔ تو لامحالہ روئے گا۔ اور آہ و زاری سے کام لے گا۔ لیکن اور اگر اس پر بھی اسے رونا نہیں آتا ہے۔ تو کم از کم اپنی قساوت قلبی ہی پر اس کو رونا چاہیے۔ کہ قرآن پڑھتا ہے۔ اور اس میں مندرجہ عبر و بصائر پر نظر نہیں ڈالتا ہے اور ان سے متاثر نہیں ہو پاتا۔ اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اثنائے تلاوت میں کچھ آیات ایسی بھی آتی ہیں۔ جو سجدہ کی متقاضی ہیں۔ یہ قریب قریب چودہ ہیں۔ انھیں پڑھتے یا سنتے وقت سجدہ کرنا چاہیے۔ ان سجدات کے لیے بھی طہارت شرط ہے۔ قبلہ شرط ہے اور ستر عورت شرط ہے۔ تلاوت سے پہلے تعوذ ضروری ہے۔ اور فارغ ہو چکنے کے بعد یہ کہنا چاہیے۔

صدق اللّٰہ تعالیٰ و بلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اللّٰھم انفعنا بہ و بارک لنا فیہ الحمد للّٰہ رب العالمین و استغفر اللّٰہ الحی القیوم۔

اللہ تعالے نے سچ فرمایا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام تعلیمات کو اس کے بندوں تک پہنچا دیا ہے یا اللہ! ہمیں اس سے بہرہ مند ہونے کی توفیق مرحمت فرما۔ اور اس میں برکت عطا کر۔ سب ستائشیں اللہ کے لیے ہیں۔ جو کائنات کا رب ہے۔ اور میں حی و قیوم خدا سے بخشش و عفو طلب کرتا ہوں۔

دوران قرأت میں مضامین کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر آیت تسبیح سامنے آئے تو تسبیح بیان کرنا چاہیے۔ تکبیر کا ذکر ہو، تو اللہ اکبر کہنا چاہیے۔ اسی طرح دعا و استغفار کے مواقع پر اس سے بخشش طلب کرنا چاہیے۔ اور دعا مانگنا چاہیے۔ حدیث میں ہے۔

قال حذیفۃ صلیت مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فابتدا بسورۃ البقرۃ فکان لا یمر بآیۃ رحمۃ الا سأل و لا بآیۃ عذاب الا استعاذ و لا بآیۃ

حذیفہ کہتے ہیں میں نے آں حضرت کے ساتھ نماز پڑھی۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ آپ نے سورۂ بقرہ کا آغاز فرمایا۔ لیکن اس طریق سے۔ کہ جہاں آیت رحمت آتی ہے۔ اللہ سے دعا مانگنا شروع کی۔ جہاں عذاب کا ذکر آیا، اس سے پناہ چاہی۔ اور جہاں اس کی

تنزیہ الاسنیٰ - (۱) تنزیہہ مذکورہوئی اُس کی تسبیح بیان کی۔

کیا قرآن باآواز بلند پڑھنا چاہیئے؟ یا باسر۔ تین مختلف انداز۔

قرآن باآواز جہر پڑھنا چاہیے - یا باسر- اس میں اختلاف رائے ہے لیکن اتنا تو بہرحال درست ہے۔ کہ سر میں بھی کم ازکم اتنی آواز سے تو ضرور پڑھنا چاہیے - کہ الفاظ و حروف خود اُسے سنائی دیں۔ ورنہ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوجائے گا۔ کہ قرأت کے تقاضے پورے ہو رہے ہیں یا نہیں۔ بعض بزرگوں نے قرأت میں سر کو ترجیح دی ہے۔ انھیں میں سعید بن مسیب بھی ہیں۔ چنانچہ ان کے بارہ میں ایک روایت میں ہے - ایک مرتبہ اُنھوں نے سُنا۔ کہ کوئی شخص باواز بلند قرآن پڑھ رہا ہے - تو غلام کو بھیجا۔ کہ اس کو روک دے۔ اس نے آکرا طلاع دی۔ جناب ایک صاحب مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور مسجد ان کی اپنی ہے۔ ہماری نہیں - اس لیے ہمیں حق نہیں پہنچتا۔ کہ اس معاملہ میں دخل اندازی کریں۔ آپ نے دور ہی سے پکار کر کہا -

یا ایہا المصلی! ان کنت تریں اللہ عز وجل بصلاتک فاخفض صوتک وان کنت تریں الناس فانہم لن یغنوا عنک من اللہ شیئا۔

اے نماز پڑھنے والے! اگر نماز پڑھنے سے تمھارا مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے تو اس طرح بلند آواز سے نہ پڑھ۔ اور اگر تو لوگوں کی خوشنودی چاہتا ہے۔ تو تمھیں معلوم ہونا چاہیے۔ کہ لوگ تمھیں اللہ کی گرفت سے بچانے والے نہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں یہ کون شخص تھے - یہ عمر بن عبدالعزیز تھے۔ جو ان دنوں مدینہ کے امیر تھے۔ انھوں نے جب یہ سُنا، تو چپکے سے ہاتھ میں جوتا سنبھال چل دیے۔

بالجہر کے حق میں یہ روایت پیش کی جا سکتی ہے۔ کہ آں حضرت نے اپنے بعض صحابہ کو صلاۃ اللیل میں بالجہر قرأت پڑھتے سُنا۔ تو اس کی تصویب فرمائی۔ اسی مضمون کی ایک حدیث یوں ہے۔ آں حضرت کا ایک مرتبہ اپنے تین صحابہ پر گذر ہوا۔ اور تینوں کو اعمال میں مختلف پایا۔ ابو بکر کو دیکھا کہ بالسر پڑھ رہے ہیں۔ پوچھا سر کی کیا وجہ ہے۔ انھوں نے کہا۔

ان الذی اُناجیہ — جس سے میں سرگوشیاں کر رہا ہوں

ھو یسمعنی۔ — وہ سن رہا ہے۔

عمر کے پاس سے گذرے تو دیکھا۔ بآوازِ بلند پڑھ رہے ہیں۔ سبب دریافت کیا۔ تو کہنے لگے۔

اوقظ الوسنان واذجر — اونگھتے کو جگانا اور شیطان کو

الشیطان۔ — بھگانا مقصود ہے۔

بلال کو اس حال میں پایا۔ کہ کسی ایک ہی سورہ پر انتظار نہیں کرتے۔ بلکہ کچھ آیتیں ایک سورہ کی پڑھتے ہیں۔ اور کچھ آیتیں دوسری سورہ کی۔ اور وجہ بیان کی۔

اخالط الطیب بالطیب۔ — کہ میں طیب کو طیب سے ملاتا ہوں۔

آں حضرت نے فرمایا۔

کلکم احسن واصاب۔ — تم میں کا ہر ایک محسن اور مصیب ہے۔

اختلافِ احوال سے مسئلہ کا انداز بدل جاتا ہے

بات یہ ہے کہ اختلافِ احوال سے، احکام و مسائل میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو تصنع و ریا سے محفوظ رہنا چاہتا ہے۔ اُس کے حق میں یہی بہتر ہے۔ کہ بالسر پڑھے اور جو یہ چاہتا ہے۔ کہ

اس کی قرأت سے دوسرے بیدار ہوں ۔ ان میں شوق کے داعیے اُبھریں ۔ اور خود اس کی ہمت و نشاط میں اضافہ ہو، تو اس کو چاہیے کہ جہر کا التزام کرے ۔ مزید برآں جہر اس بنا پر بھی افضل ہے کہ اس میں کئی کئی نیتوں کا اجتماع ہو جاتا ہے ۔ اور یہ قاعدہ ہے ۔ کہ کسی نیک کام کے جس درجہ محرکات زیادہ ہونگے اسی نسبت سے اس کے اجر و ثواب میں بھی اضافہ ہوگا ۔ جیسے مطلقاً قرأت سے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے ۔ کہ مصحف کو دیکھ کر پڑھا جائے ۔ کیونکہ اس میں مصحف کو ہاتھ میں لینے، دیکھنے اور اس میں غور و تامل کرنے کا اجر بھی شامل ہو جاتا ہے اور صرف پڑھنے میں یہ بات نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صحابہ مصحف کو دیکھ کر اور سامنے رکھ کر تلاوت کرتے تھے ۔ یہی نہیں بلکہ بغیر مصحف کو دیکھے اور دیدہ و نظر کو اس کی زیارت سے بہرہ مند کیے گھر سے باہر نکلنا تک مکروہ سمجھتے تھے ۔ ایک فقیہہ کو سحری کے وقت امام شافعی سے ملنے کا اتفاق ہوا ۔ دیکھا کہ قرآن کھولے بیٹھے ہیں ۔ فرمایا ۔

شغلکم الفکر عن	تم پر فکر کا ایسا غلبہ ہے ۔ کہ تم قرآن
القرآن انی لاصلی	سے بے نیاز ہو گئے ہو ۔ اور میرا یہ حال ہے
واضع المصحف بین یدی	کہ عشاء کے بعد جو قرآن کھول کر بیٹھتا
فما اطبقه حتی اصبح ۔	ہوں ۔ تو صبح کی نماز تک یہ عمل جاری رہتا ہے

قرآن کو ترتیل و خوش الحانی سے پڑھنا چاہیے ۔ مگر اس کے معنی موسیقی نہیں

آداب تلاوت میں ۔ قرأت و تجوید کے قاعدوں کو ملحوظ رکھنا بھی شامل ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس میں توازن برقرار رہے ۔ اور اس انداز سے کہ اس میں حد سے بڑھی ہوئی کھینچا تانی نہ ہو ۔ آواز کو موسیقی کے قالب میں ڈھالنے کی اس درجہ

کوشش نہ کی جائے۔ کہ اس میں نظم قرآن ہی میں تغیر لازم آئے۔ اس طرح اچھے لب و لہجہ کے ساتھ پڑھنا اور الفاظ و حروف کے مخارج کا خیال رکھنا ترتیل ہے جو سنت ہے۔ حدیث میں وارد ہے۔

زینوا القرآن باصواتکم[1] قرآن کو حسن صوت سے آراستہ کرو۔

ایک مرتبہ آں حضرت حضرت عائشہ کے انتظار میں تھے۔ وہ تاخیر سے آئیں۔ تو آپ نے دریافت فرمایا۔

ما حبسك تھیں کس چیز نے روک رکھا تھا۔

آپ نے کہا۔ میں ایک ایسے خوش آواز شخص کی آواز سن رہی تھی جس سے بہتر پڑھنے والا میں نے نہیں دیکھا۔

آں حضرت اُٹھے۔ اور حضرت عائشہ کے ساتھ ہوئے۔ اور جاکر خود قرأت سماعت فرمائی۔ پھر لوٹے اور کہا۔ کہ یہ سالم بن حذیفہ کے غلام ہیں۔ اور کہا۔

الحمد لله الذی جعل فی امتی مثله۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں اس مرتبہ کے پڑھنے والے پیدا کیے ہیں۔

آں حضرت کا معمول تھا۔ کہ خوش الحان صحابہ سے قرآن سنتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود سے قرآن پڑھنے کو کہا۔ اُنھوں نے عرض کیا۔

یارسول الله اقراء علیك وعلیك اُنزل۔ یا رسول اللہ کیا میں آپ کو سناؤں حالانکہ آپ ہی پر تو یہ صحیفۂ خداوندی نازل ہوا ہے۔

آپ نے فرمایا میں چاہتا ہوں، دوسروں سے سنوں۔ اس پر اُنھوں نے پڑھنا شروع کیا۔ اور آنحضرت کے تاثرات کا یہ عالم تھا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔

---

(۱) ابن حبان و مستدرک۔

ایک دفعہ ابوموسیٰ سے قرآن سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایسے خوش الحان تھے کہ ان الفاظ میں آپ نے داد دی۔

اوتی ھذا من مزامیر آل داؤد۔ — انھیں آل داؤد کے مزامیر سے نوازا گیا ہے۔

صحابہ بھی جب فرصت کے اوقات میں بیٹھتے اور غذائے روح کی احتیاج محسوس کرتے۔ تو ایک دوسرے سے قرآن سننے کی فرمائش کرتے۔ حضرت عمر اکثر ابوموسیٰ سے فرمایا کرتے تھے۔

ذکرنا ربنا۔ — ہمارے پروردگار کی دلوں میں یاد تو تازہ کرو۔

وہ یہ سنتے تو قرآن کی کوئی نہ کوئی سورت شروع کر دیتے۔ اور یہ اس میں اتنا محو ہوتے۔ کہ وقت کا احساس جاتا رہتا۔ پھر جب کوئی یہ کہہ کر اُن کے اس استغراق کو ختم کر دیتا۔ کہ

یا امیر المؤمنین الصلاۃ الصلاۃ۔ — کہ اے امیر المومنین! نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔

تو کہتے۔

اولسنا فی صلوٰۃ — کیا ہم نماز ہی میں مشغول نہیں تھے۔

اس سے اُن کا اشارہ غالباً اس آیت کی طرف ہوتا۔

ولذکر اللہ اکبر۔ — اور اللہ کا ذکر سب سے بڑھ کر ہے۔

تلاوت و قرأتِ قرآن کے باطنی پہلو

فہم و تدبرِ قرآن سے متعلق دس اہم نکات

قرآن حکیم کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل دس پہلو ایسے ہیں جن کا سمجھ لینا ضروری ہے -

(۱) کلام اللہ کی حقیقت - اور اس کا باعثِ نزول -
(۲) تعظیم و توقیر کے تقاضے -
(۳) حضورِ قلب -
(۴) تدبر -
(۵) تفہیم -
(۶) موانعِ فہم سے دست کشی -
(۷) تخصیص -
(۸) تاثر -
(۹) ترقی -
(۱۰) تبری -

اب ان پہلوؤں کی تفصیلات ملاحظہ ہوں -

کلام اللہ کی اصل حقیقت یعنی اللہ کی تجلیاتِ کلامیہ نے کیونکر الفاظ و حروف کی قید کو گوارا کیا -

جہاں تک کلام اللہ کی حقیقت کا تعلق ہے - سب سے اہم اور قابلِ غور بات یہ ہے - کہ کیونکر اللہ تعالیٰ

کے لطف و کرم نے یہ گوارا فرمایا۔ کہ مفہوم و معنی کی تجلیات بلند سے نیچے اتر کر بندوں سے ہم کلام ہو۔ اور اپنی صفت کلام کو جو ازل سے اُس کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور نہایت لطیف و نازک ہے۔ الفاظ و حروف کا جامہ پہناتے۔ اس کرم و لطف بے نہایت کا اندازہ اس سے لگائیے۔ کہ اگر انسان چاہتا کہ اپنی عقل و زیرکی سے اُس کی صفات کے بارہ میں علم حاصل کرے۔ اور فکر و دانش کی پرواز سے اس کے حریم ناز تک پہنچے۔ تو اُس کو اس میں قطعی کامیابی نہ ہو پاتی۔ اور کسی طرح بھی اس کے کلام و منشار تک اس کی رسائی نہ ہو پاتی۔ یہ تو محض اس کا فضل بے حد، اور فیض غیر محدود ہے۔ کہ اُس نے اپنے کلام کے انوار کو الفاظ و کلمات کی صورت میں ظاہر کیا۔ اور اس کامیابی کے ساتھ کہ عامی سے عامی بھی اس کی حکمتوں کو پالینے پر نازاں ہے۔ اور اُسی کا کام ہے کہ بندوں کو قرب و اتصال کے ان درجات پر فائز کرے۔ اور ان مراتب کا اہل قرار دے ورنہ کہاں ممکن تھا۔ کہ طور ایسا پہاڑ تو ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اور اس کی تجلیات گوناگوں کا تحمل نہ کر سکے۔ اور موسیٰ کا ضعیف و ناتواں قلب و جگر نہ صرف ان کو برداشت ہی کرے بلکہ ان سے بہرہ مند بھی ہو۔

نزول کا سبب اُس کا لطف و کرم ہے

مسئلہ تنزیل کی حکیمانہ تشریح۔

اللہ کے اس لطف و کرم کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے کہ جس نے باوجود اپنے درجات کی بلندیوں کے، اور باوجود اپنی صفات کی تنزیہہ کے۔ اپنے بندوں کو شرفِ تخاطب سے مشرف فرمایا اور ان میں یہ اہلیت پیدا کی۔ کہ اس کے اس کلام لطیف کو سمجھ سکیں جو حروف و الفاظ کی منت کشی سے یکسر آزاد ہے۔ ایک حکیم کی اس مثال کو سامنے رکھیے اس سے اُن کے انداز کرم اور اسلوب لطف کی کچھ تصویر ذہن کی گرفت میں

آ جائے گی۔ مثال یہ ہے کہ جب آپ کا سابقہ بعض حیوانات سے ہو۔ یا طیور اور پرندوں سے ہو۔ یعنی آپ انھیں پالنا چاہتے ہوں۔ اور اپنے ہاں گھروں میں رکھنا چاہتے ہوں۔ تو اس کے سوا کیا طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے۔ کہ آپ ان کو سدھائیں۔ اور بعض حرکات اور آوازوں پر لگائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے رتبے کا خیال کیے بغیر اُن کی سطح پر آجاتے ہیں۔ اور عجیب عجیب آوازیں حلق سے نکالتے ہیں۔ اور عجیب عجیب حرکات و اشارات کو کام میں لاتے ہیں۔ تب جا کر کہیں وہ اس قابل ہوتے ہیں۔ کہ آپ کے احکام کی پیروی کر سکیں۔ بالکل یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ ہے۔ اس کی صفت کلام اور اُس کی تجلیات معنی و منشا کو یہ حیوان ناطق کب سمجھ سکتا تھا۔ اور کب اس لائق ہو سکتا تھا۔ کہ آپ سے آپ اس کے احکام کی پیروی کر سکے۔ یہ اس کی مہربانی اور محبت ہے۔ کہ اس نے اپنے مقام جلال سے نیچے اُتر کر الفاظ و حروف کی سطح پر انسان کو خیر و شر کا فلسفہ سمجھایا۔ حالانکہ اس کی ذات اس سطح سے بہت بلند و بالا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ کلام الٰہی بمنزلہ جسد و جسم کے ہے اور معنی و منشا بمنزلہ روح و نفس کے۔ پھر جس طرح ایک جیتے جاگتے جسم کا احترام اس کی زندگی کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ اور شئے زائد سمجھ کر چھوڑ نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح کلامِ الٰہی کا احترام اس کے معنی کے اعتبار سے ضروری ہے۔ یہ ایک تمثیل ہے۔ اس سے بس اتنا ہی سمجھانا مقصود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ کلامیہ نے انسانی حرف و صوت کا جو لباس اختیار کیا ہے۔ اس میں اُس کی مہربانی کو خاص دخل ہے۔ کیونکہ اگر اس کی ذاتِ گرامی مہربان نہ ہوتی۔ اور اُس کا فیض و جود جوش میں نہ آتا۔ تو اس کی تجرید و ماورائیت کبھی بھی کسوتِ الفاظ میں متجلی ہونا گوارا نہ کرتی۔

(۲) **تعظیم و توقیر کے تقاضے** تعظیم و توقیر کے تقاضوں کا مطلب یہ ہے کہ جب قاری قرآن حکیم کی تلاوت کرنے لگے۔ تو سب سے پہلے دل میں متکلم کی عظمت کا نقش جمائے۔ اور یہ سمجھے کہ یہ کلام انسانی کلام ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق پروردگار عالم سے ہے۔ اس لیے اس کا پڑھنا کسی معمولی کتاب کا پڑھنا نہیں۔ بلکہ صحیفۂ خداوندی کا پڑھنا ہے۔ اس تصور میں کس درجہ نزاکت ہے۔ اور اس سے تلاوتِ قرآن کا مشغلہ کس درجہ پُر خطر ہو جاتا ہے۔ اس کو ہرگز نہیں جان سکتا۔

لا یمسہ الا المطھرون۔ (واقعہ) اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں۔

پھر جس طرح قرآن کے اوراق و حروف کو چھونے کے لیے ضروری ہے۔ کہ چھونے والا پاک ہو۔ اور کسی ظاہر آلائش سے ملوث نہ ہو۔ اسی طرح جو شخص اس کے معانی و مطالب کو جاننا چاہتا ہے۔ اس کے لیے بھی ضروری ہے۔ کہ قلب و نظر کی پاکیزگی کا حامل ہو۔ یعنی جس طرح ہر ہر ہاتھ اس کو چھونے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ اسی طرح ہر ہر ذہن و قلب بھی اس لائق نہیں کہ اس کی گہرائیوں سے تعرض کرے۔ اس کے لیے اس خاص نوع کی صلاحیتِ فکر، تطہیرِ باطن اور تعظیم و توقیر کی حاجت ہے۔ تلاوت کے سلسلہ میں یہی وہ نکتہ ہے جس کو سمجھ لینے کے بعد تلاوت کا مرحلہ اس درجہ آسان نہیں رہتا جس درجہ عوام نے سمجھ رکھا ہے حضرت عکرمہ کے بارہ میں منقول ہے۔ کہ جونہی اُن کا شوقِ تلاوت جوش میں آتا۔ اور یہ قرآن کو ہاتھ میں لے کر اس کی ورق گردانی شروع کرتے، اُن پر غشی طاری ہو جاتی اور بے اختیار اُن کی زبان پر یہ کلمات جاری ہو جاتے۔

ھو کلام ربی ھو کلام ربی۔ یہ تو میرے رب کا کلام ہے، یہ تو میرے رب کا کلام ہے۔

یعنی اُن کو اپنی اس عبارت پر افسوس ہوتا۔ کہ میں نے اپنے محبوب کے پیام و کلام کے ساتھ یہ سرسری سا معاملہ کیوں روا رکھا۔ متکلم کی عظمت کا نقش دل میں بٹھانے اور جمانے کے لیے ضروری ہے۔ کہ اس کی صفات پر غور کرے۔ اس کے افعال و سنن کے متعلق سوچے۔ اور اس حقیقت کا اقرار کرے۔ کہ عرش و کرسی سے لے کر کائنات کے ادنیٰ ظہورات تک کا وہی خالق ہے۔ وہی سب کو رزق پہنچانے والا ہے۔ اور سب اُسی کے قبضہ قدرت کے اسیر ہیں۔

(۳) حضورِ قلب حضورِ قلب سے یہ مراد ہے کہ قرآن پڑھتے وقت پوری پوری یکسوئی حاصل ہو۔ اور سوا قرآن کے خیال کے اور کوئی خیال فکر و تدبر کے واجبات کو اکسانے والا نہ ہو۔ ایک صاحب سے پوچھا گیا۔ قرآن پڑھتے وقت آپ حدیث نفس سے دوچار ہوتے ہیں یا نہیں؟ اُنھوں نے کہا۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔ کیا قرآن سے بڑھ کر بھی کوئی شئے محبوب اور پیاری ہو سکتی ہے۔

سلف میں سے بعض حضرات کا معمول تھا۔ جب قرآن پڑھتے اور اس میں جی نہ لگتا۔ تو پھر بار بار مختلف آیات کی تلاوت کرتے۔ تا آنکہ انس و محبت کے تقاضے بیدار ہو جاتے۔ ایک صاحب نے کیا خوب کہا ہے۔ قرآن میں کیا نہیں ہے! اس میں لق و دق میدان بھی ہیں۔ اور باغ و بُستانِ معانی بھی۔ بالاخانے بھی ہیں، اور محبوبانِ دلنواز بھی۔ دیباج و حریر کے پیراہن بھی ہیں اور آراستہ و پیراستہ کمرے، یا گوشہ ہائے عزلت و خلوت بھی۔ چنانچہ میمات تو لق و دق میدان ہیں۔ راٰات کا سلسلہ گویا باغات کی ایک قطار ہے۔ حامات کو بالاخانے سمجھیے۔ اور مسبحات کو محبوبانِ دلنواز قرار دیجیے۔ حامیمات دیبا و حریر کے پیرہن ہیں۔ اور مفصلات گوشہ ہائے عزلت و خلوت، جن میں غور و تدبر

کی ہزارہا لذتیں پنہاں ہیں۔ اب جس نے ان میدانوں میں قدم دھرا۔ ان باغات میں گھوما پھرا۔ اور جوان صاف ستھرے بالاخانوں میں استراحت پذیر ہوا۔ اور جس نے ان آنکھوں سے محبوبانِ دلنواز کو دیکھا۔ دیبا و حریر کے پیراہنوں کو زیبِ تن کیا۔ اور ان گوشہ ہائے عزلت و خلوت میں رہ کر فکر و تدبر کی لذتوں سے آشنا ہوا۔ اُس کو اس کا یارا کب ہے کہ ادھر ادھر ذہن کو مشوش کرتا پھرے۔

(۴) تدبر۔ کن کن مضامین میں کیا کیا چیزیں پیش نظر رہنا چاہئیں

تدبر کا مرتبہ حضورِ قلب سے آگے کا ہے۔ حضورِ قلب سے صرف اتنا ہی مقصود تھا کہ قاری کا ذہن قرآن کے بارہ میں یکسو ہو۔ تدبر کا یہ مطلب ہے۔ کہ قاری نہ صرف یکسو ہو۔ بلکہ قرآن کے معانی و مطالب میں غور و فکر بھی کرے۔ اور جو کچھ پڑھ رہا ہے اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش بھی کرے۔ ترتیل و تجوید کے قاعدوں کو اسی بناء پر اہمیت دی گئی ہے۔ کہ اس سے فہم قرآن میں مدد ملتی ہے۔ حضرت علی کا کہنا ہے۔

لا خیر فی عبادۃ لا فقہ فیھا ولا قراءۃ لا تدبر فیھا۔

اس عبادت میں خیر کا کوئی پہلو نہیں جس میں فقہ و شعور نہ ہو۔ اور اُس قرأت میں بھلائی کا کوئی شائبہ نہیں جو تدبر سے عاری ہو۔

تدبر کے دواعی کو بیدار کرنے کا ایک طریق یہ ہے۔ کہ آیاتِ قرآن کو بار بار پڑھے۔ اور اس اثناء میں اُن کی تہوں میں اترنے کی کوشش کرے۔ لیکن آیات کے اعادہ و تکرار کا یہ طریق اسی وقت مفید رہے گا۔ جب قاری تنہا نماز پڑھ رہا ہو۔ اور امام کے پیچھے نہ کھڑا ہو۔ کیونکہ اقتداء کی صورت میں اس کی پیروی ضروری ہے۔ اور بار بار پڑھنے اور غور و فکر کو کسی ایک ہی آیت پر مرکوز کرنے میں یہ اندیشہ ہے۔ کہ جب تک وہ کسی ایک آیت پر غور کرے گا۔ اور اُس کو

اپنے تدبر کا مدار و محور ٹھہرائے گا۔ امام اس مقام سے آگے بڑھ جائے گا۔
قرآن میں غور و فکر اگرچہ بجائے خود مقصود و مطلوب ہے۔ مگر نماز با جماعت
چونکہ ایک طرح کا نظم چاہتی ہے۔ اس لیے اس میں اگر مبالغہ کی حد تک اس
کی اجازت دی جائے گی۔ تو یہ بجائے نیکی کے ایک بُرائی شمار ہوگا۔ اسی حقیقت
کی طرف عامر بن عبد قیس نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

الوسواس یعترینی فی الصلوٰۃ۔ — میں نماز میں وسوسوں سے محفوظ نہیں رہ پاتا۔

پوچھا گیا۔ کیسے وسوسے؟ کیا امور دنیا سے متعلق قلب و ذہن کسی طرح کا
الجھاؤ محسوس کرتا ہے۔ کہنے لگے۔ جی نہیں۔

لان تختلف فی الاسنۃ احب الی من ذالک ولکن یشتغل قلبی بمعقفی بین یدی ربی عز و جل و انی کیف انصرف۔ — میرے جسم پر تیر و سناں کے حملے ہوں۔ یہ تو گوارا ہے۔ مگر یہ گوارا نہیں کہ نماز میں امور دنیا مجھے اُلجھاتے رہیں۔ وسوسہ یہ ہے۔ کہ نماز با جماعت کے دوران میرا قلب اس احساس میں ڈوب جاتا ہے۔ کہ میں اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہوں۔ اور یہ ایسی کیفیت ہے جس سے ذہن علیحدگی برداشت نہیں کرتا۔

یعنی میں اسی لذت میں مشغول رہتا ہوں۔ اور امام آگے بڑھ جاتا ہے۔
بار بار آیات کے پڑھنے اور دُہرانے کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ
صحابہ و تابعین کے ان اقوال سے لگائیے۔
تمیم الداری رات بھر اس ایک ہی آیت کی تلاوت میں لگے رہے۔

ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلھم کالذین — جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں۔ کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ہم ان لوگوں کو ان جیسا کر

اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت۔ (جاثیہ-۲۱) دیں گے جو ایمان لائے۔

سعید بن جبیرؒ نے اس آیت کی تلاوت میں پوری رات گذار دی۔

وامتازوا الیوم ایھا المجرمون۔ (یٰسن-۶۰) اور گناہ گارو! آج الگ ہو جاؤ۔

سلیمان الدارانی کا کہنا ہے۔ چاہے چار پانچ راتیں بیت جائیں میں جب تک ایک آیت میں تدبر نہیں کر لیتا۔ اور اس کی کیفیات سے قلب وذہن کو پوری طرح متاثر نہیں کر لیتا۔ دوسری آیت نہیں پڑھتا۔

سلف میں سے ایک بزرگ کے بارہ میں منقول ہے۔ ان کو سورۃ ہود کے مطالب ومعانی پر تدبر کرنے میں چھ مہینے صرف کرنا پڑے۔ ایک عارف نے اپنے معمولات کا یوں ذکر کیا ہے۔ کہ میں نے ختم قرآن کی کئی صورتیں مقرر کر رکھی ہیں۔ ایک ختم تو روزانہ ہوتا ہے۔ ایک ماہ بماہ ہوتا ہے۔ اور ایک پورے سال میں ایک دفعہ تیس برس سے تلاوت وتدبر کا یہ عمل جاری ہے۔ مگر نہیں کہہ سکتا کہ اس کے تمام معانی کے احاطہ سے فراغت حاصل کر چکا ہوں۔ اس کی توجیہہ انھوں نے یہ بیان کی کہ میری حیثیت قرآن کے اس مزدور کی سی ہے، جو اس میں محنت کرتا ہے۔ پھر اجرت کا ایک حصہ تو روزانہ وصول کرتا ہے۔ دوسرا حصہ ہفتہ وار وصول کرتا ہے۔ اور تیسرا متعین مقدار ماہ بماہ اور سال بسال وصول کرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ یعنی مطالب ومعانی قرآن کے کئی درجے ہیں۔ کچھ سرسری توجہ چاہتے ہیں۔ کچھ فوراً گہرے التفات کے متقاضی ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں۔ کہ پورے پورے استغراق کے طالب ہیں۔

تفہیم سے مقصود ہے کہ قرآن کے مطالب ومعانی پر اس انداز سے غور کرے کہ ہر ہر مضمون کے مقابلہ میں صرف اسی رائے اور نقطۂ نظر کو اپنائے۔ کہ جو صحیح

ہو۔ اور اس مضمون اور مقام کے شایان شان ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ قرآن میں کئی اہم مضامین کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں اللہ کی صفات کی وضاحت بھی ہے اور اس کے افعال و سنن کی تشریح بھی۔ انبیاء علیہم السلام کے احوال و سوانح کا تذکرہ بھی ہے۔ اور مکذبین کی حالت کا بیان بھی۔ پھر اس میں اوامر و نواہی کی تفصیلات بھی مذکور ہیں۔ اور جنت و دوزخ کا نقشہ بھی۔ ظاہر ہے۔ ان سب مضامین میں ایک متعین رائے اور عقیدہ ہی نجاتِ اُخروی کا باعث، اور ارتقائے مدارج کا سبب ہو سکتا ہے۔ مثلاً وہ آیات جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا تذکرہ ہے۔ جن میں اُس کا سمیع و بصیر، قدوس و عزیز اور جبار اور متکبر ہونا مذکور ہے۔ ان سب میں قاری کو صحیح و مناسب رائے قائم کرنا چاہیے۔ اور ان اسماء و صفات کی تہوں میں جو غوامض پنہاں ہیں۔ اُن کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ عبداللہ بن مسعود کا ارشاد ہے۔

من اراد علم الاولین و	جو شخص پہلوں اور پچھلوں کے علوم حاصل
الاٰخرین فلیتدبر القراٰن	کرنا چاہتا ہے۔ اُسے قرآن کے معانی میں
و اعظم علوم القراٰن تحت	تدبر کرنا چاہیئے۔ اور علوم قرآن کا عظیم ترین
اسماء اللہ عزوجل و	ذخیرہ اسماء و صفات کے اسرار میں پوشیدہ
صفاتہ۔	ہے۔

اللہ تعالیٰ کے افعال و سنن میں غور و فکر کا نہج یہ ہے۔ کہ اس کی ہر ہر مخلوق اور اس کے ہر ہر فعل میں فاعل و صانع ہی کی عظمت کی طرف توجہ مبذول ہو۔ مزید براں قاری یہ سمجھے کہ ہر ہر شئے اسی کی توجہات تخلق سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اسی کی مرضی و ارادہ سے قائم و زندہ ہے۔ اور بالآخر اسی کے حکم و فیض سے اسے فنا کے گھاٹ اترنا ہے۔ خود اپنی ذات کے بارہ میں یہی رائے رکھے۔ کہ اس کا

وجود بالتبع ہے۔ بالاستقلال نہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو خود اس کی عقل و دانش اس کو ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔

اسی طرح جب ایسی آیات کی تلاوت کرے۔ جن میں انسان کی پیدائش کا ذکر ہے۔ تو ان میں مذکورہ ان تمام عجائب وغرائب پر ایک دقیق نظر ڈالے کہ کیونکر اللہ تعالیٰ نے اُس کو ایک قطرۂ آب سے گوشت پوست میں بدلا۔ کس طرح اس میں سمع وبصر کی صلاحیتیں پیدا کیں۔ اور پھر کس طرح اس میں عقل وشعور نے انگڑائی لی۔ لیکن ان تمام انعامات کے مقابلہ میں اس کا طرزِ عمل یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو آسانی سے ماننے والا نہیں۔

اولم یر الانسان انا خلقناہ من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین۔ (یٰس۔ ۷۷)

کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر تو وہ تڑاق پڑاق جھگڑنے لگا۔

انبیاء علیہم السلام کے احوال وسوانح کا مطالعہ کرتے وقت اس نکتہ کا استحضار ضروری ہے۔ کہ قاری یہ دیکھے کہ ان کی جلالتِ قدر اور محبوبیت کے باوجود مخالفت ہوئی۔ لڑائیاں ہوئیں۔ اور اُن میں سے بعض جامِ شہادت تک پینے پر مجبور ہوئے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ کہ باوجود اس گہرے اور مشفقانہ تعلق ورشتہ کے جو اس کو انبیاء اور اپنی مخلوق سے ہے۔ وہ ان دونوں کی ان آزمائشوں میں کچھ پروا نہیں کرتا۔ پھر جب یہ دیکھے کہ آخر آخر میں ان امتحانات کے بعد انبیاء علیہم السلام اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہتے ہیں۔ تو اس سے اس کے اس یقین میں اضافہ ہونا چاہیے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے حق کی نصرت واعانت کو بہرحال اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

آ تا ہے۔ اور وہ اس لائق نہیں رہتا۔ کہ حقائق قرآنی تک رسائی حاصل کر سکے کیونکہ یہ چیز تقلید سے حاصل ہونے والی نہیں۔ اس کی نفسیات کچھ اس ڈھنگ کی ہو جاتی ہیں۔ کہ ہر ہر بات کو اپنے ہی آبا ؤ اجداد کے معیار پر جانچ کر دیکھتا ہے۔ اور نفس مسئلہ پر غور نہیں کر پاتا۔ ظاہر ہے۔ اس حالت میں قرآن اس کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قرآن تو ذاتی بصیرت و مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے اور ایسے حقائق و معارف کی طرف بلاتا ہے۔ جو فکر و عقل کی کاوش اور جد و جہد کے متقاضی ہیں۔ یہی مطلب ہے صوفیار کے اس قول کا۔

ان العلم حجاب   علم بھی ایک پردہ ہے۔

یعنی ایسا علم جو تقلید سے حاصل ہو۔ جو جدلیات و مناظرہ کا نتیجہ ہو۔ حقیقی اور سچا علم نہیں۔ اس سے بڑھ کر کشف حقائق کا مانع اور کون ہو سکتا ہے تقلید کی دو صورتیں ہیں۔ اور دونوں غلط ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق غیر صحیح عقیدہ سے ہو۔ مثلاً ایک شخص کو استوار علی العرش کے معنی یہی یاد کرائے گئے ہیں۔ کہ اس سے مراد جسمانی تمکن و استقرار ہے۔ اور اللہ تعالیٰ عرش پر اس طرح متمکن ہے۔ جس طرح ایک انسان تخت پر بیٹھتا ہے۔ تو اس کے سامنے ہزار تنزیہہ کی آیات پیش کیجیے۔ یہ اُن سے از راہِ تقلید متاثر نہیں ہوگا اور اُسی پہلے عقیدے پر جما رہے گا۔

دوسرے یہ کہ اس کا تعلق ایک صحیح عقیدہ سے ہو۔ اس میں یہ قباحت ہے کہ چونکہ اس کا علم تقلیدی ہے تحقیقی نہیں۔ اس لیے اس مسئلہ کے دوسرے باریک اور نازک پہلو اس کی نظروں سے اوجھل رہیں گے۔

اور وہ یہ نہیں سمجھ پائے گا۔ کہ علم کے کئی درجے ہیں۔ یعنی علم کبھی کسی مسئلہ کے ظواہر سے معتبر ہوتا ہے۔ اور کبھی اس کے باطن کو گھیر لینے کی جد و جہد کرتا ہے

اور مقلد نے چونکہ صرف ظاہر رُخ کی جھلک ہی دیکھی ہے اور اس پر مطمئن ہے اس لیے بالطبع اس کے لیے باطنی اسرار تک پہنچنا دشوار ہے۔

(۳) ہجوم شہوات۔ معانی قرآن کے فہم و تدبر میں ایک بہت بڑا مانع بدعملی بھی ہے۔ جب کوئی شخص گناہوں پر اصرار کرے، کبر و غرور کو اپنائے اور معصیت کے ارتکاب پر اترائے۔ اور اصرار کرے۔ تو اس پر قرآن فہمی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ شہوات اور ہوائے نفس کی پیروی سے آئینہ قلب زنگار آلود ہو جاتا ہے۔ اور اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس پر قرآن کے معانی و مطالب منعکس ہو سکیں۔ حدیث میں ہے۔

اذا عظمت امتی الدینار والدراھم نزع منھا ھیبة الاسلام و اذا ترکوا الامر بالمعروف والنھی عن المنکر حرموا برکت الوحی۔	جب میری امت نے درہم و دینار کو زیادہ اہمیت دینا شروع کی۔ ان کے دلوں سے اسلام کی ہیبت نکل گئی۔ اور جب اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے منہ موڑا۔ وحی کی برکتوں سے محروم ہو گئی۔

حضرت فضیل کا کہنا ہے وحی کی برکتوں سے محروم ہونے کے معنی فہم قرآن سے محروم ہو جانے کے ہیں۔ نیکی اور قلب کی صلاحیتوں کو فہم قرآن میں دخل ہے اس پر خود قرآن نے جابجا روشنی ڈالی ہے۔

تبصرةً و ذکری لکل عبد منیب (ق - ۸)	تاکہ رجوع لانے والے بندے ہدایت اور نصیحت حاصل کریں۔
و ما یتذکر الا من ینیب۔ (مومن - ۱۳)	اور نصیحت تو وہی پکڑتا ہے۔ جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

انما یتذکر اولو الالباب - (رعد - ۱۹) اور سمجھتے تو وہی ہیں جو عقلمند ہیں -

عقل و دانش کے بارہ میں یہ بات سمجھ لینے کی ہے - کہ اس سے مراد وہ صلاحیتیں نہیں ہیں، جن کی بنا پر کوئی شخص مزخرفاتِ دنیا کو حاصل کرنے کی تگ و دو کرتا ہے - بلکہ اس سے مقصود وہ بصیرت ہے جس کے سبب دنیا کے مقابلہ میں آخرت و عقبیٰ کی قدر و قیمت زیادہ محسوس ہوتی ہے -

(۴) تفسیر ظاہری پر انحصار - قرآن کی تعبیر و تفسیر کے کئی پہلو ہیں - اس لیے ہر شخص یہ سمجھتا ہے، کہ تفسیر کا وہی حصّہ مستند اور صحیح ہے - جو ظواہر الفاظ سے متعلق ہے - اور جو ابنِ عباس، مجاہد یا عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے - اور اس کے باطن اور روحانی پہلو درخورِ اعتنا نہیں - یقین رکھیے کہ ایسا شخص قرآن کے اسرار و معارف سے یکسر محروم ہے - اور یہ خیال بھی من جملہ ان حجابات کے ہے - کہ جو فہم قرآن کے سلسلہ میں حائل ہوتا ہے -

تفہیم ہی کا ایک مرتبہ یہ ہے - کہ قرآن پڑھنے والا ہر ہر حکم اور ہر ہر آیت کا مخاطب اپنی ذات کو قرار دے - اسے تخصیص کہتے ہیں - یعنی جب کسی امر کے بارہ میں پڑھے تو اس سے داعیۂ عمل بیدار ہو - جب نہی پر مشتمل آیات کا مطالعہ کرے تو گناہوں سے نفرت کے جذبات بیدار ہوں - اسی طرح انبیاء کے قصص و احوال کی تلاوت کرے - تو ان میں تذکیر و اعتبار کے پہلوؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے - اور یہ نہ سمجھے کہ اللہ نے ان کو محض بطورِ کہانی کے بیان کیا ہے -

اسی کیفیتِ تفہیم کو قرآن نے تثبت سے تعبیر فرمایا ہے -

ما نثبت به فوادك - (ہود) اس سے ہم تمہارے تثبت کا اہتمام کرتے ہیں -

غرض یہ ہے کہ نزولِ قرآن کا سبب یہ قرار دے کہ بغیر کسی استثنار کے اس کے مخاطب تمام افراد اور تمام بنی نوع انسان ہیں اور ان میں ہر ایک کی اصلاح مقصود و مطلوب ہے۔

واذکروا نعمت اللہ علیکم وما انزل علیکم من الکتاب و الحکمۃ یعظکم بہ۔ (البقرہ - ۱۳۱)

اور تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں جن سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے۔ وہ یاد کرو۔

لقد انزلنا الیک کتابا فیہ ذکرکم افلا تعقلون۔ (انبیاء - ۱۰)

ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔

ھذا بصائر للناس وھدی ورحمۃ لقوم یوقنون۔ (جاثیہ - ۲۰)

یہ قرآن لوگوں سے دانائی کی باتیں ہیں اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

اسی حقیقت کو محمد بن کعب القرظی کی چشمِ بصیرت نے بھانپا۔ اور ان الفاظ میں بیان کیا۔

من بلغہ القرآن فکانما اللہ کلمہ

جس شخص کی قرآن تک رسائی ہو جاتی ہے اس نے گویا اللہ تعالے سے بات چیت کی۔

اور اسی نکتہ دلنواز کی طرف مالک بن دینار نے ایک سوال پوچھ کر توجہ دلائی۔

ما زرع فی قلوبکم یا اھل القرآن۔ ان القرآن ربیع المومن۔

اے حاملینِ قرآن یہ تو بتاؤ تمہارے دلوں میں قرآن نے کیا گل بوٹے کھلائے۔ یاد رکھو قرآن مومن کے لیے موسمِ بہار کی مانند ہے۔

یعنی جس طرح بہار کے زمانے میں مُردہ زمین بھی زندہ ہو جاتی ہے۔ اور اس میں روئیدگی کی مخفی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کی برکت سے تمہارے دلوں کی زمین کو بھی روکشِ گلستاں ہونا چاہیے۔ اور اس میں بھی ایمان کے برگ و بار پر نکھار آنا چاہیے۔ کیا اس سے یہ مقصد حاصل ہوا۔ اور اس کی تلاوت سے تم نے اپنے دلوں میں کوئی اثر محسوس کیا؟

(۶) تاثر

تاثر سے یہ مطلب ہے۔ کہ قاری مختلف مضامین کی آیات سے قلب وذہن میں ایسی کیفیات پیدا کرے۔ اور اکسائے۔ جو ان مضامین کے عین مطابق ہوں۔ یعنی یہ کہ پھر صرف کیفیات ہی پیدا نہ کرے۔ بلکہ ان کے نتیجے میں وجد وحال کے جذبات کو بھی طاری کرنے کی جدوجہد کرے۔ یعنی اگر آیات خوف وخشیت اور حزن وغم کے اسباب پر مشتمل ہوں تو جسم پر رعشہ اور کپکپی کے آثار نمودار ہونا چاہییں اور اگر مغفرت وبخشش کے وعدوں کے تذکرے ہوں، تو سارے جسم میں سرور وانبساط کی لہر دوڑ جانا چاہیے۔ اور ایسا محسوس ہونا چاہیے۔ کہ قاری نے فی الواقعہ مسرت و ابتہاج کے دواعی کو محسوس کیا ہے۔ اور اس کو اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کا پورا پورا یقین ہے۔

لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ قرآن سے جس درجہ شغف بڑھے گا اور ان معارف ومضامین سے جس درجہ واقفیت زیادہ گہری ہوتی جائے گی۔ اسی نسبت سے، خوشی ومسرت کے بجائے غم وحزن کی کیفیات سے دل زیادہ متاثر ہوگا۔ کیونکہ اس کتاب ہدیٰ میں ایسی آیات کی کثرت ہے۔ کہ جن سے گداز، رقت، اور سوز کے کے احوال پیدا ہوتے ہیں۔ اور کہیں کہیں اگر مغفرت وبخشش کی خوشخبریاں سنائی گئی ہیں۔ تو ایسی کڑی شرائط کے ساتھ کہ جن کا ایفاء آسان نہیں۔ مثلاً سورۂ العصر میں انسان کی محرومیوں کے بارہ میں یہ بتایا گیا۔ کہ یہ جدوجہد اور تگ ودو کے باوجود بالعموم فساد اور گھاٹے کی زندگی ہی بسر کرتا ہے۔ اور اس کے اعمال کا رُخ عموماً ہلاکت وبربادی ہی کی طرف رہتا ہے۔ ہاں اس چکر سے اس کا مخلصی حاصل کر لینا بھی ممکن ہے۔ مگر کیونکر اور کن کن لوگوں کے لیے؟

الا الذین آمنوا وعملوا — مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے

الصلحت وتواصوا بالحق و — رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی

تواصوا بالصبر۔ (عصر۔ ۳) تاکید کرتے رہے۔

گویا ایمان، عمل صالح اور تواصی بالحق، اور تواصی بالصبر کی چار چار شرطوں کو اس غرض کے لیے پورا کرنا ضروری ہے۔ ان پر غور کیجیے اور بتائیے کیا ان سے نپٹنا آسان ہے۔ اور یہ خوشخبری ایسی ہے کہ بغیر سخت شدائد و محن سے گذرے اس سے کوئی شخص بہرہ مند ہو سکے۔

اسی تاثر کے بارہ میں حسن بصری نے فرمایا۔

واللہ ما اصبح الیوم عبد یتلوا القرآن یومن بہ الا کثر حزنہ وقل فرحہ وکثر بکاؤہ وقل ضحکہ، وکثر نصبہ و شغلہ وقلت راحتہ وبطالتہ۔

بخدا جس روز بھی کسی شخص نے قرآن کی تلاوت کی۔ اُس کا حزن بڑھ گیا، اس کی خوشیاں کم ہو گئیں۔ اس کے نالہ و شیون میں اضافہ ہوا۔ اس کی ہنسی مذاق کا دور ختم ہو گیا۔ اُس کی تگ و دو اور سعی و کوشش کے دائرے وسیع ہوئے اور راحت و بطالت جاتی رہی۔ بشرطیکہ یہ شخص اس قرآن پر ایمان بھی رکھتا ہو۔

یہی وہ تاثر تھا جس کی وجہ سے کچھ اہل اللہ قرآن پڑھتے وقت غش کھا کر گر پڑتے اس تاثر کا یہ کرشمہ ہے کہ کچھ اہل دل حضرات سے متعلق ہم سنتے اور پڑھتے ہیں۔ کہ تلاوت کے دوران اُن کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور اگر تاثر کی یہ کیفیات دل میں نہ اُبھریں تو پھر قاری کی حیثیت اس سے زیادہ کیا ہے۔ کہ وہ صرف حقائق و واقعات مندرجہ کی حکایت کرنے والا ہے بلکہ ان حقائق کو جھٹلانے والا ہے۔ مثلاً جب وہ کہیگا۔

قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم (انعام۔ ۱۵)

کہہ دو اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

اور اس کے دل کا یہ حال ہے۔ کہ خوف و حزن کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا نہیں جاتا۔ تو

یہی آیت پکار کر کہے گی۔ جھوٹ بکتا ہے۔

اسی طرح جب کہے گا۔

علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر۔ (ممتحنہ - ۴)	اے پروردگار تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی حضور میں لوٹنا ہے۔

اور اس کی حالت سے توکل وانابت کا اظہار نہیں ہو پاتا۔ تو یہی آیت اس کے جھوٹ پر سب سے بڑی دلیل ہو گی۔

غرضیکہ قرآن تو اس لیے پڑھا جانا چاہیے۔ کہ اس سے یہ کیفیات پیدا ہوں۔ اور یہ احوال وکیفیات نمودار ہوں۔ اور اگر اس سے ادنیٰ تاثر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اور قلب وذہن کسی تبدیلی کو محسوس نہیں کرتا۔ تو یہ تلاوت نہ ہوئی۔ صرف زبان چلانا ہوا۔ جو کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس سلسلہ میں اہل اللہ کیا سمجھتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس قصّہ سے لگائیے۔ ایک قاری کا کہنا ہے، میں نے ایک مشہور اور خدا رسیدہ عارف سے قرآن کی چند آیات پڑھیں۔ پھر جب دوبارہ اُن کی خدمت میں اعادہ وتکرار کی نیت سے حاضر ہوا، تو انھوں نے ڈانٹا۔

جعلت القرآن علی عملا اذهب فاقرأ علی اللہ عزوجل	تم نے قرآن کو بھی کوئی دنیاوی کام سمجھ رکھا ہے کہ اس میں صنعت وکمال پیدا کرنا خوبی ہے جاؤ جو پڑھا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش کرو اور اپنا محاسبہ کرو۔

صحابہ کا نقطۂ نظر بھی تلاوت وحفظ کے بارہ میں یہی تھا۔ کہ وہ محض عمل کی نیت سے پڑھتے۔ اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی غرض سے یاد کرتے۔ ترتیل وتجوید کے وصفی قاعدوں میں کمال پیدا کرنا ان کا مقصود نہ تھا۔

چنانچہ یہ واقعہ کس قدر حیرت انگیز ہے۔ کہ جب حضور کا انتقال ہوا بیس ہزار

صحابہ میں سے جن کو پورا قرآن یاد تھا۔ اُن کی تعداد چھ سے زیادہ نہ تھی۔ باقی تمام حضرات کو بس ایک آدھ سورۃ ہی یاد تھی۔ یا ان کے بعض حصّے یاد تھے۔ کیوں؟ اس لیے نہیں کہ ان کا حافظہ خدانخواستہ قوی نہ تھا۔ یا ان میں حفظ یا تثبت کی صلاحیتیں پائی نہیں جاتی تھیں۔ اس لیے اور محض اس لیے کہ یہ جتنا بھی پڑھتے تھے اس کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے۔ اور اس پر عمل کرنا ضروری جانتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی کا قصّہ ہے۔ یہ آں حضرت کی خدمت میں قرآن پڑھنے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ جب اس آیت پر پہنچے۔

فمن يعمل مثقال ذرة	جس نے ذرہ برابر نیکی کی وہ بھی اس کو
خيرا يره۔ ومن يعمل مثقال	پائے گا۔ اور جس نے ذرہ بھر بُرائی کی وہ
ذرة شرا يره۔	بھی اُس کے نتائج سے دوچار ہوگا۔

تو کہنے لگے۔

يكفي هذا۔ — جناب میری عملی زندگی کے لیے یہی بہت ہے

یہ کہا اور چل دیے۔ اس پر آں حضرت نے فرمایا۔

انصرف الرجل وهو فقيه۔ — کہ پلٹ کر چلا یہ آدمی۔ سرمایۂ حیات کو پا گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ تاثر کی یہ کیفیت آسانی سے پیدا ہونے والی نہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے۔ کہ یہی تلاوت سے مقصود بھی ہے۔ اور اس کے بغیر اس کی لذتوں سے انسان دوچار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی نہیں بلکہ تلاوت کا سرے سے صرف زبان ہلا دینے پر اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ تلاوت کہتے ہیں اس چیز کو، کہ اس میں زبان عقل اور قلب تینوں کا برابر حصّہ ہو۔ یعنی زبان تو تصحیحِ حروف کے درپے ہو۔ عقل معنی پر غور کرے اور قلب تاثر کی نعمتوں سے مالا مال ہو۔ قاری کا ایک مقام ترقی کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ قاری یہ محسوس کرے۔ کہ وہ کلامِ الٰہی کو اپنی زبان سے

نہیں سُن رہا ہے۔ بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی زبان سے سُن رہا ہے۔ اور اُس سے شرفِ تخاطب حاصل کر رہا ہے۔ یوں قرأت کے تین درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے۔ کہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کے حضور تصور کرے۔ اور یہ سمجھے کہ اُس کی نظریں اس کے جمالِ جہاں آرا کے لطف سے بہرہ مند ہیں۔ اور اس کی توجہ پوری طرح اس کی ذاتِ گرامی کی طرف مبذول ہے۔ یہ مقام دعا، تضرع اور ابتہال چاہتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے۔ کہ دل سے اس حقیقت پر ایمان رکھے۔ کہ اس کا آقا و مالک اسے دیکھ رہا ہے، اس سے مخاطب ہے۔ اور اپنی عنایتوں کا تذکرہ کر رہا ہے۔ یہ مقام بھی تعظیم اور توجہ و فہم کا طالب ہے۔

تیسرا درجہ ان دونوں سے بلند ہے۔ اس کا یہ تقاضا ہے۔ کہ قاری آیات و کلمات میں اللہ تعالیٰ کے جلوؤں کو ملاحظہ کرے۔ اور اُس کی صفات کی کرشمہ سازیوں اور کارفرمائیوں کو اپنی آنکھ سے دیکھے۔ اس وقت اُس کے سامنے نہ تو اپنی ذات ہو گی۔ اور نہ اس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے انعامات ہوں گے کہ اُس نے ان سے کس درجہ فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ اس وقت توجہ و ہمت کی تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی ذات برتر پر مرکوز ہوں گی۔ خیال ہو گا تو اس کا اور فکر و تدبر ہو گا تو اس کے بارہ میں گویا پورے پورے استغراق سے کام لیا جائے گا۔ یہ درجہ مقربین کے ساتھ خاص ہے اور اس سے پہلے کے دو درجے اصحاب الیمین کے ساتھ مختص ہیں۔ اس کے علاوہ جو مقامات ہیں۔ اُن کو بجز سہو و غفلت کے مقامات کے اور کس مقام و درجہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

پہلے درجہ کے متعلق حضرت جعفر بن محمد الصادق کا کہنا ہے۔

لقد تجلی اللہ عز وجل   اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں متجلی تو ہے مگر یہ لوگ

فی کلامہ ولکنہم لا یبصرون۔ اس کی تجلیات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

ایک مرتبہ ایک آیت کی تلاوت کے دوران انھیں غشی آگیا سبب پوچھا گیا۔ تو فرمایا۔

ما زلت اردد الآیۃ علی قلبی میں بار بار اس آیت کو دہرا رہا تھا تاکہ

حتی سمعتہا من المتکلم بہا۔ فلم خود متکلم اور کہنے والے کے منہ سے اس کو سن سکوں

یثبت جسمی لمعاینتہ قدرتہ۔ چنانچہ بالآخر اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ لیکن

اس حال میں کہ جسم اس مشاہدہ کا متحمل نہ ہو سکا۔

یہ وہ مقام ہے جہاں قرآت و تلاوت کی لذتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اور انسان قرآن کے صحیح صحیح لطف سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔

ایک صاحب دل حکیم کا قول ہے۔ کہ میں نے قرآن پڑھا۔ مگر اس کی فرحتوں سے محروم رہا۔ پھر اس نقطہ نظر سے اس کی تلاوت کی۔ کہ آں حضرت سے گویا براہ راست سماعت کا فخر حاصل کر رہا ہوں۔ پھر اس مقام سے آگے بڑھا۔ اور جبرئیل کی زبان فیض ترجمان سے سننے کی کوشش کی۔ اور بالآخر وہ مرحلہ آیا کہ قرآن کے اتارنے والے سے ہم کلامی کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور نہ پوچھیے اس مقام کی لذتیں کیا درجہ رکھتی ہیں۔ بس اختصاراً اتنا ہی سمجھ لیجیے۔

لا اصبر عنہ کہ یہاں پہنچکر پھر جدائی کا یارا نہیں رہتا۔

حضرت حذیفہ نے فرمایا۔

لو طہرت القلوب لم تشبع اگر دل پاک ہوں تو قرآن سے سیر ہونے کی

من قراۃ القرآن۔ نوبت کبھی نہ آئے۔

یعنی اس کی ہر ہر لذت تشنگی کو اور بڑھاتی ہے۔ اعلیٰ لذتوں کی نشاندہی کرتی ہے

آخری درجہ تبری کا ہے۔ اس

(۷) تبری۔ یعنی پندار و زعم سے دست برداری کا یہ تقاضا ہے۔ کہ قاری

اپنی استطاعت وطاقت کے پندار و زعم سے یکسر علیحدگی اختیار کرے۔
اور رضائے الٰہی اور تزکیۂ نفس کو اپنی تمام توجہات کا مرکز ٹھہرائے۔
قاری جب ایسی آیات کی تلاوت کریں کہ جن میں اللہ تعالےٰ کے وعدے اور خوشخبریاں ہوں۔ تو اُن کا مخاطب اپنی ذات کو ہرگز نہ سمجھے۔ بلکہ اُمت کے صلحاء وصدیقین کو ان کا مخاطب صحیح قرار دے۔ اور اس خواہش و آرزو کا اظہار کرے کہ اللہ تعالےٰ اس کو بھی ان لوگوں میں شمار کرے۔ اور ان کے تتبع و پیروی کی توفیق مرحمت فرمائے۔
جب ایسی آیات پر اُس کا گذر ہو جن میں اللہ کے غضب کا تذکرہ ہو۔ اور اُن لوگوں کا بیان ہو جنھوں نے دین کے معاملہ میں ہر طرح کے تساہل و کوتاہیوں کو روا رکھا ہے۔ تو اس کا مخاطب اپنی ذات کو سمجھے۔ اور بخشش وعفو میں مصروف ہو۔ یہی وہ عارفانہ گر ہے۔ جس کی طرف عبد اللہ بن عمر نے اپنی ایک دعا میں اشارہ کیا ہے۔

اللھم استغفرك لظلمی وکفری۔ — اے خدا میں اپنے ظلم اور کفر پر معافی کا طالب ہوں۔

پوچھا گیا کہ حضرت ظلم کا اطلاق تو سمجھ میں آسکتا ہے، مگر یہ کفر کیسا ہے؟ مسلمان اور کافر؟ فرمایا کفر کے بھی درجے ہیں۔ کیا یہ آیت نظر سے نہیں گذری۔

ان الانسان لظلوم کفار۔ (ابراہیم۔ ۳۴) — بے شک انسان بڑا بے انصاف اور کافر نا شکرا ہے۔

تفسیر بالرائے

کیا تاویل و تفسیر کے دائروں کو صرف ظاہر تک محدود رہنا چاہیے؟

پچھلے بابوں سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ ان میں تو فہم قرآن پر زور دیا گیا ہے اور اسرار و رموز قرآن کی اہمیتوں کو اُجاگر کیا گیا ہے لیکن آں حضرت کی سخت وعید اس معاملہ میں آئی ہے۔

من فسر القران برایه فلیتبوأ مقعده من النار۔

جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں تیار کرے۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ قرآن کو اُس کے ظاہر پر محمول کرنا چاہیے۔ اور اس سلسلہ میں مین میخ نکالنا، اور نکتہ سنجی یا خواہ مخواہ کے تکلفات سے کام لینا ممنوع ہے یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم کی ایک بہت بڑی جماعت نے ظاہری معانی کے بل پر اہل تصوف پر زبانِ طعن دراز کی ہے۔ اور کہا ہے کہ انھوں نے تفسیر کے نام پر وہ وہ باریکیاں پیدا کی ہیں۔ اور ایسے ایسے نکتوں کی نشان دہی کی ہے جن کا کوئی ثبوت صحابہ سے نہیں مل سکتا۔ یعنی نہ تو ابنِ عباس کی تشریحات میں ان کا کوئی نشان ملتا ہے۔ اور نہ عبداللہ بن مسعود ہی نے کہیں ان کی تائید کی ہے۔ اگر یہ صورتِ حال صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر اس فہم قرآن اور اسرار و رموز قرآن کا کیا مقام رہ جاتا ہے۔ جس کی تفصیلات سے چشم و قلب نے ابھی ابھی تسکین حاصل کی ہے۔ اور اس سے کیا مراد ہے؟

ہمارا جواب یہ ہے۔ کہ جو شخص قرآن کے معانی کو صرف ظاہر الفاظ میں

معانی اور باطن قرآن کے سلسلہ میں آثار و اقوال

محصور ہو جاتا ہے۔ اور یہ نہیں جانتا کہ اس کی تہ میں بے شمار گوہر ہائے یکدانہ پنہاں ہیں۔ وہ صرف اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اور اپنی استعداد اور رسائی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ جہاں تک قرآن کی تعبیر اور معانی کی وسعتوں کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق اخبار و آثار کا اچھا خاصا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

آں حضرت کا ارشاد ہے۔

ان للقران ظهرًا و بطنًا و حدًا و مطلعًا۔ — قرآن کا ایک ظاہر ہے۔ ایک باطن ہے ایک حد ہے اور ایک مطلع ہے۔

اسی انداز کا ایک قول عبداللہ بن مسعود سے بھی مروی ہے۔ یہ عبداللہ بن مسعود کون ہیں؟ تفسیر کے مسلمہ امام۔ حضرت علی کا کہنا ہے۔

لو شئت لاوقرت سبعين بعيرًا من تفسير فاتحة الكتاب۔ ۱ — میں اگر چاہوں تو صرف فاتحہ کی تفسیر پر اتنا کچھ لکھ ڈالوں، کہ اس کو اٹھانے کے لیے ستر اونٹ درکار ہوں۔

قابلِ غور بات یہ ہے۔ کہ اگر معانی کا اطلاق صرف ظاہر کے اعتبار سے ہو تو تفصیلات کا یہ پھیلاؤ کیونکر ممکن ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ دنیا میں جس درجہ علوم و فنون ہیں۔ یہ سب افعال اللہ کے حکم میں ہیں۔ اور قرآن میں جملہ افعال اللہ کی وضاحت موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ عقل و خرد کے جتنے اختلافی مسائل لوگوں میں دائر و سائر ہیں۔ ان سب کے بارہ میں اس میں فیصلہ کن اشارات پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کا آسانی سے گرفت میں آنا ممکن نہیں۔ ادراک، فہم اور کاوش شرط ہے۔

ظاہر ہے جو شخص صرف الفاظ کے قریب ترین اطلاقات پر غور کرتا اور رک جاتے

سمندر کی گہرائیوں کے آزمانے کے صرف ساحل ہی تک اپنے استفادہ کو محدود رکھتا ہے۔ وہ کہاں ان معانی تک پہنچ سکتا ہے۔

حدیث میں ہے۔

اقرءوا القرآن والتمسوا غرائبه۔

قرآن پڑھو اور اس کے عجائب کی تلاش میں رہو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

والذی بعثنی بالحق نبیّا لتفترق امتی عن اصل دینها وجماعتها علی اثنتین وسبعین فرقة کلها ضالة ومضلة یدعون الی النار فاذا کان ذلک فعلیکم بکتاب الله عز وجل فان فیه نبأ من کان قبلکم ونبأ ما یأتی بعدکم وحکم ما بینکم۔ من خالفه من الجبابرة قصمه الله عز وجل۔ ومن ابتغی العلم فی غیره اضله الله عز وجل وهو حبل الله المتین ونوره المبین۔ وشفاءه

اس خدا کی قسم جس نے مجھے حق و صداقت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ میری امت اصل دین سے ہٹ کر بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ یہ سب خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اور جہنم کی دعوت دیں گے جب یہ نوبت آئے۔ تو کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اس میں تم سے پہلوں کی خبریں ہیں اور ان حالات کی پیش گوئی ہے جن سے تمہیں دو چار ہونا ہے۔ اس میں تمہارے موجودہ مسائل کا بھی تذکرہ ہے۔ جبابرہ اور سرکشوں میں جو بھی اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگا۔ اس کی گردن مار دی جائے گی اور جو اس کے سوا دوسری جگہوں سے علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دیں گے۔ یہ اللہ کی مضبوط رسی

النافع عصمة لمن تمسك به ـ ونجاة لمن اتبعه لا يعوج فيقوم ولا يزيغ فيستقيم ولا تنقضى عجائبه ولا يخلقه كثرة الترويد ـ (۱)

ہے ۔ اور واضح روشنی ہے ۔ اور ایسی شفا ہے جو نعمت ہے ۔ یہ ان لوگوں کے لیے بمنزلہ پناہ گاہ کے ہے ۔ جو اس سے تمسک کرتے ہیں ۔ اور وہ ان کے حق میں نجات کا پیغام ہے ۔ اور جو اس کی پیروی کی سعادت حاصل کرتے ہیں ۔ یہ ایسی سیدھی راہ ہے جس میں کہیں ٹیڑھ اور پیچ و خم نہیں ۔ مزید برآں اس کے عجائب ختم ہونے والے نہیں اور نہ اس کے مطالب کثرتِ تلاوت سے کبھی فرسودہ ہونے والے ہیں ۔

ان تصریحات کے پہلو بہ پہلو اس حقیقت پر بھی غور کیجیے ۔ کہ ابن عباس نے قرآن میں جس حکمت کو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام قرار دیا ہے ۔ اس کو فہم قرآن سے تعبیر فرمایا ہے ۔

ومن يؤت الحكمة فقد اوتى خيرا كثيرا ۔ (بقرہ ۔ ۲۷) يعنى الفهم فى القرآن ۔

اور جسے حکمت عطا کی گئی ۔ اُسے خیر کثیر سے بہرہ مند کیا گیا ۔ یعنی فہم قرآن کی صلاحیتیں بخشی گئیں ۔

اس سے معلوم ہوا ۔ کہ قرآن فہمی کا میدان بہت وسیع ہے ۔ اور غور و فکر کرنے والوں کے لیے گنجائش کی بے انتہا فراوانیاں ہیں ۔ اور مقصودِ شرع یہ نہیں کہ انسانی بصیرت کے دائرے صرف الفاظ کے ظواہر تک محدود ہو کر رہ جائیں ۔ اور ان کے اندر جو معانی اور نوادر کی ایک دنیا آباد ہے ۔ اُس کے بارے میں کوئی تحقیق نہ کی جائے ۔

---

(۱) ترمذی ۔

تفسیر بالرائی کے معنی کیا ہیں؟ تفسیر و تعبیر کے تقاضوں کو مسموعات تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے

رہی یہ بات کہ آں حضرت نے جو تفسیر بالرائی سے روکا ہے۔ یا حضرت ابو بکر نے جو یہ فرمایا ہے۔

ای ارض تقلنی و ای سماء تظلنی اذا قلت فی القرآن برائی۔

مجھے کون زمین برداشت کرے گی، اور کون آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوگا۔ اگر میں قرآن میں اپنی رائے چلاؤں۔

تو اس کا محل و مورد کیا ہے؟

سب سے پہلے سوچنے کی بات یہ ہے۔ کہ اگر تصریحات سے یہ مقصود ہے۔ کہ تفسیر و تعبیر کی کوششیں صرف منقولات و مسموعات تک محدود رہیں۔ تو یہ بوجوہ ممکن نہیں۔

کیونکہ اگر مسموعات سے مراد یہ ہے۔ کہ آنحضرت سے منقول و مروی ہوں۔ تو یہ بہت ہی محدود ہیں۔ ان سے کسی طرح بھی تفسیر قرآن کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے۔ اگر مسموعات کا دائرہ صحابہ تک وسیع ہے۔ تو یہ بھی قابل قبول نہیں۔ اس لیے کہ صحابہ بھی تو آخر انسان ہی ہیں۔ ان کی رائے پر کیونکہ تفسیر بالرائے کا اطلاق نہ ہوگا، پھر جو لوگ صحابہ کی تفاسیر پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ ان میں معنی و تعبیر کا بے حد اختلاف پایا جاتا ہے جس سے اتنی بات تو بہرحال ثابت ہوتی ہے۔ کہ ان کے سامنے استدلال کے لیے صرف مسموعات و منقولات کا ذخیرہ نہ تھا۔ ورنہ اختلاف تفسیر کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ بلکہ ان میں کے ہر ایک نے قرآن کے معانی میں غواصی کی ہے۔ اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس بحر بے کراں سے اخذ مطالب کیا ہے۔ اور یہ حدیث تو فضائل ابن عباس کے سلسلہ میں خاص شہرت رکھتی ہے۔

دعا لابن عباس رضی اللہ عنہ، قال اللّٰھم فقہہ فی الدین و علمہ التاویل ۔

آں حضرت نے حضرت ابن عباس کے حق میں دعا فرمائی۔ کہ اے اللہ اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا کر اور تاویل کے اسرار کا محرم بنا۔

اب اگر تاویل الفاظ و منقولات تک ہی محدود ہوتی۔ اور اس کے دائرے معنی کی وسعتوں تک پھیلے ہوئے نہ ہوتے۔ تو اس دعا و تخصیص کا کوئی مطلب ہی نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں ارشادِ ربانی ہے۔

لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم ۔ (نساء ۔ ۸۳)

تو استنباط کرنے والے اس کی حقیقت کو پا لیتے۔

استنباط صرف سماع و نقل کا حامل نہیں بلکہ معنوی تقاضے اور گہرائیاں بھی اس میں شامل ہیں

تفسیر بالرائے کے دو محمل

جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالے نے استنباط و استدلال کا ذکر مقام مدح میں کیا ہے۔ جو کھلا ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ فعل دین کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس لیے اس سے روکنا اور باز رکھنا کیونکر ممکن ہے پھر استنباط کا لفظ یہ بھی بتا رہا ہے۔ کہ یہ مجرد سماع نہیں ہوسکتا۔ بلکہ سماع سے قطعی مختلف چیز ہے۔ جو معنی و باطن سے متعلق ہے۔ ظاہر و سطح سے نہیں۔

اب ان تصریحات پر غور کریں جن میں تفسیر بالرائے سے روکا گیا ہے۔ اور مورد و محمل متعین کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری رائے میں۔ اس کے دو محمل ہوسکتے ہیں

(۱) یہ کہ کوئی شخص پہلے سے کوئی رائے رکھتا ہو۔ اور پہلے سے کسی نظریہ کی صحت کا قائل ہو۔ اور تفسیر سے اس کی غرض محض یہ ہو کہ اپنے حسب منشا آیات تلاش کرے۔ اور اس نظریہ و رائے کے مطابق ان کی تشریح کرے۔ نیز اپنے رجحانات و میلانات نفس کے لیے قرآن کی تائید و نصرت چاہے۔ یہ فعل یقیناً برا ہے۔ اور کوئی

شخص بھی اس انداز تفسیر کو جائز نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو محض جہل اس کا باعث ہوگا یعنی ایک آیت کے فرض کیجیے۔ دو معنی منقول ہیں تو وہ ازراہِ نادانی، ان میں سے اس معنی کو اختیار کرے گا۔ جو اس کے مطابق ہو۔ اگرچہ نفس تاویل کے اعتبار سے وہ مرجوح ہو۔ اور دوسرا معنی زیادہ قوی ہو۔ اور یا جانتے بوجھتے وہ غلط تاویل کو اس بنا پر پسند کرے گا۔ تاکہ اپنے حریف کو شکست دے سکے۔ اور اپنے رجحان و عقیدہ کی صحت ثابت کر سکے۔

اس انداز کی تاویلات بالملہ متعدد ہیں۔ مثلاً سحری کے بارہ میں حدیث ہے۔

تسحروا فان فی السحور سحری ضرور کھاؤ اس میں برکت ہے

برکۃ۔

اب اگر کوئی شخص کہتا ہے تسحّروا سے مراد سحری کھانا نہیں بلکہ اللہ کا ذکر ہے تو یہ تفسیر بالرائے ہوگی۔

موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مقابلہ کے لیے مبعوث فرمایا۔ اور یہ حکم دیا۔

اذھبا الی فرعون انہ اور فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ سرکش

طغیٰ۔ (طٰہٰ۔ ۴۳) ہو رہا ہے۔

اس پر اگر کسی صوفی صافی نے ازراہِ موشگافی و نکتہ سنجی یہ کہہ دیا کہ فرعون سے مراد انسان کا دل ہے۔ کوئی تاریخی شخصیت نہیں۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کون سرکش ہو سکتا ہے۔ تو یہ تاویل منشار قرآن کے منافی ہوگی۔ اور تفسیر بالرائے کہلائے گی۔

یہ انداز درحقیقت واعظوں کا ہے جو مجالس کو گرمانے کے لیے اور جہلا پر اپنا اثر رعب گانٹھنے کے لیے اس نوع کی تاویلاتِ فاسدہ سے کام لیتے ہیں۔ یا یہ باطنیہ کا خاص ڈھنگ ہے۔ جس کے ذریعہ یہ حقائق دینیہ کو مسخ کرتے ہیں۔

(۲) قرآنِ حکیم کا اپنا ایک اندازِ بیان ہے۔ جو زبانِ عربی کے اعلیٰ ترین تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس میں کہیں اختصار ہے۔ کہیں حذف ہے۔ کہیں اضمار سے کام لیا گیا ہے۔ پھر کہیں تقدم ہے کہیں تاخر۔ ظاہر ہے اس مرحلہ پر تعیین معنی کے لیے سماع اور منقولات کی مدد لی جائے گی۔ ورنہ سخت غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ اب اگر کوئی شخص ان صحیح روایات کی پروا نہیں کرتا جو معنی و تاویل کی حقیقتوں پر روشنی ڈال سکتی ہیں۔ اور آیات کے ضروری پس منظر کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور صرف عربیت کے بل بوتے پر اُن کی تاویل کرتا ہے۔ یا غرائب کی تشریح کی آڑ لیتا ہے۔ تو وہ صریحاً قرآن کے ساتھ تلعب کرتا ہے۔ اور اسی قیمتی ذخیرہٴ احادیث و آثار کی قدر و قیمت گھٹاتا ہے۔ جس سے مشکلاتِ قرآن کی عقدہ کشائی ہوتی ہے۔ اور چہرہٴ معانی کی جلا بڑھتی ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس احمق کی سی ہے۔ کہ جو گھر کے وسط تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر صدر دروازے سے داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ دو صورتیں ہیں جن پر تاویل بالرائے کا صحیح صحیح اطلاق ہوتا ہے۔ آں حضرت نے انہیں دو صورتوں سے روکا ہے۔ ورنہ معانی میں غور و خوض ایسی چیز نہیں کہ ظاہر معنی کی اس میں مخالفت پائی جائے۔ بلکہ یہ تو ایک طرح سے الفاظ و ظواہر ہی کی مدد سے مغز و باطن یا عطر و روح تک پہنچتا ہے۔
